لمحات

خُرّم مُرادؔ

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

گر تو می بینی حسابم ناگزیر

از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اقبالؒ

ترتیب

اعتراف	خورشید احمد	۱۹
ابتدائیہ	خرم مراد	۲۵

ا۔ بچپن اور زندگی کا دورِ تشکیل

ابتدائی نقش	۳۵
جماعت سے تعلق کی ابتدا	۳۵
والد صاحب	۴۰
گھر کا کتابی ماحول	۴۱
مطالعے کا شوق	۴۳
تنہائی پسندی	۴۸
''ترجمان القرآن'' سے تعلق	۴۸
والدہ کی توجہ اور تربیت	۵۰
تحریک پاکستان میں دلچسپی	۵۳
دینی تعلیم کا ارادہ	۵۵
جماعت سے تعلق کی خواہش	۵۶
کالج میں داخلہ	۵۷
تحریکی لٹریچر سے ربط	۵۸

چند شخصیات، کچھ رفیق	۵۸
طالب اور جماعت کی رکنیت	٦٠
بھارت میں نظم جماعت	٦١

۱۔ پاکستان میں آمد اور مسائل

پاکستان آنے کا فیصلہ	٦٣
پاکستان کا سفر اور جذبات	٦۴
سنت رسول ﷺ کی سعادت	٦۵
لاہور کی فضا	٦٦
کراچی کے دامن میں	٦٧
مخالفانہ فضا	٦٧
گھر کے مسائل	٦٨
تعلیم کا مسئلہ	٦٨
بھائی کا انتقال	٦٩

۳۔ جمعیت سے وابستگی اور سفر شوق

جماعت کے دفتر میں	٧١
جمعیت کا پتا	٧٢
محبت کی دنیا میں	٧٣
مولانا انصاری سے ملاقات	٧۴
کراچی کے کالج میں	٧۴
قومی قیادت، چند آوازیں	٧۵

جمعیت میں سرگرمیاں	۷۶
انجینیرنگ کی طرف	۷۸
کراچی جمعیت کی نظامت	۸۰
نظامت میں پہلا قدم	۸۱
اپنے مکان میں	۸۲
ابتدائی کاوشیں	۸۲
سعید رمضان سے تعارف	۸۶
ایک تربیتی پروگرام	۸۸
کالج ہال میں	۸۹
دعوت کے بارے میں	۹۰
رہایشی حلقوں کا تجربہ	۹۱
جلسے میں مولانا کی شرکت	۹۲
''اسٹوڈنٹس وائس'' کا اجرا	۹۳
قابل رشک ٹیم	۹۵
خدمت طلبہ کا کام	۹۶
تحریک سے بیرونی حلقے تک	۹۷
دفتر جمعیت کا حصول	۱۰۰
اساتذہ اور ہماری اعانت	۱۰۲
نظامت سے فراغت	۱۰۵
مسجد خضرا کی یاد	۱۰۹
طالبات میں کام، ناکام کوشش	۱۰۹

پیر کالونی کا رہائشی حلقہ	۱۱۲
تربیت کا مرکزی نکتہ	۱۱۲
جنت کی طلب	۱۱۳
کچھ ذکر، ذکر کا	۱۱۵
زیارت قبور کا عمل	۱۱۷
رعایتی ٹکٹ، غلطی پر پشیمانی	۱۱۸
لاہور میں خوش گوار رابطے	۱۲۰
سفر کے جمعیت پر اثرات	۱۲۱
کچھ ذکر شب بیداری کا	۱۲۳
جماعت سے تعلق	۱۲۴
خود مختاری کا ثمر	۱۲۶
ایک اہم واقعہ	۱۲۹
بنگلہ زبان اور جمعیت	۱۳۱
مشرقی پاکستان سے قلبی وابستگی	۱۳۲
مسلم دُنیا سے رابطہ	۱۳۵
کچھ اور کرم فرما	۱۳۸
ایک یادگار جلوس	۱۳۹
وقت کی پابندی	۱۴۱

۴۔ نظامت اعلیٰ اور جمعیت سے فراغت

نظامت اعلیٰ کی ذمہ داری	۱۴۴
مولانا اصلاحی صاحب	۱۴۶

ذمہ داری کے دوران	۱۴۹
دستور جمعیت، تدوین کے مرحلے	۱۵۱
۵۲ء کی کچھ یادیں	۱۵۵
اسٹوڈنٹس یونین انتخاب میں	۱۵۸
کالج کا بہترین مقرر	۱۶۱
چند سبق آموز یادیں	۱۶۴
چند مفروضے، کچھ حقائق	۱۶۶
۵۳ء کی تحریک ختم نبوت	۱۶۸
مولانا مودودی کو سزائے موت	۱۷۰
احتجاج کا راستہ	۱۷۲
امتحان اور نتیجہ	۱۷۴
ایک ساتھی	۱۷۵
جمعیت میں اختلافات	۱۷۸
کراچی میں سالانہ اجتماع	۱۸۰
خورشید بھائی کا انتخاب	۱۸۱
افسوس ناک واقعہ	۱۸۲
میرے بھائی	۱۸۵
جمعیت سے فراغت	۱۸۶
قرطاس وقلم سے ناطہ	۱۸۷

۵۔ عملی زندگی میں قدم

پہلی ملازمت	۱۹۱

جماعت سے تعلق اور سرگرمیاں ۱۹۳
کارنر میٹنگز ۱۹۴
مولانا کی رہائی کے لیے مظاہرے ۱۹۵
ایک امدادی مہم ۱۹۸
سرزمین بنگال، تعلق کی خوشبو ۱۹۹
ملازمت میں تبدیلی ۲۰۱
جمعیت: فاصلہ اور قربت ۲۰۳
انورالسادات سے آمنا سامنا ۲۰۶
مسعود عالم ندوی، ایک محسن ۲۰۸
انجینیر نگ کالج میں لیکچررشپ ۲۱۴
پاک نیوی کے ساتھ ۲۱۶
ٹیوشن پڑھانا ۲۱۷
نظام اسرہ کا خاتمہ ۲۱۸
شادی ۲۲۱
''کارکنوں کے باہمی تعلقات'' ۲۲۲
مشرقی پاکستان کا پہلا سفر ۲۲۵
ایک اجتماع اور احساس کرب ۲۲۸

۶۔امریکہ میں تعلیم، سرگرمیاں اور مشاہدات

اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ۲۳۷
جانے کی تیاریاں ۲۳۸
عیسائی مشنری کا خط ۲۴۰

جب وہاں پہنچا ۲۴۱

"محمد ﷺ کون ہیں؟" ۲۴۲

کچھ دعوتی سرگرمیاں ۲۴۳

عیسائیوں سے مکالمہ ۲۴۵

یوم پاکستان پر اجلاس ۲۴۸

تین امریکی مسلمان ۲۵۰

مرغوب بھائی کی رحلت ۲۵۰

چند امریکی روابط ۲۵۱

پاکستان ہاؤس میں ۲۵۵

جنرل ایوب کا مارشل لا ۲۵۶

ڈاکٹریٹ کا ارادہ منسوخ ۲۵۹

مغرب سے کیا سیکھا؟ ۲۶۰

۷۔ امریکہ سے واپسی

انجینئرنگ کی ملازمت ۲۶۳

دین کے ساتھ دنیا ۲۶۴

سیٹر ڈے کلب ۲۶۵

الیکشن میں حصہ ۲۶۶

کمپنی میں پیش رفت ۲۶۸

مشرقی پاکستان کی طرف ۲۶۹

قدموں نے ڈھاکہ چھوا ۲۷۱

رفقائے جماعت ۲۷۱

پیشہ ورانہ دلچسپی ۲۷۲
دوبارہ امریکہ روانگی ۲۷۴
واپسی کا سفر ۲۷۵
عمرہ ۲۷۶

۸۔ڈھاکہ جماعت میں براہ راست حصہ

فعال تعلق ۲۷۷
ڈھاکہ جماعت کی امارت ۲۸۰
کارکن کون؟ ۲۸۳
تنظیمی کام کی بنیاد ۲۸۴
بیت المکرّم کے زیر سایہ ۲۸۵
بنیادی یونٹ ۲۸۷
ایک تربیتی تجربہ ۲۸۸
اجتماع کارکنان میں برکت ۲۸۹
وقت کی تقسیم ۲۸۹
ایک کامیاب دعوتی تجربہ ۲۹۳
مالی ایثار کا ایک واقعہ ۲۹۴
عوامی خطوط ۲۹۶
شخصی اعتماد کی اہمیت ۲۹۶
جمعیت سے کیا پایا؟ ۲۹۹
تحریک اسلامی کا مستقبل ۳۰۰
عربک اسلامی یونی ورسٹی رپورٹ ۳۰۱

جمعیت طلبہ عربیہ ۳۰۳
بنگالی رفقا کی محبت ۳۰۴

۹۔ جماعت پر پابندی: گرفتاری اور قومی سیاست

داخل زنداں ہونا ۳۱۰
جیل میں پہلی رات ۳۱۱
قیدی ساتھیوں سے ملاقات ۳۱۳
قرآن کے سائے میں ۳۱۴
عمومی مطالعہ اور فکری بحث ۳۱۶
ایک سماجی سبق ۳۱۷
دو دوستوں کی آمد ۳۱۸
ٹریبونل کے سامنے پیش ۳۱۹
اُمید اور نا اُمیدی ۳۲۱
رہائی ۳۲۲
اور پھر کمپنی ۳۲۴
متحدہ حزب اختلاف کا قیام ۳۲۵
جماعت کی نمائندگی ۳۲۶
پروگرام کمیٹی ۳۲۸
ہمارے نکات ۳۲۹
ہائی کورٹوں کے متضاد فیصلے ۳۳۴
جماعت بحال ہوگئی ۳۳۵
مزدوروں میں کام ۳۳۵

۱۰۔ انتخابات، جنگ اور کچھ اہم واقعات

محترمہ فاطمہ جناح، صدارتی امیدوار ۳۳۷

ایک مخمصہ ۳۳۹

انتخابی مہم کے موڑ ۳۴۱

جلسہ عام کی تقاریر ۳۴۴

انتخابی مہم: بداخلاقی کا مسئلہ ۳۴۶

انتخابی نتائج کے لمحے ۳۴۸

ایک خطرناک تبصرہ ۳۴۹

اسمبلی انتخابات سے سبق ۳۵۰

جنگ ستمبر ۶۵ء -- چند نازک پہلو ۳۵۳

اعلان تاشقند کے بعد ۳۵۸

کمپنی میں ترقی ۳۶۰

درددل کی رفاقت ۳۶۳

القدس کا زخم ۳۶۷

تحریک جمہوریت میں ۳۶۸

۱۱۔ تعمیر و تخریب کا مشاہدہ

نیا دفتر، کوثر ہاؤس ۳۶۹

اسلامی جمعیت طلبہ سے ربط ۳۷۰

طلبہ عربیہ کے حوالے سے ۳۷۲

کچھ لباس کا ذکر ۳۷۶

مشرقی پاکستان کا سیاسی منظر	۳۷۷
سیاسی مخالفین پر الزام	۳۷۹
مسٹر بھٹو کی آمد	۳۸۱
جماعت میں فیصلہ سازی: ایک تجویز	۳۸۲
مشرقی پاکستان، سیاسی تناظر میں	۳۸۵
نسلی تفاخر کی ایک مثال	۳۸۸
وسائل کی تقسیم میں عدم توازن	۳۸۹
اہل بنگال کی ذہانت پر شک	۳۹۱
عدم اعتماد کا رویہ	۳۹۳
مضبوط مرکز کا غیر حقیقی نظریہ	۳۹۵
پرنٹنگ پریس	۳۹۶
اخراج کا مسئلہ	۳۹۸
''لبرل'' سوچ	۴۰۰
جمعیت کی مالی مدد	۴۰۲
لٹریچر کا پھیلاؤ	۴۰۵
لٹریچر کا ترجمہ	۴۰۷
''پرتھوی'' کا اجر	۴۰۷
نعروں کا ردھم	۴۰۸
حج بیت اللہ	۴۰۹
دینی یا سیاسی؟	۴۱۰

۱۲۔ مارشل لا کا نفاذ، زوال کا راستہ

اتحاد جماعتوں کے اجلاس	۴۱۳
صدر ایوب کے خلاف تحریک	۴۱۸
شیخ مجیب سے ملاقات	۴۱۸
بے ثمر گول میز کانفرس	۴۱۹
جنرل یحیٰی سے ملاقات	۴۲۰
مارشل حکام سے ملاقاتیں	۴۲۳
ایک جسارت	۴۲۶
عبدالمالک کی شہادت	۴۳۲
یہ شہادت اور ایک مخالف	۴۳۷
ایک عوامی لیگی لیڈر	۴۴۱
ہمارا منشور، ایک تاثر	۴۴۴

۱۳۔ ۱۹۷۰ء: انتخابی امتحان اور پاکستان

جب ''سنگرام'' نکالا	۴۴۷
فنڈز کا مسئلہ	۴۴۹
۱۸ جنوری کا جلسہ	۴۵۶
انتخابات اور کمپنی	۴۵۷
شعبہ انتخابات میں	۴۵۹
الیکشن فنڈز	۴۶۰
ہماری انتخابی مہم، کمزور پہلو	۴۶۱

انتخابی منظر کا جائزہ ۴۶۵
ہم خیال جماعتوں سے مفاہمت ۴۶۸
دفتر پر حملے کا خدشہ ۴۶۹
پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ۴۷۲
قبل از انتخاب تجزیہ ۴۷۴
مخالفین کے تبصرے، اہمیت ۴۷۴
انتخابی نتائج کا طوفان ۴۷۵
خوش فہمی کی دھند ۴۷۶
غلط اندازوں کی روایتی مثال ۴۷۸
چند سوالات ۴۸۰

۱۴۔ المیوں کا سال

کراچی کا سفر ۴۸۳
امارت شہر سے فراغت ۴۸۴
شیخ مجیب کو پیغام ۴۸۴
مسئلے کا حل ممکن تھا ۴۸۵
سیاسی بحران، امڈتے بادل ۴۸۹
بھٹو صاحب کا غیر جمہوری رویہ ۴۹۰
مشرقی پاکستان میں ردعمل ۴۹۱
پُراسرار سرگرمیاں ۴۹۲
مذاکرات کا کھیل ۴۹۳
فوجی کارروائی کی خونیں رات ۴۹۵

شیخ مجیب کے بچوں کو دعوت		۴۹۷
''ادھورا'' قدم		۴۹۸
فوجی قیادت سے ملاقات		۴۹۸
فوج سے تین سوال		۴۹۹
زیادتی کے آثار		۵۰۱
جماعت کا اجلاس		۵۰۳
فوجی تربیت کی ضرورت		۵۰۴
ایک المناک واقعہ		۵۰۶
بنگالیوں سے نفرت کا ماخذ		۵۰۸
فوجی کارروائی کی نوعیت		۵۰۹
البدر کا قیام		۵۱۱
ضمنی انتخابات		۵۱۳
سفر برطانیہ		۵۱۵
فوجی حکام، چند تاثرات		۵۱۵
''دوستوں'' کی مدد کا انتظار		۵۱۷
پناہ		۵۲۱
جستجو	سلیم منصور خالد	۵۲۷
اشاریہ		۵۳۱



اعتراف

لمحات اُردو کے تحریکی ادب میں ایک منفرد اضافہ ہے۔

اسے نہ معروف معنی میں آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری کہا جاسکتا ہے اور نہ اسلامی تحریک کی تاریخ۔ یہ نہ روزنامچہ ہے اور نہ ڈائری کی قبیل کی شے، گو اس میں ان میں سے ہر ایک کی کچھ کچھ جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ لمحات یادوں کا ایک ایسا قیمتی مرقع ہے، جس میں ایک طرف ایسے انسان کی بامقصد شخصی اور تحریکی زندگی کی اہم ترین جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں، جس نے عنفوانِ شباب ہی میں اپنے کو ایک پاکیزہ نصب العین اور ایک تعمیری تحریک کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دوسری طرف خود اس دعوت اور تحریک کی داستان کا ایک ہیولا بھی ان سطور اور بین السطور سے اُبھر آتا ہے، جس کے عشق میں یہ نوجوان سرگرداں رہا ہے اور جس کی جستجو، خدمت، آبیاری اور تزئین کے لیے اس نے پوری زندگی نچھاور کر دی۔

جس طرح خرم کی ذات میں دعوتِ دین و اسلامی تحریک رچ بس گئے تھے، اسی طرح ان کی یادوں کے مجموعے میں شخص اور دعوت و تحریک، برگِ گل اور بوئے گل کی طرح یک جان نظر آتے ہیں اور یہی اس داستان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

جہاں جائیں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے

اگرچہ اسلوب کے اعتبار سے دونوں میں نمایاں فرق ہے، تاہم لمحات کو پڑھتے ہوئے مجھے حسن البنا شہید کی ''مذاکرات'' [ترجمہ: حسن البنا شہید کی ڈائری] کا بار بار خیال

لمحات

آیا!

لمحات کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی راست گوئی ہے۔

خرم نے اپنی اور تحریکی زندگی کے جن ادوار، مراحل اور واقعات کو اس میں بیان کیا ہے، اس کے کم از کم تین چوتھائی کا میں خود گواہ اور شریک رازہائے دروں خانہ ہوں۔ مجھے اس امر کی شہادت دینے میں بھی ذرا بھی تامل نہیں، کہ خرم نے سچائی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ اس رودادِ زندگی میں خودنمائی ہے اور نہ ذاتی تشہیر۔ اظہار کے نام پر اخفا اور دوسروں کی قیمت پر ذاتی جلوہ نمائی، جو خودنوشت سوانح عمریوں اور ''اپنی کہانی اپنی زبانی'' نوعیت کی داستانوں کا خاصہ ہے، ایسی کثافت سے یادوں کا یہ گل دستہ بالکل پاک ہے۔ خوداعتمادی اور اپنی رائے پر بھروسا خرم کی شخصیت کا حصہ تھا، لیکن **لمحات** اس حیثیت سے ایک نادر داستان ہے، جس میں خرم نے انفرادی کردار، ساتھیوں کے اثرات اور اجتماعی زندگی کے احوال کی توازن اور صحت کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ **لمحات** کو پڑھتے وقت خود میرے دل و دماغ کے پردۂ سیمیں پر یادوں کے نقوش تازہ ہوکر جلوہ فگن ہوتے رہے اور خرم کے حافظے، صحتِ بیان، اور حسنِ اعتدال پر عش عش کرتا رہا ۔

یہ رتبہ بلند ملا ، جس کو مل گیا

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، **لمحات** کی اصل خوبی یہ ہے کہ یہ ذاتی جلوہ نمائی کا ذریعہ نہیں، بلکہ تعلیم و تربیت کا ایک باب ہے، جس سے تحریک کا ہر کارکن بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ یہ تحریکِ اسلامی اور اس کے کارکنوں کی ہنگامہ خیز زندگی کے چند بڑے اہم ادوار کا ایک ایسا مرقع ہے، جس سے تحریک کی نئی نسلیں صرف اپنے ماضی سے گہری اور سچی روشناسی ہی حاصل نہیں کرسکتیں بلکہ اس دریچے سے تحریک کے حقیقی مزاج، اس کے اسلوبِ کار، اس کے فیصلوں کے انداز، ان میں موجزن روح اور تنظیم کے داخلی نظام کی تفہیم بھی حاصل کرسکتی ہیں۔

بلاشبہ **لمحات** خرم کی شخصیت اور زندگی کا ایک آئینہ ہے۔ اس آئینے میں تحریکِ اسلامی کے اس کارکن اور اُمتِ مسلمہ کے مایہ ناز خادم کے چہرے کے اصل خدوخال دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہر چند کہ خرم نے اسے اپنی ذات کا مظہر نہیں بنایا لیکن داستان خود بہ خود صاحبِ داستان کی شخصیت کا آئینہ بن گئی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تحریکِ اسلامی کے ہر کارکن کے لیے ایک معیاری کارکن بننے کے عمل کو سمجھنے اور اس پر کارفرما ہونے میں یہ معاون و مددگار ہوسکتی ہے۔

لمحات کا خاصا بڑا حصہ خرم کی جمعیتی زندگی اور خود اسلامی جمعیت طلبہ کے سب سے اہم اور تشکیلی (formative) دور کے شب و روز پر مشتمل ہے۔ یہ جمعیت کی تاریخ سے بھی زیادہ اہم دستاویز ہے کہ اس میں اس شے کو دیکھا جاسکتا ہے جسے صحیح ترین الفاظ میں 'جمعیت کلچر' کہا جاسکتا ہے۔ جس کے کچھ نہ کچھ اثرات زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں کے باوجود جمعیت کے تشخص اور پہچان کا حصہ بن گئے ہیں۔ جو لوگ جمعیت اور جماعت کے ایک ہی دعوت اور ایک ہی تحریک کا حصہ ہونے کے باوجود، دونوں کی کچھ اپنی اپنی امتیازی خصوصیات کی بات کرتے ہیں، وہ **لمحات** میں اس طرح حقیقت اور کیفیت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ اس حیثیت سے **لمحات** کے ذریعے تحریکی لٹریچر کا ایک ایسا خلا پُر ہوگیا ہے، جس کے پُر ہونے کا کوئی اور ذریعہ مشکل تھا۔

لمحات میں تحریکِ اسلامی کے ایک اور وصف کی تصویر بھی دیکھی جاسکتی ہے، یعنی تحریک میں مشورے، تنقید، اختلاف اور فیصلے کا عمل اور اس کی برکتیں۔ ایک طرف آزادیِ رائے اور اختلاف کا برملا اظہار اور دوسری طرف فیصلوں کا احترام اور شخصیات کے باہمی تعلقات میں محبت اور اعتماد کی فراوانی ـــــ یہ اسلام اور تحریکِ اسلامی ہی کا ایک کرشمہ ہے، جس کی جھلکیاں **لمحات** میں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ تحریکی لٹریچر میں اس سلسلے کی اصولی ہدایات موجود ہیں لیکن یہ **لمحات** کا ایک گراں قدر اضافہ (contribution) ہے کہ ان نظری اصولوں کی عملی شکل اس میں دیکھی جاسکتی ہے، جو

تحریک کے کارکنوں اور قائدین کے لیے پہاڑی کے چراغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی عرض کر دوں کہ **لمحات** سے یہ بات بھی بہت سوں کے سامنے آجائے گی کہ فوج کے سیاسی کردار کے بارے میں تحریک میں نہ صرف مختلف آرا رہی ہیں، بلکہ یہ اختلاف، خیر کا بہت بڑا ذریعہ رہا ہے۔ البتہ ہمارے یہاں یہ بحث اخباروں میں نہیں ہوتی۔ لیکن ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب تاریخ کے تمام اوراق کھلی کتاب بن جاتے ہیں۔

لمحات میں آپ کو نئے تحریکی تجربات کی بھی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ میں اس کا خصوصیت سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تحریک کو جمود اور لکیر کا فقیر بننے سے کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ روایت کے احترام کے ساتھ ساتھ نئے تجربات اور حکیمانہ اجتہادات ہی ہیں۔ جمعیتی زندگی ہو یا امریکا کا قیام، ڈھاکہ کی امارت ہو یا بعد کی مساعی ـــــ خرم نے ہمیشہ روایت کے احترام کے ساتھ نیا راستہ نکالنے، سوچ اور تجربے، دونوں کے لیے نت نئی راہوں کی تلاش کو اپنا شعار بنایا۔ اس عمل نے تحریک کو تازگی اور قوت فراہم کی۔ کسی تعلّی کے بغیر ان تجربات کا ذکر تحریک کے کارکنوں کے لیے اپنے اندر رہنمائی کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

تحریکِ اسلامی اپنے کارکنوں میں حق پرستی اور قیامِ انصاف کی کیا کیفیت دیکھنا چاہتی ہے، اس کی بھی بڑی چشم کشا مثالیں آپ کو **لمحات** میں ملیں گی۔ جمعیتی دور میں لاہور کے پہلے اجتماعی سفر میں نظم کے تحت ایک بے قاعدگی اور اس پر پشیمانی ہماری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ اور آیندہ زندگی کے لیے ہمارے ہاتھ اور پاؤں کو حدود کا پابند بنانے میں فیصلہ کن اثر کا حامل رہا ہے۔ خرم کی کیفیت کو دیکھ کر خود میں نے اور میرے ساتھیوں نے بہت کچھ سیکھا، اور ماہر صاحب کے اس شعر کی معنویت قلب ونظر پر واشگاف ہوئی ؎

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اِک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

اسی طرح محمد عبدالمالک (ڈھاکہ یونی ورسٹی) کی شہادت [۱۵ اگست ۱۹۶۹ء] کے ضمن میں پولیس رپورٹ میں ابوالمنصور صاحب کے بیٹے کے نام کے غلط اندراج پر خرم کا موقف اور جمعیت کے ناظم کی جرأت، حق پرستی، انصاف پسندی اور اطاعت نظم —— یہ ساری باتیں دراصل تعلیم، تربیت اور تزکیہ کے اسباق ہیں جو تحریکی زندگی کے تابندہ نقوش کی طرح آنے والوں کے لیے ان شاء اللہ مشعل راہ بنیں گے ۔

آیا جو مے کشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ہاتھ میں اِک جام دے گیا

میری نگاہ میں **لمحات** محض ایک فرد کی کچھ منتشر یادوں کا مجموعہ نہیں ہے، یہ تو اسلامی شخصیت سازی کا ایک نمونہ، تحریکِ اسلامی کی دعوت، اسلوبِ کار اور خود اُمت کی اصلاح اور احیا کے لیے ایسے روشن نقوش راہ کا مربوط مرقع ہے جو دلوں کو گرماتے، حوصلوں کو تازہ کرتے اور تاریک راہوں کے اسباب و محرکات کو نمایاں کرتے رہیں گے۔

افسوس کہ **لمحات** ایک نامکمل داستان ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے ساتھ ہی یہ داستان بھی خاموش ہوگئی۔ خرم کی زندگی نے وفا نہ کی کہ بھارت کی قید، کچھ عرصہ ایران میں، سعودی عرب میں حرم شریف کی توسیع کا منصوبہ، اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر کے دس سال، لاہور کی امارت، مرکز میں نائب امارت اور ترجمان القرآن کی ادارت کی چھے سالہ جاں گسل جدوجہد کی یادوں میں ہم سب کو شریک کر سکتے ۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمھی، سو گئے داستاں کہتے کہتے

خورشید احمد

لسٹر

۱۹ اگست ۱۹۹۹ء

ابتدائیہ

ڈائری لکھنے کو ہمیشہ دل چاہتا رہا ہے، لیکن یہ خواہش، خواہش ہی رہی، کبھی حقیقت نہ بن سکی اور چند صفحات، چند صفحات ہی رہے۔ روزمرہ کے معمولات، ان کے احتساب اور اپنے وقت کے صحیح استعمال اور صرف ریکارڈ رکھنے کے لیے کئی دفعہ ڈائری لکھنا شروع کی۔ چند دن سلسلہ چلا، پھر وہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ میری پرانی ڈائریوں میں کہیں کہیں اس کے آثار موجود ہوں گے۔ یہ عادت بھی کبھی نہ رہ سکی کہ وہ کام جو روز کرنا ہے، اس کی ڈائری ہی رکھ سکوں۔ ہر سال ڈائریاں ملتی ہیں، میز پر بھی ڈائری کیلنڈر رہتا ہے، مگر یہ سب بالعموم سادہ ہی نظر آئیں گے۔ ساری مشغولیات ذہن ہی میں رہتی ہیں۔

اس کی ایک وجہ تو زندگی کی مصروفیات ہیں۔ اگرچہ میں جتنا وقت یوں ہی گزار دیتا ہوں، وہ کچھ کم نہیں۔ اصل وجہ شاید یہ ہے کہ میں تحریر کے معاملے میں بہت ٹال مٹول کرنے والا ہوں، اس لیے کہ بہت سُست رو ہوں، لکھنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ 'آمد' بہت کم ہوتی ہے، بیش تر 'آورد' ہی ہوتی ہے، وہ بھی بڑی مشکل سے اہتمام کرنے اور وقت لگانے کے بعد ـــــ اگرچہ 'آورد' کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد 'آمد' کے دھارے بھی بہہ نکلتے ہیں۔ لکھنے کے لیے وقت تو شاید مل جاتا، لیکن اگر قلم رواں ہوتا، اور تحریکی و خانگی زندگی کی ذمہ داریوں اور پیشہ ورانہ مصروفیات سے اتنی فراغت اور یکسوئی ملتی، تو پھر شاید ڈائری لکھنے کی نوبت بھی آجاتی۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۵ء تک پاکستان میں قیام کے نو سال واقعی ویسے ہی ثابت ہوئے، جیسا کہ اندازہ تھا۔ تحریک کی حد تک بھی اور ذاتی زندگی میں بھی بڑے فیصلے ہوئے، نازک موڑ آئے اور بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے۔ اس منظرنامے میں میرا رول: تعریف یا مذمت،

اعتماد یا شک و شبہہ، اتفاق یا اختلاف اور بے شمار سوالات کا موضوع بنا رہا۔ میری ذاتی پوزیشن کی وضاحت کے لیے ہی نہیں، تحریک کی خاطر بھی اس بات کی ضرورت کا احساس شدت سے ہوتا رہا کہ ڈائری لکھنا چاہیے۔ مختلف مواقع پر جن مسائل و معاملات سے واسطہ رہا اس دنیاے فانی سے رخصت ہونے سے قبل ان پر اپنی رائے اور تاثرات کو محفوظ کر دینا چاہیے۔ اجتماعی طور پر کیا ہوا، کیسے ہوا، کیا کر سکتے تھے اور کیا نہ ہو سکا؟ اس طرح کے بہت سے سوالات تحریک کے داخلی اور بیرونی حلقوں میں زیر بحث آتے رہیں گے۔ ان پر تفصیل سے نہ سہی مگر کچھ حوالوں سے اپنا تاثر بیان کر دینا شاید بہتر رہے۔ ممکن ہے اس ساری روداد کا منظرِ عام پر آنا ابھی مناسب نہ ہو، یا میرے مرنے کے بعد بھی مناسب نہ ہو، لیکن اس کا ریکارڈ ہو جانا، شاید کبھی ضرور مفید ثابت ہو۔

اس شدّتِ احساس کو بھی دو سال ہو چکے ہیں، لیکن ڈائری لکھنے کا کام شروع نہ ہو سکا۔ اگر ہو جاتا تو اس ماضی قریب میں بھی واقعات و مشاہدات کی جو لہریں گزر چکی ہیں، کم از کم وہی تازہ بہ تازہ محفوظ ہوتی رہتیں۔ پھر وہی مصروفیت، کوتاہ قلمی، تحریر میں حائل رہی ہے۔ یہ خیال گزرا کہ ماضی بعید کی روداد حیات بھی ضروری ہے کہ وہ ریکارڈ ہو۔ اس عرصے میں تحریکی مسائل اور جماعت کے 'داخلی موضوعات' پر کچھ تحریریں لکھیں، جو فیصلہ سازی کے ذمہ دار احباب اور اداروں تک پہنچائی گئیں، لیکن منظرِ عام پر نہیں آئیں۔ ان میں سے اکثر تحریریں محفوظ ہیں۔ اس سوچ اور رائے کا ایک حصہ مسائل و افکار اول میں چھپ چکا ہے۔ جو غیر شائع شدہ تحریریں ہیں، وہ ریکارڈ کا حصہ بن سکتی ہیں، لیکن وہ تو ایک قلیل سا حصہ ہیں، باقی کا کیا ہو؟



ہر شخص کے لیے اپنی زندگی بڑی اہم ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ اسی طرح فانی دنیا میں سب سے زیادہ عزیز 'میں' کا لفظ ہوتا ہے۔ اس کو اَنا یا ego بھی کہا جاتا ہے۔ مجھے

فی الحقیقت اپنی زندگی کی داستان بیان کرنے کا نہ کبھی کوئی شوق رہا ہے، اور نہ کوئی داعیہ۔ نہ یہ سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کوئی ایسی مختلف زندگی ہے جس کو ضرور ریکارڈ کیا جائے۔ البتہ ذاتی یادداشت لکھنے کی اہمیت کا ضرور قائل رہا ہوں۔

یہ امرِ واقعہ ہے کہ حالات و واقعات، یادداشت یا سفرنامہ اور آپ بیتی وغیرہ بیان کرنے کے لیے جو اسلوب اور قوتِ اظہار ہونا چاہیے، وہ میرے پاس نہیں ہے۔ الحمدللہ، استدلال اور نتائج پر کچھ لکھ اور بول تو ضرور سکتا ہوں، لیکن کوئی واقعہ بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان یادداشتوں میں جو کچھ بھی کہوں گا، اس میں وہ چاشنی نہیں ہوسکتی، جو ایک خودنوشت میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی واقعے یا کسی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کو تفصیلات کے ساتھ نہ یاد رکھ سکتا ہوں اور نہ بیان ہی کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی میں سنتا زیادہ اور بولتا کم ہوں۔ پانچ روزہ شوریٰ یا تین روزہ اجتماع کے بارے میں زیادہ سے زیادہ پانچ سات منٹ میں لب لباب بیان کر دیتا ہوں، اس سے زیادہ کہنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے، مجھے اپنے دین کی خدمت اور اپنے دین کے غلبے کی جدوجہد میں حقیر سا حصہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ پھر یہ کام ایسے مقام سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی، کہ اپنی گوشہ نشیں طبیعت کے باوجود احباب میں نمایاں ہوگیا۔ اسی لیے مجھے بہت سے افراد، حالات اور واقعات سے براہِ راست سابقہ پیش آیا ہے۔ انھی شب و روز اور گرم و سرد میں عملی تجربات بھی ہوتے رہے اور ذاتی سوچ بھی بنتی بگڑتی رہی۔ صرف اس لیے ان یادداشتوں کو بیان کرنے کے لیے تیار ہوگیا کہ شاید اس رودادِ سفر میں ہم سفروں کے لیے کوئی افادیت کا پہلو نکل آئے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری زندگیاں برابر ہیں۔ ہر فرد کی زندگی کی حقیقت کے بارے میں اصل فیصلہ تو آخرت میں ہوگا۔ اس لیے فی الواقع ریکارڈ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے محفوظ ہے۔ اگر وہ سوانح کچھ قابلِ قدر ہوگی تو وہ فرد فخر کرے گا اور اس میں حسن و خوبی

اور ایمان و عمل نہیں ہوگا تو شرم کرے گا۔ بلاشبہہ میں زندگی کی ایک لمبی بہار گزار چکا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ زندگی کی مہلت کتنی ہے۔ اس ہنگامہ خیز اور بُری بھلی زندگی میں بہت سارے حالات و واقعات سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ اس زندگی کی کشاکش میں یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ اس نے بھرپور زندگی بڑے اچھے، نیک دل، صاحبِ ایمان، باعمل، بے لوث، خدا ترس اور ہمدرد لوگوں کی رفاقت میں گزارنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

اگرچہ انسان کو صبح سے شام تک زندگی کا یقین نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن آج کل میں اپنی صحت کے لحاظ سے جس مقام پر ہوں اس میں نفسیاتی کیفیت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ درحقیقت یہ خیال آتا ہے کہ معلوم نہیں کتنا بیان کرسکوں گا، کتنا مکمل ہوگا، اور کتنا لکھا جاسکے گا____

گذشتہ سال جب فلبائٹس کی بیماری میں شدت آئی تو میں نے سوچا کہ اب کام کرنے کے لیے وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اپنی عمر کے ۶۳ سال پورے کر چکا ہوں اور قلب کی بیماری شدید تر ہوتی جارہی ہے۔ اب علاج کی غرض سے آج کل لسٹر (مارک فیلڈ) میں مقیم ہوں۔ بہت عرصے سے دوستوں کا یہ اصرار ہے کہ اپنی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور واقعات لکھوں۔ اس اصرار میں حسنِ ظن کو زیادہ دخل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کی مہلت اور فرصت بہت کم ملتی ہے۔ اس لیے دوسری تجویز یہ سامنے آئی کہ اس کو ریکارڈ کرادوں۔ چنانچہ اسی کوشش کے تحت یہ ریکارڈنگ شروع کی ہے۔ لکھنا مشکل اور وقت طلب کام ہے، جب کہ ریکارڈ کرانا قدرے آسان ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ جتنی مہلت اور جتنا وقت ہے، اس میں سے کچھ حصہ اس کام کے لیے لگادوں۔



یادداشتوں کے اس سلسلے کو تین حصوں میں تقسیم کر رہا ہوں:

ایک حصہ تو وہ ہے کہ جس میں جماعت اسلامی پاکستان کی پالیسیوں اور عملی اقدامات کے بارے میں کلام کروں گا۔ ان پالیسیوں کے بارے میں جو میری سوچ اور موقف رہا ہے، جس میں اکثر اتفاق اور کبھی اختلاف بھی رہا ہے، وہ بیان کروں گا۔ اس ضمن میں کچھ دستاویزات اور کاغذات ہیں۔ اسی طرح وہ بہت ساری چیزیں ہیں جو لکھ کر نظم کے سامنے پیش کر چکا ہوں، ان سب کو بھی پیش کر دوں۔ اسی طرح اس جدوجہد کو باثمر بنانے کے لیے کئی جگہوں پر اپنی آرا اور سوچ کو ایک متعین شکل بھی دی ہے، وہ بھی اس کا حصہ بن سکتی ہیں۔ یہ سوچ کوئی اچانک نہیں بن گئی، بلکہ اس کی جڑیں اپنی تحریکی زندگی کے آغاز ہی سے رکھتا ہوں۔ اس لیے جہاں بھی موقع ملتا رہا، انھیں محدود دائرے میں اختیار بھی کیا۔ اس حصے کی اہمیت دو وجوہ سے ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت تحریک ایک کش مکش اور گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ جس میں پالیسی کے معاملات اور ایشو اہمیت رکھتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خصوصاً پچھلے دس سالوں (۹۶-۱۹۸۷ء) کے دوران پاکستان میں عام طور پر لوگوں نے یہ تاثر لیا ہے اور اس کی اشاعت کی ہے، کہ جماعت نے جو کچھ بھی موقف اور پالیسی اختیار کی ہے وہ سب میری فکر کا نتیجہ ہے۔ بلکہ لوگوں نے یہ تک بھی کہا ہے، کہ دماغ میرا ہے اور جماعت اسلامی پاکستان کے امیر اس پر صرف عمل کرنے والے ہیں۔ اس بات میں کس قدر صداقت ہے اسے سامنے آنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم قاضی حسین احمد صاحب کو میرے اُوپر بڑا اعتماد ہے اور مجھے ان سے بے پناہ محبت ہے۔ تحریکی زندگی کے معاملات میں اکثر میری اور ان کی فکر میں بہت اتفاق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، لیکن سب معاملات اور پالیسیوں میں ایسا نہیں ہے۔ اس حوالے سے بہت کچھ جماعت کے ریکارڈ پر موجود ہے اور وہ پبلک نہیں ہے۔ اس میں کئی حسّاس نکات بھی ہیں، جن کو عام لوگوں کے سامنے بیان کرنے میں مجھے تامل ہے۔ اس لیے اب بھی جو کچھ ریکارڈ کروں گا، اس میں بھی یہی چاہوں گا کہ اس وقت تک وہ چیزیں منظر عام پر نہ آئیں، جب تک یہ بات یقینی نہ ہو کہ ایسی کسی بات سے جماعت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

جماعت اسلامی میرے نزدیک ایک مسجد کی طرح محترم ہے۔ اس کی کسی ایک اینٹ کا

بھی سرکانا یا اس میں دراڑ ڈالنا ایسا کام ہے، جس کی ذمہ داری نہ میں نے پہلے کبھی لی ہے اور نہ اب لینا چاہوں گا۔ عمر بھر یہی کوشش کرتا رہا ہوں کہ جماعت کو اگر کوئی فائدہ نہ پہنچا سکوں تو کم از کم میری ذات سے، میرے کسی قول اور فعل سے اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ لیکن بہر حال ان باتوں کو ریکارڈ ضرور ہونا چاہیے۔

دوسرا حصہ، تحریکی زندگی کے واقعات اور تجربات پر مشتمل ہوسکتا ہے، جو باقاعدہ طور پر ۱۹۴۸ء سے شروع ہوتی ہے اور الحمدللہ تاحال جاری ہے۔ یہ عرصہ ۴۸ برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا ناظم اعلیٰ رہا۔ پھر جماعت اسلامی ڈھاکہ کا امیر بنا۔ مشرقی پاکستان کے آخری نو سالوں کے دوران وہاں پر جماعت کی تنظیم، پالیسی اور سیاسی معاملات کے اندر بھی کلیدی رول رہا۔ درمیان میں اسلامک فاؤنڈیشن کو بھی چلایا اور لاہور آنے کے بعد کچھ عرصہ جماعت اسلامی لاہور کا امیر رہا۔ اب جماعت اسلامی پاکستان کا نائب امیر ہوں اور ترجمان القرآن کی ادارت بھی کر رہا ہوں۔ اس حصہ میں بیان کردہ تجربات و مشاہدات میرے نزدیک زیادہ اہم ہیں۔ اس وقت میں اسی حصے کو ریکارڈ کر رہا ہوں۔

تیسرا حصہ ذاتی زندگی کے بارے میں ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے مجھ پر آج تک بہت سارے انعامات و احسانات رہے ہیں۔ میری پیشہ ورانہ زندگی میں، مالی معاملات میں، بچوں کے معاملے میں اور خاندان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اتنا کرم اور اتنے رحم کا معاملہ کیا ہے کہ اگر اس میں سے بھی کچھ حصے ریکارڈ ہو جائیں تو شاید پڑھنے والوں کے لیے کچھ مفید ہو۔ زندگی کو برتنے، استعمال کرنے اور اس کو ترقی دینے میں جن اصولوں کی پابندی کرتا رہا ہوں، جن ضابطوں کو میں نے مفید پایا ہے اور جن کے بہت سے اچھے نتائج نکلے ہیں، ان کا ذکر بھی مفید ہوسکتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو یہ تیسرا حصہ سب سے آخر میں ریکارڈ ہوگا۔

یادوں کے یہ تینوں حصے آپس میں کچھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں، کہ ان کو کسی

عملِ جراحی کے ذریعے سے بالکل الگ کر دینا ممکن نہیں ہے۔لیکن تینوں کو ملا دینے سے بات پھیل جانے کا احتمال ہے۔ بہرحال انھیں الگ رکھنے کی کوشش ضرور کروں گا، اورحتی الوسع تکرار سے اجتناب بھی کروں گا،مگر مکمل اجتناب کرناممکن نہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، کہ مجھ پر مہلتِ حیات کی کمی کا احساس ایک طویل عرصے سے طاری ہےاوراب وقت کی کمی کا احساس اوربھی زیادہ شدید تر ہے۔اس لیے میں پہلے حصے کوترجیح دیتا ہوں۔مگراسے قلم سے لکھنا چاہتا ہوں۔ دوسرے کو دوسرے نمبر پر رکھتا ہوں اورتیسراذاتی حصہ اگرنہ بھی ریکارڈ ہوتوکوئی مضائقہ نہ ہوگا۔



اس وقت دوسرے حصے یعنی اپنی تحریکی زندگی کے واقعات ونتائج تک محدود ہوں گا۔ اس میں خشک چیزیں زیادہ ہوں گی، حالات و واقعات کا بیان مختصر ہوگا اور شاید ان کے مالہ وماعلیہ یانتائج پرگفتگوزیادہ ہو۔ایک مشکل یہ ہے کہ افراد کے نام اور چہرے یادرکھنے میں میراحافظہ کمزور ہے۔اسی طرح واقعات کی صحیح ترتیب، درست تاریخیں اورمفصل گفتگوئیں یاد نہیں رکھ پاتا۔ اس لحاظ سے یہ یادداشت تشنہ رہے گی۔ اس کمی کی شاید ایک وجہ میری تنہائی پسند طبیعت بھی ہے۔ میں جلوت کے بجائے خلوت میں مطمئن رہتا ہوں۔اس کے باوجوداتنی بڑی پبلک لائف میں بےشمارلوگوں سے ملنا جلنا صرف تحریک کی وجہ سےممکن ہوا ہے۔ ورنہ شاید میں ہوتا، کتاب ہوتی، ایک گوشۂ عافیت ہوتا اور یہی میری زندگی کی تمام کہانی ہوتی۔ کچھ حوالوں سے بات اندازوں میں کرنا ہوگی۔ بہرحال اصل چیز جزئیات اورتفصیلات نہیں ہیں، بلکہ ماحصل (substance) اوران واقعات سے نکلنے والےنتائج ہیں۔اور وہی شاید زیادہ مفید بھی ہوں گے۔ یہ دو باتیں سامنے رہیں تو ان شاء اللہ بات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اسی طرح ۴۸، ۴۹ سال کے بعد آج جو کچھ حافظے کی مدد سے کہوں گا، اس بات کا

غالب امکان ہے، بلکہ یہ بات یقینی ہے کہ اس میں ایک حصہ امرِ واقعہ سے زیادہ عقب بینی (hind sight) یعنی بعد کے تجربات، اور آج کے موقف کا نتیجہ ہو، نہ کہ ہو بہو ماضی کا واقعہ، بہرحال اس سے شاید مکمل طور پر بچنا محال ہے۔ اپنی سی کوشش ضرور کروں گا کہ یہ 'حادثہ' یا 'رنگ' کم سے کم ہو۔

اگرچہ میں اپنی سوچ اور فکر کی کوتاہیوں یا جماعت کو چلانے میں یا تدابیر کی غلطیوں، اور ایسی خامیوں کو جو پبلک سے متعلق ہیں، ان کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کرتا اور نہ یادداشتوں میں ایسا کروں گا، لیکن وہ گناہ کہ جن کا تعلق پبلک سے نہیں ہے، ان کے بارے میں سختی سے اس حدیث پر عامل ہوں، کہ جس چیز پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالا ہے، بندے کو اسے آشکار نہیں کرنا چاہیے۔ خودنوشت سوانح حیات ہو یا دوسروں کی سوانح حیات، مغرب میں طریقہ یہ ہے کہ کھوج کرید کر کے خامیاں خصوصاً اخلاقی خرابیاں دریافت کی جائیں اور ان کو منظرِ عام پر لایا جائے، یہ طریقہ درست نہیں۔ ہمارے ہاں اگرچہ ایک انتہائی دوسرے رُخ پر فنِ سوانح نگاری چلا گیا ہے، جس میں صرف تعریف ہوتی ہے، قصیدہ ہوتا ہے اور مبالغہ آمیزی ہوتی ہے، حالانکہ پبلک معاملات میں تنقید و جائزہ اور ٹھوکروں کے تعین کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مگر تجسس کر کے پرائیویٹ زندگی سے گناہوں کو تلاش کرنا اور ان کو آشکار کرنے کا کوئی فائدہ نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔ یہ کشفِ عیوب کی ذیل میں آتا ہے، جسے حدیث پاکؐ میں منع کیا گیا ہے۔

اسی طرح میرے لیے ایک بڑا مشکل مرحلہ یہ ہے کہ اس گفتگو میں، لفظ 'میں' کا استعمال ہوگا۔ حالانکہ یہ سارا کام کسی فردِ واحد کا کام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں سبھی بزرگوں، دوستوں اور نوجوانوں کا حصہ ہے۔ لیکن 'میں' کے استعمال سے اس لیے دامن بچانا ممکن نہیں ہے، کہ مجھے ایک شاہد، گواہ اور خود اس قافلے کے ایک فرد کی حیثیت سے اس روداد کو بیان کرنا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ یادداشت، دوسروں کے لیے مفید ہوگی۔ ورنہ صرف اپنی پوزیشن

کی وضاحت، اپنے موقف کے بیان، اپنی سیاہ زندگی کی سرگذشت لکھنے کے لیے میں کبھی قلم نہ سنبھالتا، اتنے صفحات سیاہ نہ کرتا، اتنا وقت نہ لگاتا۔ یہ سب باتیں تو ایک دن، یعنی یومِ حساب میں صاف ہو ہی جائیں گی۔ جو اعمال دوسروں کے لیے نافع ہوں، میرے نزدیک وہی اعمال اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور میرے لیے اجر کا باعث ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

بہرحال اب یہ سوچ لیا ہے، کہ یہ سلسلہ شروع کردیا جائے۔ وبید اللہ التوفیق۔ اللہ تعالیٰ کو جس قدر ریکارڈ کرانا منظور ہوگا، اتنا آخری سانس سے پہلے مکمل ہوجائے گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس چیز کو محفوظ کردے جو دنیا و آخرت میں نفع بخش ہو، اور اس کو ضائع کردے، جو ضرر رساں ہو۔ (۱۵راگست ۱۹۹۶ء)



گذشتہ دنوں دل کی تکلیف میں شدت ناقابلِ برداشت ہوگئی تو ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ آج ہی ہسپتال سے اس پروگرام کے تحت فارغ ہوکر گھر آیا ہوں کہ ۱۸ردسمبر ۹۶ء کو دوبارہ ہسپتال آنا ہوگا، تاکہ دلِ ناتواں، تیسری بار جراحت کے عمل سے گزر سکے۔ اگرچہ خود ڈاکٹروں کی رائے میں ''یہ ایک بڑا ہی risky (نازک) آپریشن ہے، تاہم اس کے سوا کوئی چارہ نہیں''۔ میں اپنے مالک و خالق کی رضا پر راضی ہوں، اگر اسے منظور ہے تو یہ مرحلہ بھی گزر جائے گا۔ اس کی مشیت کے سامنے یہ نازک اور غیر نازک کی بحث بے معنی ہے۔ اگر اس کو یہاں کی زندگی منظور ہے تو فبہا، ورنہ وہاں کی زندگی بھی تو اسی کا فیصلہ ہے، جس سے کسی بھی ذی روح کو مفر نہیں۔ وہ یہاں پر زندگی کی سانسیں بڑھا دے تو اس کی راہ میں صرف ہوں، اور اگر وہاں بلائے تو نامۂ اعمال کی رسوائی سے بچالے۔ آج نہیں تو کل، آخر جانا وہیں ہے، جہاں لمحے لمحے کا حساب ہوگا، بلکہ عدل اور انصاف کا مطلب وہاں پر ہی ظاہر ہوگا۔

آپریشن کی تیاری اور انتظار کے ان بیس دنوں میں میری کوشش ہے، کہ اپنی بچی کھچی قوت ان کاموں پر لگا دوں، جن کی تکمیل کے لیے کچھ ہوسکتا ہے۔ اس سال اگست کے دوران اپنی ریکارڈ شدہ یادداشتیں مَیں سلیم منصور خالد بھائی کے سپرد کر رہا ہوں۔ ابھی چند گھنٹے پیش تر میں نے فون پر انھیں تفصیلی ہدایات دے دی ہیں، کہ ان کے مطابق انھیں مرتب کردیا جائے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو ان پر نظرثانی کرلوں گا، ورنہ مجھے اعتماد ہے کہ تحریک کے مفاد میں یہ کام بہترین اسلوب پر پیش کردیا جائے۔ وما علینا الا البلاغ ۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۶ء
لسٹر، برطانیہ

خرم مراد

۱

بچپن اور زندگی کا دورِ تشکیل

وسط ہند کی ایک چھوٹی سی، مگر بااثر مسلم ریاست بھوپال تھی۔ اس کے قصبے رائے سین میں ہم رہتے تھے۔ یہ علاقہ آج کل بھارت کی ریاست مدھیہ پردیش کا حصہ ہے۔ وہاں پر بڑی گہری دینی فضا تھی، جو چار پانچ مسلسل مسلمان خاتون حکمرانوں کی وجہ سے تھی۔ اس کا اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ یہ تمام خواتین دین پسند تھیں، اور ان سب نے بھوپال کے ماحول کو بڑا اسلامی اور دینی رنگ دیا تھا۔

ابتدائی نقش

قصبہ رائے سین میں ۳ نومبر ۱۹۳۲ء کو میری پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک ہمارے والد محترم [م: ۱۹۶۳ء] ملازمت کے لیے سب ڈویژن گوہر گنج میں بھی رہے۔ وہ پی ڈبلیو ڈی میں ایس ڈی او تھے۔ ساڑھے چار سال بعد دوبارہ ان کا تبادلہ رائے سین ہوگیا، جہاں ۴۲ء میں، میں نے چھٹی کلاس میں داخلہ لیا۔ عمر کے اس حصے میں ریاضی کے علاوہ میری ساری تعلیم والدہ محترمہ [م: ۱۹۷۳ء] اور میری بڑی بہن آپا [نفیسہ خاتون، م: ۲۲ جنوری ۲۰۰۰ء] کی مرہونِ منت ہے۔ الحمدللہ ہمارے گھر کی فضا دینی تھی۔

تحریک کی زندگی یا اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے جدوجہد کی زندگی کہہ لیجیے، اس سلسلہ میں پہلا سوال یہی سامنے آتا ہے کہ کیسے آئے اور کیوں آئے اور کب آئے؟

جماعت سے تعلق کی ابتدا

اگر باضابطہ طور پہ دیکھا جائے تو جماعت اسلامی سے میرا تعلق ۱۹۴۷ء کے آخر میں یا

۱۹۴۸ء کے شروع میں بھوپال میں قائم ہوا۔

میرے والد ریاست بھوپال میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے کہ میرے ایک کالج فیلو نے (جو کلاس فیلو تو نہیں تھے، ان کے مضامین آرٹس یا کامرس کے تھے اور میں سائنس پڑھ رہا تھا، ان دنوں مَیں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا) مجھ سے کہا کہ ''تم کبھی کبھی جماعت اسلامی کا ذکر کرتے ہو۔ یہاں پر نور محل کے علاقے میں جماعت اسلامی موجود ہے اور اس کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ تم کسی وقت ان اجتماعات میں چلو'' ـــــ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔

ہندستان کے مشہور عالم دین اور نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن مرحوم کے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹے نواب نورالحسن نے نور محل کے نام سے اپنے مکانات تعمیر کیے تھے۔ وہاں سید نورالحسن صاحب کے پوتے سید ظہیرالحسن صاحب رہتے تھے، جو اس وقت جماعت اسلامی بھوپال کے امیر تھے۔ وہ جامع مسجد نور محل میں باقاعدگی سے جمعہ کی نماز پڑھاتے اور بڑا مؤثر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنا خطبہ لکھ کر لاتے، لیکن اسے تقریری انداز میں پڑھا کرتے تھے۔ وہیں ان کی بیٹھک تھی، ان کی لائبریری تھی اور اسی مسجد میں اجتماع عام بھی ہوتا تھا۔ ان کی بیٹھک میں خصوصی اجتماع ہوتا تھا۔ انھی دنوں وہاں پر میرا آنا جانا شروع ہو گیا تھا، لیکن بات اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی۔

حمیدیہ کالج کے امتحانات میں، سال اول میں میری پہلی پوزیشن آئی۔ یہ بھوپال کا پہلا کالج تھا اور ہماری کلاس اس کالج کی پہلی کلاس تھی۔ یہ پہلے سال کا امتحان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کے لیے مقامی امیرِ جماعت سید ظہیرالحسن صاحب نے مجھے اور کالج کے چند لڑکوں کو اپنے ہاں شام کی چائے پر بلایا اور بڑی پُرلطف گفتگو کی۔

میں نے کالج میں اپنے جس دوست کا تذکرہ کیا ہے، ان کا نام سید حسن الزماں اختر ہے۔ جو اپنے دورِ طالب علمی سے جماعت اسلامی کے ساتھ ایک گونہ تعلق رکھتے ہیں۔ بعد میں انھوں نے برطانیہ سے ''اسلامی ریاست کے معاشی وظائف'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ

کی۔ ایک عرصہ دراز تک اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے شعبہ تحقیق سے وابستہ رہ کر چند سال پہلے ریٹائر ہوئے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک کتاب اسلامک فاؤنڈیشن نے بھی شائع کی ہے۔ محترم مولانا ظفر احمد انصاری [م: ۲۰ دسمبر، ۱۹۹۱ء] کے داماد اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کے بہنوئی ہیں۔ بھوپال ہی سے وہ میرے بہت اچھے اور گہرے دوست ہیں، اور اب تک ان سے تعلقِ خاطر ہے۔ وہ اس دعوت کا ذریعہ بنے تھے۔ چائے کی اس دعوت کے بعد سے میں نے جماعت کے اجتماعات میں جانا شروع کر دیا۔ اس سے میرے باضابطہ تعلق کی ابتدا ہوگئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ بات اتنی آسان نہیں ہے کہ بس کسی نے مجھے بتایا، اجتماع میں چلا گیا، کتابیں پڑھیں اور جماعت کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے۔

اس کا ایک پس منظر ہے جس کو میں پہلے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ جو لوگ بھی جماعت میں آئے ہیں (میرے پس منظر کی کچھ ذاتی چیزوں کو چھوڑ کر) ان کے اور میرے پس منظر میں یہ چیزیں مشترک ہیں، یعنی گھر کا دین پسند ماحول ـــــ اس کے برعکس مخالف دین ماحول سے نکل کر آنے والے افراد بہت کم نظر آئیں گے۔ یہ مختصر کہانی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں بہت سی ایسی چیزیں دکھائی دیں گی، جو لوگوں کو تحریک میں لانے کا سبب بنتی رہی ہیں، یا ممکن ہے آیندہ بھی لوگوں کو قریب لانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ پس منظر بیان کروں۔

حال میں لیری پوسٹن نے ایک کتاب Islamic Dawah in the West لکھی ہے، جسے اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس نے امریکا سے شائع [۱۹۹۲ء] کیا ہے۔ مصنف نے اس میں ایک باب میرے بارے میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ ''خرم کو اس کی والدہ اور بہنوں نے جماعت اسلامی سے روشناس کرایا اور جماعت اسلامی میں شامل کرایا ہے''۔ یہ بات صحیح ہے، لیکن پوری طرح صحیح نہیں ہے۔

بلاشبہہ جماعت اسلامی سے فکری ربط کا پہلا ذریعہ میری والدہ اور بڑی بہنیں ہیں۔

اگست ۱۹۴۱ء میں جب لاہور میں جماعت اسلامی قائم ہوئی، تو اس وقت ہم ایک قصبے رائے سین میں رہتے تھے۔ جس کا مختصراً ذکر ابتدا میں کرچکا ہوں۔ میری عمر اس وقت ۹،۸ سال کے درمیان تھی۔ میری تربیت میں نمایاں حصہ میری والدہ کا اور میری دو بڑی بہنوں اور خصوصاً بڑی بہن کا رہا ہے۔ اس لیے مجھے ان سے بڑا گہرا جذباتی تعلق اور وابستگی تھی۔ ہمارے گھر پر رسالے اور کتابیں آتی تھیں۔ ان میں ترجمان القرآن (اجرا: ۱۹۳۲ء) اور مولانا مودودی (۱۹۰۳-۷۹ء) کی کتابیں بھی تھیں۔ لیکن میں نے نہ انھیں پڑھا اور نہ کوئی دل چسپی لی۔ ظاہر ہے اس عمر میں کیا دل چسپی لے سکتا تھا۔

اس زمانے کی بات ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ گھر میں ایک سخت تناؤ کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ایک ایسی فضا تھی جسے ہم سب محسوس کر سکتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ فضا کیوں کشیدہ ہے اور جھگڑا کس بات پہ ہے۔ یہ بات یاد ہے کہ جھگڑے کی بنیاد ایک لفظ تھا: 'جماعت اسلامی'—— یہ میرا احساس تھا کہ میری والدہ اور دونوں بہنیں جماعت اسلامی کی ابتدائی رکن بن گئی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے مجھے کبھی یہ نہیں بتایا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب) سے خطوط آتے تھے۔ غالباً مولانا مودودی کے بھی ہوں گے، لیکن بیش تر خطوط قمرالدین صاحب [م: مارچ ۱۹۸۵ء] ناظم شعبہ تنظیم کے ہوا کرتے تھے۔

مجھے ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ اس لیے تھا کہ ان خطوط کے آنے اور جانے پر میرے والد صاحب نگرانی کرتے تھے، گویا کہ وہ سنسر ہوتے تھے۔ تناؤ کی یہ فضا میری والدہ، دونوں بہنوں اور میرے والد کے درمیان کش مکش کی بنیاد لگتی تھی۔ والد صاحب کو ان خطوط کا آنا جانا پسند نہیں تھا۔ شاید میں بھی، ان میں سے بعض خطوط حوالہ ڈاک کرنے کا ذریعہ بنا ہوں گا۔ لیکن خاص طور پر ڈاک کے آنے کا منظر یاد ہے۔ والد صاحب، ڈاکیے کا انتظار کرتے تھے اور اس سے خطوط لے لیا کرتے تھے۔ گھر کی اس تلخ فضا سے میں بھی متاثر تھا۔ مجھے جذباتی طور پر اماں سے، بڑی بہنوں آپا [نفیسہ خاتون] اور بی بی [زبیدہ خاتون، م: ۲ جولائی ۱۹۹۷ء] سے وابستگی اور ہمدردی تھی۔ اسی وجہ سے میں بھی اپنے آپ کو اس گھریلو تناؤ میں

شریک کردار سمجھتا تھا اور احساسات کی دنیا میں یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ جو کچھ جھیل رہی ہیں، اپنی جگہ میں بھی وہ دکھ اور کرب جھیل رہا ہوں۔

اس دوران ایک روز کا واقعہ ہے کہ ناشتے کا وقت تھا۔ پرانے گھروں کی طرح ہمارے گھر میں ایک آنگن، دالان اور قدرے وسیع باورچی خانہ تھا۔ اس میں ایک لکڑی کی میز کے چاروں طرف پیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم ناشتہ کرلیا کرتے تھے۔ اس دن ناشتے کے وقت میں نے دیکھا کہ ابا اور اماں کے درمیان بہت طویل گفتگو ہوئی۔ اگرچہ مجھے اس گفتگو کی تفصیلات یاد نہیں، تاہم اب تک تاثر ذہن میں موجود ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ ''جس چیز کے نتیجے میں گھر میں کھنچاؤ پیدا ہوجائے، وہ کیسے بھلی ہوسکتی ہے؟'' یہ گفتگو لمبی چلتی رہی۔ میں اٹھ کر چلا گیا، پھر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد مجھے ایسے لگا کہ دارالاسلام پٹھان کوٹ سے ربط کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مرکز جماعت اسلامی سے اس تعلق کے ٹوٹنے پر والدہ اور بہنوں کو تو تکلیف پہنچی ہوگی، مگر اس سے مجھے بھی اپنی جگہ تکلیف ہوئی۔

اس وقت میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ مولانا مودودی کون ہیں؟ انھوں نے کیا لکھا ہے؟ جماعت اسلامی کیا ہے؟ وہ کس مقصد کو لے کر کام کر رہی ہے؟ جماعتیں کیا ہوتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آٹھ، نو برس کا بچہ ان چیزوں سے کیسے واقف ہوسکتا تھا، تاہم مجھ کو جو محبت اور وابستگی اماں اور دونوں بہنوں سے تھی، اس کی وجہ سے مجھے اپنا یہ جملہ اب تک یاد ہے جو میں نے اپنی افسردہ آپا سے کہا تھا: ''میں جب بڑا ہوجاؤں گا تو جماعت اسلامی کا کام کروں گا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو وابستگی جذبات کی بنیاد پر استوار ہوجائے وہ آزمایش میں بھی بڑی پائے دار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جو وابستگی عقلی ہوتی ہے وہ غالباً کمزور ثابت ہوتی ہے۔ جذبے میں آ کر میرا یہ جملہ ان سے کوئی کمٹ منٹ نہیں تھا، بس ایک بات تھی۔ میں بے چین تھا، چونکہ ان ہستیوں سے محبت تھی، اس لیے یہ بات زبان پر آ گئی۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ یہ جملہ یا یہ واقعہ جماعت میں میرے آنے کی بنیاد بنا۔ یقیناً جب میں نے جماعت کے ساتھ وابستہ ہونے کا آخری فیصلہ کیا تو اس دوران تحت الشعور میں اس پس منظر کی کوئی چیز موجود رہی ہوگی۔

والد صاحب

ابھی والد صاحب کا ذکر آیا ہے۔ اس سے شاید یہ تصویر بنے کہ وہ کوئی مخالف دین انسان تھے، ایسی کوئی بات نہیں۔ جہاں تک یاد ہے ابا باقاعدہ نماز پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ نکالتے تھے۔ وہ ایک شریف النفس انسان اور خوددار آدمی تھے۔ ان کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ زندگی کے آخری دنوں میں، میں نے ان کو راتوں میں سجدوں میں پڑا روتے اور استغفار کرتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سوال اپنی جگہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی طرف سے گھر میں تناؤ اور کھنچاؤ کی کیا وجہ تھی؟ یہ سوال جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی، مگر میرا قیاس ہے کہ دوسرے دینی گھرانوں کی طرح یہ کش مکش بھی دراصل خاندان، گھر، معاشرت اور دین کی کش مکش تھی۔ اس دعوت کو قبول کر لینے کے نتیجے میں ہر جگہ جماعت سے وابستہ ہونے والے افراد کے گھروں میں مختلف ایشوز پر اختلاف پیدا ہو رہا تھا اور ہر چیز زیر بحث آ رہی تھی۔

ہمارے گھر میں اس مسئلے کی ایک وجہ معاشرتی بھی تھی، کہ نوجوان لڑکیاں براہِ راست کسی غیر مرد سے خط و کتابت کر رہی تھیں۔ چاہے ان کا موضوع دین اور دینی مسائل ہی کیوں نہ ہو۔ آج سے نصف صدی پہلے ۱۹۴۰ء، ۴۱ء کے ماحول پر نظر دوڑائیں، تو معلوم ہوگا کہ شرفا اور وضع دار گھرانوں کی لڑکیاں جب گھر سے باہر نکلتی تھیں، تو تانگے پر بھی پردہ باندھا جاتا تھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بھی پردہ کر کے انھیں بٹھایا جاتا تھا۔ ان سماجی حالات میں یہ مراسلت بھی ایک اچنبھے کی بات ہوگی۔ اسی لیے ۱۹۴۱ء کے کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے جلدی جلدی میری بڑی بہن آپا کی شادی کر دی تھی۔

ابا مجھے جمعیت میں کام کرتے دیکھتے رہے۔ پھر ڈھاکہ جا کر میں کمپنی میں چیف انجینئر بن گیا تھا۔ ۶۳ء سے جماعت کا باقاعدہ ذمہ دار بن کر کام کرنے لگا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے اسے کبھی پسند تو نہیں کیا، لیکن یہ کہ انھوں نے کبھی مجھے اس کام سے روکا بھی نہیں اور نہ اس میں کوئی رکاوٹ ڈالی۔ اس لیے میرے نزدیک ابا کے اس رویے کی

زیادہ وجوہ معاشرتی تھیں۔ اس مخالفت کی اصل بنیاد جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے کام کی مخالفت پر نہیں کھڑی تھی۔

میرے والد صاحب کی پیدایش ۱۸۹۰ء میں سرگودھا (پنجاب) میں ہوئی۔ اگرچہ ان کے آبا و اجداد کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ ہماری والدہ محترمہ کا تعلق شمالی یوپی میں مظفر نگر (قصبہ عمر پور) سے تھا۔ ہمارے ددھیال کے رشتے دار پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے اور ان میں اکثر اچھی طرح پنجابی جانتے تھے۔ والد صاحب نے پشاور سے میٹرک کیا، اور پھر غالباً ۱۹۱۲ء میں رسول انجینیرنگ اسکول (گجرات، پنجاب) سے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ایک مرتبہ میں نے اس بات کا تذکرہ یہاں اپنے رفقا سے کیا تو گجرات کے امیر جماعت تو بار بار کہتے: ''آپ پر گجرات کا حق زیادہ ہے''۔ اور سرگودھا کے ساتھی شگفتگی سے کہتے کہ ''آپ 'فرزندِ زمین' ہیں، اس لیے اپنا گھر بار سرگودھا میں لے آئیں''۔ خیر، یہ تو یونہی بات آ گئی۔

والد صاحب ایس ڈی او تھے اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے دوران ان کا واسطہ ٹھیکے داروں سے پڑتا تھا۔ ایک روز کی بات ہے مغرب کے وقت ہمارے گھر پر ایک ٹھیکے دار صاحب تشریف لائے، وہ دروازے کے باہر والد صاحب سے بات کر رہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر میں بظاہر بے دھیان کھڑا تھا، مگر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ٹھیکے دار نے والد صاحب کو کچھ رشوت دینے کی کوشش کی، تو انھوں نے کہا: ''بھئی، میں یہ نہیں لیتا''۔ اس نے بہت اصرار کیا تو والد صاحب نے کہا: ''میں ہرگز نہیں لوں گا۔ بلاشبہہ بہت پہلے مجھ سے ایسی غلطی سرزد ہوتی رہی ہے، تاہم جب سے ان بچوں کی والدہ آئی ہیں، انھوں نے کہا ہے جتنا کچھ جائز ہے، اسی میں گزارا کریں گے۔ تب سے میں نے چھوڑ دی ہے''۔ ابا کی اس بات کا میرے ذہن پر بڑا مثبت اثر ہوا۔

گھر کا کتابی ماحول

ہمارے گھر میں ایک خوش گوار کتابی فضا پائی جاتی تھی۔ رائے سین سے پہلے ہم لوگ

بھوپال کے ایک دوسرے قصبے میں رہتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے وسط میں جب ہم رائے سین آئے تو اس وقت میری عمر ساڑھے چار سال ہوگی، لیکن مجھے وہاں جا کر اُترنا یاد ہے۔ وہاں کی بہت ساری یادیں اور دوستیاں اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ میرے ذہن میں یہ رہا کہ ہمارا وہ مکان بہت بڑا تھا لیکن جب ۱۹۵۶ء میں بھوپال گیا تو بھائی جان [فضل احمد سعید، م: مارچ ۱۹۹۷ء] کو لے کر خاص طور پر رائے سین گیا، کہ ''مجھے اس مکان کو دیکھنا ہے، جہاں سے میری شعوری زندگی کا آغاز ہوا''۔ وہاں جا کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ تو کراچی میں ہمارے چھوٹے سے گھر کے مقابلے میں بھی بہت چھوٹا مکان ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بچپن میں فاصلوں کے اندازے بڑے ہوتے ہیں، لیکن بڑے ہو کر وہ سمٹ جاتے ہیں۔

اس گھر کے پچھلے حصے میں ہماری لائبریری تھی اور بہنیں اس کی انچارج تھیں۔ وقفے وقفے سے ہندستان کی مختلف جگہوں سے کتابوں کے پارسل آیا کرتے تھے۔ جب کتابوں کا پارسل آتا تھا تو بہت شوق سے اس کو کھولنے کا انتظار ہوتا تھا۔ پارسل کھلتا تھا، ہم لپک کر کتاب کو دیکھتے اور پھر اس کو چھوتے تھے۔ جن کتابوں پر جلد نہیں ہوتی تھی، ان کی جلد بندی کا کام ہوتا تھا۔ اسی عمل کے دوران میں نے اپنی بہنوں سے جلد بندی کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ باتیں ساڑھے چار سال اور ساڑھے آٹھ سال کی عمر کے دوران کی ہیں۔ لاہور سے بچوں کا رسالہ پھول آیا کرتا تھا۔ اس کو میں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اس عمر میں ترجمان القرآن پڑھنا مجھے یاد نہیں ہے مگر وہ ضرور آتا ہوگا۔ کیونکہ بعد میں، میں نے دیکھا کہ ہمارے گھر میں ۱۹۳۳ء تک ترجمان القرآن کی فائل موجود تھی۔ الفرقان، معارف، مولوی، پیشوا اور خواجہ حسن نظامی کا بھی ایک رسالہ منادی آتا تھا۔

اس وقت بھی ہمارے گھر میں گھاٹ گھاٹ سے پانی پینے کا اہتمام موجود تھا۔ یہ وہ فضا تھی، جس میں کتاب بہت ہی محبوب چیز بن گئی تھی۔ ساتویں اور آٹھویں کلاس (۱۹۴۳ء- ۱۹۴۵ء) میں نے رائے سین سے پاس کی۔ ۴۵ء میں میرے والد ریٹائر ہوئے اور ہم بھوپال شہر میں آ گئے۔ یہاں ہمارا دو منزلہ مکان تھا۔ اُوپر کی منزل میں دو دالان تھے۔ برآمدوں کے اُوپر کونے میں ایک کمرہ تھا۔ گھر سے الگ وہاں میں نے اپنے پڑھنے لکھنے اور

ذاتی کتابوں کا گوشۂ عافیت بنالیا تھا۔

ہمارے گھر میں مولانا مودودی کی کتابیں موجود تھیں۔ ان میں دارالاسلام کے پہلے ایڈیشن، بڑے خوب صورت گلیز آرٹ پیپر پر بہت عمدہ کتابت کے ساتھ چھپے ہوئے موجود تھے۔ یاد نہیں کہ میں نے ان میں سے کسی کو پڑھا ہو، لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ان کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر محبت اور عزت و احترام سے رکھتا ضرور تھا۔ اس وقت ان کتابوں کی موجودگی، دعوت اور پیغام سے متعارف کرانے کا ذریعہ نہیں بن سکی۔ یہ کام تو بعد میں بفضلِ تعالیٰ میں نے خود ہی کیا یا دوسرے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ پھر اس کے بعد کچھ اور محرکات نے بھی جماعت کے ساتھ تعلق کو بنانے کے لیے بنیاد فراہم کی۔

۱۹۴۵ء میں، مَیں نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ میری والدہ دہلی میں اپنے بھائی اور میرے ماموں زاہد حسین صاحب [م: ۱۴ نومبر ۱۹۵۷ء] کے ہاں جا کر وقتاً فوقتاً رہا کرتی تھیں۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فنانس ڈیپارٹمنٹ میں بہت اُونچے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۴۵ء میں والدہ صاحبہ مجھے بھی اپنے ساتھ دہلی لے گئیں۔ نئی دہلی میرے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب دوسری جنگِ عظیم [۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء] ختم ہوئی تھی۔ برطانوی حکومت ہند نے یومِ فتح منایا تھا۔ اس دن دہلی میں بڑا زبردست چراغاں کیا گیا تھا۔ میں نے بھی یہ چراغاں دیکھا تھا۔

نئی دہلی میں میری دل چسپی کا محور اپنے ماموں زاد بھائی آصف مرحوم کی بہت بڑی لائبریری تھی۔ اس میں رسالہ پھول اور پیسہ لائبریری کی سو، ڈیڑھ سو کتابیں موجود تھیں۔ میں ان کتابوں سے وابستہ ہو کر رہ گیا۔ نئی دہلی کے اس قیام کے دوران میری دل چسپی دو چیزوں سے تھی: کتابیں اور آثارِ قدیمہ۔ مثال کے طور پر: ہمایوں کا مقبرہ، شیخ نظام الدین اولیاء کا مزار، لال قلعہ، جامع مسجد وغیرہ۔

مطالعے کا شوق

میں ابھی مڈل کلاس میں تھا کہ والد صاحب کی کتابوں میں سے طلسم ہوش ربا

کی دو جلدیں میرے ہاتھ لگ گئیں۔ انھیں بڑے شوق سے پڑھا اور تگ و دو کر کے باقی جلدیں بھی حاصل کر کے پڑھ ڈالیں۔ پھر داستان امیر حمزہ پڑھی۔ اس زمانے میں ایک آنہ لائبریری سے بڑی اچھی اور دلچسپ کتابیں مل جایا کرتی تھیں، اس لحاظ سے میرے مطالعے کی خواہش وہیں سے پوری ہونا شروع ہوگئی۔ اس لائبریری سے جاسوسی ناول لے کر بڑی کثیر تعداد میں پڑھ ڈالے۔ ان کے ساتھ دوسرے ناول اور رومانی کتابیں بھی کثرت سے پڑھیں۔

ناول پڑھنے سے فائدے اور نقصان دونوں ہوئے۔ نقصان یہ ہوا کہ لایعنی قصے کہانیاں پڑھ کر بڑا قیمتی وقت ضائع کیا۔ مگر فائدہ یہ ہوا کہ ''اب کیا ہوگا، پھر کیا ہونے والا ہے'' جیسے سوالات پر غور و فکر کی حِس تیز ہوئی مثلاً ناول کی کہانی میں جب الجھاؤ پیدا ہوتا تو پڑھنے کے دوران میں قافیہ لگانے کے لیے لکھ لیا کرتا تھا کہ فلاں کردار کا یہ انجام ہوگا، اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس چیز نے عملی زندگی میں واقعات و حوادث، سیاسی یا جماعتی پالیسیوں اور افراد کے رویوں کے بارے میں تھیوری بنانے میں غیر محسوس انداز سے مدد کی۔ بالفاظِ دیگر ادب، کہانی اور ناول پڑھنے سے زندگی کے واقعات کو سمجھنے اور انسانی نفسیات کی باریکیوں کو جاننے کی تربیت ہوتی ہے۔ زبان دانی اور الفاظ کے ذخیرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے، جس سے مافی الضمیر کے اظہار میں فرد کو سہولت میسر آتی ہے۔

بعض دوست پوچھتے ہیں کہ ''بھئی تم نے طلسم ہوش ربا اور جاسوسی ناول ٹائپ چیزیں کیسے پڑھ لیں؟''

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ میری والدہ نے کبھی بھی مجھے کسی بات پر نہیں ٹوکا۔ یقیناً کسی نہ کسی بات پر ڈانٹا ہوگا، مگر ویسا نہیں ڈانٹا کہ جسے عموماً لوگ یاد رکھتے ہیں یا بچے اپنے ہم جولیوں کے ساتھ مل کر اس ڈانٹ ڈپٹ کا دکھ اور درد بھرے لہجے میں تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر میرے والدین نے مجھے کسی دوسرے فرد کے سامنے کبھی سخت سُست بھی نہیں کہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے والدین کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان تھا، جس نے شخصیت کو

زخمی ہونے سے بچایا۔ اس کے باوجود میں نے حکمت کے ساتھ، تکیے کے نیچے چھپا کر، لحاف کے اندر دبا کر، موقع محل دیکھ کر بچپن کے اس مطالعے کو جاری رکھا۔ لیکن میں جب اپنے بھولے بسرے ماضی کی یاد تازہ کرتا ہوں، تو لگتا ہے کہ میرے والدین یقیناً میری ان تمام کوششوں کو جانتے تھے، مگر احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ انھیں سب کچھ معلوم ہے۔

اسی طرح ساتویں جماعت کے دوران والد صاحب کے ذخیرۂ کتب سے چارلس ڈکنز ناول لے کر پڑھا۔ اس عمر میں ناول کو کیا سمجھتا، مگر اس سے انگریزی کتابیں پڑھنے کا شوق ضرور پیدا ہوا۔ اسکولوں میں بھی اچھے معیار کی انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ انگریزی شاعری کا ایک اچھا انتخاب نصاب میں شامل تھا اور مجھے انگریزی بہتر بنانے کا شوق تھا۔ خیر، ساتویں کلاس کا طالب علم کتنی انگریزی جان سکتا ہے____

ہمارے اسکول میں نویں جماعت کے طالب علم فدا حسین صاحب، فرخ آباد (یوپی) کے پٹھان تھے۔ وہ بڑے اچھے اور شفقت کرنے والے دوست بن گئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: ''انگریزی کو کیسے بہتر بنایا جائے؟'' انھوں نے کہا: ''سمجھ میں آئے یا سمجھ میں نہ آئے، بس انگریزی اخبار پڑھا کرو''۔ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں ان دنوں Times of India پڑھا کرتا تھا۔ مجھے اس کی خبروں سے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی، البتہ ادارتی صفحہ پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ انگریزی بہتر بنانے کے سلسلے میں میرا مشورہ ہے کہ بار بار ڈکشنری نہ دیکھی جائے۔ البتہ بار بار وہی الفاظ پڑھنے کے نتیجے میں زیادہ بہتر انداز سے مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے، جس طرح کہ ایک بچہ معنی و مفہوم کی بندش میں پڑے بغیر الفاظ کا ذخیرہ بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

بعد میں انگریزی ناول کثرت سے پڑھے جن کا اثر یہ ہوا کہ میری انگریزی اچھی ہوگئی۔ مجھ کو خود انگریز کہتے ہیں کہ ''تم انگلش میں انگلش ہی لکھتے ہو''۔ اس چیز میں بچپن کے دوران ناول پڑھنے کا خاصا دخل ہے۔ جس سے زبان کے سدھار، اظہار میں سلاست

(lucidity) اور عام سطح پر بولی جانے والی ستھری زبان تک رسائی ممکن ہوئی۔ مگر اس کے باوجود یہ احساس دامن گیر رہا اور آج تک یہ احساس موجود ہے کہ اگر وقت ان چیزوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے میں دین اسلام کے بنیادی ماخذ اور عربی پڑھ سکتا تو یقیناً علم میں گہرائی پیدا ہوتی اور آج دوستوں میں میرے بارے میں جو بھی حسنِ ظن پایا جاتا ہے، کچھ اس کے مصداق ہو جاتا۔

اس کے بعد پھر حکایات اولیا پر مبنی ایک کتاب اولیاء اللّٰہ کی کہانیاں پڑھی۔ آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ وہ مل جائے تو اس کو چھپواؤں۔ اس میں مجھے دو قصے خاص طور پر پسند آئے تھے۔

ایک یہ تھا، کہ ایک بزرگ نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تربیت دینے کے لیے کہا: ''بیٹا، کھانا مجھ سے نہیں بلکہ اللّٰہ سے مانگنا''۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ بچے کو باورچی خانے کی کھڑکی کے سامنے کھڑا کر کے کہتے: ''بیٹا! تم اللّٰہ تعالیٰ سے کھانا مانگو، جو اس سے مانگتا ہے وہ اس کو دیتا ہے''۔ بچہ جب دعا کرتا تو وہ پیچھے سے کھانے کی پلیٹ اس کے آگے سرکا دیتے تھے۔ جب وہ نہیں مانگتا تھا تو اس کو نہیں ملتی تھی۔ ایک روز وہ بزرگ باورچی خانے نہیں گئے، مگر بچے نے حسب سابق پورے خلوص سے دعا مانگی کہ ''اللّٰہ مجھے کھانا دے دے'' تو کھانے کی پلیٹ اس کے سامنے آ گئی۔ والد نے کہا: ''تم تو بہت پہنچے ہوئے بن گئے ہو''۔ یہ بات سن کر وہ بچہ مر گیا___ معلوم نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے۔ لیکن یہ واقعہ اللّٰہ تعالیٰ پر یقین اور اعتماد کو متعین کرتا ہے۔ اگرچہ یقین واعتماد کی تعلیم قرآن وحدیث سے ملتی ہے، تاہم اس تمثیل میں بچپن کے زمانے میں بڑا سبق موجود ہے۔

ایک اور بزرگ کا واقعہ تھا: ''جب میں چھوٹا تھا تو میرے ماموں نے کہا کہ رات کو سوتے وقت تین مرتبہ کہہ دیا کرو کہ ''اللّٰہ میرے ساتھ ہے، اللّٰہ میرے ساتھ ہے، اللّٰہ میرے ساتھ ہے'' میں کہتا رہا۔ کئی مہینے بعد انھوں نے اس ذکر کی تعداد بڑھا دی۔ آخر میں مجھ سے کہا

کہ "دیکھو جس کو تم روزانہ اتنا یاد کر چکے کہ اللہ میرے ساتھ ہے، اب اس کی نافرمانی نہ کرنا، کیونکہ وہ تو تمھیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ اور ہاں، اگر گناہ کرنا تو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کے کرنا" ـــــ یہ واقعہ بھی مجھے بہت پسند آیا۔

خواجہ حسن نظامی کی کتاب عرب کا چاند میں نے بہت تلاش کی، یہ بچوں کے لیے ایک عمدہ کتاب ہے۔ اسی طرح حسن نظامی صاحب کی وہ تحریریں، جن میں انھوں نے سلطنت مغلیہ کے دورِ زوال کو قلم بند کیا ہے، بڑی عبرت آموز چیز ہے۔

پھر مجھے علامہ راشد الخیری کی تحریریں بہت پسند تھیں۔ ان میں بھی دینی رنگ ہوتا تھا۔ وہ عورتوں کے حقوق کے بڑے چیمپین سمجھے جاتے تھے۔ ان کے رسالے عصمت کا میں قاری تھا۔ اس رسالے میں میری والدہ کی ممانی باقاعدہ مضامین اور افسانے لکھا کرتی تھیں۔ یہ رسالہ دین پسند خواتین میں مقبول تھا اور ہمارے ہاں باقاعدہ آیا کرتا تھا۔ ان تحریروں میں بیان کردہ عورت کی مظلومیت اور بے بسی نے، میرے اندر ابتدا ہی سے عورتوں کے حوالے سے ایک ہمدردانہ نقطۂ نظر پیدا کیا۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت سے ہمدردی کا تصور مغرب سے آیا ہے۔ مگر یہ بات قطعی طور پر درست نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت طیبہ اور ذخیرہ احادیث میں جو تعلیم دی ہے اور مجموعی طور پر اسلام نے اپنے ماننے والوں کے دل و دماغ میں جو حسِ انصاف (sense of justice) راسخ کی ہے، افسوس کہ خود مسلمان بھی اس پر نظر نہیں رکھتے ـــــ عدل کے خلاف کہیں بھی کوئی بات ہو رہی ہو، یا خود جماعت میں کہیں ایسا کوئی معاملہ دکھائی دے تو میں اسے قبول نہیں کرتا، اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے گھر میں کسی نوعیت کی ذہنی بندش یا تعصب نہیں تھا، کہ فلاں چیز پڑھی جائے اور فلاں چیز نہ پڑھی جائے۔ دینی پرچوں کے ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے مصنّفین کی کتابیں اور رسائل بھی موجود تھے۔ اس لیے ہمیں یہ تمام چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ

وسعتِ قلب ونظر پیدا ہوئی۔

تنہائی پسندی

بچپن ہی سے میں تنہائی پسند تھا۔ اس تنہائی کے اگر کچھ نقصانات تھے تو بہت سے فوائد بھی تھے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا، کہ طبیعت کی تنہائی نے کتب کی رفاقت کو چن لیا۔ یہ لمحے میں بھوپال میں اپنے گھر کے اُوپر والے کمرے میں گزارتا تھا۔

اس تنہائی پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ ہماری چچازاد بہن کی شادی کا موقع تھا۔ ان کے بھائی ہمارے گھر دعوت نامہ لے کر آئے اور میرے بارے میں پوچھا۔ میری بڑی بہن آپا، جنھوں نے میری تربیت کی ہے، ان سے کہنے لگیں: ''بھائی، خرم کے لیے آپ کو الگ کارڈ لانا چاہیے تھا، کیونکہ وہ اس گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر میں نہیں، بلکہ اس کا گھر اُوپر والے کمرے میں ہے''۔ اگرچہ یہ ایک لطیف اور بے ساختہ جملہ ہے، لیکن اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میرے گھر والوں کو میری تنہائی پسندی کتنی محسوس ہوتی تھی۔

'ترجمان القرآن' سے تعلق

کچھ پہلے، والدہ محترمہ کے ہمراہ نئی دہلی کے یادگار سفر اور قیام کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہ شاید ستمبر ۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ اچانک میرے نام رسالہ ترجمان القرآن آنا شروع ہوگیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اس لیے کہ ۱۹۴۶ء میں میری عمر ۱۴ سال تھی، اور اس عمر میں چھوٹے سے قصبے میں اگر باہر سے کوئی رسالہ اپنے نام آئے تو لازمی بات ہے کہ ہر ایک کو خوشی ہوگی، مجھے بھی ہوئی۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا نام ذہن میں موجود تھا۔ اس شمارے میں سورۂ یوسف کی تفسیر (تفہیم القرآن) شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس شمارے کو بہت شوق سے اپنے ہاتھوں میں تھاما اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ترجمان القرآن بنیادی طور پر

جماعت اسلامی کی دعوت پر مشتمل رسالہ تو نہیں ہوتا تھا۔ اس میں بہت سے علمی مباحث بھی ہوتے تھے۔ میرے ذہن کی تعمیر میں مولانا مودودی کے سلسلۂ تحریر ''رسائل و مسائل'' اور پاکستان کے قیام کے مسائل پر تحریروں نے بڑا اثر ڈالا۔

قیامِ پاکستان سے ایک سال قبل ترجمان القرآن میرے پاس آ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ترجمان میرے نام کیسے آیا؟ اگر یہ معلوم کرنا چاہتا تو آسانی سے معلوم ہو جاتا، مگر میں نے کبھی والدہ سے یہ سوال نہیں پوچھا۔ میری یادداشتوں میں جو کمی رہی ہے، اس کا سبب میری تنہائی پسند طبیعت ہے۔ اگر آپ کسی معروف پیمانے پر ناپتے ہوئے اس کو مردم بیزار طبیعت کہنا چاہیں تو کہہ لیں، اگرچہ میں خود کو مردم گریز انسان نہیں سمجھتا۔ مجھے انسانوں سے محبت ہے۔ اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا کے لیے بھی، کہ انھیں وہاں راحت اور پاکیزگی اور جنت نصیب ہو۔ خیر، بات کر رہا تھا، ترجمان کس نے جاری کرایا، یہ کسی سے دریافت نہیں کیا۔ کیونکہ آدمی کو بے وجہ چھان پھٹک میں نہیں پڑنا چاہیے۔ قرآن نے کہا ہے: زیادہ سوال مت کرو، کام کی بات سے غرض رکھو۔ تجسّس نہ کرو ــــــ اسی لیے میں کم بات کرتا ہوں۔ کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ کی تنخواہ یا آپ کی آمدنی کتنی ہے؟ افراد سے ذاتی سوالات بھی کم سے کم کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے ترجمان، والدہ محترمہ ہی نے جاری کرایا ہوگا۔ اور کون کرا سکتا تھا؟

اس کے بعد پھر ایک دن رام پور سے ماہنامہ الحسنات کا پہلا شمارہ آیا۔ غالباً انھوں نے میرا نام ترجمان سے حاصل کیا ہوگا۔ اس کے مدیر ابوسلیم عبدالحیٔ کا خط بھی آیا تھا، ''ہم نے بچوں اور نوجوانوں کے لیے یہ رسالہ جاری کیا ہے۔ ان شاء اللہ آپ اس کو مفید پائیں گے''۔ چنانچہ ہم نے اس کا بھی چندہ بھیج دیا تھا۔ یہ سمجھیے کہ یہ سب کچھ والدہ اور بہنوں کے جماعت سے فکری تعلق کا نتیجہ تھا۔

یہی وہ پس منظر تھا، جس کی وجہ سے میرے دوست حسن الزماں صاحب نے مجھے غالباً نومبر یا دسمبر ۱۹۴۷ء میں جماعت کے اجتماع میں جانے کی دعوت دی تو کوئی تامل نہیں ہوا۔

ہوسکتا ہے میں نے کبھی حسن الزماں صاحب کو گفتگو میں بتایا ہو کہ ''ہمارے گھر ترجمان اور الحسنات آتے ہیں''۔اس کی بنیاد پر بھی انھوں نے ہمت کی ہوگی کہ ''بھئی چلو اجتماع میں'' اور میں چلا گیا ہوں گا۔لیکن اس کے علاوہ اور بھی عوامل تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو بھی سامنے لے آؤں تا کہ دعوتی کام کے لیے یہ تذکرہ مفید ہو۔

مثال کے طور پر ایک چھوٹے بچے کو اہمیت دینے سے، اس کو کوئی مقام دینے سے اور حوصلہ بڑھانے سے بچے کی مثبت شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ اس میں یہ بڑی اہم بات ہے، کہ کس قسم کا آدمی یہ تعمیری کام کر رہا ہے؟ ایک دفعہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی، تو وہ مجھے کہنے لگے: ''جو لوگ تنہائی پسند اور شرمیلے ہوتے ہیں، ان کو غلط چیزوں کے ڈر سے ایک قسم کا حفاظتی حصار (cover) مل جاتا ہے۔ ان کی فطرت زیادہ سلیم ہوتی ہے، اس لیے وہ خیر کو زیادہ جلدی قبول کرتے ہیں۔ ان کے برعکس جو مجلسوں، گفتگوؤں اور بحث در بحث کے عادی ہوتے ہیں، وہ زیادہ بگڑ جاتے ہیں''۔ یہ ان کی ایک رائے تھی، معلوم نہیں ایک عمومی قاعدے کے اعتبار سے کہاں تک درست ہے؟

والدہ کی توجہ اور تربیت

دوسری بات یہ تھی ہمارے گھر کا ماحول بنیادی طور پر دینی تھا۔ میری والدہ نے ہماری دینی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہر طریقے سے انھوں نے ہمارے دلوں میں ایمان کی حلاوت اور اسلام کی محبت سمو دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میں سوچتا ہوں، کہ اگر جماعت نہ بھی ہوتی تو اس دینی تربیت کے نتیجے میں اسلام اور اسلام کی صحیح تعلیمات و تصورات سے وابستگی لازماً ہوتی۔ انھوں نے مجھے پورا قرآن پڑھایا، تختی لکھنا سکھایا۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے سعدی کی گلستان اور بوستان پڑھائی۔ ان کتابوں کی تعلیم کا زمانہ مجھے یاد نہیں۔ ان کو دیوان حافظ سے بڑا شغف تھا۔ حافظ کے اشعار پڑھ کر بعض اوقات وہ تشریح بھی کیا کرتی تھی۔ البتہ مثنوی مولانا روم کا ذکر ان کی زبان سے

نہیں سنا۔۱۹۴۲ء میں چھٹی جماعت میں پہلی بار اسکول میں داخلہ لیا۔ تب عمر ساڑھے نو سال ہوگی۔ نو سال کی عمر تک کی یہ ساری تعلیم گھر پر انھی سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد جب اسکول میں چلا گیا تو پھر ان سے نہیں پڑھ سکا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ میرے ننھیال میں تو بڑے دینی رجال رہے ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب بھی ہمارے قریبی رشتہ دار ہیں اور بھی بہت سارے بزرگوں کا نام آتا ہے۔ البتہ ان افراد کا تعلق سلفیت سے زیادہ قریب تھا۔ چنانچہ ہمارے ہاں شب برأت، محرم، فاتحہ، قل، ختم، نذر و نیاز قسم کی رسومات نہیں ہوتی تھیں۔ شاید میرے نانا بھی ان چیزوں کے قائل نہ تھے۔ والدہ بھی ان چیزوں کی حامی نہیں تھیں۔ ماموں تو علی گڑھ سے مغربی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ ہوسکتا ہے اس چیز کے اثرات ان کی بہن پر ہوں۔ پھر گھر پر نماز کا بڑا اہتمام تھا۔ مسجد ہمیشہ ہمارے دروازے سے قریب یا ہمسائیگی میں رہی۔ اس لیے پانچوں وقت مسجد میں جانا، مسجد کی صفائی کرنا، اذان دینے کا شوق، بچوں کے ساتھ مل کر تکبیر کا شوق وغیرہ، یہ چیزیں ایک چھوٹے سے قصبے میں ہماری دل چسپیوں کا مرکز تھیں۔ گویا کہ مسجد زندگی کا مرکز تھی جس سے وابستگی میں گھر اور کتاب دو، مضبوط ستون تھے۔ یہ مسجد ہی کی طرف دل چسپی کو موڑنے والے تھے۔ ویسے بھی ہمارے گھر پر نماز باجماعت کا اہتمام بہت تھا۔

جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو والدہ محترمہ نے بہت خواہش ظاہر کی کہ میں عربی پڑھوں۔ اسکول کے استاد مولوی صفی اللہ صاحب فارسی اور اُردو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے بعد میں نواب شاہ (صوبہ سندھ) میں آ کر جماعت اسلامی کے ساتھ کام کیا۔ میں ان کے گھر صبح فجر کے بعد یا بعض اوقات شام کے وقت جایا کرتا تھا۔ ان سے **عربی کا معلم** کے دو حصے اور کتاب **حکایات الاطفال** بھی پڑھی۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کے شوقِ تدریس اور میرے شوقِ تعلیم کا یہ نتیجہ تھا، کہ اپنی کلاس میں اُردو اور فارسی میں میری اچھی پوزیشن آتی تھی۔ ویسے بھی کلاس میں اول پوزیشن تھی۔

۱۹۴۵ء میں جب ہم بھوپال چلے گئے، تو والدہ نے سوچا کہ عربی تعلیم کا سلسلہ جاری

رکھا جائے۔ صفی اللہ صاحب کو ہم نے پرائیویٹ ٹیوشن کی پیش کش کی تھی، لیکن اس زمانے میں استادوں کا ایسا مزاج تھا کہ انھوں نے انکار کردیا۔ انھوں نے کہا کہ ''عربی پڑھانے کے میں پیسے نہیں لے سکتا''۔ اسی طرح بھوپال میں عبدالحمید صاحب ہمارے اسکول میں عربی، اُردو اور دینیات پڑھاتے تھے۔ والدہ نے ان سے کہا کہ ''آپ اس بچے کو پڑھا دیں''۔ انھوں نے کہا: ''شوق سے''۔ پھر ان سے ٹیوشن کا پوچھا، تو انھوں نے کہا: ''نہیں، میں اس کے پیسے نہیں لوں گا''۔ چنانچہ ان سے بھی میں نے کچھ عربی پڑھی۔ لیکن ہائی اسکول میں پڑھائی کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ میں اسے چلا نہیں سکا۔ پھر جمعیت میں آنے کے بعد جب عربی میں اپنی استعداد کو بڑھانا چاہا تو اس وقت وہ بنیاد جو پہلے سے موجود تھی، اس سے مدد ملی۔ یہ ساری چیزیں دین کے ساتھ تعلق کی مضبوطی میں مددگار بنیں۔

اس کے ساتھ عملی طور پر بھی کچھ چیزیں موجود تھیں۔ بھوپال کی ایک مسجد میں حدیث سنائی جاتی تھی، میں وہاں جایا کرتا تھا۔ پھر آسان حدیث نام کے رسالے میں وہ احادیث جمع کردی جاتی تھیں۔ بڑے پیمانے پر سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ سیہور میں یا رائے سین میں ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء کی بات ہوگی، سیرت رسولؐ کا ایک بڑا جلسہ ہونا تھا، علما آرہے تھے اور ہم لوگ بڑے اشتیاق سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وفور شوق سے دُور دُور تک ان کی گاڑی کے ساتھ دوڑے چلے جاتے تھے۔ انھوں نے کیا تقریریں کیں، کچھ نہیں معلوم، لیکن اس قسم کی سرگرمیوں سے ایک وابستگی بہرحال موجود تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس عمر میں کیا کہا، یہ زیادہ اہم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی نسبت افراد، شخصیات اور نظریات سے وابستگی بہت زیادہ مفید ہوا کرتی ہے۔ جمعیت میں بھی میرا تجربہ یہی رہا۔ مجھے سیہور کا واقعہ یاد ہے کہ وہاں پر تبلیغی جماعت والے آئے اور گشت پر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ کئی دفعہ گشت پر گیا۔ مجھے یہ لوگ پسند تھے۔ ان کا مزاج اور طریقہ بھی اچھا لگتا تھا۔ مرکز سے نکلتے ہوئے دعا کرتے تھے، بستی میں داخل ہوتے وقت دعا پڑھتے تھے۔ پھر فرداً فرداً گھروں پر جانا، ان سے بات کرنا وغیرہ، بڑا خوش کن منظر ہوتا تھا۔

تحریکِ پاکستان میں دل چسپی

بچپن کے اسی دور میں ایک محرک، سیاست میں دل چسپی بھی تھا۔ یہ دل چسپی صرف آلِ انڈیا مسلم لیگ اور حصولِ پاکستان کے ساتھ تھی۔ میں اور میرے دو تین دوست تھے۔ ان میں ایک خلیل شمسی مرحوم تھے، جو بعدازاں کراچی جا کر جماعت کے بہت فعال رکن بھی رہے۔ بھوپال میں میرے سب سے زیادہ قریبی دوست تھے۔ پھر حسن الزماں اختر صاحب سے بھی بڑی قربت تھی۔ [۲۴ مارچ]۱۹۴۶ء میں برطانوی سرکار نے لارڈ پیتھک لارنس کی سربراہی میں ہندستان 'کیبنٹ مشن' بھیجا اور انتخابات ہوئے۔ یہ بھرپور سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ ہم روزانہ بیٹھ کر انتخابات کے نتائج کا انتظار کرتے تھے۔ جب مسلم لیگ نے پوری ۳۰ سیٹیں جیت لیں، اور اس کے بعد جب اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ نے تقریباً ۱۰۰ فی صد سیٹیں جیت لیں، تو ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

جب صوبہ سندھ میں مسلم لیگ کی وزارت بن گئی تو ہمیں دلی مسرت ہوئی، اور صوبہ پنجاب میں نہیں بن سکی تو اس بات کا بہت رنج ہوا۔ بنگال میں مسلم لیگ کے رہنما حسین شہید سہروردی صاحب [م: ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء] کی وزارت بن گئی تو یہ خوشی کا باعث ہوئی۔ اسی دوران بہار اور کلکتہ کے فسادات میں بہت خوں ریزی ہوئی، اس پر سخت رنجیدہ ہوئے۔ یہ واقعات ہماری دل چسپی اور فکرمندی کا باعث تھے۔ ہم بیٹھ کر کئی کئی نشستوں میں یہ فہرستیں بناتے تھے کہ ''جب پاکستان بنے گا تو اس کی کابینہ کن افراد پر مشتمل ہوگی؟ کس کو وزیراعظم ہونا اور کس کو کون سی وزارت سنبھالنی چاہیے؟''

اب میں سوچتا ہوں تو یہ بات کچھ عجیب لگتی ہے۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ مولانا مودودی، کانگرسی تصور متحدہ وطنی قومیت کے مخالف ہونے کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے نہیں ہیں۔ وہ ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے بڑے محترم تھے۔ مجھے اس کے باوجود مسلم لیگ اور جماعت اسلامی دونوں میں کوئی تضاد محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کے ساتھ دل چسپی رکھتا تھا، پاکستان کے ساتھ وابستگی کا رشتہ تھا اور مولانا مودودی سے دینی تعلق تھا۔ اس لیے

میری خواہش تھی کہ پاکستان بن جائے۔ ان دنوں ترجمان القرآن میں جو بحثیں چل رہی تھیں، وہ کوئی متضاد باتیں نہیں لگتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ٹھیک چل رہی ہیں۔ مجھے مسلم لیگ کی قیادت سے ہمدردی تھی اور جماعت سے محبت کا تعلق تھا۔

اس زمانے میں ہمارا شدت سے یہ خیال تھا: ''پاکستان کا پہلا وزیراعظم حسین شہید سہروردی صاحب کو ہونا چاہیے''۔ اس کی ایک وجہ تو بنگال میں ان کی عظیم الشان کامیابی تھی۔ پھر دہلی کے کنونشن میں ان سے قرارداد پیش کرائی گئی تھی۔ وہ فاتح بنگال کے طور پر بڑے لمبے جلوس کے ہمراہ پنڈال میں داخل ہوئے تھے۔ ان مختلف عوامل کی بنا پر ہم اس عمر میں ان کی شخصیت سے بہت مسحور تھے، کہ وہ مسلم لیگ کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ بعد میں جا کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ہماری سوچ صحیح تھی۔ اگر قائداعظم [م:۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء] ان کو مرکزی دھارے میں رکھتے اور وہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم ہوتے تو شاید جمہوری روایات بھی قائم ہو جاتیں اور مشرقی پاکستان بھی الگ نہ ہوتا، لیکن اب شاید اور کاش کا وقت نہیں ہے۔

اسی طرح نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب [م:۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء] کے مقابلے میں ہم نواب اسماعیل خان [م: ۲۸ جون ۱۹۵۸ء] کو زیادہ پسند کرتے تھے، پتہ نہیں کیوں یا ہم کو معلومات نہیں تھیں۔ بہرحال یہ تو ہم لڑکوں کی اپنی سوچ تھی۔ آخرکار مسلم لیگ کے لیڈر ہی ہمارے قومی لیڈر اور محترم افراد بھی تھے۔ قومی سیاست میں ہماری معلومات کا ذریعہ انگریزی پریس تھا، جس میں اہم ٹائمز آف انڈیا تھا۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ہم نے جماعت نہم سے تعلق رکھا۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ طلبہ تنظیم کا صدر استاد ہوا کرتا تھا، جب کہ باقی عہدے دار طالب علم ہوتے تھے۔ (ہم نے اس ماڈل کو اسلامی جمعیت طلبہ میں اختیار کرنے کے بارے میں بھی کئی دفعہ سوچا، کیونکہ استاد تو ہمیشہ رہتا ہے، مگر لڑکے آتے جاتے رہتے ہیں)۔ ایک غلط قسم کے استاد ہمارے ہاں فیڈریشن پر قابض تھے۔ ہم تین چار دوستوں اور آٹھ دس لڑکوں نے مل کر سوچا

کہ ان کو ہٹایا جائے اور ان کی جگہ صحیح آدمی لایا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایم ایس ایف کا جلسہ منعقد کر کے یہ کوشش کی، کہ ان کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کریں۔ استادِ محترم کا نام شاید محمود حسن تھا۔ انھوں نے یہ دیکھا تو ایک جذباتی تقریر اور بے بنیاد بات کرتے ہوئے، ہماری تحریک عدمِ اعتماد کو براہِ راست قائداعظم کے خلاف قرار دیا اور الزام لگا دیا کہ ہم پاکستان کے مخالف ہیں۔ ممکن ہے جماعت اسلامی کے بارے میں نرم گوشہ کی وجہ سے کوئی بات مسلم لیگ کے مقامی لیڈروں کی عمومی روش کے بارے میں منہ سے نکل گئی ہو۔ اس کے بعد پورا مجمع ہمارے خلاف ہوگیا۔ اس طرح نویں کلاس میں اپنی تنظیم میں اچھے لوگ برسرِ اقتدار لانے کی کوشش اسی طرح ناکام ہوگئی، جس طرح کہ آج تک ہوتی چلی آرہی ہے۔ سیاست سے دل چسپی تھی جو برقرار رہی۔

دینی تعلیم کا ارادہ

بھوپال میں قیام کے دوران پاکستان بن گیا۔ انھی دنوں میں نے میٹرک پاس کرلیا تھا، بڑے جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ ہم لوگ وہیں رہتے۔ میٹرک کا نتیجہ آنے تک یہ ذہن بنا چکا تھا کہ کسی مادی مستقبل (کیریئر) کے بجائے میں پوری توجہ اور محنت دینی تعلیم پر دوں۔ اس کے لیے رام پور کی دینی درس گاہ جو ثانوی درس گاہ کے نام سے معروف تھی، میں داخلہ لینے کے لیے پروگرام بنایا۔ وہیں پر ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر عبدالحق انصاری، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، عرفان احمد خاں اور اشفاق صاحب نے تعلیم حاصل کی۔ یہ تمام لوگ بعد میں جماعت اسلامی کے دست و بازو بنے۔ میرا رجحان بھی اسی جانب تھا۔ اس وقت تک مولانا مودودی کی تقریباً تمام کتب پڑھ چکا تھا۔ زیرِ مطالعہ لٹریچر اس جذبے کو بڑھا رہا تھا۔

انھی دنوں مولانا مودودی کے بارے میں اپنی والدہ صاحبہ کا ایک جملہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ انھوں نے ایک بار مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تھا: ''ہم تذکرۃ الاولیاء جیسی کتابیں

پڑھتے ہیں، اولیا کے کردار پڑھتے ہیں، تو بڑا دلکش لگتا ہے، ہم کو ان پر بہت رشک آتا ہے، اور بس یہ سوچ کر رہ جاتے ہیں کہ ہم ایسے نہیں بن سکتے لیکن اس کے برعکس مولانا مودودی کی تحریریں پڑھتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی کوشش اور محنت سے اچھے مسلمان بن سکتے ہیں''۔ والدہ کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے اور تب سے اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

جماعت سے تعلق کی خواہش

اگرچہ میں جماعت سے متعارف ہو چکا تھا، تاہم جماعت سے گہری وابستگی کا سبب ایک واقعہ بنا۔

۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرلیا، تو اہلِ خانہ کی طرف سے جدید تعلیم کے حصول پر ہی زور دیا جا رہا تھا۔ اس لیے یہ سوچا کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں پڑھوں۔ میرے بڑے بھائی جان (جو اَب بھی بھوپال میں ہیں) نے بھی علی گڑھ سے ایم اے کیا تھا۔ ان کے بعد دوسرے بھائی سعید اختر مراد، اس وقت علی گڑھ میں ایم ایس سی کیمسٹری سال اول میں پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ گیا۔ میرے بھائی تو وہاں پر موجود نہیں تھے، البتہ وہاں پر ان کے ایک گہرے دوست کا مہمان بنا، جو پکے کمیونسٹ اور مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ انھوں نے بڑی محبت سے میری خاطر مدارات کی۔ میں ان کے پاس آٹھ دن تک ٹھیرا۔

اپنی طبیعت کے مطابق میں نے ان سے درخواست کی کہ ''یہاں تعلیم کے دوران میں کسی ایسے کمرے میں نہیں ٹھیروں گا، جہاں کوئی دوسرا کام ہو، مجھے الگ کمرے میں داخلہ دلا دیجیے''۔ اس یونی ورسٹی میں ایک آفتاب ہوسٹل ہی تھا، جہاں پر سنگل بیڈ روم تھے، لیکن وہاں پر جگہ پانے کے لیے جتنے نمبر ہونے چاہییں تھے، وہ میرے پاس نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے داخلہ نہیں لیا اور اسی بات پر واپس آ گیا۔ اگست ۴۷ء کا مہینہ تھا اور حالات بڑے خطرناک تھے۔ اس سے اگلے دن آگرہ سے گزرنے والی ریل گاڑی میں سوار تمام مسلمان قتل

کر دیے گئے۔ میں اس حادثے سے بالکل بے خبر، اپنے خیالات میں غرق بھوپال پہنچ گیا، اور یہ طے کرلیا کہ اب یہیں پر کھلنے والے نئے کالج میں پڑھنا ہے۔

علی گڑھ میں جب میں آٹھ دن رہا، تو اس دوران میں نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی، حالانکہ بچپن سے پانچ وقت نماز پڑھنے کا عادی تھا۔ ماحول ایسا تھا، دوست ایسے تھے کہ نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں آتا تھا۔ میں نکو بننے کے خوف کی وجہ سے نماز پڑھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ یہ دن گزار کر میں واپس آ گیا، تاہم میرے ذہن میں اپنا یہ فعل ایک خلش بن کر کھٹکنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ ''اتنی دین داری اور نماز کی پابندی پر کھڑی دیوار، علی گڑھ کے ایک ہی ہلّے میں ڈھے گئی۔ آخر وہ اتنی کمزور کیوں ثابت ہوئی؟''

گھر واپس پہنچنے کے بعد مولانا مودودی کی کتاب خطبات پڑھی، تو مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا کہ: رسمی دین داری کیوں کم زور اور بے جان ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے دین کی جدوجہد، اور تعلق کے بعد انسان کے اندر کیا مضبوطی پیدا ہوجاتی ہے؟___ اس لمحے مجھے اچھی صحبت اور ایک دینی تنظیم کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوا۔ اس واقعے نے ایمان وعمل کے ساتھ مضبوط تعلق قائم رکھنے کا راستہ دکھایا اور واپس آنے کے چند ماہ بعد میں نے جماعت کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کرلیا۔

کالج میں داخلہ

علی گڑھ سے واپس آ کر حمیدیہ کالج بھوپال میں داخلہ لے لیا۔ سائنس کے مضامین کا انتخاب کیا اور لگ کر پڑھائی کی۔ اللہ کے فضل سے فرسٹ ایئر میں فرسٹ پوزیشن آئی۔ کالج سے پندرہ یا پچیس روپے ماہوار کا وظیفہ بھی ملا۔ خصوصاً، گھر کے حالات یہ تھے کہ والد صاحب ریٹائر ہوچکے تھے اور ایک بڑے گھر کی کفالت کا مسئلہ درپیش تھا۔ ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی تنخواہ نوے روپے تھی۔ اس اعتبار سے میرے لیے تو پندرہ یا پچیس روپے قارون کے خزانے سے کم نہ تھے۔ اس رقم سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ سائیکل خریدی، کیونکہ گھر سے کالج تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ایک سال تک پیدل آتا جاتا رہا تھا۔ کچھ

رقم سے کتابیں خرید لی تھیں۔

تحریکی لٹریچر سے ربط

یہ زمانہ میری بہت زیادہ مصروفیت کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں اجتماع نورمحل کی دعوت قبول کر کے تن، من، دھن سے لگ گیا تھا۔ جماعت کے اجتماعات میں جانا شروع کر دیا اور امیر جماعت سید ظہیر الحسن صاحب سے ترجمان القرآن کی پوری فائل [۱۹۳۳-۴۶ء] لے کر میں نے پڑھی۔ گویا کہ اس طرح مولانا مودودی کی تقریباً ساری چیزیں پڑھ لیں۔ ترجمان میں اور بھی جو کچھ شائع ہو رہا تھا، وہ بھی پڑھ لیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سب کچھ کو میں نے اس وقت سمجھ لیا یا ذہن میں بٹھا لیا ہوگا، لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ جذب ضرور کیا۔ آج بھی بعض دفعہ جب کوئی چیز سوچنے اور لکھنے کے بعد سمجھتا ہوں کہ یہ میری اپنی چیز ہے، مگر بعد میں کہیں دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ نہیں، یہ چیز تو کہیں اور بھی پہلے سے موجود ہے۔ ذہن میں مطالعہ شدید تحریر کا وقتی ربط تو کٹ گیا، لیکن ظاہر ہے کہ خیال تو وہیں سے جذب کیا ہوگا۔

تحریک سے تعلق کو مضبوط بنانے میں **خطبات**، **شہادتِ حق**، **دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات** نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ **شہادتِ حق** اور **خطبات** تو آج تک میری تقریر اور گفتگو کا جزو چلی آ رہی ہیں۔ **دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات** میں مجھے مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی [م: ۱۵دسمبر ۱۹۹۷ء] کی تقریریں اس وقت بھی مؤثر لگیں اور آج بھی بہت اثر انگیز لگتی ہیں۔ میں نے نماز کے اندر خشوع وخضوع کے لیے محترم میاں طفیل محمد کے مضمون سے بھرپور استفادہ کیا۔ جب کبھی میاں صاحب کو منصورہ کی جامع مسجد میں خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو مجھے ان پر بڑا رشک آتا ہے اور اسی لمحے ان کا مضمون بھی یاد آ جاتا ہے۔

چند شخصیات، کچھ رفیق

مولانا سید سلیمان ندوی [م: ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء] اسی زمانے میں یعنی ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء

میں، قاضی بن کر بھوپال آئے تھے۔ ان کی آمد پر بھوپال میں خاص دینی فضا بنی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی وہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔

مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی صاحب ہمارے گھر کے اُوپر کے حصے میں کرائے دار بن کر رہ چکے تھے۔ اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کا شمار اچھے کبار علما میں ہوتا تھا۔ حامد الرحمٰن اور ساجد الرحمٰن ان کے دو لڑکے تھے۔ ان دونوں سے ہماری بہت گہری دوستی تھی۔ ہم ساتھ کھیلتے تھے، اور ساتھ ہی نماز پڑھنے جاتے تھے۔ یہ ساجد الرحمٰن وہی ہیں، جنھوں نے پاکستان میں بہت سی عربی کتابوں کا اُردو ترجمہ کیا ہے، اور آج کل اسلام آباد میں ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کا سید سلیمان صاحب سے زیادہ تعلق تھا۔ چنانچہ انھی کے ہمراہ سید سلیمان صاحب کی صحبت میں کئی مرتبہ بیٹھا۔ سید صاحب، میرے ساتھ بڑی شفقت اور توجہ سے پیش آتے تھے۔ ۱۹۴۸ء کی عید کا خطبہ انھوں نے دیا تھا، جس کے بعد ہم ان کے گھر پر بھی گئے۔

ہمارے محترم رفقا میں انعام الرحمٰن خان صاحب تھے، جو بعد میں بھوپال جماعت کے امیر اور پھر مدھیہ پردیش جماعت کے بھی امیر بنے۔ ان کو ہم ''بنے میاں'' کہا کرتے تھے اور وہ بہت محبت واحترام سے پیش آتے تھے۔ اسی طرح مشتاق صاحب اور سمیع اللہ صاحب بھی تھے۔ یہ ہمارا مختصر سا حلقۂ دوستی تھا۔ قرآن سے خصوصی شغف تھا، اس لیے شوق سے پڑھتا رہتا تھا۔ غالباً ۱۹۴۶ء کے رمضان میں، میں نے پورا تیسواں پارہ حفظ کرلیا تھا۔ ہمارے مکان کے سامنے ایک دینی مدرسہ سلیمانیہ تھا۔ اس کے ہیڈ ماسٹر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ہم مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ وہ دین دار اور عالم آدمی تھے، انھوں نے بھی بڑی محبت کا تعلق قائم رکھا تھا۔ ان سے ۳۰واں پارہ اور بیان القرآن کا کافی حصہ سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ یہ جماعت اسلامی میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔

بھوپال کی معروف دینی و علمی شخصیت نواب سید صدیق حسن خان کو ریاست بدر کردیا

گیا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ میں جا کر 'بھوپال ہاؤس' بنایا اور اپنا کتب خانہ بھی وہیں پر منتقل کر لیا۔ ان کے بڑے بیٹے نواب سید علی حسن، ہندستان کی معروف علمی اور سیاسی شخصیت تھے۔ ہند کے معروف علما اور سیاسی قائدین بھوپال ہاؤس جایا کرتے تھے۔ سلطان جہاں بیگم کے زمانے میں ان کے پوتے سید ظہور الحسن صاحب بھوپال میں آئے اور ریاست کے فنانس سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ظہور صاحب ہمارے امیر جماعت سید ظہیر الحسن صاحب کے والد گرامی تھے۔

طالب علم اور جماعت کی رکنیت

۱۶ سال کی عمر میں، میں نے جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ تب بھوپال میں جماعت کے امیر اور دوسرے ارکان سمجھتے تھے کہ مجھے جماعت کا رکن بننا چاہیے۔ ظہیر بھائی نے مرکز کو لکھا کہ ''اس عمر کے طلبہ کو ہم رکن بنانا چاہتے ہیں''۔ ان کو جواب موصول ہوا کہ ''ہماری پالیسی یہ ہے کہ طالب علم کو رکن نہ بنایا جائے''۔ یہ غالباً مولانا مودودی ہی کی بنائی ہوئی پالیسی تھی، جس کا مجھے پاکستان آنے کے بعد ان کی ایک گفتگو سے بھی اندازہ ہوا تھا۔

مولانا مودودی کا خیال تھا کہ: ''طالب علم جب عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو دو مرحلے ایسے آتے ہیں، جن میں اکثر لوگ ضائع ہو جاتے ہیں۔ ایک شادی کا مرحلہ اور دوسرا کیریئر کا مرحلہ'' ــــ وہ چاہتے تھے کہ ''آدمی ان دونوں مرحلوں سے گزر جائے۔ اپنی پختگی ثابت کر دے، اس کے بعد رکن بنے''۔

اس پس منظر میں مولانا مودودی کی ایک گفتگو سے اندازہ ہوا، کہ جمعیت کی تاسیس بنانے کے پیچھے جو بھی مصالح رہے ہوں، ان میں ایک بڑا اہم پہلو یہ تھا کہ طالب علم خود تعلیمی زندگی کے مخصوص تقاضوں کے پیش نظر، اس ڈسپلن اور یکسوئی کا مظاہرہ شاید نہ کر سکیں جو جماعت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے سلسلے میں جو طالب علم آئیں وہ اپنے دائرۂ کار میں الگ سے کام کریں۔ اسی طرح جب عملی زندگی میں وہ شادی

کرلیں اور ان کا کیریئر بن جائے، تو پھر وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر، اگر جماعت کے رکن بنا چاہیں تو بنیں۔ اگرچہ یہ کوئی باقاعدہ طے شدہ پالیسی نہ تھی، تاہم اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

بہرحال، بھوپال میں جماعت میرے ساتھ ایک رکن کی طرح ہی معاملہ کرتی تھی۔ ادھر جیسے ہی جماعت کے ساتھ تعلق ہوا تو مطالعہ، ذاتی تربیت اور اجتماع میں شرکت کے علاوہ کوئی دیگر پروگرام نہ ہوتا تھا۔ البتہ دعوت پہنچانے کا ایک جذبہ تھا۔ چنانچہ کالج کے رفقا میں، کالج کے بعد سائیکل پر سوار ہوکر دُور دُور گھروں میں جانا، ان دوستوں کو لٹریچر پہنچانا اور اساتذہ تک دعوت لے کر جانا ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے کالج کے تمام اساتذہ سے ربط قائم کیا تھا اور ان کو لٹریچر پہنچایا تھا۔ ایسے اساتذہ میں سے بعض لوگ بعد میں رکن جماعت بھی بنے۔ اسی طرح اپنے محلے میں اگرچہ دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا، بہرحال ایک لگن تھی جس کے تحت ان تک پہنچے۔

ہم یہ سمجھتے تھے کہ ایک کارکن کا بنیادی کام ہی یہ ہے، کہ وہ دوسروں کو دعوت پہنچانے کے لیے کھڑا ہوجائے۔ مگر اب یہ چیز بہت مدھم پڑ گئی ہے، بلکہ عنقا ہوگئی ہے۔ اسی لیے سرکلروں اور تقریروں کے ذریعے کارکن کو بتانا پڑتا ہے کہ بھائی، دعوت پھیلانے کا کام کریں۔ حالانکہ اگر ایک کارکن دعوت نہیں پھیلاتا تو کارکن کس بات کا؟ ___ لیکن اس وقت کوئی اور کام نہیں تھا، سوائے اس کے کہ آدمی خود مطالعہ کرے، اجتماعات میں شرکت کرے، دعوت پھیلائے اور دوسروں کو لٹریچر پڑھائے۔

بھارت میں نظمِ جماعت

اسی زمانے میں قیامِ پاکستان کا مرحلہ آیا، تو جماعت اسلامی کا مرکز پاکستان منتقل ہوگیا۔ اس افراتفری کے عالم میں بھارت میں رہ جانے والی جماعت سخت آزمایش سے دوچار تھی۔ اس کا کوئی امیر نہیں تھا۔ ایک خیال یہ بھی سامنے آیا تھا کہ اس کو ختم کردیا جائے۔ وہاں کے ارکان جمع ہوئے اور انھوں نے محترم مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی [م: ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء]

کو اپنا امیر منتخب کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مولانا مودودی نے اپنے خط میں بھی یہاں کے ارکان کو یہی مشورہ دیا تھا کہ ''آپ لوگ منظّم ہوجائیں۔ ابواللیث صاحب آپ کی امارت کے لیے موزوں ہیں''۔ بھارت میں تقسیم ہند کے بعد ابتدائی دنوں کے دوران کام کی تنظیم و توسیع کے بارے میں بڑی اہم بحثیں اُٹھیں، ان کا اندازہ مجھے بعد میں لٹریچر کے مطالعہ سے ہوا۔

اس زمانے میں حالات بڑے ابتر تھے۔ ہم نے بھوپال ہی میں ریڈیو پاکستان سے مولانا مودودی کی نشری تقریریں: **اسلام کا سیاسی نظام، معاشی نظام اور معاشرتی نظام** وغیرہ سنی تھیں۔

۲

پاکستان میں آمد اور مسائل

قیامِ پاکستان کے بعد، وہاں بھارت میں رہ جانے والے مسلمان گھرانے ایک عجیب کش مکش سے دوچار تھے۔ بھارت میں رہیں یا پاکستان چلے جائیں۔ یہ سوال ہر گھر اور ہر فرد کے سامنے آن کھڑا تھا۔

پاکستان آنے کا فیصلہ

ہمارے ماموں زاہد حسین صاحب [۲۵ جون ۱۹۴۸ء] اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر مقرر ہو چکے تھے۔ وہ اگرچہ مغربی تعلیم یافتہ تھے، تاہم ان کی تربیت بھی اسی آنگن میں ہوئی تھی، جہاں میری والدہ محترمہ کی دینی تربیت ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ان پر دینی اثرات اور دینی رنگ بھی تھا ــــــ جہاں تک مجھے علم ہے، اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب [جولائی ۱۹۴۸ء] میں قائداعظم محمد علی جناح کی معرکہ آرا تقریر کا مسودہ زاہد حسین صاحب ہی نے لکھا تھا، جسے انھوں نے قبول کیا اور کچھ تراميم و اضافے کے بعد پڑھا۔ اس تقریر میں اسلام کے معاشی نظام کا ذکر نہایت پُرجوش الفاظ میں اور تیقن کے ساتھ کیا گیا تھا۔

ماموں کی رائے تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اچھے مستقبل کے امکانات پاکستان میں ہیں، اور بھارت میں ان کا مستقبل تاریک ہوگا۔ اس لیے جب اسٹیٹ بنک آفیسرز کا پہلا گروپ منتخب کیا جا رہا تھا، تو انھوں نے اپنے انھی خیالات کی بنا پر میرے بڑے بھائی سعید اختر مراد صاحب سے رابطہ کیا۔ جو اس وقت مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ایم ایس سی

کیمسٹری کے طالب علم تھے۔ چنانچہ وہ کراچی چلے گئے اور بنک آفیسرز ٹریننگ پروگرام میں شامل ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ تک انھوں نے نیشنل بنک آف پاکستان میں ملازمت کی۔ ان سے چھوٹے بھائی خالد محمود بھی علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور اکثر بیمار رہتے تھے۔ ان کی بیماری کی تشخیص نہیں ہو رہی تھی، آخرکار معلوم ہوا کہ انھیں آنتوں کی دق ہوگئی ہے۔ وہ بھی کراچی چلے گئے اور ماموں کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔

اگرچہ بھوپال میں مسلمانوں کی حیثیت اچھی تھی۔ وہاں پر کسی قسم کے فسادات نہیں ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہاں سے بھی لوگ پاکستان آ رہے تھے۔ ہمارے اہلِ خانہ میں سے اکثر افراد کی رائے تھی: ''ہمیں یہیں بھوپال میں رہنا چاہیے''۔ ہم سب کی سیاسی وابستگی مسلم لیگ سے تھی۔ لیکن ادھر ماموں زاہد کے اصرار پر آخرکار یہ فیصلہ ہوا: ''ہمیں پاکستان چلے جانا چاہیے''۔

پاکستان کا سفر اور جذبات

ہمارے دو بھائی پہلے ہی کراچی جا چکے تھے۔ ایک مشترکہ فیصلے کے بعد والدین نے مکان بیچ کر پاکستان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی آخری تاریخوں میں ہم بھوپال سے دہلی پہنچے۔ وہاں سے ضروری کاغذات بنوانے کے بعد ڈکوٹا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لاہور پہنچے۔ لاہور میں ہمارا قیام تین روز کے لیے کرشن نگر میں رہا۔ پھر وہاں سے کراچی چلے آئے۔ غالباً ۳ نومبر ۱۹۴۸ء کو ہم کراچی پہنچے تھے۔

میرے لیے یہ بہت جذبے اور جوش سے معمور سفر تھا۔ اس جذبے کی حدت آج تک محسوس کرتا ہوں۔ ذہن میں یہ تصور تھا کہ ''میں ایک ایسی جگہ پر جا رہا ہوں، جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی، وہ خطہ زمین دارالاسلام بنے گا''۔ مگر مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کر یہ بھی واضح تھا کہ اس کے لیے شعوری جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اسی سفر کے دوران یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ حکومت پاکستان ریاست کے تخلیقی مقصد، اسلام کو باقاعدہ دستاویزی شکل میں منظور نہیں کر رہی۔ اسی لیے مولانا مودودی کے ساتھ، مولانا امین

احسن اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کو گرفتار [اکتوبر ۱۹۴۸ء] کرلیا گیا تھا۔ جماعت کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ مہم بھی چل رہی تھی۔ اس کے باوجود اس سفر میں میرے جذبات میں بڑی بالیدگی تھی۔

سنت رسولؐ کی سعادت

جس وقت ہم نے یہ سفر شروع کیا اس وقت تک میں نے داڑھی نہیں رکھی تھی۔ بھوپال میں جماعت کے اجتماع میں اکثر یہ مسئلہ اُٹھتا رہتا تھا۔ امیر جماعت ظہیر صاحب بہت وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی، خود سے داڑھی اُگے گی کہ مولانا مودودی کا مسلک یہی ہے'' ___ اس سفر میں، مَیں نے داڑھی رکھی، اور اللہ کے فضل سے استقامت کے ساتھ رکھی۔ یہ فیصلہ کرتے وقت مجھے بڑی خوشی تھی اور جذبہ بھی تھا۔ اس زمانے میں داڑھی رکھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر ماموں کے ہاں جس ماحول میں ہم جارہے تھے وہاں تو یہ اور بھی مشکل نظر آتا تھا۔

جب ہم پاکستان آئے تو کچھ عرصہ بعد جماعت سے تعلق رکھنے والوں کو ملازمتوں سے نکالا جارہا تھا۔ قاسم حسنی صاحب ہمارے پڑوسی تھے، اور دُور سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [م: ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء] کے رشتہ دار بھی تھے۔ وہ باریش تھے اور سرکاری شعبے سے وابستہ تھے۔ ان کے افسروں نے ان سے کہا کہ ''اگر ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو آپ داڑھی صاف کرادیں''۔ اسی روز انھوں نے ڈیوٹی سے واپس آکر مجھے بتایا کہ ''بظاہر دیکھنے میں تو یہ تولہ بھر بال ہیں، لیکن ان کے پیچھے پہاڑ جتنا ایمان ہے، اس لیے یہ تو نہیں کٹ سکتے''۔ مجھے ان کا یہ جملہ بہت اچھا لگا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کے دوران سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر مجھے بھی یہ آزمایش پیش آئی۔ میرے بنگالی دوست ابوالمنصور صاحب کے بڑے بیٹے محبوب انعام نے مجھے پناہ دی تھی۔ انھوں نے جب مجھے بھارتی فوج کے سپرد کیا، تو ہمدردی اور خلوص بھرے لہجے میں التجا کرتے ہوئے کہا: ''کوئی ایسی شکل ہونی چاہیے کہ آپ کو یہ لوگ بنگلہ دیش حکومت کے سپرد

نہ کرسکیں''۔ میں نے کہا: ''بتائیے، وہ کیا صورت ہوسکتی ہے؟'' ___ وہ کہنے لگے: ''آپ داڑھی منڈوا دیں''۔ میری جان کو واقعی زبردست خطرہ تھا، ان کا شدید اصرار تھا اور مشورہ بھی مخلصانہ تھا۔ مگر میری طبیعت اس 'رخصت' کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔ میں نے کہا: ''بھائی، موت کا وقت برحق ہے، اور اگر جان جانی ہے تو جائے۔ میں اسے بچانے کے لیے داڑھی کیوں قربان کروں؟''

وہ داڑھی جو سفرِ پاکستان کے دوران رکھی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت بھی سلامت رکھا، اگرچہ یہ میرے بس میں نہ تھا۔

لاہور کی فضا

ہم پاکستان پہنچے۔ ہمارے لیے یہ ایک نئی جگہ تھی، نئے نئے لوگ تھے، اور اس نئے پن کے باوجود پاکستان سے محبت کا تعلق تھا۔ پاکستان کی مشکلات اور مصائب کا بھی اندازہ تھا۔ پاکستان میں حکومت اور جماعت کے درمیان 'قراردادِ مقاصد' کے مسئلہ پر کش مکش چل رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں میرے جذبات، تمنائیں، آرزوئیں اور ہمدردیاں جماعت اسلامی اور پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوششوں کے ساتھ تھیں۔

میں نے بڑے جذبات کے ساتھ یہ سفر کیا تھا۔ اگرچہ میرے ذاتی حالات دگرگوں تھے، لیکن ذہن پر اسی بات کا غلبہ تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی جماعت کے ساتھ ربط قائم کرنا ہے۔ اگرچہ لاہور میں قیام بہت مختصر تھا، تاہم لاہور پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں پر جماعت کے لیے فضا بڑی مخالفانہ ہے۔

ہم کرشن نگر میں ٹھیرے تھے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جماعت کا مضبوط حلقہ تھا۔ اتنے بڑے شہر اور نئی جگہ پر اپنے مہاجر رشتہ داروں کے درمیان کوئی موقع نہ مل سکا، کہ اچھرہ جانے کی ہمت کروں، جہاں جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی دفتر تھا۔

کراچی کے دامن میں

جب کراچی پہنچ گئے تو یہاں پر بھی یہ ممکن نہیں ہوا، کہ میں فوری طور پر جماعت کے دفتر پہنچوں۔ پاکستان سے بھارت میں جماعت کے جو رسالے پہنچتے تھے، ان سے معلوم تھا کہ ۹-لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ، جماعت کراچی کا دفتر ہے اور مجھے وہیں پہنچنا ہے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں پر کام کرنے کے ذمہ دار چودھری غلام محمد صاحب [م: ۲۹ جنوری ۱۹۷۰ء] ہیں۔ کراچی پہنچنے کے بعد ہم ماموں کے ہاں ٹھیرے۔ وہ فریئر اسٹریٹ پر رہتے تھے، جہاں آج کل میٹروپول ہوٹل اور فریئر گارڈن ہے۔ اس کے سامنے تقریباً ایک دو مکان چھوڑ کر قائداعظم کا مکان [یعنی فلیگ اسٹاف ہاؤس] تھا جہاں پر محترمہ فاطمہ جناح [م: ۹ جولائی ۱۹۶۷ء] کافی عرصہ مقیم رہی ہیں۔

یہ بڑے اور صاحبِ حیثیت لوگوں کا علاقہ تھا، جہاں پر پبلک ٹرانسپورٹ کا ملنا مشکل تھا۔ ویسے بھی جماعت کا دفتر دُور تھا۔ مجھ جیسا شخص جو ملنے جلنے، آنے جانے میں بڑا کم آمیز اور کم گو تھا، اس کے لیے کراچی جیسے نئے اور بڑے شہر میں پتا پوچھ کر پہنچنا مشکل تھا۔

مخالفانہ فضا

جیسا کہ میں نے لاہور میں مخالفانہ فضا محسوس کی تھی، کراچی میں آکر معلوم ہوا کہ یہاں اس سے بھی زیادہ مخالفانہ فضا پائی جاتی ہے، بلکہ ماموں کی زبان سے بھی بعض دفعہ شدید قسم کے جملے سننے میں آئے۔

یہیں گھر میں یہ تک بھی سنا کہ ''مولانا مودودی کو پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے، وہ غدار ہیں''۔ میری ممانی، بیگم رعنا لیاقت علی کے ساتھ عورتوں کے حقوق کی علَم بردار اور تنظیم 'اپوا' کی سرگرم کارکن تھیں۔ پھر لیاقت علی خان اور ان کی بیگم جماعت کا ہدفِ تنقید تھے۔ ان کے لیے بھی عورتوں کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس فضا میں مجھے ہمت نہیں ہو رہی تھی، کہ گھر میں ایسی بات کروں یا ان سے کوئی مدد لوں کہ مجھے جماعت اسلامی کے دفتر پہنچنا ہے۔

گھر کے مسائل

ادھر یہ حالات یہ تھے کہ ہم خانماں برباد بھوپال چھوڑ کر کراچی جیسے وسیع و عریض شہر میں آ بسے تھے۔ کہاں بھوپال کی زندگی، جس کی محدود دنیا میں گویا بادشاہت تھی ـــــ اپنا گھر تھا، اپنا کمرہ تھا، اور لوگ بھی جاننے والے تھے۔ جہاں چاہتے، پیدل چلے جاتے تھے۔ کہاں بھوپال کی پُرسہولت زندگی اور کہاں کراچی کی زندگی کا یہ دور، کہ ایک بڑے سے کمرے میں ہم تقریباً ۱۰، ۱۲ افراد تھے۔ سامنے ایک برآمدہ تھا۔ کھانا بھی اپنے میزبانوں کے ساتھ کھانا ہوتا تھا۔ یہ امور ذہن کے لیے ایک بہت بڑا بوجھ تھے۔

اس لیے کراچی جاتے ہی مکان کی تلاش شروع ہوگئی تھی تاکہ ہم وہاں منتقل ہوجائیں۔ مگر اس میں کوئی کامیابی نہیں ہورہی تھی۔ کراچی میں بے شمار مہاجرین آئے ہوئے تھے، اور ہمارے آنے سے پہلے لوگ سب اچھی اچھی جگہوں پر قبضہ کرچکے تھے، یا خرید چکے تھے۔ ماموں انتہائی دیانت دار آدمی تھے۔ بہن کے لیے بھی وہ اپنا اثر ورسوخ اور اپنی حیثیت کو استعمال کریں، اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ممانی تلاش کرتی رہتی تھیں، تاکہ ہمیں کوئی ٹھکانہ ملے جہاں منتقل ہوجائیں۔ گھر کے یہ پریشان کن حالات تھے، جہاں نہ پڑھنے کا گوشۂ عافیت تھا، نہ لکھنے کی جگہ تھی اور نہ خلوت نشینی کا کوئی موقع تھا۔

تعلیم کا مسئلہ

پھر میری تعلیم کا معاملہ بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر نومبر ۴۸ء کے دوسرے ہفتے میں ڈی جے کالج میں، سیکنڈ ایئر سائنس میں داخلہ لے لیا۔ پہلے روز ہی مجھے کچھ پریشان حال دیکھ کر، ایک خوب رُو لڑکے نے حوصلہ سا دینے کے انداز میں مجھ سے میرا نام پوچھا۔ اور پھر بڑے سلجھے انداز سے اپنا نام بتایا 'مرغوب احمد'۔ مرغوب پھر آخری وقت تک میرے جگری دوست رہے۔

یہاں پر درسی نصاب مختلف تھا اور اساتذہ مختلف تھے۔ یہاں سندھی پڑھنا لازمی تھا اور اس کا امتحان بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح بھوپال میں اُردو پڑھنا لازمی نہیں تھی، مگر یہاں لازمی

تھی۔ یہاں پر اسلامیات بھی لازمی تھی، وہاں نہیں تھی۔ چونکہ بھوپال میں چھوٹا سا کالج تھا، اس لیے سب اساتذہ سے ذاتی ربط تھا۔ اپنے کالج میں، مَیں ہی فرسٹ کلاس فرسٹ اسٹوڈنٹ تھا، اس اعتبار سے قدر تھی، اور رہنمائی اور تدریسی معاونت بھی حاصل تھی۔ اس کے برعکس یہاں پر ڈیڑھ دوسو طلبہ کی کلاس ہوتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون شاگرد ہیں اور کون استاد۔ کلاس میں حسبِ عادت کوئی دوست نہ تھے۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی، اس لیے فریئر گارڈن سے، جہاں اس وقت قیام تھا، ڈی جے کالج تک پیدل ہی جانا ہوتا تھا۔

بھائی کا انتقال

مجھ سے بڑے بھائی خالد محمود ایک عرصے سے بیمار تھے اور اسی بیماری کے عالم میں وہ کراچی پہنچ گئے تھے۔ ماموں کے ہاں وہ بسترِ علالت پر پڑے تھے، انھیں مسلسل بخار رہتا تھا۔ ہم کو یہاں پہنچ کر معلوم ہوا تھا کہ انھیں آنتوں کی دق ہے اور مرض جس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، اس وقت اس کا کوئی علاج نہیں۔ وہ کچھ عرصہ ہسپتال میں بھی رہے۔ انھی دنوں نئے اینٹی بائیوٹک انجکشن آئے تھے، وہ بھی ان کے اُوپر آزمائے گئے، لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ جنوری ۴۹ء کی کسی تاریخ کو عین جوانی کے عالم میں ان کا انتقال ہوگیا، انا للّٰہ وانا الیہ رٰجعون۔

خالد بھائی کی تعزیت کرنے چودھری محمد علی، ملک غلام محمد اور دوسرے اکابرین آئے۔ اسی طرح بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری خواتین بھی ماموں کے گھر آئیں۔ جنازہ انھی کے گھر سے اُٹھا تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ ماموں کے تعلق کی وجہ سے آئے تھے۔

اس رحلت نے ہمارے دلوں پر غم اور افسردگی کی ایک زبردست کیفیت پیدا کر دی تھی۔ لیکن گھر کے دینی ماحول اور خود اماں کی جانب سے حوصلہ دینے اور اللہ سے لو لگانے کی ہدایت نے اس سوگوار ماحول کو سنبھالا دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ حالانکہ اماں خود ان دنوں بیمار رہتی تھیں۔

۳

جمعیت سے وابستگی اور سفر شوق

کراچی میں چاروں طرف خانماں بربادی کے مناظر تھے۔ لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے تھے۔ بے بسی اور بے چارگی کا سماں تھا۔ ریاست کے کارپردازوں کے پاس وسائل کی قلت اور افراد کی شدید کمی نے ماحول کو اور زیادہ افسردہ بنا رکھا تھا۔ یہ سوچتا تھا کہ ان حالات میں تو بہتری آ ہی جائے گی، مگر جس قافلے سے وابستگی اختیار کر کے بھوپال سے چلا تھا، اس کے مرکز ابھی تک نہیں پہنچا۔ مولانا مودودی کی گرفتاری نے ویسے بھی ایک طرح کا ردعمل پیدا کر رکھا تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ ہم سفروں سے ملوں اور اگلی راہوں پر سفر کے لیے نکلوں۔

جماعت کے دفتر میں

گھر اور مستقبل کے مختلف مسائل ذہن پر طاری تھے، اسی کیفیت میں دو ڈھائی ماہ گزر گئے۔ آخرکار ایک دن فریئر گارڈن سے وکٹوریہ روڈ اور وہاں سے چلتا ہوا آرام باغ روڈ پر ۹ لوٹیا بلڈنگ کے دروازے تک چلا گیا۔

اس دفتر میں قدم رکھتے وقت اپنے مسرت بھرے احساسات کی تفصیلات بیان کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں پر کافی لوگ جمع تھے۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ اس وقت مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، جس میں 'قرارداد مقاصد' کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ ''لیاقت علی خان صاحب اسمبلی میں جو قرارداد پیش کرنے والے ہیں، جماعت اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ اور یہ کہ اس قرارداد میں

جماعت کا مطالبہ کس حد تک پورا ہوتا ہے یا پورا نہیں ہوتا؟ اس تناظر میں جماعت اس کو قبول کرلے یا مسترد کردے؟'' میں کمرے میں داخل ہوا، تو مجلس میں بیٹھے ہوئے دو بزرگوں کے درمیان شدید، بلکہ تلخ بحث ہورہی تھی۔

ایک بزرگ منحنی سے تھے، قدرے سانولا رنگ، سفید سیاہ داڑھی تھی، ان کے سر پر صافہ نما رومال بندھا ہوا تھا اور وہ زیادہ جوش وخروش کے ساتھ بول رہے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ''قرارداد مقاصد کا جو مسودہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ کسی طرح بھی ہمارے بنیادی مطالبات کے مطابق نہیں ہے۔ ہماری طرف سے اس کو مان لینا دراصل اپنے مطالبے سے دست بردار ہونے اور اپنے موقف کی خلاف ورزی کرنے کے مترادف ہوگا''۔

ان کے برعکس ایک دراز قامت اور وجیہہ شخصیت کے مالک بزرگ تھے، گورا رنگ، داڑھی سیاہ اور ٹوپی پہنے ہوئے۔ وہ بڑے تحمل اور اطمینان کے ساتھ مسکرا مسکرا کر ان کو جواب دے رہے تھے، اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ''بلاشبہہ ہمارا مطالبہ مکمل طور پر تو نہیں مانا گیا، لیکن بہرحال اس میں ہمارے مطالبے کی روح آ گئی ہے''۔ اور شاید انھوں نے یہ ذکر بھی کیا کہ مولانا مودودی نے بھی اس قرارداد کو دیکھ لیا ہے اور کچھ ذہنی تحفظات رکھنے کے باوجود وہ اس سے اتفاق کرتے ہیں''۔ یہ بحث وہاں جاری تھی، جسے میں نے بیٹھ کر کسی حد تک سنا۔

جمعیت کا پتا

چودھری غلام محمد صاحب بھی ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ بڑی خوشی اور گرم جوشی سے وہاں پر موجود لوگوں سے ملوایا۔ ان سب کے نام مجھے یاد نہیں۔

مولانا مودودی کی گرفتاری کی وجہ سے عبدالجبار غازی صاحب اس وقت قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان تھے۔ ان سے وہاں ملاقات ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد چودھری

صاحب نے مجھے بتایا کہ ''یہاں پر اسلامی جمعیت طلبہ کے نام سے طلبہ کی تنظیم بن چکی ہے۔ اس لیے جو بھی طلبہ تحریک کی دعوت سے متاثر ہو کر آئیں، ہم ان سے یہی کہتے ہیں کہ وہ جماعت کے بجائے اس کے ساتھ مل کر کام کریں۔ یہاں پر ان کا اپنا نظم موجود ہے''۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: ''میں آپ کی ملاقات اسلامیہ کالج کے طالب علم ظفر اسحاق انصاری صاحب سے کرادوں گا۔ وہ آپ کو دوسرے طالب علم دوستوں سے ملوادیں گے''۔

محبت کی دنیا میں

مجھے صحیح طرح یاد نہیں کہ ظفر اسحاق سے پہلی ملاقات کس طرح ہوئی، بہرحال دو تین روز بعد ان سے پہلی ملاقات ہوگئی۔ پھر جس طرح وہ محبت کرنے والے اور دوست نواز انسان ہیں، فوراً ہی ان سے ایسا تعلق استوار ہوگیا، کہ آج ۶۷ سال گزرنے کے بعد بھی وہ اسی طرح قائم و دائم ہے اور روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ وہ سائیکل پکڑے ہوئے تھے اور میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ یہ جگہ بعد میں ۱۲/۱۸ بندر روڈ کے نام سے ہمارے لیے بڑی معروف جگہ بن گئی۔ یہاں کچھ عرصے کے لیے جمعیت کا مرکز بھی بنا۔

ظفر اسحاق نے اپنے والد محترم مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے بھی ملاقات کرائی۔ پھر ان کے ہاں آنا جانا ہوگیا۔ ظفر اسحاق نے باتوں ہی باتوں میں مجھے یہ بھی بتایا کہ ''تمھارے ماموں کے بڑے لڑکے ساجد اکرم اسلامیہ کالج میں میرے کلاس فیلو ہیں۔ وہ بھی جمعیت کی دعوت سے کافی متاثر ہیں''۔ یہ معلوم کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی، کہ گھر اور خاندان میں اس معاملے میں میرے ایک ہمدرد موجود ہیں۔

پھر انھوں نے بتایا کہ ''ڈی جے کالج میں پروفیسر جلیل الدین خان صاحب بھی جماعت کے ہمدرد ہیں''۔ اس وقت کراچی جمعیت کے ناظم عشرت علی نجمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء کے وسط میں اچانک جمعیت کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ترک کر دیا، اور پھر کبھی جمعیت

کے کسی پروگرام میں نہ آئے۔ وہ بھی ڈی جے کالج کے ہی طالب علم تھے۔

مولانا انصاری سے ملاقات

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے ملاقات میری زندگی میں ایک بڑا قیمتی اضافہ تھا۔ بندر روڈ پر واقع، ان کے گھر میں ہمارے بہت سے شب و روز گزرے، ہم ان سے بہت بے تکلفی سے بڑے بڑے مسائل پر بات کیا کرتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جو کچھ سیکھا، اس میں شعوری طور پر بھی مولانا انصاری صاحب کی صحبت اور ان کی تعلیم کا اثر رہا ہے۔ البتہ یہ نشان دہی کرنا مشکل ہے کہ کون سی چیز ان سے حاصل کی۔ بعد میں کئی امور میں مجھے ان سے اختلاف بھی رہا ہے، مگر ان کی شفقت، ہمدردی، وسعتِ نظر، دُور اندیشی اور قوم کا درد، ان کی شخصیت کا بڑا قابلِ قدر پہلو تھا۔

وہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے سیکرٹری [۵۴-۱۹۴۹ء] بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ بورڈ کے لیے جو رپورٹیں مرتب کرتے تھے، وہ confidential (بہ صیغہ راز) ہوتی تھیں۔ ظفر اسحاق انصاری اور میں، مل کر ان رپورٹوں کو پڑھ لیا کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع صاحب [م: ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء] اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی اس بورڈ کے رکن تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی [م: ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء] اور مولانا مودودی سے بھی انصاری صاحب کے تعلقات تھے۔ مولانا مودودی کی رہائی کے لیے وہ برابر کوشش کرتے رہتے تھے۔

کراچی کے کالج میں

ادھر ڈی جے کالج میں پروفیسر جلیل الدین احمد خان صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ انھوں نے رضا کارانہ طور پر اپنے ذمے دینیات کا پرچہ بھی لے رکھا تھا۔ بلکہ وہ انگریزی میں بھی دینیات ہی زیادہ پڑھاتے تھے! وہ بہت اچھے مقرر تھے۔ دینی اور مغربی علوم میں ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ تہذیبی، سماجی، تاریخی اور دیگر اجتماعی مسائل پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی۔

اس لیے وہ دینی علوم بھی خوب پڑھاتے تھے۔ ان کی انگریزی سمجھ میں آتی تھی اور اُردو بھی۔ دونوں زبانیں اچھی بولتے تھے۔ مدلل، ٹھوس اور بڑے جذباتی لیکچر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ دوسری بڑی شخصیت تھی جن سے اس زمانے میں تعارف ہوا۔

جو کچھ میں نے خود حاصل کیا، اس کے اندر، بلکہ کراچی جمعیت کو بنانے میں بھی پروفیسر جلیل الدین احمد صاحب کا بڑا قابلِ قدر اور نا قابلِ فراموش کردار رہا ہے۔ شروع میں وہ ہمارے جمعیت کے ہر اجتماع میں آتے تھے۔ وہاں پر مسلسل گفتگوئیں کرتے تھے۔ راتوں کو ان کے ساتھ لمبی لمبی نشستیں ہوتی تھیں۔ جب تک ہم لوگوں میں صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اعتماد سے پروگرام کر سکیں، اس وقت تک ہمارے اجتماعات میں وہی پروگرام کیا کرتے تھے۔

قومی قیادت، چند آوازیں

پہلے بتا چکا ہوں، کہ ماموں کے ہاں جب ہم قیام پذیر تھے ملک غلام محمد صاحب [جو بعد میں اکتوبر ۵۱ء تا اکتوبر ۵۵ء گورنر جنرل رہے] اور چودھری محمد علی صاحب [م: یکم دسمبر ۱۹۸۰ء] جو بعد میں چوتھے وزیراعظم بنے، ان دنوں سیکرٹری جنرل مرکزی حکومت پاکستان تھے۔ ماموں کے گہرے دوست تھے۔ اس طرح ماموں کا گھر ان لوگوں کا بھی مرکز تھا، جو مسلم لیگ اور حکومت کے اندر اسلام کے لیے کوشاں تھے۔ ان ناموں میں سے مجھے خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر عمر حیات ملک [م: ۲۸ مئی ۱۹۸۲ء] کا نام یاد ہے، جو پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ وہ پہلی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے اور اکثر ماموں کے ہاں شام کو آیا کرتے تھے۔ محفل جما کرتی تھی اور قومی اُمور پر باتیں ہوتی تھیں۔

میں کیونکہ اس وقت بہت چھوٹا تھا اور ویسے بھی شرمیلی طبیعت راہ میں حائل تھی، اس لیے ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جا کر ان مجلسوں میں بیٹھوں۔ شاید ان گفتگوؤں میں میرا شریک ہونا پسند بھی نہ کیا جاتا۔ لیکن بہرحال گھر میں رہتے ہوئے میرے کانوں میں یہ باتیں پڑتی رہتی تھیں: ''ریاست کے اسلام سے تعلق کی مخالفت ہو رہی ہے'' ایک روز یہ سنا کہ

''سیکولر عناصر بڑے سخت مخالف ہیں''۔ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے لیاقت علی خاں سے کہہ دیا ہے، کہ اگر آپ نے ریاست کے اسلامی ہونے کی قرارداد کو پاس نہیں کیا، تو پھر میں عوام میں جا کر کہہ دوں گا، کہ ہم نے عوام سے اسلام کے حوالے سے جتنے وعدے کیے تھے، وہ سارے وعدے جھوٹ تھے''۔

پاکستان کے معروف صحافی زیڈ اے سلہری صاحب [م: ۲۱ اپریل ۱۹۹۹ء] سے میری پہلی ملاقات وہیں پر ہوئی تھیں۔ سلہری صاحب اس دور میں بھی جماعت اور مولانا مودودی کے بڑے سخت مخالف تھے۔ وہ ماموں کے دوست تھے اور ملنے کے لیے باقاعدہ آتے تھے۔ محمد اسد صاحب [م: فروری ۱۹۹۲ء]، روڈ ٹو مکہ، اسلام ایٹ دی کراس روڈز کے مصنف، بھی وہاں آیا کرتے تھے۔ ماموں سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ان لوگوں سے میری سرسری سی سلام دعا ہوتی البتہ کبھی کوئی باقاعدہ گفتگو، ربط یا ذاتی تعلق استوار نہیں ہوا۔

جمعیت میں سرگرمیاں

پروفیسر جلیل الدین صاحب کی معرفت ہی خورشید بھائی کے بڑے بھائی ضمیر احمد صاحب سے میرا ربط قائم ہوا، البتہ خورشید بھائی سے کچھ عرصہ کے بعد تعارف ہوا۔ ضمیر بھائی ہمارے کلاس فیلو بھی تھے، ان سے یہ تعلق گہری دوستی میں بدل گیا۔ ہمارا اجتماع بڑے عرصے تک، فریئر روڈ پر انھی کے چھوٹے سے فلیٹ میں ہوتا تھا۔ یہ فلیٹ بھی جمعیت کی سرگرمیوں کا بڑا مرکز رہا۔ کالج یہاں سے قریب تھا۔ چھٹی ہوتے ہی ہم لوگ وہاں جمع ہوتے، وہیں کھانا کھاتے اور بہت سا وقت گزارتے تھے۔

حکومت کیونکہ جماعت اسلامی کی مخالف تھی، اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کالج کی انتظامیہ ہم کو برداشت کرتی۔ پھر اس وقت تک ہم ابھی سیٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہمارا حلقہ اتنا چھوٹا تھا، جس سے ہم خود پریشان تھے۔ ڈی جے کالج کے لان میں بیٹھ کر

اجتماع کرلیا کرتے تھے، لیکن یہ نہیں سوچتے تھے کہ کالجوں میں ذرا آگے بڑھ کے کام کریں۔ بس تھوڑا بہت دعوتی کام جاری تھا۔

اس پورے زمانے میں اگرچہ ساتھیوں سے باہم ربط بھی رہا، جمعیت کے اجتماعات میں شرکت بھی رہی۔ لیکن بعد کے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا، کہ یہ تعلق بس گنڈے دار قسم کا تعلق تھا۔ معمولی معمولی عذر اجتماعات سے غیر حاضری کا باعث بن جایا کرتے تھے۔ اس کلچر میں، میں بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ البتہ دوستیاں پکی ہوتی جارہی تھیں، خاص طور پر ظفر اسحاق سے جن کو ہم ''راجہ'' کہا کرتے تھے۔ ان کے والد بھی انھیں پیار سے راجہ ہی کہتے تھے۔ راجہ سے ہماری بہت گہری دوستی تھی۔

ادھر ہمارے لیے مکان کی تلاش جاری تھی۔ ہماری ممانی نے بڑی کوشش کر کے گاندھی گارڈن کے قریب ہی ہمارے لیے کسی کوٹھی میں تین کمروں پر مشتمل ایک آؤٹ ہاؤس حاصل کرلیا۔ یہ آؤٹ ہاؤس محمد امین صاحب کا تھا۔ انھوں نے بعد میں مشرقی پاکستان میں امین جیوٹ مل بنائی تھی۔ ہم پر بعد میں یہ انکشاف ہوا، کہ محمد امین صاحب ہمارے خواجہ محبوب الٰہی کے نانا تھے۔ ان دنوں خواجہ محبوب الٰہی ڈھاکہ جمعیت کے غالباً ناظم تھے۔ امین صاحب نے مکان شاید اس لیے دیا تھا کہ میری والدہ، اسٹیٹ بنک کے گورنر کی بہن ہیں اور ہم ان کے بھانجے۔ بعد میں جب ان کی توقعات، وہ جو بھی ہوں، پوری نہیں ہوئیں تو پھر ان کا رویّہ مخالفانہ ہوگیا۔ کیونکہ یہ بات پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ماموں بہت دیانت دار آدمی تھے۔ ان کی جانب سے کسی قسم کی بے جا رُو رعایت لینا یا کسی قسم کے مفاد حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

گاندھی گارڈن میں خاندان منتقل ہوا تو اطمینان ہوا۔ انٹر کے بعد ہمارا یہیں وقت گزرا۔ جب امتحان کا نتیجہ آیا تو انٹر سائنس میں میری تھرڈ ڈویژن تھی۔ حالانکہ میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ جن حالات کا تذکرہ کر چکا ہوں، اسی حالت میں، میں نے امتحان دیا تھا، اور ان حالات میں ویسے بھی کوئی بہت زیادہ توقع نہیں تھی۔ اس نتیجے کے بعد اب ایک

مسئلہ یہاں میرے سامنے اپنے معاشی کیریئر کا تھا۔ یہ ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کا تعلق بعد میں تحریک سے بھی بنا۔

انجینیرنگ کی طرف

بھوپال میں میٹرک پاس کر کے میری یہ خواہش تھی کہ دنیوی تعلیم کے بجائے دینی علوم میں تخصص حاصل کروں۔ مگر بعد میں جب اہلِ خانہ نے زور دیا تو میں نے انجینیرنگ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب بھی سول انجینیر تھے۔ والدین جس پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں، عموماً بچوں میں وہی بننے کا شوق ہوتا ہے۔ البتہ والد صاحب کے پاس انجینیرنگ کی ڈگری نہیں تھی، ڈپلومہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ڈگری حاصل کروں۔

جب کراچی میں آیا، اور جمعیت سے باقاعدہ تعلق ہوا تو پھر اس عرصے میں مجھے یہ خیال گزرا کہ انجینیر بننے کے بعد جہاں بھی جاؤں گا، رشوت کا چکر ہوگا، یا پھر گورنمنٹ کی ملازمت ہوگی۔ اس طرح عملی زندگی میں جماعت کے ساتھ کام کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس لیے پاکستان میں آنے کے چند ماہ بعد، انجینیرنگ سے میری دل چسپی دوبارہ ہٹ چکی تھی۔ ویسے بھی اپنے فطری رجحان کے باعث قرآن، حدیث، سیرت، دینی کتابوں اور عمومی مطالعے سے شغف تھا۔ اسی ذہنی کیفیت میں انجینیرنگ کی خشک کتابیں پڑھنے سے زیادہ دل چسپی اور لگن پیدا نہیں ہوتی تھی۔

اس وقت یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ شوگر ٹکنالوجی کو اختیار کرلوں۔ اس زمانے میں پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن نئی نئی بنی تھی۔ چینی اور کپڑے کے کارخانے کھل رہے تھے، جب کہ سول انجینیرنگ ڈیپارٹمنٹ کی شہرت رشوت سے منسوب تھی۔ اس سے بچنے کی یہ ایک سبیل تھی، کہ جس میں حلال روزی کا امکان تھا۔

جواں بخت میرے خالہ زاد بھائی تھے جنھوں نے اسی سال این ای ڈی انجینیرنگ کالج، کراچی سے گریجویشن (BE) کی تھی۔ ان کا میدان کیمیکل انجینیرنگ تھا۔ پہلے کورسز

وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے پڑھ کر آئے تھے۔ یہاں آ کر انھوں نے صرف فائنل کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس میں پاس ہوئے۔ اسی بنیاد پر این ای ڈی کالج میں لیکچرر ہو گئے۔

محترمہ نیر بانو صاحبہ، جماعت اسلامی پاکستان کے حلقہ خواتین پاکستان کی قیمہ بھی رہی ہیں۔ وہ میری حقیقی خالہ زاد بہن ہیں۔ ابتدائی زمانے میں میری والدہ اور بہنیں جماعت سے متعلق تو ہوئیں، مگر وہ جماعت سے باقاعدہ تعلق نہیں رکھ سکیں، کیونکہ ہمارے والد صاحب کا ان پر شدید دباؤ تھا۔ البتہ ان کے برعکس نیر بانو صاحبہ پر تحریک سے تعلق رکھنے کے حوالے سے ایسا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ اسی زمانے میں نیر بانو صاحبہ کی چھوٹی بہن کی شادی جماعت اسلامی کے شعبہ تنظیم کے پہلے ناظم قمرالدین خاں صاحب سے ہوئی تھی۔ جواں بخت، نیر بانو صاحبہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی پرورش میرے ماموں کے ہاں ہوئی تھی، ان کی والدہ یعنی میری خالہ کا انتقال ۳۷ء، ۳۸ء میں ہو گیا تھا۔ پاکستان کے سابق ٹیسٹ کرکٹر اور میڈیم فاسٹ باؤلر سکندر بخت انھی جواں بخت کے بیٹے ہیں____

بہرحال انٹر سائنس کا نتیجہ آیا، جواں بخت نے اس مایوس کن صورت حال میں میرا ہاتھ پکڑا، کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا اور لے جا کر این ای ڈی انجینیرنگ کالج کے سول انجینیرنگ ڈیپارٹمنٹ میں داخل کرا دیا۔ یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ اس زمانے میں تھرڈ کلاس کو بھی داخلہ مل گیا اور اب تو فرسٹ کلاس حاصل کرنے کے بعد بھی داخلہ نہیں ملتا۔ لیکن میرے خیال میں ۱۹۴۹ء کے اس بیچ میں فرسٹ کلاس شاید کسی ایک کی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ سب لوگ خانماں برباد ہو کر بھارت سے آئے تھے اور اس وقت بحالی کے دشوار مرحلے سے گزر رہے تھے۔

انجینیرنگ کالج میں بھی بھائی ضمیر احمد میرے ساتھ تھے۔ یہاں آتے ہی سرگرمی کے ساتھ ہم نے کچھ ہم خیال ساتھی تلاش کیے۔ جن میں ایک قاضی محمد انوارالحق تھے۔ جب وہ ہمارے ساتھ ملے تو پھر ان کے گھر کے اور لوگ بھی جمعیت کے ساتھ آ گئے۔

کراچی جمعیت کی نظامت

اس دوران ضمیر احمد کراچی جمعیت کے ناظم منتخب ہوگئے۔ وہی جمعیت کے اجتماعات منعقد کیا کرتے تھے۔ انھی اجتماعات میں سے کسی اجتماع میں ان کے چھوٹے بھائی خورشید بھی آئے۔ ان سے ہمارا تعارف ہوا۔ پھر یہ تعلق بڑی جلد استوار ہوکر بڑھتا رہا۔ ان کے گھر پر اجتماع ہوتا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے، گھر کے حالات کی وجہ سے اب تک میرا یہ تعلق کچھ زیادہ یکسوئی یا جوش وخروش پر مبنی نہیں تھا، البتہ تھوڑا بہت کام ضرور ہو رہا تھا۔

پھر اچانک ایک دن ضمیر احمد بھائی نے یہ خبر سنائی کہ ''میں تو انگلینڈ جا رہا ہوں، کیونکہ مجھے پاکستان نیوی میں کمیشن مل گیا ہے۔ وہاں چار سال کی ٹریننگ ہے۔ اسی لیے انجینیر نگ بھی چھوڑ رہا ہوں اور جمعیت بھی۔ اب آپ لوگ یہ کام سنبھالیں، میں تو چلا''۔

اس موقع پر ارکان نے مجھے کراچی جمعیت کا ناظم منتخب کرلیا۔ مجھے اس وقت بھی اس کی خواہش نہیں تھی کہ ناظم بنوں، اور اللہ کے فضل سے آج تک کسی عہدے کی خواہش نہیں رہی۔ بلاشبہہ بعض جگہ میں نے یہ ضرور سوچا کہ فلاں کام چلا سکتا ہوں۔ بہرحال نظامت سنبھالتے وقت ایک خوف تھا، ویسے بھی نسبتاً جمعیت میں احساس ذمہ داری بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔ تحریک کے ساتھ تعلق، اور میری تشکیل ذات میں، اس احساس ذمہ داری کا بڑا دخل رہا ہے۔

جو دوست میرے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں، تحسین کرتے ہیں اور پھر مختلف ذمہ داریاں بھی سونپ دیتے ہیں۔ اس بارے میں، میں نے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا کہ ان کے حسنِ ظن کے اظہار کو تو میں نہیں روک سکتا۔ میرے اللہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں، لیکن تو مجھے ایسا بنا دے اور لوگوں کے حسنِ ظن کو صحیح ثابت کردے، اور وہ خوبیاں پیدا کردے جو میرے اندر موجود نہیں ہیں، مگر لوگ سمجھ رہے ہیں کہ موجود ہیں۔

نظامت میں پہلا قدم

جب ناظم منتخب ہوا تو ایسے لگا، جیسے میرے اُوپر ذمہ داریوں کا پہاڑ آ گیا ہو۔ میری لیت ولعل کی روش ختم ہوئی، اور سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ یہ کام جس طرح چل رہا ہے، اس سے زیادہ بہتر انداز سے چلنا اور بڑھنا چاہیے۔ چنانچہ اس سوچ کے ساتھ وہ پہلی ذمہ داری ہی بہت بڑی ذمہ داری بن گئی تھی۔

کام بڑھانے کے لیے، میں نے سب سے پہلی بات یہ سوچی کہ ہم کو بیٹھ کر منصوبہ بنانا ہے: ہماری افرادی قوت کتنی ہے؟ وسائل کتنے ہیں؟ حالات کیسے ہیں؟ ان حالات میں ہم کیا کریں؟ اور کیسے کریں؟___ اس سے پہلے جمعیت کے کام کو بڑھانے کے لیے غالباً منصوبہ بندی نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال یہ منصوبہ بنانا شروع کیا، جس میں غالباً سائنس کی تعلیم کو بھی عمل دخل ہوگا۔

اس مقصد کے لیے ایک سوال نامہ جاری کیا۔ سوال نامے کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ جس وقت یہ پہلی ذمہ داری پڑی تھی، تب بھی میں نے پہلا کام یہی سوال نامے کا کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کام کرنے والے سارے لوگوں سے مشورہ کر کے ہی آگے بڑھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھی جہاں کہیں میرے سر پہ کوئی ذمہ داری آئی، ڈھاکہ جماعت کی امارت یا لاہور جماعت کی ذمہ داری یا مرکز میں ذمہ داریاں (مثلاً منصوبہ بنانے کا کام)۔ میں نے، ان سب میں ہمیشہ یہی طریقہ اپنایا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وابستہ کیا جائے۔ ان میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ مشوروں اور فیصلوں میں وہ برابر کے شریک ہیں اور ان کی سوچ کی اہمیت بھی ہے۔

ذکر ہو رہا تھا کہ یہ جمعیت میں ایک نئی روایت تھی، تاہم یہ بات نہیں کہ یہ کوئی میرا کارنامہ تھا، بلکہ اس میں ہم سب دوست شریک تھے۔ گاندھی گارڈن میرے کمرے میں یہ نشست ہوئی تھی۔ اس میں ظفر اسحاق، خورشید احمد، قاضی انوارالحق، عبداللہ جعفر اور محمد زبیر فاروقی شریک تھے۔ ہم نے ایک منصوبہ بنایا، پھر اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔

اس منصوبے میں ہمارا اصل زور توسیع دعوت پر تھا۔ اگرچہ اب اس کی ساری تفصیلات یاد نہیں ہیں۔

اپنے مکان میں

جب ہم یہاں آئے تھے، اس وقت کراچی کی آبادی جمشید روڈ تک محدود تھی اور جیل پر ختم ہو جاتی تھی۔ جیل سے آگے پیر الٰہی بخش کالونی بن رہی تھی۔ پیر الٰہی بخش سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے مہاجروں کے لیے دو دو کمروں کے کوارٹر بنوائے تھے، جو شاید ساڑھے تین چار ہزار روپے میں حکومت دے رہی تھی۔ جب ہم نے پہلی بار اس کالونی کو جا کر دیکھا تو مسترد کر کے آ گئے، کہ ''اتنی دُور بیابان میں آ کر کہاں رہیں گے''۔ اندازہ نہیں تھا کہ کالونی کو اتنی مرکزی اہمیت حاصل ہو جائے گی اور مستقبل میں کراچی کتنا پھیلے گا۔

والد صاحب ان معاملات میں زیادہ جہاں دیدہ تھے۔ بھوپال میں فروخت شدہ گھر سے حاصل کردہ رقم دے کر انھوں نے دو کوارٹرز لے لیے۔ غالباً ان کا نمبر ۱۰۷۰، ۱۰۶۹ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مزید دو پلاٹ خرید لیے۔ یہ پلاٹ لیاری ندی کے کنارے پر واقع تھے۔ موسم برسات کے علاوہ یہ ندی سارا سال خشک رہتی تھی۔ میں فرسٹ ایئر انجینیرنگ میں پڑھتا تھا، جب پیر کالونی کے مکان میں ہم منتقل ہوئے۔

جمعیت کے کام کو بہتر بنانے کے لیے ہم نے جو پروگرام شروع کیے، ان میں اسٹڈی سرکل تھے، تربیت گاہیں تھیں اور توسیع دعوت کا کام بھی تھا۔

ابتدائی کاوشیں

ہمارا اجتماع ایک گھنٹے میں ختم ہو جاتا تھا، تاہم اس کے بعد جو اجتماع شروع ہوتا وہ دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔ سڑک پر کھڑے یا چلتے پھرتے بات چیت ہو رہی ہے، منصوبے بن رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تبادلۂ خیال ہو رہا ہے، ٹہل رہے ہیں۔

یوں لگتا تھا جیسے پوری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ یہ محبت، باہمی ایثار اور جوش، پاور ہاؤس کی طرح کام کر رہا تھا۔اس سے ہم خود بھی جذبہ پاتے تھے اور باہر سے لوگ بھی اس میں کھنچ کے آتے تھے۔

اس زمانے میں اس قدر کثرت سے لوگ قریب آئے، کہ اب نام بھی یاد نہیں ہیں۔ ان رفیقوں کے نام شمار کروں اور چھوٹے چھوٹے دل چسپ اور سبق آموز واقعات بیان کروں تو یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہو جائے گا۔ دراصل، یہ تربیت کے ساتھ ساتھ دعوت کے کام کے ثمرات تھے۔ ہم اس جستجو میں رہتے تھے کہ ذہین لڑکوں کو تلاش کریں اور ان کو جمعیت میں لائیں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں اس کے لیے باقاعدہ کوشش اس طرح شروع کی، کہ اخبار سے میٹرک کا نتیجہ دیکھ کر پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے رول نمبر نوٹ کیے۔ ان کے گھروں کے پتے تلاش کیے، پھر ان کے گھروں پر پہنچ کر انھیں مبارک باد دی۔ وسائل تو تھے نہیں، مگر اہتمام سے ان کو تحریکی کتب ہدیہ کیں۔

آج کے معروف صاحبِ علم، محقق اور ماہر معاشیات ڈاکٹر عمر چھاپرا نے اسی سال میٹرک میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی، یہ فریئر روڈ پر رہتے تھے۔ گھر کا پتا حاصل کیا، ان سے ملے، الحمدللہ یہ جمعیت میں آ گئے۔ پھر اس کے بعد بھی مسلسل تین چار سال تک جو لڑکے اوّل آتے رہے، جمعیت ان سے ملنے اور ان کو ساتھ ملانے کے لیے کوشاں رہی۔ اگلے برس جمیل احمد خان صاحب نے میٹرک میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ وہ بھی جمعیت میں آئے، کراچی جمعیت کے ناظم منتخب ہوئے اور اس کے بعد این ای ڈی انجینیرنگ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے ساتھی قافلۂ حق میں ہمارے ہم سفر بنے۔

دعوتی کام کے لیے ہم کالجوں میں جاتے، ہدف بنا کر کوشش کرتے کہ ہر لڑکے تک پہنچیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا، کہ جب کلاسوں میں جائیں تو ہاتھ میں تحریکی لٹریچر ہو۔ جس میں مولانا مودودی کا نام اور ان کی کتاب کا عنوان نمایاں ہو، تاکہ لوگ پوچھیں کہ یہ

کیا چیز ہے؟ پروفیسر جلیل الدین احمد خان صاحب ہمارے ساتھ برابر سرگرمِ کار تھے۔ ہماری تعلیم و تربیت کے لیے، ہمارے اجتماعات میں جلیل صاحب پروگرام پیش کرتے تھے۔

میں اس وقت تک کوئی چیز لکھ نہیں سکتا تھا اور تقریر کرنا تو میرے لیے بہت دُور کی چیز تھی۔ اگرچہ میٹرک کے دوران یہ محسوس کیا کرتا تھا، کہ تقریر کر سکتا ہوں۔ لیکن جب کھڑا ہوتا، پسینے چھوٹتے اور آواز لڑکھڑاتی۔ شروع شروع میں یہ کیا کہ لٹریچر سے نقل کر کے لے گیا اور پڑھ ڈالا۔ بھوپال میں بھی یہ تجربہ کیا تھا۔ لیکن اس دوران بھی یہ چاہتا تھا کہ خود لکھ کر لے جاؤں، مگر کوئی دوسرا ساتھی اس کو پڑھ دے۔ خورشید بھائی نے اس بات کا ذکر لمعاتِ زنداں کے مقدمے میں کیا ہے، کہ لکھ کے لائے تھے اور اصرار تھا کہ راجہ پڑھ لیں گے۔ منظور بھائی فقرے بھی چست کرتے تھے کہ مقرر بناؤ بگاڑ کیا نقل کر کے لائے ہیں۔ بہرحال یہ باتیں دل چسپی کے ساتھ ہوتی تھیں۔

تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد کے عرصے میں، ناظم اعلیٰ بننے تک یہ نہیں بتا سکتا کہ کون سی بات پہلے ہوئی، کون سی بعد میں۔ البتہ یہ بات ذہن میں محفوظ ہے کہ اسی عرصے کے دوران جمعیت نے میری صلاحیتوں کو اُبھارنا شروع کیا۔ اگرچہ ابھی باقاعدہ تقریر شروع نہیں کی تھی، لیکن تھوڑا تھوڑا بولنے لگا تھا۔ میری پہلی تقریر وہ تھی، جو اُردو کالج میں اساتذہ کے درمیان ہوئی تھی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ اساتذہ کے سامنے جمعیت کی دعوت پیش کی جائے۔ پروفیسر جلیل صاحب نے اس کی ہمت افزائی اور تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''سبحان اللہ، گونگے بولنے لگے ہیں'' ان کا جملہ اب بھی یاد ہے۔

اس دوران اسٹڈی سرکل کا باقاعدہ نصاب بنایا۔ اس میں ہم نے قرآن کا مطالعہ بھی شامل کیا۔ یہیں سے میرے باقاعدہ قرآن کے مطالعے کی ابتدا ہوئی۔ پہلے نصاب کے مطابق مجھے سورہ آل عمران کے آخری رکوع کا مطالعہ پیش کرنا تھا۔ یہ مطالعہ پیش کرنے کے لیے ذہن پر بڑا زبردست دباؤ تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے میں نے رکوع حفظ کیا۔ پھر غور و فکر اور تیاری کے لیے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی حقیقتِ دین، مولانا مودودی کی

کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ پڑھ ڈالی، حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

ہم نے اتفاق رائے سے یہ طریقہ اختیار کیا تھا، کہ ایک فرد پوری تیاری کے ساتھ مطالعہ پیش کرتا اور اس کے بعد باقی لوگ گفتگو کرتے جو اپنی جگہ مطالعہ کر کے آئے ہوتے تھے۔ اس تیاری اور بحث و مباحثہ سے ہمارے علم میں وسعت آتی رہی۔ ایک دوسرے کی علمی ترقی میں ہم سب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان نشستوں میں پروفیسر جلیل الدین احمد صاحب باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ جدید علوم کے موضوعات پر پروگرام خورشید بھائی کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مغربی فکر میں بغاوت کے حوالے سے خاص طور پر پروفیسر جوڈ ہمارے ہیرو تھے۔ ان کے بہت سے اقوال اور افکار، جلیل صاحب اور خورشید بھائی کو ازبر تھے۔ محترم جلیل الدین احمد خان صاحب کا انگریزی علوم میں وسیع مطالعہ ہمارے لیے بڑا مفید تھا۔

گاندھی گارڈن میں ہمارے گھر کے پیچھے والی بلڈنگ میں محمود اعظم فاروقی [م: اکتوبر ۱۹۹۷ء] صاحب رہتے تھے۔ کراچی میں جماعت کے جس فرد سے میرا سب سے پہلا اور بے تکلف ربط قائم ہوا، وہ فاروقی صاحب ہی تھے۔ اسی طرح وہاں پر بی اے شیخ صاحب، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن مقیم تھے۔ ان کے بیٹے نصیر اے شیخ صاحب سے ذاتی ربط قائم ہو گیا۔ انھوں نے ہمارے اجتماعات میں آنا شروع کیا۔ نصیر اے شیخ بعد میں پیپلز پارٹی کے بہت سرکردہ رکن بنے اور پھر ۱۹۹۳ء میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئر مین بنا دیے گئے۔

اسی دوران خورشید بھائی کے گھر کے قریب ہمارا رابطہ مولانا محمد طاسین صاحب [م: ۱۹۹۸ء] سے ہوا۔ وہ رباط العلوم کے لائبریرین تھے، جہاں ہم اکثر جاتے اور کتابیں پڑھتے تھے۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارے اپنے گھر میں ہر قسم کے رسالے اور کتابیں آتی تھیں، مگر مولانا مودودی سے گہری عقیدت کے باوجود یہ کبھی ذہن میں نہیں آیا کہ مولانا کے علاوہ

کسی اور کی چیز نہ پڑھیں، یا کسی اور سے استفادہ نہ کریں۔ اسی طرح خود مولانا مودودی بھی یہ نہیں چاہتے تھے، کہ تحریک کے کارکن بس انھی کی تحریروں پر انحصار کر کے بیٹھ جائیں، بلکہ مولانا محترم چاہتے تھے کہ کارکنوں میں وسیع مطالعہ کا ذوق پیدا ہو، اور اس بنیاد پر وہ تقابلی مطالعہ کر سکیں اور ان میں تجزیاتی نقطۂ نظر پیدا ہو۔

چنانچہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مطالعے کے باب میں شروع ہی سے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، اور اللہ کے فضل سے آج تک اس معاملے میں کسی قسم کی تنگ دلی، تنگ ظرفی یا کسی نوعیت کا تعصب پیدا نہیں ہوا۔ بعد میں جب مجھ پر ترجمان القرآن کی ذمہ داری پڑی تو یہ وسیع المشربی عام رفقا پر عیاں ہوئی۔ مختلف مکاتب فکر کے افراد، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جنھوں نے جماعت کی مخالفت کی، ان کی تحریریں بھی ترجمان میں شائع کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہوا۔ یہ حال میرا ہی نہیں تھا، بلکہ جمعیت میں میرے تمام قریبی رفقا مثلاً خورشید بھائی، ظفر اسحاق، منظور اور محمد عمر چھاپرا وغیرہ کا بھی یہی حال تھا۔ ہم لوگ ہر طرح کے رسالے پڑھتے تھے، کیوں کہ پڑھنے کا شوق تھا۔ قرآن کی مختلف تفسیروں کا مطالعہ کرتے، تلاش کر کے اچھی کتابیں پڑھتے اور ایک دوسرے سے کتابوں کا تبادلہ کرتے۔

سعید رمضان سے تعارف

یہاں پر ایک اور شخصیت کا ذکر بہت ضروری ہے جنھوں نے میری، میرے رفقا اور کراچی جمعیت کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ تھے سعید رمضان [م: اگست ۱۹۹۶ء] تاریخ تو مجھے یاد نہیں کہ ان سے کب تعارف ہوا، لیکن لگ بھگ یہی زمانہ تھا، جب ہم نے کراچی جمعیت کا کام شروع کیا۔ ان سے تعارف بھی مولانا ظفر احمد انصاری صاحب ہی کی معرفت ہوا۔

سعید رمضان سے ہمیں خاص دلی تعلق ہو گیا۔ ان کے ہاں بے تکلف آنا جانا، اور طویل گفتگوئیں کرنا ہمارا معمول بن گیا۔ حالانکہ کراچی جماعت کے قائدین کے ساتھ ہمارا ذاتی تعلق گہرا نہیں تھا۔ اگرچہ ہماری سوچ اور فکر جماعت ہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

میں نے تو ۴۸ء ہی میں مولانا مودودی کی تمام چھپی ہوئی چیزیں پڑھ لی تھیں اور اس کے بعد بھی مطالعہ برابر جاری تھا۔ لیکن اخوان المسلمون کے تجربات اور طریق کار کے بارے میں معلومات کا حصول ہمارے لیے ایک نئی چیز تھی، بلکہ یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ عمل ہمارے لیے بہت دل چسپ اور متاثر کن بھی تھا۔ مصر میں اخوان المسلمون پر دورِ ابتلا کا آغاز ہوگیا تھا۔ اسی لیے سعید رمضان کراچی میں پناہ گزین تھے۔

اسی زمانے میں ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو اخوان المسلمون کے مرشد عام حسن البنا کی شہادت ہوئی تھی۔ سعید رمضان میں تقریر کرنے کی خاص صلاحیت تھی۔ حالانکہ وہ عربی بولتے تھے اور ان کو انگریزی بہت کم آتی تھی۔ لیکن ان کی زبان میں مٹھاس، نگاہ میں چمک اور شخصیت میں ایسی کشش تھی، کہ نئے نئے لوگ ان سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے گرد ایک وسیع حلقہ قائم ہوگیا تھا۔ انھوں نے نہ کوئی نئی جماعت بنائی اور نہ ان کے ذہن میں کوئی ایسی بات تھی۔ مولانا مودودی، جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ سے وہ بڑی محبت رکھتے تھے۔

سعید رمضان ہماری تربیت، صرف اسی لیے کر رہے تھے کہ تحریک اسلامی کے کام آئے۔ یہ پروگرام ہمارے تربیتی نظام میں داخل ہوئے۔ کراچی جمعیت، کارکنوں میں باہمی محبت کے حوالے سے بہترین نمونہ تھی۔ اسی طرح تعلق باللہ میں بھی وہ بہتر نمونہ پیش کرتی تھی۔ اجتماعی پروگراموں میں قیام اللیل، شب بیداری اور نوافل کے اہتمام کو ہمارے ہاں سعید رمضان نے متعارف کرایا۔

سعید رمضان کے ایما پر ہماری پہلی شب بیداری ظفر اسحاق کے گھر پر ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''سورۃ الانفال پوری یاد کرو''۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ پھر انھوں نے درسِ قرآن دیا۔ شب بیداری میں ہم عموماً ساری رات ہی جاگتے۔ اس لیے جاگتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کی تیاری ہو، اپنے ہم سفر دوستوں کے ساتھ بھی گفتگو کا موقع میسر آئے۔ کبھی شرکا کو سلانے کا اہتمام ہوتا، اس کے بعد اٹھایا جاتا تھا اور پھر نوافل کے بعد

مناجات اور دعا۔ ان چیزوں کا ہم کو اجتماعی طور پر روح پرور تجربہ ہوا، تو پھر ہم نے اسے جمعیت میں بھی اختیار کیا۔

جمعیت کی ان شب بیداریوں میں جماعت کے لوگ بھی آتے تھے۔ شیخ سلطان احمد صاحب نے الٰہی بخش کالونی کی جامع مسجد میں ہونے والی شب بیداری میں ہمیں نوافل پڑھائے تھے۔ تربیتی پروگراموں میں اسٹڈی سرکل، تربیت گاہیں اور شب بیداریاں مل کر ایسا محبت بھرا پاکیزہ ماحول بناتی تھیں کہ روحانی اور عملی سطح پر بڑی بالیدگی محسوس ہوتی تھی۔

ایک تربیتی پروگرام

کراچی سے دُور ایک جزیرہ سینڈپٹس ہے۔ ہماری پہلی دو روزہ تربیت گاہ وہاں پر ہوئی تھی۔ اس وقت میں ناظم کراچی تھا۔ وہاں پر ہم نے کچھ 'ہٹس' (huts) کرائے پر لی تھیں۔

اس اعتبار سے یہ ایک بڑی کامیاب تربیت گاہ تھی کہ پروگرام بھی نئے نئے تھے اور اسی لیے ان کا تاثر بھی زیادہ گہرا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتلا و آزمایش کے موضوع پر میرا پروگرام تھا۔ میں نے طائف کے واقعے کو مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب [م: ۵ جون ۱۹۵۶ء] کی کتاب النبیؐ الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کر کے پیش کیا تھا۔ اب بھی وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ بہت سے لڑکے آبدیدہ تھے۔ اس پروگرام میں قرآن، سیرت اور حدیث پر میرے پروگرام تھے۔

مغرب، جدید مسائل، معیشت اور سیاست کے موضوع پر خورشید بھائی نے تقاریر کی تھیں۔ اسی طرح منظور بھائی کے بھی پروگرام ہوئے۔ ساتھ ہی ہم نے اسپیکرز فورم (حلقہ مقررین) وغیرہ کے پروگرام بھی رکھے، جن میں کارکنوں کی تقریری صلاحیت بہتر بنانے کی تربیت دی جاتی تھی۔

کالج ہال میں

اگرچہ میں نے اب تھوڑا تھوڑا تقریر کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ ہمارا دعوتی اجتماع فریئر روڈ پر خورشید بھائی کے فلیٹ میں ہوتا تھا، جلد ہی ہم نے محسوس کیا کہ یہ جگہ تو بہت تنگ ہے۔ غالباً یہ ۱۹۴۹ء کے آخر یا ۵۰ء کے شروع کی بات ہے، جب اُردو کالج نیا نیا کھلا تھا۔ اُردو کالج میں بہت سے اساتذہ جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ اجتماع عام کے لیے ہم کو وہاں پر ایک بڑا کمرہ مل گیا، اور ہم نے وہاں پر اپنا اجتماع منتقل کر دیا۔ وہاں بھی لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس بڑھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ بہر حال لوگوں کی آمد میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ جگہ بھی ناکافی ہوگئی۔ اس زمانے میں منظور احمد، ایس ایم کالج میں پڑھا کرتے تھے اور وہ بہت نمایاں اور فعال رکن تھے، لیکن بعد میں یہ صورت نہ رہی۔ اسی طرح کالج میں محمد میاں صاحب بھی بڑے فعال رکن تھے۔

سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب [م: ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء] ۱۹۵۱ء میں ایس ایم کالج کے پرنسپل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کسی گورنمنٹ کالج میں کوئی پرنسپل جمعیت کو اجتماع کرنے کے لیے جگہ دے۔ مگر غلام مصطفیٰ شاہ صاحب نے ہمیں کالج کے لٹریچر ہال میں جمعیت کا اجتماع کرنے کی اجازت دے دی۔ ۲۵۰، ۳۰۰ لڑکے ہمارے اجتماع میں آتے تھے۔

خورشید بھائی بہت تیاری کے ساتھ تقریریں کرتے تھے۔ منظور بھی تیاری کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ میں نے بھی وہاں پر سیریز میں تقریریں کیں۔ مثلاً مجددین اُمت پر ایک سیریز تھی، جس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے شروع کر کے شاہ ولی اللہؒ اور پھر سید احمد شہیدؒ تک کا تذکرہ کیا تھا۔ اس تقریری سلسلے کے لیے گھنٹوں صرف کر کے بڑے مفصل نوٹس تیار کیے تھے۔ اس وقت کا یہ مطالعہ اور محنت مستقبل میں بہت کام آئی۔

دعوت کے بارے میں

دعوت کے کام کا کچھ ذکر پہلے بھی ہوا ہے۔ جس طرح اب ہم باقاعدہ طے کر کے اور لکھ کر منصوبے میں بیان کرتے ہیں کہ ''اس سال دعوت کو اوّلین اہمیت حاصل ہوگی'' لیکن اس کے باوجود عمل کی دنیا میں اسے وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ شاذونادر مثالوں سے اس مسئلے کی اہمیت کا جواب تلاش کرنا کارلاحاصل ہے۔ اس زمانے میں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے یہ بات لکھنی ضروری سمجھی ہو، یا دو اور دو چار کی طرح یہ فیصلہ کیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود ہماری سرگرمیوں میں دعوت کو لازمی، مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ حالانکہ ہمارا تربیتی پروگرام بھی کچھ کم پھیلا ہوا نہیں تھا۔

تربیتی پروگرام بہ کثرت ہوتے تھے، اچھے اور بڑے جامع پروگرام ہوتے تھے۔ یہ بڑے intensive اور sustained پروگرام تھے۔ جن میں تربیت گاہوں اور شب بیداریوں کو خاصی اہمیت دی جاتی تھی۔ ۵۱ء یا ۵۲ء میں لاہور میں ایک دس روزہ تربیت گاہ ہوئی۔ اسی طرح کراچی میں بھی کئی کئی روزہ تربیت گاہیں ہوتی تھیں، تاہم کراچی میں دعوت کا کام ہی مرکز ومحور اور مطلوب ومقصود تھا۔ یہ بات بغیر کسی دستاویز میں اعلان کے سبھی کارکنوں اور ذمہ داران کی فکرمندی کا عنوان ہوتی تھی، کہ طلبہ اور بطور خاص لائق طالب علموں کو جمعیت میں شامل کریں اور جذب کریں۔ کیونکہ یہ سب سے بڑا کام تھا اور ہے۔

اس زمانے ہمارے درمیان سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ جملہ بڑا مقبول اور اکثر بولا جاتا تھا: ''مچھلیوں کو پکڑنے والو، آؤ میں تمھیں انسانوں کو پکڑنے والا بنادوں''۔

کوشش یہ ہوتی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہم لوگوں تک پہنچ جائیں، ان کو منظّم کریں اور تربیت کریں۔ میں اُردو کالج اور پھر ایس ایم کالج کے بڑے اجتماعاتِ عام کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ رہایشی حلقوں کی بنیاد پر چھوٹے اجتماعاتِ عام اور تربیتی پروگراموں کا بھی بھرپور نظام قائم کرلیا تھا۔ رہایشی حلقہ جات کا یہ نظام سب سے پہلے

کراچی میں متعارف کرایا گیا اور آج بھی وہاں مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔

رہائشی حلقوں کا تجربہ

کراچی جمعیت نے جو کچھ حاصل کیا، جو کچھ اس نے ترقی کی، جو کچھ انسانی وسائل اس نے ذخیرہ کیے، اور جس طرح لوگوں کو جذب کیا، اس سب میں رہائشی حلقوں میں نظم کے قیام نے بڑا اہم حصہ ادا کیا ہے۔

کراچی کے کالج تو شہر کے ایک گوشے میں مرکوز تھے۔ آج کی طرح جگہ جگہ نہیں پھیلے ہوئے تھے اور آبادی پیر کالونی یا لالوکھیت پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ چونکہ وسائل اور ذرائع محدود تھے، سیاسی سرگرمیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں، اس لیے ہمارا زیادہ وقت محلوں میں گزرتا تھا۔ کراچی کی آبادی لاہور کی طرح موبائل نہیں تھی کہ دیہاتوں سے لوگ پڑھنے آ جائیں اور چھٹیوں میں واپس چلے جائیں، بلکہ طلبہ تعطیلات میں بھی وہیں رہتے تھے۔ ان حالات کا فطری تقاضا تھا کہ محلے پر توجہ مرکوز کریں۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ دعوت کا فطری میدان کالج نہیں، محلّہ ہے۔ یہ خیال رہائشی حلقہ جات میں نظم کے قیام کا باعث بنا۔ وہاں پر وہ تمام دعوتی اور تربیتی پروگرام ہوتے، جو مرکزی بنیاد پر بھی ہوا کرتے تھے۔

محلوں میں جگہ جگہ یہ کام منظّم ہو رہا تھا اور خاص طور پر تعطیلات اور رمضان المبارک کے زمانے میں اس کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ رمضان میں تقریباً روزانہ ہی پروگرام ہوتے تھے۔ اس زمانے میں آج کی طرح کی افطار پارٹیاں نہیں ہوتی تھیں، کہ لوگ آخری وقت بھاگم بھاگ آتے ہوں، یا ایک پکوڑا، ایک سموسہ اور ایک گلاس کے لیے آتے ہوں اور مقرر مشکل سے پانچ منٹ بول سکے۔

نہیں، اس کے مقابلے میں طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگ جن سے ربط ہے یا جن پہ دعوتی کام ہو رہا ہے، وہی بلائے جاتے۔ اہتمام کیا جاتا کہ وہ عصر کے وقت آ جائیں۔ عصر کے وقت قرآن کا کچھ مطالعہ ہوتا تھا، درس ہوتا، گفتگو ہوتی اور باہمی بات چیت بھی ہوتی تھی۔

افطار کے بعد عموماً کھانا نہیں ہوتا تھا۔نمازِ مغرب کے بعد لوگ گھروں کو جاتے تھے۔ یہ افطار کا اچھا پروگرام ہوتا تھا۔ایسی افطار پارٹیاں، تربیتی اور دعوتی دونوں لحاظ سے بڑی مؤثر اور مفید ہوتی تھیں۔ ان میں سے اکثر افطاریاں، چاکیواڑہ، لالوکھیت، ناظم آباد، برنس روڈ اور پیرکالونی میں ہوئیں، جہاں پر میں شریک ہوا، اور ساتھیوں سے گفتگوئیں ہوئیں۔ رمضان کے مہینے میں اچھی فضا اور پاکیزہ ماحول ہوتا ہے، اس ماحول میں دعوت وتربیت کے کام پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

جلسے میں مولاناؒ کی شرکت

یہ غالباً ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے، مولانا مودودی جیل سے رہائی پانے کے بعد پہلی دفعہ کراچی آرہے تھے۔ اس سے قبل میں نے مولانا کو نہیں دیکھا تھا۔اس لیے ہمارے اشتیاق کا عالم بیان نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ تو محبوب نظر پر پہلی نظر کا معاملہ تھا۔ بہت بے چینی تھی، بڑا اضطراب تھا اور ملنے کا زبردست شوق تھا۔

ہم نے کراچی جماعت سے درخواست کی کہ جمعیت کے لیے بھی مولانا کا وقت دیا جائے۔ انھوں نے پہلا ہی پروگرام کراچی جمعیت کو دے دیا۔ اس زمانے میں کراچی میں خالق دینا ہال، بندر روڈ ایسی جگہ تھی، جہاں ایک چھت کے نیچے سب سے زیادہ لوگ کسی اجتماع میں شریک ہوسکتے تھے۔ ہم اس بات کا اندازہ نہ کرسکے کہ مولانا محترم جیل سے رہا ہوکر پہلی مرتبہ کراچی آرہے ہیں، اس لیے ان کی پہلی تقریر سننے کے لیے لوگ کتنی کثرت کے ساتھ آئیں گے۔ ہم تو اس بات پر بہت خوش تھے کہ جلسے کا پہلا موقع ہمیں مل گیا ہے۔

اس وقت تک میں کوئی اچھی یا لمبی چوڑی فی البدیہہ تقریر نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال یہ طے پایا کہ اجتماع میں بحیثیت ناظم کراچی، استقبالیہ تقریر میں کروں۔ اس تقریر میں جمعیت کا تعارف ہو اور مولانا مودودی کا استقبال بھی ہو۔ یہ بات طے کرلی گئی کہ یہ تقریر لکھ کر کی جائے۔ ہمارے ہاں اچھا لکھنے والے ظفر اسحاق انصاری تھے۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ ساری

تقریر انھوں نے لکھی، شاید کچھ جملوں کا اضافہ کمی میں نے بھی کیا ہو، مگر وہ استقبالیہ تقریر انھی کی تخلیق تھی۔ اس لکھی ہوئی تقریر کا پہلا جملہ اب تک یاد ہے کہ ''کسی قوم کی اصل دولت اس کے کارخانے نہیں ہوتے، فصلیں پیدا کرنے والے کھیت نہیں ہوتے، بلکہ اس کی اصل دولت وہ جوان ہوتے ہیں، جو آسمان سے تارے نوچ کر لا سکتے ہیں'' وغیرہ۔ اس طرح کے بہت سے خوبصورت جملے تھے۔ تقریر لمبی تھی، جس کا مجھے پہلے اندازہ نہیں ہوا تھا۔

چنانچہ جب اجتماع شروع ہوا تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اندر جانے کا راستہ نہیں تھا، سخت گرمی کا موسم تھا۔ اور اس گرمی میں یہ عالم کہ مقرر تقریر کرنا نہیں جانتا، ہاتھ میں لکھی ہوئی تقریر کا مسودہ اور اس پر یہ قیامت کہ مائیک فیل ہوگیا۔ اب ہم حیران و پریشان کھڑے ہیں۔ اس وقت استادِ گرامی پروفیسر جلیل الدین احمد خان نے محسوس کرلیا، کہ شاگرد سخت پریشانی میں مبتلا ہے، چنانچہ وہ خود آگے بڑھے، اور انھوں نے آ کر اسٹیج سنبھال لیا۔ انھیں مائیک کی ضرورت نہ تھی۔ اگرچہ مائیک ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب کی آواز ہال کے کونے کونے تک پہنچ رہی تھی، دوسرا ان کا دبنگ اور پُرکشش لب ولہجہ۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ وہ روسٹرم سے پیچھے ہٹے اور مجھے کچھ مزید تقریر پڑھنے کا موقع ملا، جو راتوں کو جاگ جاگ کر لکھی گئی تھی، مگر اس کے باوجود وہ پوری نہیں پڑھی جاسکی۔ مولانا مودودی شیروانی میں تھے، سر پر ٹوپی تھی، پسینے میں بری طرح شرابور، اسی عالم میں، بغیر کسی تامل یا ذہنی بوجھ کے، انھوں نے تقریر کی، جس کا بڑا خوش گوار تاثر تھا۔ یہ ہماری پہلی بڑی تقریب تھی اور خاصا اچھا تجربہ تھا۔ اس واقعے کے بعد پھر کبھی تقریر لکھ کر پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔

'اسٹوڈنٹس وائس' کا اجرا

ہم نے باقاعدہ منصوبے کے تحت، غالباً ۱۹۵۱ء کے موسم گرما میں جمعیت کے زیر اہتمام انگریزی رسالہ Students Voice (اسٹوڈنٹس وائس) نکالا۔ اگرچہ میں ناظم تھا،

تاہم یہ ساری مہم جوئی خورشید بھائی کی صلاحیت اور ہمت کی مرہونِ منت تھی۔ جمعیت کے کارکن اس کو ٹائپ کرتے تھے، خود سائیکلو اسٹائل کرتے تھے، خود ہی کالجوں میں لے جا کر بیچتے تھے۔ پہلا شمارہ غالباً ڈیڑھ ہزار نکلا۔ وہ بے پناہ خوشی کا لمحہ ہوتا ہے، جب والدین کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ شاید اس دن بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنی اسٹوڈنٹس وائس کے پہلے پرچے کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی تھی۔ اس مسرت و انبساط کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان دنوں انگریزی میں تحریک اسلامی کا یہ پہلا پرچہ تھا۔

لیکن جب یہ پہلا شمارہ آیا تو ہمارے استاد پروفیسر جلیل صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ہماری نشست ہوئی۔ اس نشست میں، میں تھا، خورشید بھائی اور ظفر اسحاق کے علاوہ دو تین ساتھی اور بھی تھے۔ استاد محترم نے اس پرچے کو سامنے رکھ کر اس کے بخیے ادھیڑنے شروع کیے۔ تب ہم کو ایسا معلوم ہوا جیسے کچھ کیا ہی نہیں۔ وہ بڑی مفید تنقیدی مشق تھی، جس کا ہمیں یقیناً بڑا فائدہ ہوا۔ بعد میں جب میں نے جنوری ۱۹۷۰ء میں ڈھاکے سے روزنامہ سنگرام نکالا، تو اس کے پہلے ڈمی شمارے پر میں نے اخباری اسٹاف کے سامنے تین گھنٹے تک احتسابی تقریر کر کے اس کا بے رحمانہ تجزیہ کیا تھا۔ اور پھر جب ۱۹۹۱ء میں ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت سنبھالی، تب بھی میرے ذہن میں یہ چیز تھی کہ اگر ہم پرچہ نکالیں تو ڈھنگ سے نکالیں۔ اگرچہ پرچوں میں چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن دیکھنے اور پڑھنے والوں پر ان کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

پروفیسر جلیل صاحب کی اس تنقید کو ہم نے خوش دلی سے سنا، اور اس سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ کہ اسٹوڈنٹس وائس بہت مقبول ہوتا چلا گیا۔ پھر اس کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ اس میں وہ علمی بحثیں اٹھائیں کہ دانش ور حلقوں میں ان کا چرچا ہوا۔ خاص طور پر اسلامی دستور کے مسئلے پر خورشید بھائی نے بڑے اچھے اچھے مضمون لکھے۔ گذشتہ دنوں خورشید بھائی کہہ رہے تھے کہ ''میں نے حال ہی میں اسٹوڈنٹس وائس کے مضامین دیکھے، ان کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس عمر میں اتنا مضبوط استدلال کس طرح اختیار کیا''۔

وائس کے قافلہ تحریر میں خورشید بھائی کے علاوہ ظفر اسحاق اور انجینیرنگ کالج میں میرے ہم جماعت محمد زبیر فاروقی تھے، جو پاکستان کوارٹرز میں رہتے تھے، وہ بڑے سنجیدہ اور سلیم الطبع نوجوان تھے۔ ڈی جے کالج ہی میں پروفیسر جلیل صاحب کے ذریعے ان سے تعارف حاصل ہوا تھا۔ پھر وہ جمعیت سے قریب ہوئے اور رکن بھی بنے۔ اچھے متحرک کارکن تھے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے۔ میرے خیال میں ہم میں سب سے اچھی انگریزی لکھنے والے وہی تھے۔

الحمدللہ، پرچے کی اشاعت دو ہزار، تین ہزار، چار ہزار سے بڑھتی بہت اُوپر چلی گئی۔ اسلامی دستور پر اس کی خصوصی اشاعت دس ہزار تک گئی۔ اس کو بیچنے کے لیے طے کیا کہ ہم خود اخبار فروش بنیں گے۔ کراچی صدر میں فروخت کے لیے ہم نے ایک دن شام کو مہم چلائی اور ساتھیوں کو اس بات کی خاص طور پر تاکید کی تھی، کہ جو لوگ پتلون پہنتے ہیں وہ پتلون پہن کر آئیں، جو ٹائی لگایا کرتے تھے وہ ٹائی لگا کر آئیں اور اس طرح یہ عام اخبار فروشوں کی نسبت زیادہ ممتاز اخبار فروش نظر آئیں —— چنانچہ صدر میں ہمارے تمام کارکن جمع ہوگئے اور اس دن اسٹوڈنٹس وائس بڑی تعداد میں فروخت ہوا۔ ۵۲ء سے یہ باقاعدہ چھپ کر نکلنا شروع ہوگیا تھا، کیونکہ اس کا ڈیکلریشن حاصل کرلیا گیا تھا۔ عام پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچنے کے لیے یہ بھی ایک قابلِ ذکر چیز تھی۔

قابلِ رشک ٹیم

اس زمانے کے اپنے ساتھیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے، ان کے علم وفضل اور درجات کی بات تو نہیں کروں گا، لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، کہ ان دنوں بھی اجتماعی زندگی کے معاملات پر ہماری جو نظر تھی یا معاملات کا جتنا ادراک تھا، وہ آج سے کم نہ تھا۔

شاید اس بات کو مبالغہ سمجھا جائے، لیکن میں تب سوچا کرتا تھا اور آج سارے معاملات دیکھ کر بھی یہ کہہ سکتا ہوں، کہ کراچی جمعیت میں رفقا کی صورت میں اللہ کے فضل سے

اتناtalent[دانش اور صلاحیت] جمع ہوگیا تھا اور ان میں یہ صلاحیت موجود تھی، کہ اگر وہ سب کسی ایک جگہ جمع ہوکر، ایک ٹیم کے طور پر کام کرتے ہیں تو اس ملک کو حسن وخوبی سے چلا سکتے تھے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ان میں سے ہر شخص جہاں گیا، اس نے اپنے اپنے میدان میں بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ تعلیم، مالیات، صحافت، تحقیق، سائنس، انتظامیات، تجارت، عدل، بین الاقوامی امور، زراعت غرض ہر میدان میں شاندار انسانی ٹیم تیار ہوئی۔ یہ سب اللہ کا فضل و احسان تھا، جس نے ہماری دعوت، تربیت اور ماحول کے نتیجے میں یہ قابلِ قدر ٹیم فراہم کی۔

خدمت طلبہ کا کام

اس دور میں ہم نے خدمت طلبہ کے لیے بھی کچھ کام کیے۔ اس کام کا آغاز اس طرح ہوا کہ ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی میں تقریباً ۲۷ لڑکے ایسے تھے، جن کو فیس ادا نہ کرنے کی وجہ سے امتحان دینے سے روک دیا گیا تھا۔ اس وقت ڈاؤ میڈیکل کالج کے ناظم عبدالسلام صاحب تھے (وہ آج کل صادق آباد، صوبہ پنجاب میں پیشہ طب سے وابستہ ہیں) وہ یہ مسئلہ لے کر آئے۔ ہمیں خصوصی فنڈ جمع کرنے یا خدمت کے کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن معاشی تنگ دستی میں اتنے طلبہ کے تعلیمی مستقبل کے تاریک ہونے کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ کس تاریخ کا یہ واقعہ ہے، مجھے پوری طرح یاد نہیں ہے۔

ہم نے اس کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی۔ معتبر اور معروف لوگوں سے خطوط لیے، جن میں 'موتمر عالم اسلامی' کے انعام اللہ خان صاحب [م: دسمبر ۱۹۹۷ء] بھی تھے۔ انھوں نے ہم کو بولٹن مارکیٹ کے کچھ تاجروں کے نام خط دیے۔ ہم جہاں جہاں بھی گئے، وہاں اصحابِ ثروت کے سامنے طلبہ کا کیس پیش کیا۔

ہم نے ان لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ آپ پیسہ ہمارے ہاتھ میں ہی دیں، بلکہ یہ کہا کہ ''یہ لڑکوں کے نام ہیں، فیس کی عدم ادایگی کے باعث کالج انتظامیہ نے ان کا نام امتحان

دینے سے روک لیا ہے، آپ اس کارِ خیر میں حصہ لیں۔ کالج میں براہِ راست فیس کی ادائیگی کر دیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنا اجر لیں''۔ اس مقصد کے لیے ہم گوردھن داس مارکیٹ میں بھی تاجروں سے ملے اور دوسری جگہوں پر بھی گئے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، چنیوٹ کے ایک تاجر نے سب طلبہ کی فیس جمع کروا دینے کی ذمہ داری لے لی اور وہ تمام فیسیں ادا کر دیں۔ طلبہ کی خدمت کے سلسلے میں یہ ہمارا پہلا کام تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نہ ان طلبہ نے ہم سے درخواست کی اور نہ ہم نے ان پر کوئی احسان جتایا۔ اس تجربے سے جمعیت کی ہمت خاصی بڑھ گئی، اور اس کام کی افادیت اور اہمیت کا بھی احساس ہوا۔

کراچی میں بالعموم طلبہ بھارت سے نقل مکانی کر کے آئے تھے، جن کے والدین بے خانماں و برباد تھے۔ بہت سے طلبہ دن کو ملازمت کرتے اور شام کو پڑھتے تھے۔ ان دنوں شام کے کالج بہت پھیل گئے تھے۔ طلبہ کے بہت سے حقیقی مسائل تھے۔ اس وقت کم از کم اپنے ذہن کی حد تک میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، کہ خدمت کے اس تصور کو قرآن اور حدیث سے ہی حاصل کیا تھا، کہ اللہ کے بندوں کی خدمت بھی عبادت ہے۔ یہ عبادت بھی اتنے ہی بڑے درجے کی عبادت ہے، جتنے درجے کی عبادت نماز ہے، اور یہ ایمان کا ایک لازمی اور ناگزیر تقاضا بھی ہے۔ اگرچہ یہ بنیادی محرک تھا، تاہم اس کے ساتھ ایک محرک یہ بھی تھا، کہ اس عمل کے نتیجے میں طلبہ میں ہماری دعوت پھیلے گی، اور ان کے درمیان اثر و رسوخ میں اضافہ ہوگا۔ جو یقیناً ہوا اور ہونا چاہیے تھا۔

تحریک سے بیرونی حلقے تک

ہمارے ذہن میں دُور دُور تک یہ خیال موجود نہیں تھا کہ ہم کو جمعیت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جماعت کے بیت المال کی طرف رجوع کرنا ہے، یا جماعت کے بیت المال پر انحصار کرنا ہے، یا جماعت کے بیت المال سے کچھ حاصل کرنا ہے۔ بلکہ جیسے ہی معاشی زبوں حالی کے شکار طلبہ کا یہ مسئلہ ہمارے سامنے آیا، اسی وقت ہم نے جماعت کے

حلقے سے باہر لوگوں تک رسائی حاصل کرنے اور وسائل فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس اہم پیش رفت میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب اولین ذریعہ بنے۔ انھوں نے ہمیں مختلف لوگوں سے ملایا۔ انعام اللہ خان صاحب سے انھوں نے ہی متعارف کرایا تھا، کہ جنھوں نے میمن تاجروں میں اپنے حلقے سے ہم کو متعارف کرایا۔ اس وقت وسیع المشربی اور وسیع الظرفی کا ہمارا جو مزاج بن رہا تھا، اس کا بھی یہ تقاضا تھا، کہ ہم صرف جماعت کے حلقۂ تعارف پر انحصار نہ کریں۔ اس تجربے نے ہمیں ہمت اور حوصلہ دیا، کہ اس حلقے سے باہر جا کر خیر اور بھلائی کے کاموں کے لیے مال دار لوگوں کی مدد اور ان کا تعارف حاصل کریں، کہ یہ کام ان کے اور ہمارے درمیان ایک قدرِ مشترک ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں جو کام کیے، ان میں پچھلے سالوں کے امتحانی پرچے چھاپ کر تقسیم کرنے کا کام تھا۔ طلبہ کے لیے درسی کتب کی مفت فراہمی کے لیے لینڈنگ لائبریری بنائی۔ کراچی جمعیت میں یہ دونوں روایتیں اب تک چلی آرہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے فری کوچنگ کلاسوں کی ابتدا کی۔ ان میں پڑھنے کے لیے فرسٹ ایئر، سیکنڈ ایئر اور شاید ہائی اسکول کے لڑکے بھی آتے تھے۔ کیمسٹری اور دو ایک مضامین میں خود بھی پڑھایا کرتا تھا۔ جمعیت کے دفتر میں یہ کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ جمعیت کے ہی سینئر طلبہ پڑھایا کرتے تھے اور کچھ اساتذہ کا تعاون بھی حاصل کیا تھا۔ مفت کوچنگ کلاسوں کی یہ روایت بڑے طویل عرصے تک چلتی رہی، اور شاید آج کل بھی چل رہی ہو۔

کچھ عرصے بعد یہ کوشش کی، کہ اس کام کو باہر کے لوگوں کے تعاون سے کوئی منظّم شکل دے دی جائے۔ یہ بھی ایک عمدہ تجربہ تھا۔ یہ باتیں مجھے اس لیے یاد آرہی ہیں، کہ اپنے حلقے سے باہر کے لوگوں سے تعاون اور اتحاد کے ذریعے مشترک مقاصد کے لیے کام کرنا، ہماری اپروچ اور پروگرام کا اس وقت سے حصہ تھا۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کرچکا ہوں کہ کراچی پہنچ کر ماموں زاہد حسین صاحب کے ہاں پانچ چھ ماہ تک قیام رہا تھا۔ چونکہ وہ اسٹیٹ بنک کے گورنر تھے، اس لحاظ سے تاجر برادری

کے لیے ایک مطلوب اور مؤثر شخصیت بھی تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ساجد اکرم زاہد، اسلامیہ کالج میں ظفر اسحاق انصاری کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ساجد اکرم کے گھر کی فضا میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی جو بھی مخالفت ہو یا ان کے بارے میں ماموں کی جو بھی رائے ہو، وہ اپنی جگہ، بہرحال بنیادی طور پر گھر کا مزاج تو دینی تھا اور ساجد بھائی بہت دینی مزاج رکھتے تھے۔ پھر ظفر اسحاق سے بہت متاثر تھے، اب بھی ان سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ ماموں تک پہنچنے کا ذریعہ ساجد اکرم اور ظفر اسحاق کا یہ تعلق بنا۔ اس کام کے لیے میرا ماموں بھانجے کا رشتہ بنیاد نہیں بنا۔ وجہ یہ تھی ماموں کے سامنے زبان کھولنا، ان سے کوئی بحث کرنا، کوئی بات کرنا بھی میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔

اس دوران میں ایک واقعہ ایسا بھی ہوگیا تھا، کہ جس سے ان کے دل میں مجھ سے خاصی برہمی اور ناراضی پیدا ہوگئی تھی، اور مجھے اس حقیقت کا احساس بھی تھا۔ جن دنوں ہم ان کے ہاں قیام پذیر تھے، اور ہمارے پاس کچھ رقم تھی، جو بھوپال میں اپنا گھر بیچ کر حاصل ہوئی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس رقم کو کہاں لگایا جائے؟ ماموں نے میری اماں کو یہ مشورہ دیا کہ ''اسٹیٹ بنک شیئرز خرید لیے جائیں، کیونکہ یہ سب سے اچھی سرمایہ کاری ہے، جس سے اچھا نفع بھی ملے گا''۔ مالیاتی اور تجارتی بنیادوں پر تو بلاشبہہ ہمارے ماموں کا یہ مشورہ بڑا صائب تھا، مگر اماں کو بنک جیسے سودی ادارے کے حصص خریدنے میں تامل تھا۔ لیکن شاید انھوں نے خود کوئی بات کہنا مناسب نہیں سمجھا، یا اس میں ان کو مروّت آ گئی، کہ وہ ان سے خود کہہ دیتیں: ''ہم یہ نہیں کرسکیں گے''۔

مجھے یاد ہے ان کے ڈرائنگ روم میں اماں اور ماموں بیٹھے ہوئے تھے، شاید کوئی اور بھی موجود تھا۔ اماں نے مجھے بلایا اور کہا: ''بھائی! یہ تجویز دے رہے ہیں، تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے''۔ یہ سن کر یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ ماموں اسٹیٹ بنک کے گورنر ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اسٹیٹ بنک میں نہ لگائیں، کہ یہ ایک سودی ادارہ ہے اور شرعاً جائز نہیں ہے، تو یہ خود ان کے لیے ایک زبردست تکلیف دہ بات ہوگی۔ اگر میں کہوں گا کہ لگائیں تو یہ میرے دین، ایمان اور ضمیر کے خلاف تھا۔

بہر حال میں نے پریشانی کے عالم میں ہمت و جرأت کر کے یہی کہا کہ: ''اس میں تو سود کا معاملہ آئے گا اور سود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے''۔ اچھی طرح یاد ہے کہ، یہ بات سن کر ماموں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا، اور اس دوران انھوں نے کیا کہا، وہ مجھے یاد نہیں ہے۔ لیکن اماں کا یہ جملہ ضرور یاد ہے کہ ''بھائی، میں یہ نہیں چاہتی کہ گھر پر میرے بچوں میں تفریق ہو جائے۔ کوئی ہمارے ہاں آئے کوئی نہ آئے، کوئی ہمارے ہاں کھانا کھائے اور کوئی نہ کھائے اس لیے اس سے بچنا ہی بہتر ہے''۔ اماں نے بڑی حکمت سے اپنا موقف حرام اور حلال کی بنیاد پر نہیں پیش کیا، بلکہ اپنے خاندان کے اتفاق اور اتحاد کو برقرار رکھنے کا موقف اختیار کیا۔

میں بات کر رہا تھا کہ اس وقت جمعیت کا ماموں سے جو رابطہ قائم ہوا، وہ کالج میں ظفر اسحاق اور ساجد بھائی کے تعلق کے واسطے سے قائم ہوا تھا۔ پھر ماموں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ''ہم ایک تنظیم بنائیں جس کا نام اسٹوڈنٹس سروس یونٹ ہو اور اس کے اندر بڑے بڑے تاجر شریک ہوں اور کچھ جمعیت کے لوگ بھی ہوں''۔ ماموں نے اس خیال کو پسند کیا، ان کی حوصلہ افزائی پر ہم نے ایک اسکیم بنائی۔

اس کے بعد انھوں نے ہم کو ذاتی خط دیے۔ اس وقت کی کوئی بڑی تجارتی یا صنعتی فیملی ایسی نہیں تھی، جس نے اس اسٹوڈنٹ سروس یونٹ کی معاونت نہ کی۔ شاید ہم نے ماموں کو اس کا سرپرست بنایا تھا۔ وفاقی حکومت کے ایک افسر صوفی صاحب اس کے چیئرمین تھے۔ اس میں امیر علی فینسی بھی تھے۔ ان کے ساتھ حبیب فیملی، باوانی فیملی، آدم جی فیملی وغیرہ کے نمایندے بھی شریک ہوئے۔ جمعیت سے ہم چار پانچ ارکان شامل ہوتے تھے۔ اسٹوڈنٹس سروس یونٹ کی نشست ماموں کے گھر پر ہوتی تھی۔ وہ اس خدمتِ عامہ کے کام میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔

دفتر جمعیت کا حصول

اسٹوڈنٹس سروس یونٹ بننے کا ایک اور فائدہ، اسٹریچن روڈ پر جمعیت کے دفتر کا

حصول ہے۔ اس دفتر کا جمعیت کے کام کی ترقی میں بڑا کلیدی کردار ہے۔ اس سے پہلے تک ہمارا مرکز فریئر روڈ پر خورشید بھائی کا مکان تھا۔ کالج سے چھٹی ہوتی یا وقفہ ہوتا تھا تو ہم لوگ ان کے گھر پر چلے جاتے تھے، وہیں ڈیرہ ڈالتے تھے، وہیں کھانا کھاتے تھے، وہیں پر شوریٰ ہوتی تھی اور اجتماعِ ارکان بھی منعقد ہوتے تھے۔ وہیں پر تحریکی زندگی اور تحریک کے مستقبل کے حوالے سے گپ شپ ہوتی تھی۔ اس طرح خورشید بھائی کا مکان ہمارا مرکز تھا، لیکن تنظیم کے لیے یہ کافی نہیں تھا۔ اسی لیے ہم کو دفتر کی تلاش تھی۔

دفتر کا ماہانہ کرایہ ادا کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس وقت کراچی میں بہت سی عمارتیں متروکہ (evacuee) ملکیت تھیں۔ ہم کالجوں کے مرکزی علاقے میں دفتر بنانا چاہتے تھے، جہاں این ای ڈی انجینیرنگ کالج، ایس ایم کالج، کامرس کالج اور ڈی جے کالج بھی تھا۔ یہ سارے کالج اسٹریچن روڈ، پاکستان چوک کے چاروں طرف واقع تھے۔ ان کالجوں کے ہاسٹل بھی ادھر تھے۔ اس اعتبار سے ان دنوں کراچی میں طالب علموں کے لیے وہ مرکزی علاقہ تھا۔

ہم چاہتے تھے کہ اسی علاقے میں ہمارا دفتر ہو، لیکن کرائے پر جگہ حاصل کرنے کے لیے کراچی میں اس وقت پگڑی کا مسئلہ عام تھا۔ ہمارے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ پگڑی ناجائز ہے۔ (البتہ اب مطالعے کے بعد یہ مسئلہ مختلف فیہ دکھائی دیتا ہے، جس پر گفتگو ہوسکتی ہے)۔ وہ ہمارا پرجوش دورِ حیات تھا، اور پگڑی کے بارے میں ہمارا خیال تھا، کہ یہ مطلق ناجائز ہے، اسی لیے پریشان بھی تھے۔ مولانا مودودی رہا ہو کر جب کراچی آئے تھے، یہ اس وقت کا مسئلہ ہے یا بعد کا، بہر حال میں اور ظفر اسحاق مولانا محترم سے ملنے گئے۔ ہم نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا کہ ''دفتر کا حصول ہمارے لیے ضروری ہے، دفتر پگڑی پر مل سکتا ہے۔ پگڑی ہم کہاں سے دیں؟ پگڑی کی رقم فراہم کرنا الگ مسئلہ ہے، مگر پہلی بات یہ ہے کہ پگڑی دیں یا نہ دیں، یہ جائز ہے یا ناجائز؟''

مولانا محترم نے بہت پُرلطف انداز میں کہا کہ ''میں غضِ بصر کروں گا، آپ مجھ سے نہ

پوچھیں''۔ ہم نے اس اشارے کو اجازت کے لیے کافی سمجھا اور مزید وضاحت کے لیے سوال نہیں کیا۔ البتہ کم ازکم اس وقت زیرِ بحث مسئلے میں جواز اور عدمِ جواز کا سوال ہمارے ذہن میں بہت شدت کے ساتھ نہیں رہا۔ اسٹریچن روڈ، جہاں پر جمعیت کا دفتر آج تک ہے، اس سے بہتر جگہ ہمیں نہیں مل سکتی تھی۔ دو اڑھائی ہزار روپے اس کی پگڑی تھی۔ اس زمانے میں یہ رقم قارون کے خزانے کے برابر تھی اور ہم لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، کہ یہ رقم ادا کرسکیں گے۔ چنانچہ ہم نے ظفر اسحاق اور ساجد اکرم بھائی کی معرفت ماموں کی طرف رجوع کیا۔ ماموں نے کچھ لوگوں کے نام خط دیے۔ کئی لوگوں نے تو معذرت کرلی، کچھ نے رقم ادا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ وہ محسن کون تھے؟ اب نام بھی نہیں یاد۔ بہرحال انھوں نے غالباً تین ہزار روپے دیے جو آج کل دو تین لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ ہم نے رقم بطور پگڑی ادا کر کے دفتر کا قبضہ لے لیا۔

اس دفتر کے دو بڑے کمرے تھے اور ایک چھوٹا کمرہ پیچھے تھا۔ اسی دفتر کے ایک حصے کو 'اسٹوڈنٹس سروس یونٹ' کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ طلبہ کو درسی کتب فراہم کریں اور معیاری قسم کے نوٹس دیں۔ لیکن رفتہ رفتہ دیگر بہت سی اجتماعی مصروفیات کے باعث بعدازاں جمعیت میں آنے والوں نے اس میں دل چسپی لینا کم کردی۔ اس طرح ایک بہترین منصوبہ ختم ہوکر رہ گیا۔ اس دور کے کاموں میں یہ ایک بڑا کام تھا۔ اس کے پیچھے جو سوچ تھی، وہ بڑی اہم تھی۔ اس دور میں جب کہ حکومت اور معاشرے میں ہمیں بڑی سخت مخالفت کا سامنا تھا، الحمدللہ ہم نے مالیات کی تنگی کا یہ علاج تلاش کیا، کہ تحریک کے محدود حلقۂ وابستگی سے باہر نکل کر دیکھیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کوشش میں برکت دی۔

اساتذہ اور ہماری اعانت

ایک دو کے سوا ہم سبھی دوستوں کا معاشی پس منظر غربت اور سخت تنگ دستی کا منظر لیے ہوئے تھا۔ مثلاً میں پیر کالونی میں یا گاندھی گارڈن میں رہتا تھا، تو مشکل سے جیب میں

اتنے پیسے ہوتے تھے کہ بس کا کرایہ دیا جاسکے۔ ایک دفعہ سائیکل لی تھی، وہ چوری ہوگئی۔ اس کے بعد بڑی مشکل سے دوسری بار سائیکل لی تھی، لیکن وہ بھی چوری ہوگئی۔ پھر یہ کہ پہننے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ جب خالد بھائی کا انتقال ہوگیا، تو ان کی علی گڑھ کٹ شیروانی اور براؤن رنگ کی ایک پتلون مجھے دے دی گئی۔ جب کوئی تقریب یا کوئی بڑا پروگرام ہوتا، میں وہ پتلون پہن کر چلا جاتا تھا۔ لیکن تن وتوش کی اِس غربت میں بھی دل بڑے بڑوں سے زیادہ غنی تھے۔ صبح وشام رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا سودا تھا۔ زندگی چین، اور شکر گزاری کا استعارہ تھی۔

ان حالات میں بھی ہم اپنی جیب سے، انفاق فی سبیل اللّٰہ کیا کرتے تھے، خواہ ایک روپیہ دیتے یا دو روپے، آٹھ آنے دیتے یا چار آنے ـــــ لیکن یہ خیال کبھی بھی ذہنوں میں نہین آتا تھا، کہ ہم جمعیت کے بیت المال اور جمعیت کے کام کے لیے جماعت کی طرف رجوع کریں۔ مجھے ۱۹۵۶ء، ۵۷ء تک کا زمانہ یاد ہے اور شاید اس کے بعد بھی کہ میری والدہ، رشتہ داروں کے ہاں سے وسیع پیمانے پر جمعیت کے لیے اعانت اور فنڈز جمع کرتیں اور لاکر دیتی تھیں۔ ہمارا یہی طریق کار تھا کہ جماعت کے حلقہ تعارف سے باہر جائیں اور وہ لوگ جو جماعت کے بیت المال کو نہیں دیتے، ان سے مالی اعانت حاصل کریں۔ اللّٰہ کا بڑا فضل ہے کہ اس میں ہمیں بڑی کامیابی ہوئی۔

یہاں پر ایک مثال دوں گا۔ ملک کے جن سیاست دانوں سے ہمارا تعلق قائم ہوا، وہ بھی مولانا ظفر احمد انصاری صاحب ہی کی معرفت قائم ہوا تھا۔ ان میں مسلم لیگ کے بھی بہت سے لوگ تھے۔ مثال کے طور پر ایک نام لعل میاں معظم حسین صاحب کا ہے جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ وہ اور ان کی اہلیہ دین دار اور نماز روزے کے پابند تھے۔ وہ پیروں اور خوابوں پر بھی یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے جمعیت کے لیے پچاس روپے ماہانہ اعانت مستقل طور پر طے کر دی۔ اس زمانے کے پچاس روپے آج کے کم از کم دو تین ہزار روپے کے برابر تھے۔ میں اور ظفر اسحاق سائیکل پر جا کر ہر ماہ باقاعدگی سے یہ پچاس روپے ماہوار ان سے لایا کرتے تھے۔ سائیکل کبھی وہ چلاتے تھے اور کبھی میں۔

دوہری سواری کرتے تھے کیوں کہ مزید سواری فراہم کرنے کے لیے ہمارے پاس رقم نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح اور حضرات بھی مالی معاون بنے تھے۔ ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہم لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں جماعت کے لوگوں کو زیر بار نہ کریں، اس لیے کہ ان کے اپنے اخراجات اور اپنے منصوبے ہوتے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ این ای ڈی انجینیرنگ کالج کے اساتذہ میں اکثر لوگ دین دار تھے۔ یہاں علی گڑھ یونی ورسٹی سے آئے ہوئے اساتذہ بھی تھے۔ ہم ان سے ملتے، جمعیت کا تعارف کراتے اور ان کو باقاعدہ دعوت دیتے تھے۔ اس طرح ان اساتذہ کی ہمدردیاں حاصل کیں جو طویل عرصے تک، بلکہ ان کی ملازمت کے آخر تک برقرار رہیں۔ ہم نے ان اساتذہ کرام سے مالی معاونت کے لیے اپیل کی۔ انجینیرنگ کالج کے اساتذہ میں مستقل مالی معاونین بنانے کا یہ کام مسلسل اور مربوط انداز سے میں نے خود کیا تھا۔ البتہ یہ بات یاد نہیں کہ اس وقت کراچی جمعیت کا ناظم تھا یا ناظم اعلیٰ۔ کوئی بھی دور ہو، ہر فرد کو کارکن کے طور پر کام کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے پروفیسر ضیاء الاسلام انصاری صاحب سے بات کی، جو جیالوجی پڑھاتے تھے۔ انھوں نے پچاس روپے ماہانہ اعانت طے کی۔ پروفیسر عبدالغنی صاحب ہم کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ انھوں نے بھی ہم کو پچیس روپے دیئے۔ پروفیسر سراج الحسن صاحب ہائیڈرالکس پڑھاتے تھے، انھوں نے بھی اتنے ہی مقرر کیے۔ پروفیسر عزیز الحسن خان صاحب بھوپال کے رہنے والے اور بہت زوردار آدمی تھے، انھوں نے اچھی خاصی رقم فراہم کی۔ سروے کے پروفیسر اے ٹی خان صاحب، جو بعد میں انجینیرنگ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنے ـــــ میرے بیٹے حسن صہیب جن دنوں کراچی جمعیت کے ناظم تھے، وہ ان کا ساتھ دیتے تھے، ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، وہ بھی ہمارے مالی معاون تھے۔ اس زمانے میں روپے کی مالی قدر کا اندازہ لگانے کے لیے یہ پیمانہ بنا لیجیے کہ ایک انجینیر کی تنخواہ ۳۰۰ روپے ہوا کرتی تھی۔ این ای ڈی کالج میں ہمارے بیت المال کے لیے یہ ذرائع آمدنی تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام طلبہ کی طرف سے اساتذہ میں دعوتی کام کے پھیلاؤ، اساتذہ کے احترام، ان کی محبت اور ان کی شفقت حاصل کرنے کی کوشش سے ہوا۔ وہ ہمارے پشت پناہ اور ہمدرد بنے۔ ہم پر یہ احساس غالب تھا، کہ اساتذہ کو جمعیت کے ساتھ رکھنا چاہیے، پھر ان سے ہر طرح کی جائز مدد لینا چاہیے۔ جو لوگ علمی اور تربیتی مدد کر سکیں، ان سے ربط اور تعلق مضبوط بنانا چاہیے، کیونکہ تعلیمی ادارہ، استاد اور طالب علم دونوں کے باہم تعاون، اعتماد اور وجود ہی سے تشکیل پاتا ہے۔

علمی اور تربیتی مدد کے لیے پروفیسر جلیل الدین احمد خان صاحب اور اُردو کالج کے پروفیسر شرافت علی ہاشمی مرحوم کی خدمات اور شفقت کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ لیکن یہ توازن اس وقت بگڑنا شروع ہوا، جب اسٹوڈنٹس یونین کی قوت جمعیت کے ہاتھ آئی اور دوسری طرف اساتذہ تعلیمی دنیا میں علم سے زیادہ مال کے پیچھے پڑ گئے۔ بعد کے دور میں اساتذہ اور طلبہ کے مابین تعلقات بہت خراب بھی رہے۔ اس کا ایک سبب جمعیت کے کچھ وہ افراد بھی بنے، جو کالجوں میں کام کے ذمہ دار تھے، مگر وہ عام طالب علم رہنما اور جمعیت کے ناظم یا نمایندے کے درمیان پائے جانے والے فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ ان کی روش اور طرزِ عمل سے، یا کم سے کم وہ واقعات جو میرے علم میں آئے، جو صحیح تھے اور جن کی میں نے خود تحقیق کی، پھر ایسے راویوں سے سنا جس کی روایت میں شک نہیں کر سکتا، اس پہلو سے اندازہ ہوا کہ معاملات میں بڑا فرق رونما ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس پر آج کی قیادت کو بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

اسٹوڈنٹس سروس اور مالیات کا ذکر کرتے ہوئے بات اساتذہ تک جا پہنچی۔ یہ ہماری مالیات کا ذریعہ بنے، ہماری دعوت بھی پھیلی اور ان کی پشت پناہی بھی حاصل ہوئی۔

نظامت سے فراغت

۵۱ء کے شروع میں میرا فرسٹ ایئر انجینیرنگ کا ضمنی امتحان ہو رہا تھا۔ اور امتحان کے لیے چھٹی لی تھی۔ ہمارا طریق کار یہ تھا کہ سال بھر جمعیت کا کام کرتے تھے۔ امتحان کا وقت

آ تا تو دو مہینے کی چھٹی لے کر اچھی طرح پڑھ لیتے اور اچھی طرح پاس ہو جایا کرتے تھے۔ اس وقت خورشید بھائی اپنے علم اور مطالعے کی صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ میں نے ان کو قائم مقام ناظم بنایا۔

غالباً ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں تقریباً سوا سال تک کراچی جمعیت کی نظامت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد میں اصرار کر کے اس ذمہ داری سے سبک دوش ہونا چاہتا تھا۔ ضمنی امتحان کی چھٹی نے مجھے اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں خاصی تقویت بہم پہنچائی، کہ اپنے آپ کو نظامت کی ذمہ داری سے علاحدہ کرلوں۔

جب خورشید بھائی نے عارضی طور پر نظامت کی ذمہ داری کو سنبھالا تو یہ نہ صرف میرا مشاہدہ تھا، بلکہ ہمارے قریبی رفقا، ظفر اسحاق، عبداللہ جعفر، منظور احمد اور دوسرے سب ساتھیوں کا بھی یہی تاثر تھا کہ انھوں نے بہت اچھی طرح ذمہ داری کو سنبھالا۔ جبکہ میری رائے یہ تھی کہ خورشید بھائی نے مجھ سے زیادہ بہتر طریقے پر جمعیت کا نظم چلایا ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ انھوں نے کارکنوں سے تعلق رکھنے میں اور کارکنوں کو آگے بڑھانے میں، اور ان کی تربیت کرنے میں بھی بہت عمدہ اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے جمعیت کے کام کو پھیلانے میں زیادہ صلاحیت سے کام کیا۔

میرے ذہن میں مولانا مودودی کے وہ الفاظ ہمیشہ موجود رہے، جو انھوں نے روداد جماعت اسلامی حصہ اول کے مطابق، پہلی بار امارت سنبھالتے ہوئے کہے تھے کہ اگر کوئی بہتر آدمی آجائے تو ایک خدا ترس آدمی سے اس بات کی توقع کی جائے گی کہ وہ اس کے لیے جگہ خالی کردے ___ اگرچہ بنیادی وجہ تو یہ نہیں تھی کہ میں صرف اسی بنا پر نظامتِ کراچی سے فارغ ہو گیا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس وقت مجھ پر یہ احساس بھی غالب تھا، اور اسی لیے مجھے اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں تقویت ملی۔ اس فیصلے کا بنیادی مدار یہ احساس تھا، کہ میرے اندر ایسی کمزوریاں اور لغزشیں ہیں، جو قیادت کے اس معیار کے مطابق نہیں ہیں، جو معیار میرے ذہن میں اسلامی تحریک کے لیے موجود تھا۔ زندگی کا یہ دور

آئیڈیل ازم کا دور تھا اور ہوتا ہے۔ فطری طور پر ذمہ داریوں کے مقابلے میں اپنی کوتاہی اور کم تری کا احساس، بار بار ذہن میں خلش بن کر کھٹکتا رہتا ہے۔ یہ احساس جذبۂ عمل کو مہمیز کرتا ہے اور آگے کی طرف بھی دھکیلتا ہے۔

میں نے کراچی جمعیت کے ارکان کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں اپنی کمزوریوں کا ذکر کیے بغیر ان کا اعتراف کیا۔ پھر خورشید بھائی کے سامنے آجانے کا ذکر بھی کیا۔ تقریباً فیصلہ کن انداز میں یہ بات سامنے رکھی، کہ مجھے سبک دوش کر دیا جائے اور خورشید بھائی یہ ذمہ داری خود سنبھال لیں یا ارکان جس کو بھی ناظم منتخب کرلیں۔ اس خط پر کافی گفتگو ہوئی، اصرار ہوا اور مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی۔ خاص طور پر ظفر اسحاق نے بہت زور دیا اور بالآخر انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے کہ یہ فرد اپنی ضد پر آ گیا ہے۔ حالانکہ یہ ضد کی بات نہ تھی اور نہ میں ضدی آدمی تھا۔ بلکہ میں اسے اپنی استقامت سمجھتا ہوں۔ میرے اُوپر ایسے احساسات غالب تھے، جن کی بنیاد پر آگے کام چلانا مشکل نظر آ رہا تھا، اور پھر جب مجھ سے بہتر متبادل موجود تھا، تو اس بات کا کوئی جواز بھی نہیں تھا، کہ میں خود اس کے لیے جگہ خالی نہ کرتا۔

چنانچہ باقاعدہ انتخاب کے بعد خورشید بھائی نے قائم مقام ناظم کے بجائے باقاعدہ نظامت کی ذمہ داری سنبھال لی اور میں سبک دوش ہوگیا۔ لیکن اس سے میرے کام میں کوئی فرق نہیں آیا اور شاید پہلے سے بہتر خدمت انجام دینے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں نظامت کسی ایک فرد کی نظامت نہیں ہوتی تھی، کہ جس میں صرف وہی آدمی سوچے، منصوبہ بندی کرے، رفقا کو تیار کرے اور سارا کام لے کر چلے۔ بلکہ یہ ایک قسم کی مشترک لیڈرشپ اور اجتماعی ذمہ داری تھی جس میں ہم تین تو بہت نمایاں تھے، یعنی میں، خورشید بھائی اور ظفر اسحاق۔ جب تک جمعیت میں رہے ہم میں سے کوئی بھی اس عمل سے خارج نہیں تھا۔ اسی طرح ہمارے ساتھ عبداللہ جعفر اور منظور احمد برابر کے شریک تھے۔

یہ سمجھنا اور یاد رکھنا، کہ ان میں سے کون سا کام میری سوچ اور میرے initiative

(پہل قدمی) سے ہوا، اور پھر اس کام کا تذکرہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ سب کام، سبھی کی سوچ اور عمل سے ہوئے۔ اسی طرح اس بات کا تذکرہ کہ کون سا کام میرے دورِ نظامت میں ہوا اور کون سا کام میرے بعد کے دورِ نظامت میں ہوا، یہ ممکن نہیں ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔

بہرحال میں نے اپنے طور پر اس روایت پر عمل کرنے کی کوشش کی کہ اپنے سے بہتر آدمی نظر آئے تو اس کے لیے جگہ خالی کردی جائے۔ یہ بات ہماری روداد جماعت حصہ اول میں موجود ہے، لیکن اس بات پر عمل نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔ ایسی مثالیں کہ جہاں لوگوں نے اپنے عہدے خالی کردیے ہوں کہ اب وہ ذمہ داری نہیں نبھا سکتے، یا ان کے خیال میں ان سے بہتر کوئی آدمی آ گیا ہے، جو اس ذمہ داری کو نبھا سکتا ہے۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹ جائیں، اس کی مثالیں شاذ و نادر ہیں، بلکہ میرے علم کی حد تک تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔

جب فرسٹ ایئر انجینیرنگ کا نتیجہ آیا تو اس میں، میں فیل ہوگیا یعنی میٹرک میں فرسٹ اور انٹر میں تھرڈ ڈویژن کے بعد اگلے امتحان میں فیل۔ تعلیمی دنیا میں یہ واحد ناکامی تھی، مگر سال ضائع نہیں ہوا، بلکہ ضمنی آ گئی۔ اس تعلیمی سال کے دوران جمعیت کا ناظم بھی بن چکا تھا اور امتحان سے ۳،۴ ماہ پہلے تک بھرپور انداز سے کام کر رہا تھا۔ کالج کے اساتذہ، طلبہ اور خود ہمارے رہایشی علاقے کے لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ انجینیرنگ کالج میں اکثر لیکچرار حضرات ہمارے مالی معاون بھی بن چکے تھے۔

اپنے نتیجے کی یہ خبر لے کر میں خالہ زاد بھائی پروفیسر جواں بخت کے پاس پہنچا، جنھوں نے مجھے داخل کرایا تھا، انھوں نے رزلٹ کارڈ دیکھ کر کہا: ''ہاں اور جمعیت کا کام کرو''۔ ان کا یہ جملہ میرے لیے ایک تازیانہ بن گیا۔ میں نے ذرا سنبھل کر کہا: ''اچھا خیر یہ تو آپ دیکھیں گے ہی، ان شاءاللہ''۔

وہاں سے آ کر میں پھر جمعیت کے کام میں لگ گیا۔ ساتھ ہی تینوں مضامین میں ضمنی

امتحان کی تیاری شروع کی۔ یہ مشکل مضامین تھے، جن میں الیکٹریکل انجینیر نگ، ہیٹ انجینیر نگ اور تیسرا مضمون جس سے میں سخت بیزار تھا وہ مکینیکل ڈرائنگ کا پرچہ تھا۔لیکن ضمنی امتحان میں، میں نے اللہ کے فضل سے تینوں پرچے اعلیٰ نمبروں کے ساتھ پاس کیے، اس طرح مجموعی طور پر فرسٹ ڈویژن بن گئی۔ انجینیر نگ کا دوسرا سال بھی اچھی پوزیشن میں پاس کیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔

مسجد خضرا کی یاد

یہ ۱۹۵۰ء یا ۵۱ء کی بات ہے جب صدر میں سیکرٹریٹ کے قریب جدید طرز کی نوتعمیر شدہ مسجد خضرا ہماری سرگرمیوں کا مرکز بنی۔ مسجد خضرا کی خاص بات اس کے دالان تھے اور ساتھ ہی ایک بہت بڑا لان تھا۔ بڑی خوش گوار ہوائیں آتی تھیں۔ مسجد کے امام مولانا شمس صاحب، مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب [م: اپریل ۱۹۸۰ء] کے رشتے دار تھے۔ امام صاحب نے ہمیں شب بیداریاں منعقد کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ انھوں نے ہمیں اور بھی سہولتیں دیں۔ پھر ہم نے وہاں پر درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔

اس سال جولائی میں عیدالفطر کے اگلے روز ہم نے مسجد خضرا میں عید ملن پارٹی رکھی۔ اس پارٹی کو یادگار بنانے کے لیے مرغوب احمد بھائی اپنے والد صاحب کے ریستوران سے آئس کریم بنانے والی دو مشینیں لے آئے۔ ہم نے خوب آئس کریم بنائی اور تمام رفقاء نے خوب سیر ہو کر کھائی۔ یہ بڑا کامیاب پروگرام ہوا۔ آج تقریباً ۴۶ برس ہو گئے ہیں، ہر سال ۲ر شوال کو کراچی جمعیت کے پرانے اور نئے کارکن اس مسجد کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ مسجد خضرا ہمارے باہمی تعلقات کی مضبوطی کا سدا بہار مرکز رہی ہے۔ مسجد خضرا ہماری اخلاقی، روحانی اور فکری تربیت کا مرکز رہی ہے۔

طالبات میں کام، ناکام کوشش

میں یہاں پر اپنی ایک سال بڑی بہن عطیہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری تحریکی

سرگرمیوں میں بڑی معاون رہیں۔ رات وقت بے وقت آنے پر وہ سالن گرم کر کے، تازہ روٹی پکا کر دیتی تھیں، اور خوب خاطر مدارات کرتی تھیں۔ اپنے بھائی سے بے لوث محبت کے ساتھ خدمت دین کی جدوجہد میں شامل ہونے کا احساس بھی ان کے جذبات پر حاوی ہوتا تھا۔ وہ میرے کپڑوں کا خیال رکھتیں اور میرے کمرے کی بے ترتیبی کو بڑی خوش سلیقگی سے ترتیب دیتیں۔

جب تحریکی زندگی میں ایسی مددگار بہن کا ذکر آیا ہے تو ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ انھی دنوں ہم نے سوچا کہ طالبات میں بھی تحریک کا دعوتی کام ہونا چاہیے۔ یہ ۱۹۵۱ء یا ۵۲ء کی بات ہے۔ یہ کام ضروری مگر مشکل اور نازک بھی تھا۔ پیر کالونی میں جمعیت کے کچھ لوگ تھے، جن میں تنظیم واسطی صاحب اور دوسرے رفقا کی بہنیں تھیں۔ ان رفقا میں انجینیرنگ میں میرے ہم کلاس قاضی محمد انوار الحق صاحب بھی تھے۔ اب وہ ملک کے مایہ ناز انجینیر، بہت خدا ترس اور ایک باعمل آدمی ہیں۔ یہ اس وقت بھی میرے گہرے دوست تھے، اب بھی ہیں۔ اس لحاظ سے پڑوس میں رہتے تھے کہ جمشید روڈ پر ان کا گھر تھا اور ہم کالونی میں رہتے تھے۔ انوار صاحب کی بھی بہنیں تھیں۔

ہم نے طے کیا کہ طالبات اجتماع کریں۔ چنانچہ میرے گھر پر یہ اجتماع ہوا۔ ہماری بہنیں ابھی یہ تجربہ نہیں رکھتی تھیں کہ پروگرام کر سکیں، لہٰذا میں نے پردے کے پیچھے سے ایک تقریر میں ان بہنوں کے سامنے دعوت پیش کی۔ بہرحال اس پر اعتراض وارد ہوا کہ نوجوان لڑکے، نوجوان لڑکیوں کے سامنے کیوں تقریر کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے، کہ کوئی موقف لیں، دلائل دیں اور کوئی بات کریں۔ لیکن دل یہ ضرور جانتا تھا کہ ہم غلط نہیں کر رہے۔ بہرحال ہم فتنے سے بھی ڈرتے تھے۔ یوں چند اجتماعات کر کے ہم نے خود ہی یہ سلسلہ ختم کر دیا اور پھر طالبات میں کام نہیں ہوا۔

اس کے سترہ اٹھارہ سال بعد ستمبر ۱۹۶۹ء میں، ملتان میں اسلامی جمعیت طالبات کی بنیاد پڑی۔ اگر اس وقت وہ کام کراچی میں شروع ہو کر پھیل جاتا، طالبات کا کام، اسلامی جمعیت

طلبہ کے کام کا ہی ایک حصہ اور ایک علاحدہ ونگ رہتا تو یہ کام بہت زیادہ بڑھ سکتا تھا۔ مجھے شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم سے وہ بہت بڑی کوتاہی ہوئی تھی۔

اب بھی پردے کے پیچھے سے خواتین کے سامنے خطاب ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر لڑکیاں حجاب میں ہوں، تو اس طرح سے پردے کے پیچھے بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر مسجد نبویؐ میں خطاب ہوتا ہی ہوگا، جس میں عورتیں حجاب میں ملبوس ہوکر مجلس میں بیٹھتی ہوں گی۔ عید کی نماز کا بھی ذکر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مردوں سے خطاب کر کے پھر عورتوں کی طرف گئے، ان سے بھی خطاب کیا اور ان کے بیچ میں پردہ نہیں حائل ہوگا۔ ان چیزوں میں اپنے معیار اور دینی عمل کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔

ہمارے یہاں پردے کے پیچھے سے خطاب معروف ہے۔ اس میں فائدہ رہتا ہے اور نقصان بھی ہوتا ہے۔ فائدہ تو یہ رہتا ہے کہ آدمی کے اوپر کسی قسم کا بھی موڈ ہو، کوئی پروا نہیں۔ جب تک آواز اپنے قابو میں ہے، بات ٹھیک جاری رہتی ہے، البتہ جب سامعین سامنے بیٹھے ہوں تو پھر ہر حرکت پر قابو رکھنا پڑتا ہے۔ چہرے کے تاثرات اور ہاتھ کے اشاروں تک کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر مقرر کا سامعین سے براہِ راست ربط نہ ہو تو اس میں بھی ایک مشکل پیش آتی ہے۔ میں ان مقررین میں سے ہوں کہ جو سامعین سے ربط رکھتے ہیں، اور سامعین کے ردعمل سے اپنی تقریر میں برموقع تبدیلی کی کوشش بھی کرتے ہیں، کہ اگر سامعین بور ہو رہے ہیں تو بات مختصر کردیں۔ اگر یہ محسوس ہوا کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو اس کو آسان کر دیا۔ یہ نہیں کہ جو طے کر کے آئے ہیں کہ بولنا ہے، اور وہی بول کے رہیں گے، میرا تقریر کا یہ انداز نہیں رہا۔ سامعین کا ردعمل مقرر کی تقریر میں تفہیم، تسہیل، روانی اور زورِ خطابت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

طالبات میں کام نہ ہونے کا تحریک کو نقصان پہنچا، اور ایک بڑا اہم مورچہ متاثر ہوا۔ اس کام کے لیے میری بہن عطیہ اور گھر کے دوسرے لوگوں نے بڑے شوق اور جذبے سے

کام شروع کیا تھا، مگر یہ اسی حد تک چل کر ختم ہو گیا۔

پیر کالونی کا رہایشی حلقہ

عبداللہ جعفر صدیقی بھائی کا وجود جمعیت میں دعوتی لحاظ سے روشنی کا مینارہ تھا۔ پیر الٰہی بخش صاحب صوبہ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کی رہایش جامع مسجد کے ساتھ تھی۔ ہم نے ان سے بھی براہِ راست تعلقات قائم کیے تھے۔ یہاں پر بہت اچھا اور مضبوط حلقہ تھا۔ جامع مسجد کے چاروں طرف رہایش پذیر کئی لڑکے ہمارے ساتھ تھے۔ اسی طرح مسجد کے قرب و جوار میں رہنے والے بہت سے لڑکے ہمارے ساتھی تھے۔ یہاں کی ہاشمی مسجد میں بھی ہم نے نمازیں پڑھیں۔ کالونی اسکول میں عبداللہ جعفر بھائی پڑھاتے تھے۔ یہاں پر ظہیر عالم نے اس زمانے میں اسکاؤٹ تحریک شروع کی تھی۔ یہ بڑی کامیاب تحریک تھی۔ شیخ محبوب علی (م: اپریل ۱۹۹۱ء)، ان کے بھائی محمود، مقصود سب وہیں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ طلعت سلطان، ناظر علی وغیرہ بھی اسی رہایشی حلقے کے مذکورہ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔

پیر کالونی کے رہایشی حلقہ نے ناظم آباد، چاکیواڑہ، بولٹن مارکیٹ، لیاری، بندر روڈ اور فریئر روڈ وغیرہ کے لیے ایک ایسی مضبوط بنیاد فراہم کر دی تھی، کہ جس سے جمعیت کی طرف لوگ کھنچے آئے۔ ان سرگرمیوں کی بنیاد اسٹڈی سرکل کا نظام، شب بیداریاں اور تربیت گاہیں تھیں۔ یہ ایسا منفرد پہلو تھا، جس کو بہت سوچ سمجھ کر رائج کیا گیا تھا۔ اسے چلانے کے لیے میں نے خود آگے بڑھ کر مقدور بھر جو حصہ ادا کیا، اس کی کچھ تفصیل آگے چل کر بیان کروں گا۔

تربیت کا مرکزی نکتہ

احباب میں حسنِ ظن کی بنیاد پر یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ کراچی جمعیت کا مزاج، خرم کا بنایا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ انفرادی نہیں بلکہ ایک اجتماعی عمل کا نتیجہ تھا، جس میں ہر کوئی

اپنی صلاحیتوں کا بہترین حصہ ادا کر رہا تھا اور یہ حصہ دیانت داری سے ادا کر رہا تھا۔ جب یہ بات آ گئی ہے تو اس کی یادیں تازہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ہم سبھی کی سوچ اور فکر کا بنیادی سرچشمہ قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ ہماری تقریروں اور گفتگوؤں کا محور بھی یہی تھے، اس لیے تربیت کی نہج اسی سے روشنی حاصل کرتی تھی۔ خود مجھے یہ سعادت حاصل تھی کہ والدہ کی توجہ سے، بچپن ہی میں قرآن سے گہرا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ **ترجمان القرآن** میں **تفہیم القرآن** کے باقاعدہ مطالعے نے اسے اور مضبوط بنایا۔ اس ذوق کی آبیاری کے لیے دوسری بہت ساری چیزیں بھی تھیں۔

ان سب عوامل نے مل ملا کر دعوت پھیلانے کو مرکزی نکتے کی حیثیت دے دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ آخرت میں جنت کی طلب اور دوزخ سے بچنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی، اگرچہ یہ کوئی بہت سوچ کر بالکل واضح جملوں میں نہیں پڑھا تھا۔ ہمارا مطالعہ ہمیں یہی مینارۂ نور دکھاتا تھا۔ اسی لیے اس زمانے میں بھی میری گفتگوؤں، تقریروں اور درس وغیرہ میں اس طلب کو اولین اہمیت حاصل تھی اور اب تک اسی کو اہمیت حاصل ہے۔ اسی ذوق کو بڑھانے کا قائل ہوں اور اسی پر مجھے اطمینان ہے کہ دینی جدوجہد کا اصل محرک یہی ہے۔

جنت کی طلب

جنت کی طلب اور رب سے ملاقات کے شوق کو بطور محرک ہم جس قدر اُجاگر کریں گے، اتنا ہی لوگوں کے دل توانا ہوں گے، ان میں قوتِ عمل اور استعدادِ کار پیدا ہوگی۔ ساتھیوں کے عمل میں سرگرمی پیدا ہوگی اور کردار میں استحکام آئے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم صرف اسلامی انقلاب، اسلامی حکومت یا تنظیم کی دنیوی کامیابی وغیرہ پر زور دیں گے، اتنا ہی ہمارا کام کمزور ہوتا چلا جائے گا، ٹھٹھرتا جائے گا بلکہ روح نکلتی جائے گی۔ یہ حادثہ کسی حد تک پیش آ رہا ہے اور آ چکا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں جب مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب [م:۱۳ نومبر ۱۹۹۸ء] کی کتاب اساسِ دین کی تعمیر ہمارے گھر پر آئی تو اس میں، میں نے اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، نماز اور صبر وغیرہ کو پڑھا۔ ان مضامین نے میرے اُوپر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ان چیزوں کو اخذ کیا، جذب کیا اور یاد کیا۔ پھر ان باتوں کو اپنے کلام، اپنی گفتگو اور اپنی فکر کا حصہ بھی بنایا۔ اسی میں یہ بات درج تھی، کہ اگر یہ مقصد بھی ہو کہ اسلامی انقلاب برپا ہوجائے، پھر بھی اللہ تعالیٰ کو جو مقصد حقیقی طور پر مطلوب ہے، وہ اس کی رضا اور جنت ہے۔ چنانچہ یہ چیز دعوتی سرگرمیوں میں سب سے اہم اور مرکزی مقام کی حامل تھی۔

دوسری چیز تھی اخلاق۔ حسنِ اخلاق میں، خاص طور پر اجتماعی اور سماجی زندگی کے روزمرہ معاملات میں، سچ بولنے اور وعدے کرنے میں، بڑی پختگی اور ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہیں بھی کوئی بدمعاملگی یا بے ایمانی نہ کرے۔ روزمرہ زندگی کے معاملات میں بڑی احتیاط اور بڑی پابندی کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں فکری تربیت کے لیے حقیقت توحید، حقیقت شرک، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، رودادیں، رسائل و مسائل وغیرہ کتب ہماری سوچ اور ہماری فکر کا حصہ تھیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں 'تبلیغی جماعت' سے متاثر ہوں، اس لیے میں نے جمعیت کو تبلیغی جماعت کے سے سانچے میں ڈھالا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اخوان المسلمون سے متاثر تھا، اس لیے اس کے سانچے میں ڈھالا۔ خصوصاً ۱۹۵۳ء میں کراچی کے اجتماع میں، جب اسرار صاحب کے بجائے خورشید بھائی جمعیت کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوگئے تو اسرار صاحب نے اجتماع ارکان میں شعلہ بار تقریر کرتے ہوئے ایک الزام یہ بھی لگایا تھا کہ ''خرم نے جمعیت کو جماعت کے مزاج سے منحرف کردیا ہے اور اس کا اپنا مزاج بھی جماعت کا مزاج نہیں ہے''۔ یہ الگ بات ہے کہ جو یہ کہنے والے تھے، بعدازاں وہ جماعت سے کتنی دُور گئے اور انھوں نے جماعت کو کتنا بُرا بھلا کہا۔ مزاج اور سوچ کے جزوی اختلاف اور پالیسی پر کچھ ذہنی تحفظات کے باوجود الحمدللہ میں کبھی پگھلا نہیں، کمزوری نہیں دکھائی اور پوری

استقامت کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ شعوری طور پر میں جماعت کو یہ مقام نہیں دیتا کہ وہ کوئی بت ہے، جس کی مجھے پرستش کرنی ہے۔ نہیں، پرستش تو صرف اللہ کی کرنی ہے۔ اس لیے کسی وقت بھی جماعت کو چھوڑنے کے آپشن کو کھلا رکھتا ہوں، اختلاف بھی ہوتا ہے مگر صرف تدابیر پر۔ اس لیے اس پورے عرصے میں یہ نوبت نہیں آئی کہ اس آپشن کو اختیار کروں۔ والدہ کی تربیت سے اور پھر جو کچھ شروع میں پڑھا، یہ اس کا اثر اور اللہ کا کرم ہے۔ جمعیت میں آنے کے بعد جیسے جیسے مختلف لوگوں سے ملتا رہا یہ اس کا اثر بھی ہے۔ پھر سعید رمضان کی صحبتوں اور مولانا مسعود عالم ندوی [م: ۱۶ مارچ ۱۹۵۴ء] سے ملاقاتوں کا اثر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں نے بھی اس سوچ کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا۔

یہ وہ چیزیں ہیں، جنھوں نے بے جا تعصب اور تنگ نظری سے بچایا، اور اس طرح قرآن و سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے نے بنیادی سرچشمے سے وابستہ رکھا۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ جماعت کے مزاج کے اندر کوئی ایسی چیز ہے، جو دین کے مزاج سے مختلف ہو۔ چنانچہ سیاست کی حد تک، جو کچھ بھی میری سوچ ہے، وہ 'تبلیغی جماعت' کے لیے ناقابلِ قبول ہو گی یا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے لیے ناقابلِ قبول ہو گی۔ 'اخوان المسلمون' بھی اس سوچ کو مشکل سے قبول کریں گے۔ اخوان سے اب کچھ مزید قرب ہوا ہے، اور ان سے مختلف مسائل پر بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر حسن ترابی صاحب (سوڈان) کی سوچ سے کافی قریب ہوں، اگرچہ وہ خود اخوان کے مرکزی دھارے میں نہیں فٹ ہو سکے۔ اس لیے کسی فرد کو کوئی لیبل لگا کر بات نہیں کرنی چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا میں نے کیا اور کیا کہا؟

کچھ ذکر، ذکر کا

ایک مثال دیتا ہوں ذکر کی۔ چند سال پہلے جب میں انگلینڈ سے کراچی آیا تو وہاں ذکر کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کے بعد کچھ مسنون اذکار کی تعلیم دی۔ ان اذکار کو خود میں

نے بھی پڑھا اور دوسروں نے ساتھ دہرایا، تاکہ انھیں یاد ہوجائے۔ اس بات پر مجھے فوراً یہ ردعمل ملا، کہ لوگ کہہ رہے ہیں: ''یہ تصوف کی چیز ہے، اس لیے ایک غلط چیز ہے، اور پھر جماعت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی'۔ میں نے کسی بحث میں پڑنے سے اجتناب کیا۔ اس کے بعد وہاں ایسا پروگرام نہیں ہوا۔ لیکن پھر یہی پروگرام میں نے لاہور میں آ کر کیا، اس کے بعد پورے پنجاب کے اجتماع میں کیا، جسے لوگوں نے پسند کیا۔ کچھ عرصے بعد جماعت کے منصوبے میں بھی 'مجلس ذکر' کا لفظ آیا۔

اسی اثناء میں ایک مرتبہ صوبہ سرحد میں جماعت اسلامی کا کوئی تربیتی اجتماع تھا، جہاں میں اس مرکزی منصوبے کی تشریح کر رہا تھا۔ وہاں پر محترم مولانا گوہر رحمٰن نے کچھ تیکھے انداز میں سوال کیا کہ ''مجلس ذکر سے آپ کیا مطلب لیتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''پہلی بات یہ ہے کہ جہاں بھی اجتماعی طور پر اللہ کا ذکر ہو وہ محفل ذکر ہے۔ میرے خیال میں نماز باجماعت ایک محفل ذکر ہے۔ درس قرآن بھی ایک محفل ذکر ہے۔ ہمارا یہ اجتماع اللہ کے کام کے لیے ہو رہا ہے، اور یہاں پر اللہ کا نام لیا جا رہا ہے، اس لیے میرے نزدیک یہ بھی ایک محفل ذکر ہے''۔ پھر عرض کیا کہ: ریاض الصالحین میں امام نووی رحمتہ اللہ علیہ نے حلقات ذکر کا ایک الگ باب باندھا ہے۔ اس میں اہل ذکر کی مجلسوں کو پانے کے لیے فرشتوں کا نکلنا مذکور ہے، کہ اس مجلس میں وہ جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں یعنی تسبیح، تحمید، تہلیل، جنت کی طلب اور دوزخ سے نجات، تو یہ ساری چیزیں ذکر میں شامل ہیں۔ لوگ جمع ہوکر اگر مسنون دعائیں مانگیں وہ بھی ذکر ہے۔ ہمارا یہ اجتماع مسنون شرعی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے اگر وہ چیزیں جو مسنون ہیں، اس اجتماع میں بیٹھ کر کی جائیں تو ذکر کے ذیل میں آئیں گی'' —— مولانا گوہر صاحب بہرحال عالم آدمی ہیں اور میرے ساتھ شفقت برتتے اور محبت کرتے ہیں، انھوں نے اس دلیل کو قبول کیا۔

زیارتِ قبور کا عمل

یہاں تک کہ ہم نے قبرستان جانے کو رواج دیا۔ ویسے بھی عبرت پذیری کے لیے کسی وقت قبرستان چلے جانا چاہیے۔ ہمارے سامنے یہ حدیث رسولؐ تھی جس میں آپؐ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ ''میں نے تم کو قبروں پر جانے سے روکا تھا، مگر اب جایا کرو''۔ اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ''تم اب قبروں کے پاس جایا کرو، کیونکہ قبروں کے پاس جانا دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتا اور آخرت کو یاد دلاتا ہے'' (ابن ماجه)۔ مسلم میں درج ہے: ''قبروں کو جا کر دیکھا کرو، کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں''۔ اس لیے ہم نے جمعیت کے دور میں قبرستان میں جانے کو بھی اختیار کیا۔ وہ کیفیت مجھے یاد ہے، قبرستان میں جانے اور لے کر جانے کی۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالوہاب (ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن اور سابق وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی) جو زمانۂ طالب علمی میں مجھ سے بہت قریب تھے، ایک روز کراچی ایئرپورٹ پر مل گئے۔ جمعیت کے زمانے کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کہنے لگے کہ ''مجھے ابھی تک یاد ہے جو آپ ہمیں قبرستان میں لے کر گئے تھے۔ ذرا ایک بار یہاں ہمارے انسٹی ٹیوٹ [آئی بی اے] میں آئیں۔ جو طلبہ وہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کے لیے ایسا ہی پروگرام ترتیب دیں، تاکہ ان میں مادہ پرستی اور دنیا کی حد سے بڑھی محبت کم ہو''۔ زیارتِ قبور کے اس پروگرام سے لوگوں پر بڑے عمدہ اثرات مرتب ہوئے۔

اپنا بھی ایک واقعہ بیان کر دوں۔ ان معاملات میں محمد عمر چھاپرا بھائی مجھ سے بہت قریب تھے۔ یہ میرے جمعیت سے فارغ ہونے کے بعد کا واقعہ ہے۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ رمضان کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہم قبرستان میں گزاریں گے۔ پاکستان کوارٹرز میں بدر صدیقی رہتے تھے۔ ان سے خاصی دوستی تھی۔ جمعیت کے بڑے اچھے اور متحرک رکن تھے۔ ان کے گھر پر ہم تراویح کے بعد جمع ہوئے۔ چائے کی پیالی پی اور منگھوپیر کے

قبرستان چلے گئے۔ چھوٹی سی مسجد میں چراغ ٹمٹمار ہا تھا۔ اس مسجد میں ہم نے شب بیداری کی۔ اس رات ہم صرف دو وہاں پر موجود تھے۔ ہُو کا عالم تھا، ہمارے چاروں جانب قبریں تھیں۔ اسی دوران آدھی رات کے وقت ایک جنازہ بھی آیا۔ نمازِ جنازہ میں ہم بھی شریک ہوئے۔ ایسے سناٹے میں جنازے کا آنا اور اس وقت نماز کا ہونا، یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو اب تک دل کے اندر محفوظ ہے اور اکثر یاد آتا ہے، اس کے ہم پر بڑے دُور رس اثرات پڑے ___ جمعیت کے اندر اس بات کو رائج کیا۔

موت کی یاد، اللہ سے ملاقات کی تیاری میری گفتگوؤں اور تقریروں میں ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ یہ مختلف چیزیں ہیں جو اس زمانے میں، شاید اتنی سوچ سمجھ کر تو نہیں اختیار کی تھیں، لیکن واضح اور متعین طور پر گفتگوؤں میں، تقریروں میں، درسوں میں بہت نمایاں رہتی تھیں اور ان کے اثرات آج بھی نمایاں طور پر اپنی طبیعت پر محسوس کرتا ہوں۔

رعایتی ٹکٹ، غلطی پر پشیمانی

اب ذرا ۱۹۵۰ء میں جمعیت کے تیسرے سالانہ اجتماع (۲۵، ۲۶ نومبر) کی یاد تازہ ہو جائے۔

اس وقت میں کراچی جمعیت کا ناظم تھا، جب ہم اس اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور گئے۔ ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ مالی تھا۔ اس وجہ سے اجتماع میں جانا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے پاس تو کراچی شہر میں بس کے کرائے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، کجا یہ کہ کراچی سے لاہور تک کے سفری اخراجات پورے کرتے۔ لیکن وہاں جانے کو دل تڑپتا تھا۔ لاہور دیکھا نہیں تھا، جماعت کے بزرگوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، دل بے چین تھا کہ اب جانا چاہیے، کراچی جمعیت کے رفقا کی، ناظم اعلیٰ ظفراللہ خاں صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ ہم سب جوش اور ولولے سے کام کر رہے تھے اس لیے جب ۱۹۵۰ء کے سالانہ اجتماع کی اطلاع آئی، تو دل بے چین تھے کہ ضرور جانا چاہیے۔ لیکن پیسہ جیب میں نہیں ہے، کیسے جائیں؟

چنانچہ بہت سوچ کر ہم نے فیصلہ کیا، کہ ریلوے کا رعایتی ٹکٹ حاصل کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ دس طلبہ ہوں تو ریلوے کا رعایتی ٹکٹ ملتا ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی مگر جانے کے لیے صرف چھے تیار ہوئے۔ ایک میں تھا، ظفر اسحاق، خورشید بھائی، عبداللہ جعفر صدیقی کے علاوہ دو ساتھی تھے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کیا کریں؟ کیونکہ اتنی تعداد پر رعایت نہیں ملے گی۔

فوری طور پر ہم نے عملی راستہ یہ نکالا کہ فی الحال دس افراد کا ٹکٹ بنوا لیا جائے اور باقی اسٹیشن پر کھڑے ہوکر ہم چار ٹکٹ فروخت کر دیں گے۔ اس وقت فوری طور پر ہمارے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ یہ اقدام ناجائز ہے۔ بس فوری طور پر یہ ایک عملی تدبیر سامنے آ گئی۔ جس طرح جلدی میں، انسان نیکی کرنے کے لیے بعض غلط کام بھی کر جاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو شیطان نے کوئی برائی کی کشش سے نہیں پھسلایا تھا۔ بلکہ ختم نہ ہونے والی بادشاہت اور دائمی زندگی کی نعمتوں کا واسطہ دے کر ان کو ممنوعہ درخت کے قریب لے گیا تھا۔ بہرحال ہم نے دس طلبہ کا رعایتی ٹکٹ بنوا لیا اور اس طرح ہم لوگ لاہور چلے گئے۔

لاہور کی داستان تو میں بعد میں بیان کروں گا کہ وہ بڑا اچھا اور تاریخی دورہ تھا۔ اس سے ہم نے بہت کچھ حاصل کیا اور جمعیت کو بھی کراچی کے تجربوں سے بہت کچھ دیا۔ کراچی جمعیت کے بارے میں منفرد کام کا تاثر تھا، اور لوگ اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ لاہور سے ہمارا رابطہ تھا۔ لاہور کے چاروں طرف حلقوں سے آنے والے رفقاء اور بھائیوں سے، بڑی پُرلطف ملاقاتیں رہیں —— لیکن یہ خلش ہمارے دلوں میں رہی کہ ریل میں سفر کے لیے اس طرح ٹکٹ بنوا کر ہم نے کوئی صحیح کام نہیں کیا۔ اخلاقی طور پر یہ ٹھیک نہیں ہے، کہ چار ٹکٹ ہم نے دوسروں کو بیچ دیے۔ خیر لاہور گئے تھے اور اطمینان سے اجتماع بھی گزر گیا، لیکن واپس آتے ہوئے یہ احساس بڑا شدید ہوتا گیا۔ اتنا شدید کہ ہمارے لیے سونا مشکل ہوگیا۔ سب نادم تھے، آنکھیں پُرنم تھیں اور ہم میں سے ہر ایک

اسی پریشانی کے اندر مبتلا تھا۔ سفر کے دوران ایک وقت آیا کہ جب ہم نے ایک دوسرے سے بات شروع کی تو معلوم ہوا، کہ سبھی اس احساس گناہ وندامت میں مبتلا ہیں۔ سب شرمندہ ہیں، سب کو افسوس ہے، اللہ کے آگے سب بے انتہا گڑگڑا رہے ہیں کہ اے اللہ، ہم کو معاف کر دے۔

اس کے بعد مختلف جگہوں پر جو دیکھنے میں آتا رہا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے تو یہ غلطی، شاید غلطی بھی شمار نہ ہو۔ لیکن اس تربیتی عمل سے گزرتے ہوئے اس وقت ہماری حس کس قدر تیز تھی، یہ اس کی ایک مثال ہے۔ لیکن جہاں حیلہ شرعی کی ضرورت پڑی، مثلاً جیسا کہ میں نے دفتر لینے کے لیے پگڑی کے بارے میں بیان کیا ہے، اس میں مجھے کوئی شرمندگی یا ندامت نہیں ہوئی۔ مولانا مودودی کا 'غضِ بصر' کرنے والا جملہ جواز نہیں تھا، بلکہ خود بھی خیال ہوتا تھا کہ یہ کام ناگزیر ہے اور اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ بعد میں فقہی مباحث پڑھے تو ہم کو معلوم ہوا کہ یہ رشوت، سود وغیرہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ بہر حال اس پر ہم ہمیشہ مطمئن رہے کہ یہ دفتر والا صحیح کام تھا، مگر اس کے برعکس رعایتی ٹکٹ کے واقعے نے تو من کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

یہ بات خدانخواستہ میں نے اپنے رفقا کی فضیلت بیان کرنے کے لیے نہیں بتائی، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس وقت یہ تاثر اور یہ کیفیت ہوا کرتی تھیں۔

لاہور میں خوش گوار رابطے

بہر حال، اجتماع میں ہم پہنچے تو سب سے پہلے پھول بلڈنگ گوالمنڈی گئے۔ وہاں پر ناظم اعلیٰ ظفراللہ خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ملک نصراللہ خاں عزیز صاحب کی باغ و بہار، شفیق اور محبت بھری شخصیت نے ہمارا استقبال کیا۔ ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ اخبار کوثر میں جو لوگ کام کر رہے تھے، ان سے بھی ملاقاتیں یاد ہیں۔

لاہور جمعیت کے ساتھی اجتماع کے بعد ہم کو اپنے کالجوں میں لے گئے۔ ایف سی کالج کے محمد حسن صاحب ہمیں اپنے ہوسٹل یوئنگ ہال میں لے گئے۔ شام کا کھانا وہیں پر کھایا۔

ہاسٹل کا کھانا عام طور پر اچھا نہیں ہوتا، اور میں تو سبزی کا بالکل عادی نہیں تھا، لیکن یہاں پر گوشت میں سبزی پکنے کا بالکل نیا انداز دیکھا۔ رات وہیں پر گزاری۔ ایف سی کالج کے ساتھیوں سے محبت کے رشتے قائم ہو گئے۔ ڈاکٹر عبداللطیف (اوکاڑہ) سے بھی بہت گہرا تعلق قائم ہوا۔ ایک اور ساتھی جن کے نام میں عباس آتا تھا ان سے بھی خط وکتابت کا رابطہ رہا۔

اس کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج گئے۔ وہاں جمعیت کی بڑی مضبوط شاخ تھی۔ وہاں پر جمعیت کے کئی تاسیسی ارکان تھے۔ ڈاکٹر نسیم صاحب، ڈاکٹر عبدالجبار شاکر مرحوم، ڈاکٹر یقین صاحب، ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب، ڈاکٹر خالد نعیم بیگ صاحب وہاں پڑھتے تھے۔ اور بھی کئی ساتھی ملے جو جمعیت میں خوب نمایاں تھے۔ یہیں پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے خاصی طویل ملاقات رہی اور ان سے اپنی رشتہ داری کا بھی انکشاف ہوا جس سے بہت قربت ہوگئی۔ وہاں سے آنے کے بعد ان سے بھی بہت خط وکتابت رہی۔ پتہ نہیں وہ خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں یا نہیں۔ بہرحال میرے پاس تو اسرار صاحب کے خط محفوظ تھے، لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہ سب سرمایہ ضائع ہوگیا۔ میڈیکل کالج ہاسٹل میں جمعیت کے کام کے بارے میں رات بھر گفتگو ہوتی رہی۔ ذاتی محبتوں اور تعلقات کی استواری کا یہ بڑا دل آویز تجربہ تھا۔ بہت سارے لوگوں سے محبت کے تعلقات ذاتی سطح پر قائم ہوئے۔

سفر کے جمعیت پر اثرات

کراچی جمعیت سے اگرچہ صرف چھے افراد ہی لاہور آئے تھے، تاہم انھوں نے جمعیت کے کام میں بہتری کے لیے کچھ اقدامات تجویز کیے۔

پہلا قدم جمعیت کے تین نکاتی مقاصد میں اضافے کا پروگرام تھا۔ ہماری تحریک سے، جن دو نکات کا اضافہ ہوا، ان میں سے ایک طلبہ کے مسائل حل کرانے کی کوشش اور دوسرا اسلامی نظامِ تعلیم کے نفاذ کی جدوجہد کرنے کا تھا۔ ان دو نکات کے اضافے سے طلبہ کی

خدمت اور دوسری جانب طلبہ یونین انتخابات میں شرکت کا بھی دروازہ کھل گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کراچی میں اس وقت تک ہم نے کسی کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخاب میں حصہ لیا ہو۔ لیکن لاہور میں شاید حصہ لیا جاچکا تھا اور میڈیکل کالج لاہور میں ایک ہڑتال بھی ہوئی تھی۔ جب کہ ادھر ہم کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج سے خدمت طلبہ کے کام کا آغاز کر چکے تھے۔

کئی لوگوں کے خیال میں، ان نکات سے جمعیت کے رول میں بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان نکات کے اضافے سے ایسا ہوا، بلکہ جو کچھ جمعیت کا مقصد تھا، یہ اسی کی ایک توسیع تھی۔ ہم اس پر اس وقت خاصے مطمئن تھے اور اب بھی ہیں، کہ طلبہ کی خدمت بھی جمعیت کا کام ہونا چاہیے۔ اسی طرح طلبہ کے مسائل حل کرانے میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ طلبہ کی حد تک جس قیادت تک رسائی ممکن ہے، اس کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے اور اسلامی نظامِ تعلیم کی وضاحت کے لیے جو جدوجہد کر سکتے ہوں، وہ بھی کرنا چاہیے۔ بہرحال پروگرام میں یہ تبدیلی ہوئی، جس نے ہمارے کام کو ایک وسیع بنیاد فراہم کر دی۔

دوسرے، یہ کہ اس میں اگرچہ میں نے خود بڑھ کر کوئی کوشش نہیں کی، لیکن ہم نے یہ ضرور محسوس کیا تھا کہ ۴۷ء سے ۵۰ء تک تین سال ہوگئے، ایک ہی فرد کا مستقل طور پر اتنے عرصے تک اس منصب پر فائز رہنا، ایک طلبہ تنظیم کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اگرچہ ہم سب لوگ ظفراللہ خاں صاحب کے خلوص، سادگی اور محبت سے بہت متاثر ہوئے، لیکن ہمارے ذہن میں جمعیت کا جو مقصد تھا، اس کو جس طرح پھیلنا اور پاکستان کی تمام طلبہ برادری کے دل جیتنے والی طلبہ تنظیم بننا چاہیے، اس کے تقاضے ذرا مختلف تھے۔ اس حوالے سے ہمارا یہ خیال تھا، کہ جمعیت کی تاسیس کے ابتدائی برسوں میں ظفرصاحب نے جس قدر جاں فشانی اور محنت سے کام کیا ہے، اس کا سب کو اعتراف ہے۔ لیکن اس کے بعد مزید پھیلاؤ ان کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے جمعیت کی قیادت کو بدلنا چاہیے۔

اس کوشش میں عبداللہ جعفر صدیقی پیش پیش تھے، اور بھی لوگوں نے بات کی ہوگی،

یقیناً تھوڑی بہت کنویسنگ بھی ہوئی۔ ہم کو کنگ ایڈورڈ کالج کے محمد نسیم صاحب اچھے لگے، گفتگو کا انداز بہت شُستہ اور سنجیدہ تھا، سمجھ دار آدمی تھے۔ بہر حال ہم نے ان کے حق میں رائے دی اور عبداللہ جعفر بھائی نے خود سے ان کے لیے کام بھی کیا کہ اس طرح وہ جمعیت کے دوسرے ناظم اعلیٰ منتخب ہوگئے۔ تین سال بعد جمعیت کی مرکزی قیادت میں پہلی بار تبدیلی آئی تھی۔ یہ دوسرا کام تھا، جس سے جمعیت میں مستقبل میں قیادت کی تبدیلی کا راستہ کھل گیا۔

کچھ ذکر شب بیداری کا

لاہور میں، کراچی جمعیت کے مختلف کاموں کا ذکر ہوا۔ سالانہ اجتماع میں رپورٹ پیش ہوئی۔ پہلے تو اجتماع میں اور پھر لاہور کے ہر کالج میں گفتگو کا یہ موضوع تھا کہ ''کراچی میں کام کیسے ہو رہا ہے؟'' ہم بھی مسابقت کے جذبے سے اور دوسرے مقامات کے کام کو بہتر بنانے کے لیے مؤثر طریقے سے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے، بلاشبہ کراچی جمعیت کا کام دو تین سالوں میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھا تھا، اور کثرت سے لوگ جمعیت کے قریب آئے تھے۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ کالجوں میں، اساتذہ میں اور مختلف جگہوں پر جمعیت کے اثرات نمایاں تھے۔ ہم نے اپنے کام کی برکت میں، اخوان المسلمون کا تذکرہ کیا، تربیتی پروگراموں اور شب بیداری کا بھی ذکر آیا۔

ایک مجلس میں، میں شب بیداری کا پروگرام بیان کر رہا تھا، جہاں پر ڈاکٹر نسیم صاحب اور غالباً حفظ الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے۔ یہ مجلس ہیلی کالج آف کامرس یا پنجاب یونی ورسٹی لا کالج میں ہوئی تھی۔ ہم بیان کر رہے تھے، جنھیں سنتے وقت کچھ لوگوں کا جستجویانہ انداز تھا، کچھ کا تمسخر آمیز انداز تھا، کچھ کے زیرلب مسکراہٹ تھی اور کچھ واقعی سمجھنے جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ دراصل ان سب رفقا کے لیے یہ ایک اجنبی سا پروگرام تھا۔

سعید رمضان کی متعارف کردہ شب بیداری ہم نے پوری طرح اختیار نہیں کی تھی کہ

جس میں لوگ ہاتھ میں ہاتھ باندھیں اور حلقہ بنائیں۔ اس کے بعد روشنی گل کردی جائے، لوگ استغفار کریں، اور پھر دعا کریں ـــــ یہ ساری چیزیں، ان ساتھیوں کے لیے بڑی اجنبی تھیں۔ ان کو بتایا کہ ہم نے اس پروگرام کو اس حد تک اختیار کیا ہے، کہ شروع رات میں درس وتذکیر ہوتا ہے، اس کے بعد کچھ لوگ سو جاتے ہیں۔ پھر اُٹھ کر نوافل پڑھتے ہیں، دعا ہوتی ہے اور جب مجلس برخاست ہوتی ہے تو پھر لوگ گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات قبرستان میں بھی چلے جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں اس وقت جمعیت کے لیے اجنبی تھیں، اور جماعت میں تو ان کا کہیں بھی رواج نہیں تھا۔ لوگوں نے بہرحال صبر کے ساتھ سنا۔ ہمارے یہاں تصوف سے جو تھوڑی بہت الرجی ہے، اس کے باعث اذکار وغیرہ کا نام سنتے ہی اجنبیت محسوس ہوئی کہ کہیں تصوف کا احتمال نہ ہو۔

لاہور میں کسی ساتھی نے یہ نہیں محسوس کیا، کہ ہم کوئی ایسا کام کر رہے ہیں، جو قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ ممکن ہے کوئی ایسے راسخ العقیدہ سلفی ہوں، جنھیں رات کو اجتماعی نوافل پڑھنے پر اعتراض ہوا ہو، مگر مجھے یاد نہیں ہے۔ البتہ ہمارے واپس آنے کے بعد اس پروگرام پر اعتراضات ہوتے رہے۔ لیکن بالعموم لوگوں نے اسے قبول کیا۔ پھر تو پاکستان بھر میں یہ شب بیداری جگہ جگہ رائج ہوگئی ـــــ اس اجتماع میں ہمارے تعلقات پورے پاکستان اور خاص طور پر لاہور کے ساتھیوں سے بڑے گہرے قائم ہوئے۔

جماعت سے تعلق

یہاں تھوڑا سا ذکر جماعت کے ساتھ تعلق کا بھی ہوجائے۔

میں بھوپال ہی سے جماعت کے ساتھ وابستہ تھا اور کراچی پہنچ کر جماعت سے وابستہ ہونے کی نیت سے ہی جماعت کے دفتر میں گیا تھا۔ وہاں پر جماعت نے چونکہ مجھے میرا دائرۂ کار بتا دیا تھا، اس لیے جمعیت میں شامل ہوگیا تھا۔ ابتدا میں مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر ہونے والے تقریباً تمام طلبہ کا یہی حال تھا، سوائے ان کے جو براہِ راست جمعیت میں آئے۔ ہم سب کو جماعت کے پورے پروگرام اور اس کی جدوجہد سے، جو ملک کے دستور

اور نظام کو اسلامی بنانے کے لیے وہ کر رہی تھی، پورا اتفاق تھا، اور ہم اس میں برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں جو بھی مہم چلائی گئی، ہم نے شوق و ذوق سے اس میں حصہ لیا۔ 'قرارداد مقاصد' مارچ ۱۹۴۹ء میں پاس ہوگئی تھی۔ مجھے اتنا شوق تھا کہ میں پہلی دستور ساز اسمبلی میں، خود ان کی وہ تقریر سننے گیا تھا، جس میں وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خان نے یہ قرارداد پیش کی تھی۔

اس کے بعد جب 'اسلامی دستور کی مہم' شروع ہوئی، اس میں بھی پیش پیش تھا۔ جب مولانا مودودی رہا ہو کر کراچی آئے، ہم ہراول دستہ تھے۔ اس کے بعد جب پاکستان بھر کے چوٹی کے علما کا اجتماع ہوا، جس میں ۲۲ نکات منظور ہوئے، اس کے انتظام و انصرام میں ہم نے شرکت کی۔ میں نے اس دوران مسجدوں میں جا کر تقریریں کیں اور مختلف جگہوں پر پہنچ کر مہم چلانا شروع کیا۔ ہر چند کہ ہم بجا طور پر اس بات کی تردید کرتے تھے، کہ ہم جماعت کا حصہ ہیں، اور فی الحقیقت تنظیمی طور پر آزاد تھے اور آج بھی جمعیت ایک آزاد تنظیم ہے۔ البتہ ہماری فکر، ہمارا مقصد، ہماری سوچ قرآن و سنت کے مطابق وہی ہے، جس کا راستہ مولانا مودودی نے سجھایا ہے اور جس کی بنیاد پر پہلے جماعت اور پھر جمعیت قائم ہوئی ہے۔ بعد میں لاہور سے کچھ دوستوں نے کہا کہ "یہ تردید بہت زیادہ تھی، نہیں ہونا چاہیے تھی"۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہماری جو صحیح پوزیشن تھی، یہ موقف اس کا ترجمان تھا۔

اس پورے عرصے میں، جو میں نے جمعیت کے ساتھ گزارا، مجھے نہیں یاد کہ ہم نے کبھی جا کر جماعت سے کوئی ہدایت لی، یا جماعت کے پاس سے کچھ وسائل لینے گئے ہوں۔ میرا جماعت کی قیادت سے کوئی باقاعدہ ربط بھی نہیں تھا۔ البتہ جب خورشید بھائی ناظم تھے، تو ان کا چودھری غلام محمد صاحب سے ذاتی سطح پر ربط ہوا۔ یہ تعلق بھی امیر شہر کی حیثیت سے نہ تھا، بلکہ ان کی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے، مشفقانہ دوستی کا رشتہ تھا۔ ہماری کوشش یہ نہیں ہوتی تھی کہ ہم اس بات کو بہ تکرار ضرور کہیں، بلکہ عملی سطح پر کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہم جمعیت کو خود مختار رکھیں۔ لیکن اس کے باوجود جماعت کے وہ کام، جن میں

ہم سمجھتے تھے کہ دینی، اخلاقی، ملّی اور سیاسی طور پر ہماری شرکت ضروری ہے، اس میں ہم کبھی پیچھے بھی نہیں رہے تھے۔ ہم نے کبھی اس بات کا انتظار نہیں کیا تھا، کہ وہ خود آ کر ہمیں کہیں، یا طلب کر کے حکم دیں، اور نہ انھوں نے کبھی ایسا کیا۔ بلکہ ہر ایسے موقع پر ہم اپنے نظام الاوقات کو طے کر کے میدانِ عمل میں تحریک اسلامی کے شانہ بشانہ چل پڑتے تھے۔

جمعیت کے تربیتی پروگرام ہم خود ہی کرلیا کرتے تھے، کیونکہ ہمارے ہاں لاہور کی طرح بڑے بڑے مربی حضرات موجود نہیں تھے۔ بعد میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب بھی ہمارے پروگراموں میں آئے۔ بالعموم سارے پروگرام ہم خود کیا کرتے تھے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس عمل سے ہماری صلاحیتوں نے نشوونما پائی۔ میں نے تربیت گاہوں میں تقریر کرنے کی خاطر پڑھا، سوچا اور اپنے ذہن کو حرکت دی۔ یہ اصول سامنے رکھا کہ دوسروں کو ایسا کچھ نہ کہوں، جو خود نہ کرتا ہوں۔ اس چیز نے اپنی فکری، علمی اور عملی تربیت میں مدد دی۔

خودمختاری کا ثمر

اگر ہم جمعیت میں آنے کے بعد شروع سے جماعت کا حصہ بن جاتے، وہی کام کرتے جو جماعت کر رہی تھی، اسی طرح کام کرتے جس طرح جماعت کر رہی تھی، تو پھر نئی سوچ، نئے نئے تجربات اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کا یہ نشوونما اور ارتقا شاید ممکن نہ ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود جماعت سے دل کے تعلق اور فکر کے تعلق میں، اللہ کے فضل سے کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ مالی طور پر ہم جماعت سے کسی قسم کی اعانت یا مدد نہیں لیا کرتے تھے، بلکہ مشورہ بھی برائے نام ہوتا تھا۔ تربیتی پروگراموں میں ہم خیال اساتذہ جیسے پروفیسر جلیل الدین احمد خان صاحب، مولانا یحییٰ علی ندوی صاحب، شرافت علی ہاشمی صاحب ہماری مدد کرتے تھے یا پھر ہم خود ہی آگے بڑھ کر، ہمت کر کے ان پروگراموں کو نبھا لیا کرتے تھے۔ اگر ہم صرف انھی سہاروں کے محتاج رہتے تو نہ ہماری تربیت ہو پاتی اور نہ ہمارے

ذہنی اُفق میں وہ وسعت پیدا ہوتی، جو پیدا ہوئی۔

عملی زندگی میں ذاتی طور پر جماعت سے متعلق رہا ہوں۔ جماعت کی غلطیوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ جماعت کی غلطیوں پر اندر کھل کر بولتا رہا ہوں۔ ان باتوں کو وہاں بیان کرتا رہا ہوں، جہاں بیان کرنا ضروری ہے۔ لیکن جماعت بحیثیت ایک تحریک کے، غلبۂ دین کے لیے جو جدوجہد کر رہی ہے، اس کے ساتھ قائم ہونے والے تعلق پر آج تک نظر ثانی کی ضرورت نہیں پڑی۔ بعض دفعہ اختلاف بڑھا تو ذمہ داریاں بھی چھوڑ دیں۔ لیکن بہر حال یہ تعلق سوچ سمجھ کر قائم رہا، اور یہ سب اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہے۔ میں جماعت کو بت نہیں سمجھتا، تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا مگر قاعدے، سلیقے اور متعلقہ فورم میں۔ مگر جب کوئی بات طے ہو جائے تو اختلاف رائے کے باوجود اسے مانا اور عمل کیا ہے۔

جماعت سے تعلق کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہم فیصلہ کرنے میں آزاد تھے اور معاملات میں اپنی آزادی برقرار رکھتے تھے۔ کم از کم میری کوشش یہ تھی کہ اپنے بزرگوں کے قریب بھی رہیں، ان سے محبت بھی کریں، قومی نوعیت کے کاموں میں ان سے تعاون بھی کریں، لیکن اس امر کو ملحوظ رکھیں، کہ ہم ایک علاحدہ اور ایک خود مختار تنظیم ہیں۔ یہ چیز تصور میں بھی باقی رہے اور پالیسی بنانے کے معاملے میں بھی اس سے دست بردار نہ ہوں۔ آج بھی جمعیت اور جماعت دونوں کے لیے یہی زیادہ بہتر پالیسی ہے، جس میں ان کی خود مختاری، حصولِ مقصد کے لیے زیادہ باثمر ہو سکتی ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم جماعت کے اجتماعی کام سے دُور رہے۔ اب میرا مشاہدہ ہے کہ اس حوالے سے بھی صورت حال بدل گئی ہے۔ آج کل جماعت کی بڑی قومی، دینی، ملّی یا سیاسی مہمات میں عموماً جمعیت والے کم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی مہمات میں اور ایسے کاموں میں، ہم دل و جاں سے شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں نے کراچی جمعیت کی نظامت سنبھالی تھی، اس کے کچھ عرصہ بعد 'اسلامی دستور کی مہم' چلی۔ اس میں مختلف نوعیت کے کام تھے۔ چھوٹے چھوٹے جلسے بھی ہوتے تھے، جن میں

ہم نے بھرپور حصہ لیا اور شرکت کی۔ ہم اس بات کا اعلان کرتے تھے، کہ جماعت سے ہمارا کوئی تنظیمی تعلق نہیں ہے اور یہ بات آج کی طرح کل بھی درست تھی۔ البتہ ہمیں اس بات کے اعتراف میں کوئی باک نہیں تھا، کہ نظریاتی طور پر ہم اسی تحریک کا ایک حصہ ہیں، جو مولانا مودودی نے قرآن وسنت کی منشا کے مطابق فکری اور عملی سطح پر برپا کی ہے۔

اسی طرح وزیراعظم پاکستان جناب لیاقت علی خان نے ۱۹۵۰ء میں جو پہلی دستوری سفارشات پیش کیں، ان میں آمریت کی زبردست بنیاد پائی جاتی تھی، اور ساتھ ہی اسلام کے لیے بھی کوئی خوش گوار گنجایش نہیں رکھی گئی۔ 'قرارداد مقاصد' کا کوئی اثر ان دستوری سفارشات میں نہیں دیکھا جاسکتا تھا، حالانکہ یہی وہ اصول تھے جن کی روشنی میں پاکستان کا دستور تیار ہونا تھا۔ مولانا مودودی نے لاہور کے موچی دروازے میں ایک مدلل تقریر کرتے ہوئے ان سفارشات کو مسترد کر دیا تھا۔ جس کے بعد سارے ملک میں احتجاج کی ایک لہر پیدا ہوئی تھی۔ جماعت نے ہی آگے بڑھ کر اس مہم کو چلایا اور اس کی رہنمائی کی۔

خود میں نے مختلف مسجدوں میں تقریریں کیں۔ ہم نماز باجماعت ختم ہونے کے بعد کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دیا کرتے تھے، اور زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں اپنا مافی الضمیر پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان تقریروں کے مؤثر ہونے کے بارے میں بحث نہیں ہے، البتہ اس جذبے کا ذکر ضروری ہے، جو اس وقت جمعیت کے کارکنوں میں موجود تھا۔ اس مہم میں ہم نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے انتخابات ہوئے، مجھے یقین ہے کہ وہاں پر جمعیت کے لوگوں نے انتخابی مہم میں حصہ لیا ہوگا۔ اگرچہ اس معاملے میں مجھے جمعیت کی مجموعی پالیسی یاد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دور میں ہم ان اجتماعی کاموں میں شریک رہے۔

اس زمانے میں مولانا مودودی نے آٹھ نکاتی دستوری مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبے کی

مہم میں، میں ذاتی طور پر شریک رہا اور جمعیت کے سارے کارکن پوری سرگرمی سے شریک ہوئے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جماعت کی ایسی قومی مہمات میں گراس روٹ لیول (عوامی سطح) تک ہم نے شرکت کی۔ حالانکہ جماعت کے اور ہمارے درمیان کوئی تنظیمی ربط موجود نہیں تھا۔ البتہ دل اور فکر کا تعلق ہمیں اس بات پر آمادہ کرتا تھا، کہ قومی نوعیت کی تحریکوں میں اپنا حصہ ادا کریں۔ ہمارے ہاں یہ مسئلہ کبھی نہیں پیدا ہوا، کہ "جب ہم خود مختار تنظیم ہیں تو کیوں ان تحریکوں میں حصہ لیں؟" اس لیے کہ ہم سمجھتے تھے کہ جماعت بھی ہماری اپنی تحریک ہے۔ اپنی آزادی برقرار رکھتے ہوئے اس کی مدد کرنے، اس کے ساتھ تعاون کرنے اور اس کو مضبوط کرنے کے لیے جتنا کچھ بھی کر سکیں اتنا ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔ جماعت سے تعلق کے بارے میں یہ یاد ذہن میں محفوظ ہے۔

ایک اہم واقعہ

شعبہ خدمت خلق کے لیے قربانی کی کھالیں جماعت نے کس سال جمع کرنا شروع کیں؟ مجھے اس کی تاریخ یاد نہیں، تاہم کراچی میں ۱۹۵۰ء سے یہ کام شروع ہوا تھا۔

اس زمانے میں بقرعید کے موقع پر کراچی جمعیت کے سارے کارکن پوری طرح جماعت کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتے تھے۔ میں جب کراچی جمعیت کا ناظم تھا، اس وقت سائیکل پر بوری رکھ کر، پیر کالونی کے ایک ایک گھر جاتا، خود کھالیں جمع کرتا، بڑی خوشی اور طمانیت کے ساتھ اُٹھا کر لاتا تھا۔ یہ کام کرتے وقت، ہم میں سے کسی فرد کی پوزیشن آڑے نہیں آتی تھی۔ کسی کو نہ ناظم اعلیٰ ہونے کا احساس ہوتا اور نہ ہمارے کسی ساتھی کی راہ میں یونی ورسٹی کا طالب علم ہونے کا خیال کوئی رکاوٹ بنتا تھا۔

قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کے اسی زمانے میں ایک دل چسپ تجربہ ہوا تھا۔

عام طور پر کالونی کے مکانوں کی پچھلی گلی میں قربانیاں ہوا کرتی تھیں۔ وہاں پر جانوروں کا خون بہتا تھا۔ اس لیے ہم پچھلی گلیوں میں چکر لگاتے تھے اور جو پہلے پہنچتا تھا، اکثر اسے کھال ملتی تھی۔ اس وقت بھی جماعت کا اتنا وقار، اتنا اعتماد اور اتنی ساکھ موجود تھی،

کہ اکثر لوگ جماعت ہی کے شعبہ خدمت خلق کو قربانی کی کھال دینا چاہتے تھے اور جماعت ہی کے لیے رکھتے تھے۔ اس وقت کے اخباروں میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ ''حکومت کے وزرا، حکام اور اعلیٰ عہدے داروں نے اپنے گھر سے قربانی کی کھالیں جماعت اسلامی کو بھجوائیں''۔ وجہ یہ تھی کہ سیاسی اختلاف کے باوجود انھیں جماعت کی دیانت پر اعتماد تھا____ بہرحال، کالونی کی ایک گلی سے گزرتے ہوئے مجھے ایک مکان نظر آیا، جہاں بکرا لٹکا ہوا تھا اور کھال اُتر چکی تھی۔ ایک بے پردہ اور بنی ٹھنی خاتون وہاں کھڑی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی میں نے یہ سمجھ لیا، کہ یہاں سے تو کھال نہیں ملے گی۔ جوں ہی میں آگے بڑھنے لگا تو انھوں نے مجھے آواز دی اور پوچھا: ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے کہا: ''جماعت اسلامی کی طرف سے''۔ کہنے لگیں: ''یہ کھال آپ کی جماعت ہی کے لیے رکھی ہوئی ہے، اسے لے جائیں''۔

اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا، لیکن میں اس واقعے پر اسی دن سے مسلسل سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔ وہ لوگ اور خاص طور پر وہ خواتین جو بظاہر مغرب زدہ دکھائی دیتی ہیں، یا جو فیشن ایبل ہیں، بہرحال ان میں سے بھی ایک قابلِ ذکر تعداد ایسی ہے، جن کے اندر نیکی اور ہمدردی کے احساسات موجود ہیں، جن کو اگر ہم اللہ کے دین کے لیے اپیل کریں تو ان سے کام لے سکتے ہیں۔ اس طرح یہ خواتین بھی دین کے لیے کچھ نہ کچھ اور تھوڑا بہت کام کرسکتی ہیں۔ اس طرزِ احساس پر، آج تک میرے خلاف بہت سے اعتراضات بھی وارد ہوئے ہیں اور میرے نقطۂ نظر کو غلط طور پر لیا گیا ہے۔

نہایت افسوس سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بدگمانی تک بھی کی گئی ہے، کہ غالباً میں جماعت کو اس طرح کا بنانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ بات صرف یہ ہے، کہ اگر ساری ملّت اسلامیہ کی تمام قوت جمع کرنے کی کوشش کرنا ہے، اور پورے معاشرے میں اسلامی تبدیلی لانا ہے، اور اس عظیم مقصد کے لیے ہر طبقے کی ہر ہر رمق کو جمع کرنا ہے، تو پھر ان بے پردہ، فیشن ایبل خواتین میں بھی ایک ایسی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے، جو اسلامی سوچ، عمل اور اسلامی انقلاب کی اس جدوجہد میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہمارا ساتھ دے سکتی ہے،

جسے نظر انداز کرنا ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ جب ہم ووٹ کے لیے عوام میں آتے ہیں تو یہ کبھی سوال نہیں اٹھایا جاتا کہ فلاں اور فلاں معیار پر اُترنے والے مرد و زن ہی ہمیں ووٹ دیں۔ نہیں، بلکہ سبھی سے ووٹ بھی لیتے ہیں اور انتخابی فنڈ بھی۔

اس وقت میرے لیے یہ ایک عجیب واقعہ تھا اور توقع کے خلاف بھی تھا، تاہم اس نے میرے ذہن کو ایک دم شاک لگایا۔ جس طرح کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں نماز چھوٹنے سے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ پھر مولانا مودودی کی وہ تقریر بھی یاد آئی، جو انھوں نے ایم اے او کالج، امرتسر میں جدید تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل پروفیسروں کے اجتماع میں خطبہ تقسیم اسناد دیتے وقت کی تھی۔ جب اس تقریر کو ترجمان القرآن میں شائع کیا، تو مضمون کے تعارفی جملوں میں کچھ اس طرح لکھا تھا کہ: ''ان سوٹوں میں جو کھلے دل چھپے ہوئے ہیں وہ دارالعلوموں کی عباؤں میں نہیں'' ــــ یہ جملہ بھی ذہن میں محفوظ رہا۔

اس لیے میرا خیال ہے، کہ بے پردہ یا فیشن ایبل مسلم خواتین میں بھی ایک بڑی تعداد اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے محبت رکھتی ہے، اس محبت میں روتی ہے، دکھ درد محسوس کرتی ہے، دین کے کام کے لیے وقت اور پیسہ دینے کو تیار ہے۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے، یقیناً دوسرے لوگوں کا بھی یہ تجربہ ہوگا۔ دینی کوششوں میں ہمیں اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ہمارا حلقہ اگر ان تک پہنچے گا تو ان شاءاللہ ان پر دعوت و تربیت کے اثرات ضرور مرتب کرے گا۔

بنگلہ زبان اور جمعیت

مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلے پر جب جدوجہد شروع ہوئی تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ جمعیت کیا پالیسی اختیار کرے؟

وہاں پر خواجہ محبوب الٰہی صاحب مشرقی پاکستان جمعیت کے ناظم تھے۔ انھوں نے یہ مسئلہ ہمارے سامنے رکھا۔ میں نے مولانا مودودی سے مشورہ کیا تو ان کی رائے یہ تھی کہ ''آپ وہاں کے لوگوں کو سمجھائیں، اور بتائیں کہ اُردو کو کیوں سرکاری زبان ہونا چاہیے''۔

ہم نے جمعیت کی شوریٰ میں اس مسئلے پر غور کیا۔ میری اور شوریٰ کی بھی رائے یہ تھی کہ ''یہی مناسب ہوگا کہ ہم وہاں پر اپنے ساتھیوں کو اس مسئلے میں آزاد چھوڑ دیں۔ اگر وہ حمایت کرنا چاہیں تو اس میں ہم مخالفت نہیں کریں گے''۔ چنانچہ ہم نے یہ پالیسی اختیار کی اور ان کو یہی ہدایت دی کہ ''اگر وہ بنگالی کو سرکاری زبان بنانے کی حمایت کرنا چاہتے ہیں تو کرسکتے ہیں۔ البتہ اس میں جمعیت کا کوئی مرکزی موقف نہیں ہے، ہم اس حد تک نہیں جاسکتے کہ آگے بڑھ کر اس کی حمایت کریں''۔

بعد میں معلوم ہوا کہ جماعت نے وہاں ۹ رکنی وفد بھیجا، جس کے پاس اُردو کی حمایت میں مولانا مودودی کے لکھے ہوئے مضمون پر مشتمل شائع شدہ پمفلٹ تھا۔ اس وفد میں چودھری علی احمد خان صاحب اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب بھی تھے۔ اس وفد نے وہاں پہنچ کر پوری صورت حال کا جائزہ لیا، اور حالات کو سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا، کہ اس پمفلٹ کو نہ تقسیم کیا جائے۔ مطلب یہ کہ اس معاملہ میں ہماری سوچ باغیانہ نہیں تھی، بلکہ حکمت، حالات اور اصول کے لحاظ سے صحیح تھی اور جماعت کی قیادت نے بھی بالآخر وہی فیصلہ کیا جو اس سے پیش تر ہم جمعیت میں کر چکے تھے۔

مشرقی پاکستان سے قلبی وابستگی

اس زمانے کی یادوں میں سے ایک اہم یاد جس کا تعلق ساری زندگی سے ہوا، وہ مشرقی پاکستان کے مسلم لیگی راہنماؤں سے ملاقات ہے۔

ان میں سے اکثر ملاقاتیں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کے واسطے سے، یا ان کے گھر پر، یا ان کے ہمراہ ہوئیں۔ میں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے ممبر لعل میاں معظم حسین صاحب بہت دین دار آدمی تھے۔ وہ انصاری صاحب کے تعارف کرانے کے بعد، بڑی باقاعدگی سے جمعیت کو پچاس روپے ماہانہ اعانت دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بنگال ہی سے وفاقی وزیر تعلیم فضل الرحمٰن صاحب [م: ۱۸ دسمبر ۱۹۶۶ء] کے ساتھ بھی بڑی خوش گوار ملاقات ہوئی۔

ان ملاقاتوں میں جو تاثر لیا وہ یہ تھا کہ یہ بہت متواضع، بہت سیدھے سادے لوگ ہیں۔ ان میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہیں ہے، جو مغربی پاکستان کے اکثر رہنماؤں کے اندر ہوتا ہے۔ وضع قطع، لباس، گفتگو، بات چیت، سب میں اپنائیت، تواضع اور انکسار تھا۔ پھر یہ سب متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ ان میں کوئی بھی سرمایہ دار، جاگیردار یا مادی اعتبار سے کسی بڑے مرتبے والا آدمی نہیں تھا۔ ان سبھی لوگوں میں دین پسندی محسوس ہوتی تھی۔ ان ملاقاتوں سے بھی میں نے مشرقی پاکستان کے بارے میں بڑا اچھا تاثر لیا تھا۔

۵۱ء میں، مشرقی پاکستان جمعیت کے ناظم خواجہ محبوب الٰہی لاہور میں پہلی بار جمعیت کے سالانہ اجتماع میں شریک ہوئے۔ میرے اس وقت سے ان کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات قائم ہوئے جو آج تک قائم ہیں۔ خواجہ صاحب نے مشرقی پاکستان کے حالات کی تفصیل اور لوگوں کی کیفیات بیان کیں۔ وہاں زبان کے مسئلہ پر تحریک چل رہی تھی کہ ''بنگلہ کو سرکاری زبان بناؤ''۔ جب انھوں نے یہاں پر گفتگو پیش کی تو اسی وقت میں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کرلیا تھا کہ آیندہ مشرقی پاکستان میں جاکر تحریک کی خدمت کروں گا۔ مگر یہ کوئی اس نوعیت کا جذباتی ارادہ نہ تھا، جو میں نے ۴۲ء کے لگ بھگ اپنی بہنوں کی جماعت میں شمولیت اور گھر پر ان کی آزمایش کے زمانے میں کیا تھا، بلکہ یہ فیصلہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ کرنے میں دن یا گھنٹے نہیں لگے، بلکہ صرف چند منٹ ہی لگے اور میں مشرقی پاکستان کے حوالے سے یکسو ہوگیا۔ جیسا کہ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے، کہ کسی نے ایک جملہ کہا اور میرا ذہن اسے سوچنے پر مصروف ہوگیا، اور سوچتے سوچتے حتمی نتیجے پر پہنچ گیا۔

اس وقت میرے سامنے یہ تھا کہ ہم جمہوری طرزِ فکر سے اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے ایک روز برسبیل گفتگو ہم سے یہ کہا تھا کہ ''پاکستان کی آدھی سے زیادہ آبادی مشرقی پاکستان میں ہے۔ اس ملک میں کوئی بھی جمہوری تبدیلی مشرقی پاکستان کے عوام کو ساتھ ملائے بغیر ہرگز نہیں آسکتی۔ لیکن دوسری جانب مشرقی

پاکستان میں جماعت کا کام تقریباً صفر ہے۔ اگر آپ جماعت کا بیت المال دیکھیں اور اس کے انسانی وسائل و ذرائع کو بھی دیکھ لیں تو اس کا بہت قلیل حصہ یعنی تقریباً ایک فی صد مشرقی پاکستان میں صرف ہو رہا ہے۔ حالانکہ جو کوئی بھی پاکستان کے مستقبل کا نقشہ بنائے گا وہ مشرقی پاکستان کو نظر انداز نہیں کر سکے گا‘‘---

ممکن ہے انصاری صاحب نے یہ بات اس سے بھی کم الفاظ میں کہی ہو، لیکن ان کی اس بات پر میں مطمئن تھا، کہ یہ اسلامی انقلاب جمہوری ذریعے سے آنا ہے اور آج بھی اس پر مطمئن ہوں کہ اسلامی انقلاب کو عوام کی قبولیت اور دلی رغبت کے ساتھ ہی آنا چاہیے۔ اس کو اُوپر سے زبردستی نہیں تھوپا جاسکتا۔ اس لیے یہ خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، جب تک مشرقی پاکستان میں جماعت کا کام مضبوط نہ ہو۔ اس زمانے میں ویسے بھی مشرقی پاکستان میں جماعت کا کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہاں پر مسلم لیگ تھی، جو رفتہ رفتہ بکھر رہی تھی اور تمام سیاسی عناصر اس کے مخالف تھے۔

میں شروع سے یہ سوچتا آیا ہوں، کہ اپنی مقدور بھر صلاحیت وہاں پر لگاؤں، جہاں تحریک کے لیے زیادہ بارآور ثابت ہوں اور جہاں تحریک کا اہم مورچہ ہو۔ یہی چیز مشرقی پاکستان کے لیڈروں اور وہاں سے مسلم لیگ کے راہنماؤں سے ملاقاتیں کرنے میں ایک محرک ثابت ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو تحریک سے متاثر کرنا اور ان کو اپنے ساتھ لے کر آنا اتنا مشکل نہیں ہے، جتنا کہ مغربی پاکستان میں ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ محسوسات کی دنیا میں، اس وقت یہ اندازہ غلط نہیں تھا، کیونکہ اب تک میرے تجربات اس مشاہدے اور تجزیے کی تائید ہی کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے مشرقی پاکستان میں جماعت کا کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آج یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں پر جماعت زیادہ طاقت ور ہے اور ہر میدان میں ہم سے آگے ہے۔ اس کی جڑیں زیادہ مضبوط ہیں اور اسے عوام میں زیادہ اثر ورسوخ حاصل ہے۔

مسلم دنیا سے رابطہ

اس زمانے کی یادوں میں سے ایک بڑی یاد، پاکستان میں مسلم ملکوں کے سفارت خانوں میں متعین لوگوں سے روابط اور تعلق پر مبنی ہے۔ ان روابط کو قائم کرنے میں مولانا انصاری صاحب کے علاوہ ایک حصہ سعید رمضان کا ہے۔

سعودی عرب کے سفیر عبدالحمید خطیب کا میں خاص طور پر ذکر کروں گا۔ ان کے جواں سال اور بڑے بیٹے فواد الخطیب، سعید رمضان کے دوست تھے۔ ان کی تعلیم مصر میں ہوئی تھی، اور وہ اخوان المسلمون کی دعوت سے متاثر تھے۔ سعید رمضان ان کو اخوان ہی میں شمار کرتے تھے۔ اس سفارت خانے میں جاتے ہوئے ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ یہاں پر ہماری بات کی کوئی قبولیت ہے اور اس کے کوئی اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہ خود اپنی جگہ ایک دل کش اور قوت دینے والی چیز تھی۔ چنانچہ سعید رمضان کے ساتھ ان سے ہماری ملاقات بھی ہوتی تھی۔ ان کے ذریعے ہم مسلمان ملکوں کے سفارت خانوں میں بھی جاتے تھے۔ پھر ان سے ایسا تعلق قائم ہوا، جو آخر تک برقرار رہا۔ فواد الخطیب خود بھی مختلف جگہ پر رہے اور بالآخر بنگلہ دیش میں سعودی عرب کے سفیر ہو کر چلے گئے۔ انھوں نے ذاتی سطح پر اپنے دورِ سفارت میں بنگلہ دیش جماعت کے ساتھ تعاون کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح پروفیسر غلام اعظم صاحب کو بنگلہ دیش کی شہریت مل جائے۔ ان سے جدہ میں میری ملاقات ہوتی رہی۔ وہ OIC (اسلامی کانفرنس تنظیم) کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

اسی زمانے میں یا کچھ عرصے بعد کی بات ہے، کہ عمر بہاء الامیری، شام کی طرف سے پاکستان میں سفیر مقرر ہوئے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس وقت ہر مسلمان، پاکستان کی طرف دیکھ رہا تھا، کہ ایک بڑا مسلمان ملک وجود میں آیا ہے۔ باہر سے لوگ بھی بڑی امید کے ساتھ آرہے تھے۔ شام کے یہ سفیر بھی 'اخوان المسلمون' کی دعوت سے متاثر تھے۔ ان سے ملاقاتیں پہلے بھی رہی تھیں، لیکن جب مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا ہوئی، تو ہم ان کے گھر پر

جمع ہوئے۔ وہیں سے کراچی میں تمام مسلمان ملکوں کے سفارت خانوں سے رابطہ ہوا۔ اسی رابطے سے تمام مسلم حکومتوں نے پاکستان پر دباؤ ڈالا۔ اس وقت ہمارا جو ربط قائم ہوا، اس میں سعید رمضان کے ذریعے، اخوان کے بزرگوں سے ہمارا اور جماعت کا اچھا، گہرا، دلی، جذباتی تعلق قائم ہو چکا تھا، جب کہ سعید رمضان سے تو ہم بہت کچھ سیکھ رہے تھے۔ ظفر اسحاق اور خورشید بھائی نمایاں طور پر ان سے بہت قریب تھے۔ انھی محبتوں کی یاد میں، میں نے اپنی کتاب **تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باھمی تعلقات** کو سعید رمضان کے نام سے منسوب کیا ہے۔

سنہ یاد نہیں ہے، لیکن اسی زمانے میں کراچی میں ایک بڑی کانفرنس معیشت کے حوالے سے ہوئی تھی۔ اس کے منتظمین میں شاید انعام اللہ خان صاحب تھے، جو بعد میں **موتمر العالم الاسلامی** کے سیکرٹری جنرل بھی ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۵۱ء کے اوائل میں ایک بڑی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں تمام مسلمان ممالک سے زعماء آئے ہوئے تھے۔

اس وقت یہ پابندی نہیں ہوا کرتی تھی، کہ علمی کانفرنسوں میں صرف حکومتوں کے لوگ آئیں اور تحریکوں کے لوگ نہ آئیں۔ پھر یہ وہ زمانہ تھا، جب مصر میں 'اخوان المسلمون' کے خلاف باقاعدہ کش مکش شروع ہو چکی تھی۔ الجزائر اور تیونس میں تحریک آزادی چل رہی تھی۔ اس لیے وہاں سے وہی لوگ آئے، جو آزادی کی تحریک کی قیادت کرتے تھے۔ اس وقت ہماری ملاقات ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، امجد الزہاوی صاحب اور شیخ محمد محمود الصواف سے ہوئی۔ اسی زمانے میں ایک بہت ہی بے نظیر اور اعلیٰ سطح کی شخصیت شام کے سفارت خانے سے وابستہ تھی۔ جن کا نام محمد ابوالخیر حسن العرقسوسی تھا۔ وہ بہت بھرپور جذبہ رکھتے تھے۔ ان سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ میرے تو خاص طور پر بہت گہرے تعلقات تھے۔

اسی زمانے میں ہم کو یہ شوق پیدا ہوا تھا کہ ان شخصیات سے آٹوگراف لیا کریں۔

اگرچہ آج کل بھی جمعیت کے کارکن آٹوگراف لیتے ہیں، کسی ہدایت کے لیے ویسا اصرار نہیں کرتے۔ ہم ان لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ''آپ اس میں ہمیں کچھ لکھ کر دیں''۔ اس طرح بہت سارے دستخطوں کے ساتھ بڑی قیمتی باتیں جمع ہوگئی تھیں، مگر وہ بھی ڈھاکے میں ضائع ہوگئیں۔ میری درخواست پر ایک عرب تحریکی رہنما نے عربی میں ایک ایسا جملہ لکھ دیا جس کا مفہوم یہ تھا: ''نماز کے بعد تعلق باللہ کے لیے سب سے اہم کام دعوتِ دین کا فروغ ہے''۔ میرے لیے اس آٹوگراف میں بڑا سبق تھا۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم بڑے مفلوک الحال لوگ تھے۔ ہم میں شاید ہی کوئی ہوگا جس کی مالی حالت کچھ بہتر ہو۔ البتہ خورشید بھائی کے اہلِ خانہ کچھ بہتر پوزیشن میں تھے، لیکن وہ بھی ایک فلیٹ ہی میں رہتے تھے، جب کہ ہم عام کوارٹروں اور چھوٹے کمروں میں رہتے تھے۔ اکثر اوقات بس کے سفر کے لیے جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے۔ بیرونی ممالک سے لوگ آتے تھے تو کراچی میں ساحل سمندر کے کنارے سب سے بڑے بیچ لگژری ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔

ان ہوٹلوں کے کھانے پینے اور عارضی کروفر سے، الحمدللہ کوئی مرعوبیت پیدا نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کا امکان تھا، کیونکہ ہم انسان ہی تو تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان حلقوں میں چلنے پھرنے کو ہمارے لیے دینی لحاظ سے بڑا مفید بنایا۔ چونکہ میں خود بڑے لوگوں سے زیادہ ملنے کا قائل نہیں رہا، اس لیے میرے بہت زیادہ ذاتی روابط نہیں بنے۔

شیخ محمد محمود الصواف صاحب عراق سے خاص طور پر کھجور کے کچھ پیکٹ لے کر آئے تھے۔ ان کھجوروں میں بادام بھرے ہوتے تھے۔ ہم حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ کھجور میں بادام کہاں سے نکل آیا؟ اس زمانے میں مسلم دنیا سے جو لوگ آئے تھے ان میں تیونس کی ایک اہم شخصیت فضیل الورتلانی صاحب کی تھی۔ تیونس کو اس وقت تک آزادی نہیں ملی تھی۔ وہ ایک قسم کے باغی رہنما تھے۔ سب لوگوں سے عام طور طریقے اور بے تکلفی سے ملتے تھے۔ آج مجھے تمام نام یاد نہیں آرہے، تاہم ان روابط اور تعلقات کا ہماری فکری اور

عملی تربیت میں اور ہماری سوچ کے اُفق میں وسعت پیدا کرنے میں ایک قابلِ ذکر حصہ رہا ہے۔

کچھ اور کرم فرما

اسی طرح ہمارے سماجی تعلقات پاکستان کے چند دین دار اور چند مال دار افراد سے بھی تھے۔ اگرچہ ایسے لوگ تعداد میں بہت ہی کم تھے، لیکن ان کے ہاں بھی ہمارا آنا جانا شروع ہوا۔ جس طرح پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ ماموں زاہد حسین صاحب نے ہمارے ایما پر، 'اسٹوڈنٹس سروس یونٹ' بنانے میں ذاتی دل چسپی لی تھی۔ کراچی کے چند صنعتی اور تجارتی خاندان اس کے ممبر بن گئے تھے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر خدمتِ خلق کے معاملات پر بات چیت کرتے تھے۔

ایک بڑی دل کش اور پیاری شخصیت ابراہیم باوانی صاحب تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ان سے ہمارے بہت مضبوط اور قریبی تعلقات ہو گئے تھے، جو آخر وقت تک قائم رہے۔ اگرچہ وہ صاحبِ ثروت تاجر تھے، ان کے پاس پیسہ اور دنیا بھی تھی، لیکن اس سے بڑھ کر اللہ کا فضل یہ تھا کہ انھیں دین سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ وہ دینی سرگرمیوں کے لیے پیسہ خرچ کرنے کا زبردست جذبہ رکھتے تھے۔ بڑے صاف گو آدمی تھے۔ جب ناراض ہوتے تو اپنی ناراضی کا صاف اظہار کر دیتے تھے، مگر مجموعی طور پر بڑی محبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ جمعیت کے کاموں کے لیے ہماری مالی مدد کیا کرتے تھے۔ انھوں نے عائشہ باوانی ٹرسٹ قائم کیا۔ جہاں سے اسلامی لٹریچر کی اشاعت اور تقسیم ہوتی۔ ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا جو لندن اور کراچی سے شائع ہوتا رہا۔ مختلف افراد کو تعلیم کے لیے برطانیہ بھجوانے میں مدد فراہم کی۔

۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کے ہاں جو لوگ بھی آیا کرتے تھے، ان سے ہمارے اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ان حضرات میں جناب ماہر القادری [م: ۱۱مئی ۱۹۷۸ء] تھے۔ یہیں پر اسماعیل احمد مینائی صاحب سے تعلق قائم ہوا، جو ماہر صاحب

کی رحلت کے بعد فاران کے مدیر رہے اور انھوں نے Islamic Order کے نام سے ایک معیاری دینی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ تحریکی حلقے سے باہر دیگر بہت سے افراد سے ہمارے تعلقات کا دائرہ انصاری صاحب ہی کے ہاں پروان چڑھا۔

ایک یادگار جلوس

یہ غالباً ۲۳ جنوری ۵۱ء کی بات ہے، اسلامی دستور اور آٹھ نکاتی مطالبے کی حمایت میں جماعت نے کراچی میں بڑا زبردست جلوس نکالا تھا۔ اس میں جمعیت نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

اس لحاظ سے یہ بڑا منظّم جلوس تھا، کہ شرکاء کی چار چار کی لائنیں تھیں۔ جن کے بیچ میں ہم نے کافی کافی فاصلہ رکھ لیا تھا۔ بولٹن مارکیٹ سے شروع ہوکر اس جلوس کو جہانگیر پارک میں ختم ہونا تھا، جہاں پر مولانا مودودی کو جلوس سے خطاب کرنا تھا۔ چنانچہ اس وقت تک کراچی کی تاریخ میں یہ ایک انوکھا تجربہ اور بہت بڑا جلوس تھا۔ اگرچہ اس جلوس میں لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی، مگر ہمارے آئیڈیا کے مطابق قدرے تھوڑی تعداد کو منظّم کرکے پھیلا دیا گیا، جس سے اس کا تاثر بہت بھرپور دکھائی دینے لگا۔ ہماری ایسی تراکیب کا دوسروں پر تو بلاشبہہ اثر ہوتا رہا ہے، لیکن اس کا ایک منفی پہلو یہ نکلتا رہا ہے کہ خود ہم بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوتے رہے ہیں، کہ ہمارے ساتھ بہت زیادہ لوگ ہیں، حالانکہ بہت سارے لوگ نہیں ہوتے۔ ایک تو بولٹن مارکیٹ سے فریئر روڈ اور فریئر روڈ سے جہانگیر پارک تک سڑک بھی بہت مصروف ہوتی تھی۔ صدر کا علاقہ تھا، جہاں پر ویسے ہی بہت رش ہوتا ہے۔ اس میں یہ خاموش جلوس چل رہا تھا۔ جلوس میں کوئی نعرے وغیرہ نہیں بلند ہو رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر بھی بالکل معمولی سے تھے۔ شرکاء نے مطالبات پر مشتمل پلے کارڈز اُٹھا رکھے تھے۔ جلوس کے شرکاء کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس لیے نظم و ضبط بھی تھا۔ بہرحال، اس جلوس کا ملک پر اور دارالحکومت کراچی پر گہرا اثر ہوا۔

اگلے دن روزنامہ جنگ کراچی میں سرخی لگی تھی کہ ’’ایک لاکھ کا جلوس‘‘۔ میں نہیں سمجھتا کہ جلوس میں ۹، ۱۰ ہزار سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ ہم نے سنا کہ جنگ کے نیوز ایڈیٹر یوسف صدیقی صاحب نے جو بہت دبنگ آدمی تھے، رپورٹر کو بلا کر کہا کہ ’’یہ تم نے ایک لاکھ کیوں لکھ دیا اور جب تم نے لکھ دیا تو پھر یہ چھپ بھی گیا‘‘۔ رپورٹر نے کہا کہ ’’آپ مسلم لیگ کے جلسوں کے بارے میں تاکید کرتے تھے، کہ یہ چھوٹی سی تعداد بھی لاکھوں میں لکھو۔ حالانکہ گذشتہ برسوں میں مسلم لیگ کے اتنے بڑے جلسے، جلوس نہیں ہوئے تھے۔ جب اس سے بہت چھوٹے جلسے جلوس ایک لاکھ کی گنتی میں آسکتے ہیں، تو پھر واقعی ان سے بڑے کو میں کیوں نہ ایک لاکھ لکھتا‘‘۔

مولانا مودودی نے جہانگیر پارک میں تقریر کی۔ یہ بات ذہن پہ نقش ہے، کہ اس زمانے میں جماعت کا اسٹیج بہت لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا۔ سوائے مولانا مودودی اور صدر جلسہ کے اور کوئی اسٹیج پر بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ پہلے پہل تو جلسے میں قرآن پاک کی تلاوت کا بھی رواج نہیں تھا، جماعت میں یہ رسم بعد میں آئی ہے۔ نظمیں، نغمے یا نعروں کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

اس تقریر میں مولانا مودودی نے دستورِ پاکستان کے لیے ’بنیادی اصولوں کی کمیٹی رپورٹ‘ [۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء] اور پبلک سیفٹی ایکٹ پر بڑی جان دار تنقید کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی عوام پر آمریت مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لیے صدرِ مملکت کو ہنگامی حالات کا اعلان کرنے اور قانون معطل کرنے کا حق دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ صدر مملکت ان اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھا سکتا ہے، خاص طور پر جب اسے یہ خدشہ ہو کہ وہ ایوان کی ایک تہائی اقلیت کا بھی اعتماد نہیں رکھتا۔ اور یہ تو بالکل عجیب سفارش ہے کہ دونوں ایوانوں کی ایک تہائی حمایت کے بل پر صدر اپنے منصب پر فائز رہ سکتا ہے۔ اسی طرح مولانا مودودی نے صدر مملکت پر مقدمہ نہ چلانے اور کسی بھی قانونی عدالت کے روبرو اسے پیش ہونے سے استثنا دینے پر بھی تنقید کی۔

اگر ہم دیکھیں تو سوائے صدر فضل الٰہی مرحوم کے، یہی منصب جمہوریت کا گلا گھونٹنے کا باعث بنا، جسے ہمیشہ فوج کی حمایت حاصل رہی۔ اس اعتبار سے مولانا کی یہ بات بڑی دُور اندیشی پر مبنی تھی۔

وقت کی پابندی

جلسۂ عام یا تنظیمی اجتماعات میں ٹھیک وقت پر مولانا مودودی کھڑے ہو جایا کرتے تھے، اور تقریر شروع ہو جاتی تھی۔ ایک بار نو بجے کا وقت تھا، لیکن وہ تقریر کرنے نو بج کر پانچ منٹ پر کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے معذرت کی کہ پروگرام پانچ منٹ دیر سے شروع ہو رہا ہے۔ اس بات کی ذمہ داری انھوں نے اپنے اُوپر لی کہ ''میں چونکہ امیر جماعت ہوں، اس لیے اس کوتاہی کے لیے ذمہ دار ہوں''۔

مجھے ان کی یہ بات بہت اچھی لگی، اور پھر میں نے ہمیشہ وقت کی پابندی کا اہتمام کیا، اگرچہ پہلے بھی خیال رکھتا تھا، لیکن اس واقعے اور اتنے بڑے آدمی کے اعتراف نے وقت کی اہمیت اور قدر کو زیادہ بڑھا دیا۔ یوں بھی ان دنوں جماعت اور جمعیت کی روایات میں عام طور پر وقت کی پابندی کو اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اب تو جلسے، جلوس اور اسٹیج کا پورا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ وقت کی پابندی کا معاملہ بھی وہ نہیں رہا۔

جہاں پر بھی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رہا، وہاں میری کوشش رہی ہے کہ پروگرام تاخیر سے شروع نہ ہو۔ ایک تربیت گاہ میں تو صوبہ بلوچستان، صوبہ سندھ اور صوبہ سرحد سے امرائے جماعت آئے ہوئے تھے۔ میں نے آغاز ہی میں کہہ دیا کہ پروگرام میں وقت کی پابندی کا سختی سے خیال رکھا جائے گا اور پروگرام شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد اجتماع گاہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب پروگرام بروقت شروع ہوئے اور افراد بھی باقاعدگی سے شریک ہوئے۔ چنانچہ ایک بار امرائے اضلاع کی تربیت گاہ کے موقع پر سرکلر میں یہ لکھ بھیجا کہ: ''کوئی فرد جزوقتی شریک نہیں ہوگا۔ اگر پہلے دن وقت پر نہ آیا تو پروگرام میں شرکت کی اجازت نہیں ہوگی''۔

تربیت گاہ کے دوسرے دن ایک صاحب سوات سے تشریف لائے، حالانکہ وہ بڑا لمبا سفر کر کے آئے تھے، لیکن میں نے کہا کہ ''آپ برا نہ مانیں، میں تو آپ کو تربیت گاہ میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکوں گا، کیونکہ یہ اصول کی خلاف ورزی ہوگی''۔ وہ کہنے لگے کہ ''کیا میں واپس سوات چلا جاؤں؟'' میں نے کہا کہ ''جی، آپ واپس سوات چلے جائیں''۔ چنانچہ وہ واپس سوات چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے خط میں میرا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ ''آپ نے مجھے واپس کر کے وہ تربیت کی جو شاید دس دن کی تربیت گاہ میں بھی نہ ہوتی''۔

اسی طرح اسلامی جمعیت طالبات کی کارکنان کی ایک قرآن کلاس کا انعقاد کیا۔ خود میں بھی سات بجے کی کلاس سے پانچ منٹ پہلے پہنچ جاتا اور دوسرے مربّی حضرات سے بھی اسی پر عمل کے لیے کہا۔ حسبِ عادت میں نے آخر میں ان کو تاثرات لکھنے کے لیے کہا۔ جنھیں پڑھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ زیادہ تر نے یہ لکھا کہ ''سب سے زیادہ خوش گوار اور حیرت انگیز بات یہ تھی، کہ استاد صحیح وقت پر آتے تھے اور بروقت کلاس شروع ہوتی تھی''۔ عجیب بات ہے کہ وقت کی پابندی خود ہمارے حلقے میں ایک اجنبی سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔

اسی روایت کو میں نے مقدور بھر اپنی ذاتی اور خاندانی زندگی میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ عام طور پر شادی، ولیمہ اور دعوت میں تو اس کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس میں سسرال والوں کی جانب سے تاخیر ہوتی ہے۔ میں نے اپنے بچوں کی شادیوں کے موقع پر ان کے سسرالی رشتہ داروں سے کہہ دیا تھا کہ ''اگر آپ کی آمد میں تاخیر ہوئی تو میں وقتِ مقررہ پر مہمانوں کو کھانا کھلا دوں گا، اور خود آپ کے ہمراہ کھاؤں گا۔

۴

نظامت اعلیٰ اور جمعیت سے فراغت

لاہور میں ۱۹۵۰ء کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے بعد ہم نے واپس آ کر کراچی میں کام کو اور زیادہ جوش وخروش سے پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ سال بھر کام کے بعد ہم دوبارہ سالانہ اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور گئے۔ اس مرتبہ ہمارا قیام دہلی مسلم ہوٹل، انارکلی میں تھا۔

سالانہ اجتماع کے دوران اگلے سال کے لیے ناظم اعلیٰ کے انتخاب کا مرحلہ تھا۔ کراچی کا کام جس رفتار سے بڑھا تھا، اس کی وجہ سے لوگوں کی نگاہیں کراچی کی طرف تھیں اور خورشید بھائی کراچی جمعیت کے ناظم تھے۔ سالانہ رپورٹ اور وہاں پر کام کا ذکر بھی وہی کر رہے تھے۔ پھر اپنے طرزِ بیان، تجربے اور دین کی سمجھ میں وہ مجھ سے فائق تھے۔ لوگوں کی نگاہ ان کے اُوپر تھی کہ ناظم اعلیٰ بنایا جائے۔ لیکن کراچی جمعیت کے جو لوگ اجتماع میں گئے تھے، ان کو اس بات پر بڑی تشویش تھی کہ اگر وہ ناظم اعلیٰ بن گئے تو اس سے کراچی جمعیت کا کام متاثر ہوگا۔

اس زمانے میں ناظم اعلیٰ کے دوروں کی گنجایش بہت محدود تھی۔ ہم لوگوں کے پاس نہ پیسہ تھا اور نہ کام ہی اتنا پھیلا ہوا تھا۔ جمعیت کا مرکزی دفتر ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھا۔ کوئی مرکز ایسا نہیں تھا کہ جہاں سے روزانہ باقاعدہ سرگرمیوں کی راہ نمائی اور ہدایت کا کام ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جمعیت کی شاخیں اپنی اپنی جگہ پر خودمختار ہی تھیں۔ اس خودمختاری کا سب سے زیادہ فائدہ کراچی جمعیت نے اپنے کام کو بڑھا کر اٹھایا تھا۔ اسی بنیاد پر میرا خیال رہا ہے کہ اگر مقامات حدود کا خیال رکھیں، ان میں جذبہ بھی ہو اور

ان پر بہت زیادہ مرکزی گائیڈ لائن مسلّط نہ کی جائے تو وہ زیادہ بہتر نتائج دے سکتے ہیں۔ ویسے بھی مرکزی کنٹرول کی زیادتی ایک خاص قسم کا جمود پیدا کرتی ہے۔

کراچی جمعیت کے کارکنوں کو یہ احساس تھا کہ ''اصل اہمیت تو کراچی میں جمعیت کے کام کی ہے، اور بہترین صلاحیتوں کی ضرورت بھی کراچی کو ہے۔ اس کے مقابلے میں مرکز کا کام تو اتنا اہم نہیں ہے''۔ مگر دوسری جانب پاکستان جمعیت کے حاضر ارکان چاہ رہے تھے کہ خورشید بھائی کو ناظم اعلیٰ منتخب کرلیا جائے۔ یہ بات اہلِ کراچی کے لیے اور خود خورشید بھائی کے لیے بھی خاصی تشویش کا باعث تھی۔ عبداللہ جعفر صدیقی نے گذشتہ سال یعنی تیسرے سالانہ اجتماع میں نظامتِ اعلیٰ کی تبدیلی کے لیے نمایاں کردار ادا کیا تھا کہ جس کے نتیجے میں ڈاکٹر محمد نسیم جمعیت کے دوسرے ناظم اعلیٰ منتخب ہو گئے تھے۔

اس سال بھی جب انھوں نے دیکھا، کہ کراچی جمعیت کے کام پر اثر پڑے گا تو انھوں نے اپنی صوابدید پر میرے لیے باقاعدہ کنویسنگ کی۔ اس لیے نہیں کہ وہ سمجھتے ہوں گے کہ میں زیادہ بہتر ہوں، بلکہ اس لیے کراچی جمعیت کو خورشید بھائی کے مرکز میں جانے سے نقصان نہیں پہنچنا چاہیے (یاد رہے کہ اس وقت تک جمعیت کا دستور نہیں بنا تھا)۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے ان کی بات سنی اور مانی، شاید کچھ لوگ وہ بھی ہوں گے جو مجھ کو چاہتے ہوں گے۔

نظامت اعلیٰ کی ذمہ داری

جمعیت کے چوتھے سالانہ اجتماع میں نظامتِ اعلیٰ کا انتخاب ہوا، جس میں ووٹنگ بہت سخت ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ میرے اور خورشید بھائی کے درمیان صرف آٹھ یا دس ووٹوں کا فرق تھا۔ اگر یہ کنویسنگ نہ ہوتی تو خورشید بھائی جمعیت کے تیسرے ناظم اعلیٰ منتخب ہوجاتے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کوئی بڑا فرق پڑتا، کیونکہ پھر شاید کراچی جمعیت کی ذمہ داری مجھے سنبھالنا پڑتی۔

مجھے بھی اس دلیل سے اتفاق تھا، کہ کراچی جمعیت کا کام جس طرح بڑھ اور پھیل رہا

تھا، اور جس طرح جمعیت کا ایک مضبوط مرکز بنتا جا رہا تھا، اس میں خورشید بھائی کی وہ استعدادِ کار جس کا انھوں نے مظاہرہ کیا، اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لوگوں سے ربط رکھنے، دل موہ لینے اور ساتھ لے کر چلنے میں بھی، ان کا بڑا قیمتی حصہ تھا۔ دینی علوم اور انگریزی فکر پر انھیں ہماری نسبت زیادہ دسترس حاصل تھی۔ اسٹوڈنٹس وائس کو نکالنا اور چلانا انھی کا اعزاز تھا۔ تقریر میں استدلال اور اظہار پر بھی انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس لیے مجھے بھی اس بات سے اتفاق تھا، کہ خورشید بھائی کو بہرحال کراچی ہی کو سنبھالنا چاہیے، وہ زیادہ اہم کام ہے، اور نظامتِ اعلیٰ کا کام اس کی نسبت کم اہم۔

جمعیت کے چوتھے سالانہ اجتماع (۲-۴ نومبر ۱۹۵۱ء، لاہور) کا انعقاد دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں ہوا تھا۔ وائی ایم سی اے ہال، مال روڈ پر اجتماع کی نشستیں ہوئیں۔ اس اجتماع کے موقع پر سید سلیمان ندوی، سید مودودی، مولوی تمیز الدین، شام کے سفیر بہاء الامیری کے پیغامات آئے تھے۔ میں نے مسلم ممالک میں طلبہ کی تحریکیں پر مبنی مقالہ لکھ کر سنایا تھا۔

بہرحال ۴ نومبر، ۱۹۵۱ء کو نظامتِ اعلیٰ کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی۔ ذمہ داری کا احساس مجھے ہمیشہ بڑی مہمیز کا کام دیتا رہا ہے۔ اس لیے نظامتِ اعلیٰ کا اعلان سن کر میری جو ذہنی کیفیت تھی، اس کا بیان مشکل ہے۔ فی الواقع اس وقت یوں لگا، جس طرح کسی نے میرے اُوپر جیسے پہاڑ رکھ دیا ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ میں کس طرح پورے پاکستان کی جمعیت کی ذمہ داری اٹھاؤں گا؟ کیسے راہ نمائی کروں گا؟ کیسے قیادت کروں گا؟ اس کے باوجود کہ یہ سمجھتا تھا کہ میں کم اہل ہوں اور خورشید بھائی زیادہ اہل ہیں۔ پھر یہ سوچا کہ ذمہ داری آ گئی ہے تو اسے بہرحال ادا کرنا ہے۔

اسی سوچ بچار میں سالانہ اجتماع کے اختتامی کلمات کا وقت آ گیا۔ ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے اجتماع کے شرکا سے یہ میرا پہلا براہِ راست ربط تھا، اور یہ تقریر بھی فی البدیہہ تھی۔ آج میں جن چیزوں کو اہم سمجھتا ہوں، اس وقت بھی انھی باتوں کو اختتامی کلمات میں بیان کیا

تھا۔ سب سے پہلے تعلق باللہ پر زور دیا تھا، اوراس کے ذرائع بیان کرتے ہوئے قرآن سے قربت، قیامُ اللیل اور نوافل کے اہتمام کا ذکر کیا تھا۔ دوسرا زور اخلاق پر تھا۔ اس ضمن میں حسنِ اخلاق، ایفاے عہد، امانت، دیانت کا تذکرہ کیا تھا۔ تیسرا زور دعوت کے اُوپر تھا، کہ تیزی سے کام پھیلانا اور لوگوں کو ساتھ ملانا ضروری ہے۔ چوتھا نکتہ باہمی محبت اور تعلقات پر مبنی تھا اور بھی باتیں ہوئی ہوں گی، لیکن یہ چار بنیادی باتیں تھیں۔

میرا تاثر ہے کہ کارکنوں نے اس تقریر کا اچھا تاثر کیا تھا۔ اجتماع ختم ہوا، اس کے بعد شوریٰ ہوئی اور ہم لوگ کراچی واپس آ گئے۔

جب ناظمِ اعلیٰ منتخب ہو گیا، تو میرے سامنے یہ بات واضح تھی کہ کراچی کے کام سے الگ نہیں رہ سکوں گا۔ اس زمانے میں ہمارے ذہن میں مقام، مرتبہ اور منصب کی کوئی بات نہیں تھی، کہ اگر میں ناظمِ اعلیٰ ہوں تو کارکن کی حیثیت سے اپنے شہر میں کیوں کام کروں؟ چنانچہ میں نے نظامتِ اعلیٰ کے اس ایک سال میں مرکز کا کام تو برائے نام ہی کیا۔ جس میں کچھ خط و کتابت، کچھ شورائیں، کچھ پالیسی سازی اور جمعیت کے دستور کی تدوین شامل ہے۔ باقی زیادہ تر وقت کراچی کے حلقوں، اسٹڈی سرکل اور تربیتی پروگراموں میں صرف کیا۔ مجھے ہمیشہ اس کام میں زیادہ دلچسپی رہی کہ جو لوگ جمعیت کے قریب آ رہے ہیں، ان کو آگے بڑھاؤں، ان کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنے کے لیے اگر کچھ کر سکتا ہوں تو کروں اور اپنے اسی جذب وشوق کے تحت نظامتِ اعلیٰ کے دوران کراچی جمعیت میں کام کرتا رہا۔

مولانا اصلاحی صاحب

یوں تو ہر تربیت گاہ ہمارے لیے ایمان میں مضبوطی، راہ نمائی اور جذبوں میں فراوانی کا ذریعہ بنتی تھی، تاہم ایک تربیت گاہ میرے لیے آج تک خوش گوار یادوں کا سرچشمہ ہے۔ اس تربیت گاہ کا دورانیہ طویل تھا، اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے براہِ راست قرآن سیکھنے اور پڑھنے کا قیمتی موقع ملا تھا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تربیت گاہ میں شام کی کلاسیں لیا کرتے تھے، جن میں قرآن مجید اور تزکیۂ نفس پر لیکچر دیتے تھے۔ ان کلاسوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا۔ خاص طور پر تزکیۂ نفس پر ان کے لیکچر سے جو کچھ سیکھا اور سمجھا، وہ آج تک میری ذہنی تعمیر و تشکیل کا حصہ ہے۔ اسی طرح قرآن پڑھنے، سمجھنے اور اس سے تعلق جوڑنے کے لیے اصلاحی صاحب نے جو راہ نمائی دی وہ میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اس میدان میں مجھے جتنا اور جب بھی موقع ملا، ان کے سامنے ایک شاگرد کی طرح باقاعدہ زانوے تلمذ تہ کیا۔ فہم قرآن میں انھیں اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ میں مفسرین میں مولانا حمیدالدین فراہی [م: ۱۱نومبر ۱۹۳۰ء] سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ ان کے تفسیری منہاج، اسلوبِ تعبیر اور اسلوبِ بیان کو دل سے قبول کیا ہے، اگرچہ مجھے ان کی ہر چیز سے اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال میں نے تفاسیرِ فراھی (مترجم: مولانا امین احسن) کو لفظ بہ لفظ غور سے پڑھا تھا۔

اصلاحی صاحب نے ہمیں جو نوٹس لکھوائے اور سکون سے پڑھائے، وہ میرے پاس محفوظ رہے، ان سے برابر استفادہ کیا۔ چونکہ کراچی جمعیت کے اسٹڈی سرکل کی ذمہ داری میرے سپرد تھی، اسی طرح درسِ قرآن بھی دیتا تھا، اس کام کے لیے مجھے اس سے بہت راہ نمائی اور مدد ملی۔ ان کے درس و تدریسِ قرآن سے مجھ پر قرآن کے بہت سے گوشے کھلے اور سوچنے، سمجھنے کے بہت سے باب روشن ہوئے۔ الگ الگ سے تمام فوائد کو تو متعین نہیں کرسکتا، کہ کیا کیا حاصل ہوا؟ لیکن یہ کہ فہمِ قرآن میں اس چیز کا بڑا حصہ رہا۔ قرآن کی تعلیم کے سلسلے میں وہ تمام تربیتی کام، جو ہم تقریباً ڈیڑھ دو سال سے کراچی میں کر رہے تھے، اس کے لیے یہ تجربہ بڑا مددگار ثابت ہوا۔ قرآن سے تعلق اور رغبت، بچپن ہی سے میری والدہ محترمہ کا مجھے بہترین ہدیہ تھا، اس کے لیے عربی پڑھی، قرآن پڑھا اور بیان القرآن پڑھی۔

ایک مرتبہ اصلاحی صاحب نے ہمیں کہا کہ ''قرآن پر تدبر کا سب سے زیادہ اچھا، کارگر اور مؤثر طریقہ یہ ہے، کہ آدمی اسے قیامُ اللیل میں پڑھے اور ان لمحوں کے دوران

اس پر تدبر کرے''۔ انھوں نے اپنی اس بات کا استدلال سورۃ المزمل سے کیا تھا۔ یہ بات مجھے اپیل کر گئی۔ حفظِ قرآن کا مجھے پہلے بھی شوق تھا، اور شاید دسویں جماعت یا فرسٹ ایئر میں بھوپال میں، میں نے رمضان کے دوران پورا آخری پارہ حفظ کیا تھا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں اور سورتیں یاد کرتا رہا تھا۔ پھر سعید رمضان نے شب بیداریوں کا سلسلہ شروع کیا تو پوری سورۃ الانفال انھوں نے یاد کرائی تھی۔

اصلاحی صاحب سے قرآن پڑھتے وقت بھی میں نے یہ اہتمام کیا، کہ قرآن کا جو حصہ وہ پڑھاتے، اس کو پہلے ہی یاد کر لیتا تھا۔ بعد میں، مَیں نے قرآن سمجھنے، قرآن کے درس دینے اور قرآن سکھانے کا طریقہ اپنی کتاب Way to the Quran میں تجویز کیا ہے۔ اس کی بنیاد پر پاکستان میں آکر کئی کلاسیں چلائی ہیں۔ دوسرے لوگوں نے بھی مجھ سے یہ طریقہ سیکھا ہے۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ قرآن سیکھنے کے لیے لازمی طور پر اسے حفظ کریں، لیکن اس عمل کا یہ ایک حصہ ضرور تھا کہ جس حصے کو پڑھنا ہے، تدبر کرنا ہے اور درس دینا ہے، اس کو آپ اتنی بار پڑھیں کہ جب آنکھیں بند کر کے اس کو ذرا سا تازہ کرنے کی کوشش کریں، تو اس کے تمام موضوعات ذہن کی لوح پر نمودار ہو جائیں۔ خواہ آیات کے الفاظ نہ ہوں۔ لیکن آدمی اُٹھتے بیٹھتے، مختلف اوقات میں اس پر تدبر کرتا رہے۔ یہ چیز اصلاحی صاحب سے سیکھی تھی۔ پھر ان سے بھی خاصا محبت کا تعلق پیدا ہو گیا۔

تربیت گاہ کے آخری دن جب پروگرام ختم ہوا، تو سب لوگ چلے گئے، لیکن سلطان احمد صاحب نے مجھے اور ظفر اسحاق کو خاص طور پر کھانے کے لیے روک لیا۔ پھر اصلاحی صاحب سے ہماری خاصی بے تکلف اور نجی نوعیت کی گفتگو ہوئی، جس میں اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی کو بڑا زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے جملوں میں بھرپور خلوص، احترام اور اعتراف پایا جاتا تھا۔ بعد میں وہ جو یہ کہتے رہے کہ ہم جماعت میں مجبوراً رہے، امرِ واقعہ ہے کہ اس وقت اس کا کوئی تاثر نہیں ملتا تھا۔

اسی نشست میں انھوں نے اپنا ایک دل چسپ واقعہ سنایا کہ ''میں تو بہت غصے والا

آدمی ہوں۔ مغلوب الغضب ہو جاتا ہوں، راجپوت ہوں''۔ واقعی ان کا غصہ تو بار بار دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ کہنے لگے: ''میرے اندر اتنا غصہ تھا، کہ جب میں دارالعلوم میں پڑھاتا تھا، تو غبی قسم کے طالب علموں کو کلاس سے باہر دھکیل دیا کرتا تھا، یہ تو اختر احسن اصلاحی تھے جو بڑے نرم مزاج، نرم خو تھے اور توازن رکھتے تھے''۔ پھر انھوں نے تحریک کے بارے میں بہت سی اچھی اچھی باتیں بتائیں جو اکثر مجھے یاد رہیں۔

نظامتِ اعلیٰ کی ذمہ داری کے باعث طبیعت میں بڑا گداز تھا، جس طرح کہ زمین میں ہل چلا ہو تو وہ بیج کی بار آوری کے لیے تیار ہوتی ہے، بالکل اسی طرح ان دنوں مولانا اصلاحی کی صحبتوں اور محبتوں نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا۔

ذمہ داری کے دوران

نظامت اعلیٰ کی ذمہ داری کے دوران مجھے پاکستان بھر میں نئے روابط قائم کرنا پڑے۔ خاصی توجہ سے ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے کہ اس پر اللہ کی گواہی آئے گی۔

اس احساس کا نتیجہ تھا، کہ کراچی میں پہلے سے بڑے گہرے تعلقات کو نبھانے میں کوتاہی ہوئی۔ پرانے ساتھیوں نے اسے بے اعتنائی سے موسوم کیا۔ خاص طور پر ظفر اسحاق نے تو بہت زیادہ محسوس کیا، اور اپنی شکایت پر مبنی مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط کا مضمون تو اب پوری طرح یاد نہیں، البتہ محمد رفیع سودا کا ایک مشہور شعر یاد ہے، جو انھوں نے لکھ بھیجا تھا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

مجھے اس پر بڑی ندامت ہوئی کہ ایسی کوتاہی کیوں ہوئی؟ ان سے گہرا قلبی تعلق اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ ''اس وقت کس کیفیت میں ہوں کہ

مجھے خود اپنا پتہ نہیں، ایسے میں دوسروں کا کیا پتا ہوگا؟ شاید چند ہفتوں میں یہ کیفیت نارمل ہوجائے گی''۔ انھیں مجھ سے جو محبت اور تعلق تھا، اس میں گلے شکوے کا کوئی تصور نہیں تھا، بس یہ ایک محبت بھری توجہ تھی، جو انھوں نے دلائی۔

میں نہیں سمجھتا کہ بحیثیتِ ناظمِ اعلیٰ، جمعیت کو کوئی رخ یا رنگ دینے کے لیے، یا کسی اہم پیش رفت کے لیے میں نے کوئی نمایاں قدم اٹھایا ہو۔ اس کی ایک وجہ تو ہماری طبعی مجبوریاں بھی تھیں، عملاً پاکستان کی سطح پر جمعیت کی تنظیم ابھی تک نہیں بنی تھی۔ ہمارے پاس مادی وسائل نہیں تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا مشکل تھا۔ اس کیفیت میں ان کو ہدایات دینا اور بھی مشکل تھا۔

دوسری اہم بات یہ تھی، کہ جمعیت کا کام کرتے ہوئے ہم اپنی پڑھائی کو خیر باد کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔ البتہ یہ عزم ضرور تھا کہ جب ضرورت پڑی تو پڑھائی کو بھی قربان کردیں گے، لیکن یہ ایسی صورت نہیں تھی کہ جس میں یہ انتہائی قدم اٹھاتے۔ اسی لیے ہم میں سے جس پر ذمہ داری ہوتی، وہ کام کرتا رہتا، اور امتحان کے دنوں میں چند ہفتوں کی چھٹی لے کر پوری طرح محنت کر کے امتحان دے لیتا۔ چنانچہ ہمارے سارے ساتھی اچھی پوزیشن میں پاس ہورہے تھے۔ اس زمانے میں جمعیت کی قیادت کا تعلیمی معیار خراب نہیں تھا۔

۱۱۵۸ الف ب پیر الٰہی بخش کالونی، مرکز کا پتا تھا۔ اس کمرے میں میرا ایک بستر تھا، ایک الماری تھی، جس میں فائلیں تھیں۔ مرکزی دفتر جمعیت کی یہ کل کائنات تھی۔ کالونی کے رفقا آکر مدد کرتے تھے، اور میں اپنا زیادہ تر وقت کراچی جمعیت پر صرف کرتا تھا۔ اس لیے کہ کراچی جمعیت اپنے وجود کے ساتھ پوری طرح وہاں موجود تھی۔ اس کے تربیتی پروگراموں، حلقوں، افطاریوں، شب بیداریوں اور اسٹڈی سرکل میں جانا میرے مشاغل کا سب سے اہم حصہ تھا۔ پھر جمعیت کے دعوتی کام کے نتیجے میں نئے آنے والوں کا رابطہ تو بڑا من پسند میدان تھا۔

دستورِ جمعیت، تدوین کے مرحلے

ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جمعیت کی صرف ایک خدمت کرسکا، اور وہ ہے دستورِ جمعیت کی تدوین۔

اس وقت تک جمعیت ''قواعد وضوابط'' کے ایک غیر واضح اور ڈھیلے ڈھالے نظام کے ساتھ چل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بنیاد پر جمعیت کی تنظیم بہتر انداز سے نہیں چل سکے گی۔ کیونکہ لوگ یہاں بدلتے رہیں گے اور نئے نئے لوگ سامنے آئیں گے۔ اتنا مختصر اور غیر واضح دستور، محض روایات کے بل پر تنظیمی ڈھانچہ قائم نہیں رکھ سکے گا۔ بلاشبہہ جہاں پر لوگ طویل عرصے کے لیے رک کر کام کریں، وہاں روایات چل سکتی ہیں، لیکن جہاں پر لوگ ہر دو تین سال کے بعد بدلتے رہیں گے، وہاں پر یہ بڑا مشکل ہے۔ اسی لیے میں نے شوریٰ کے سامنے ایک باقاعدہ دستورِ جمعیت تیار کرنے کی تجویز رکھی۔ شوریٰ نے ایک کمیٹی بنائی، جس میں ظفر اسحاق اور خورشید بھائی کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔

اس دستور کمیٹی میں، میں نے دستور کا ابتدائی مسودہ لکھا۔ میرے سامنے اس وقت جماعت کا دستور بھی تھا۔ میری عمر انیس برس تھی، تعلیم بھی کوئی ایسی زیادہ نہ تھی۔ دستور یا قانون، مطالعے کا موضوع نہیں تھا اور دین کا مطالعہ بھی کوئی گہرا نہیں تھا۔ البتہ دو تین چیزیں ایسی تھیں، جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت بھی ذہن اور فکر نئی چیزیں سوچنے سے عاجز نہیں تھا، یا پھر یہ کہ کس طرز پر سوچتا تھا۔

مثال کے طور پر جماعت اسلامی کے دستور میں لکھا ہوا تھا کہ، دنیا میں اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ دنیا میں 'حکومتِ الٰہیہ کا قیام یا اقامتِ دین' اگر طلبہ کے لیے بہت وسیع چیز ہے تو اس کا متبادل کیا ہے؟ اس پہلو پر میں نے بہت سوچ کر ایسے الفاظ نکالے، جو شاید زیادہ جامع اور نسبتاً بہتر جملے میں ڈھل گئے تھے کہ:

اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر

کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول۔

یہ ایسے الفاظ تھے کہ جن میں حکومت کا لفظ تھوڑا سا دب گیا تھا اور ساتھ ہی کچھ اس سے مختلف بھی ہو گیا تھا۔ لیکن بظاہر تو یہ ایک لفظ کا فرق تھا۔ جو دوسری تبدیلی اس میں کی، معلوم نہیں بحث میں اس کو واضح کر سکا یا نہیں کر سکا۔ مجھے نصب العین میں 'اور' کا لفظ پسند نہیں آتا تھا۔ 'یہ اور یہ'۔ دنیا میں یہ 'اور' آخرت میں 'یہ'۔ میرا خیال تھا کہ اس سے دوئی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس بات کو زیادہ سادہ لفظوں میں کہوں تو بات یہ ہوئی کہ ''دنیا میں یہ سیاست مقصد ہے اور آخرت میں رضائے الٰہی مقصد ہے''۔ اس لیے میں یہ چاہ رہا تھا کہ دونوں کو ملا کر یک جان کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے لفظ 'اور' کے بدلے 'ذریعہ' کا لفظ بڑھا دیا۔ 'انسانی زندگی کی تعمیر کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول'۔ اگرچہ ایک لفظی بات ہے، اور آج اس کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی، لیکن اس وقت، میرے ذہن میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ دراصل ایک بہتر پیرایہ بیان ہے، جس میں اصل توجہ آخرت کی طرف مبذول ہوتی ہے، کہ دنیا میں بھی دین کا جو کام ہے وہ خود مقصود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ذریعہ ہے مقصد کے حصول کا، یعنی آخرت میں دائمی کامیابی کے حصول کا ذریعہ ـــــ

اس سوچ کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کی کتاب اساسِ دین کی تعمیر کا تھا۔ اس میں انھوں نے یہی لکھا ہے کہ آپ کوئی بھی نظام بنالیں، مگر یہ مقصود نہیں ہے۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ اللہ کی رضا اور اس کی جنت حاصل ہو۔ اب تک میرا خیال ہے کہ یہی چیز ہمارا مرکز ہونا چاہیے، سب چیزوں میں، گفتگوؤں میں، اپنے طرزِ دعوت میں اور اپنے طرزِ تربیت میں اسی بات کا چلن ہونا چاہیے۔ اسی لیے میں نے اس نکتے کو ہمیشہ مرکزی حیثیت دی ہے۔ اس وقت تھوڑی سی کوشش کر کے اپنی سوچ کو جمعیت کے نصب العین میں پیش کیا۔ معلوم نہیں، اس کا یہ مفہوم اس درجہ کارکنوں میں منتقل ہو سکا یا نہیں!

اس کے بعد طلبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے جو تبدیلیاں ہو سکتی ہیں، وہ کیں۔ جو ہماری

ضروریات تھیں، وہ تحریری صورت میں داخل کیں۔ پانچ نکاتی پروگرام تو طے ہی تھا، اس کو سمو دیا۔ پھر دستور کا ایک مسودہ تیار کر کے پورے پاکستان میں ارکانِ جمعیت تک پہنچایا، اس پر ارکان کی آرا آ گئیں۔ پھر ہماری تین رکنی کمیٹی (میں، ظفر اسحاق اور خورشید بھائی) نے بیٹھ کر اس کو آخری شکل دی۔ پھر طے کیا کہ نظرثانی شدہ مسودہ ۱۹۵۲ء کے سالانہ اجتماع سے قبل جمعیت کی شوریٰ کے اجلاس میں منظوری یا ترمیم واضافے کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد سالانہ اجتماع میں شریک ارکان کے سامنے منظوری کے لیے لایا جائے گا۔ جس کے بعد یہ نافذ العمل ہوگا۔

اس دستور میں ہم نے ایک نئی چیز کا، تمہید اور مقدمے کی شکل میں اضافہ کیا۔ ہمارے ذہن میں اس کا خیال 'قرارداد مقاصد' [مارچ ۱۹۴۹ء] سے آیا تھا، جو پاکستان کے دستور کی ایک تمہید ہے۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح ہمارے دستور کی بھی ایک تمہید ہونی چاہیے، حالانکہ جماعت کے دستور میں یہ آئیڈیا نہیں تھا۔ پھر کلمہ کا ذکر کر کے اس کی وضاحت میں جانا، اس پر بھی طبیعت تیار نہیں تھی۔ اگرچہ اس وقت اس بات پر غور نہیں کیا تھا، تاہم آہستہ آہستہ یہ چیز میری سوچ کا حصہ بن گئی۔ مثال کے طور پر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ جماعت صرف اپنے آپ کو اچھا مسلمان سمجھتی ہے اور باقی کو گم کردہ راہ یا بے عمل سمجھتی ہے۔ اگرچہ یہ بات بالکل بے بنیاد تھی، مگر اس شبہے کے پیدا ہونے کی ایک وجہ شاید کلمے کی تجدید کرنا بنی ہو۔ حالانکہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اور جماعت نے کبھی بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے ایمان کو چیلنج نہیں کیا۔

اگرچہ پہلے پہل ہمارے ہاں اسمبلی الیکشن کے خلاف شدت، انگریز دور میں اس کی ملازمتوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ وغیرہ میں ایک قسم کا غلو دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ چیز اس وقت ایک عظیم تر کام کا آغاز کرنے اور تشخص دینے کے لیے ضروری بھی تھی، کہ لوگ اس روایتی دھارے سے الگ رہ کر منفرد شان کے حامل بنیں۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی۔ مگر اس کو ایک حد تک رہنا چاہیے تھا، اس رویے کو پھیلنا نہیں چاہیے تھا۔

اس تناظر میں میرا دل بہت بے چین تھا کہ دستورِ جمعیت کی تمہید بہت خوب صورت،

مؤثر اور جامع ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں راجہ میاں (ظفراسحاق انصاری) ہمارے کام آئے۔ وہ بہت اچھی اُردو لکھتے ہیں۔ میں تو اچھی اُردو نہیں لکھ سکتا تھا۔ انھوں نے جمعیت کے دستور کا مقدمہ تحریر کیا۔ یہ انھی کے اسلوبِ نگارش کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں میں نے مشورے دیے، شاید چند جملوں میں اضافہ یا کچھ میں کمی بھی کی ہو، البتہ خیالات مشترک تھے، مگر یہ تحریر راجہ کی ہے۔

ایک دل چسپ بات یہ کہ، اس مقدمے کی بڑی مخالفت ہوئی۔ لاہور میں شوریٰ کا اجلاس ہوا تو وہاں پر دستور کی سب چیزیں آسانی سے پاس ہوگئیں، مگر دستور کے 'مقدمہ' پر اسرار احمد صاحب اڑ گئے کہ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں''۔ بظاہر دستور کے لیے تمہید اتنی اہم نہیں تھی، لیکن ہم سمجھتے تھے کہ اس سے وضاحت کے ساتھ تنظیم کا ایک رُخ متعین ہوتا ہے، جس طرح جماعت نے اپنے دستور کے آغاز میں کلمۂ طیبہ اور اس کی تشریح لکھ کر ایک قسم کی تمہید فراہم کی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہماری تمہید اسی چیز کو ذرا اور زیادہ منفرد انداز میں ادا کرتی ہے، اور مقاصد کی تشریح کے لیے ایسی تحریر ضروری ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ ایک اصولی اور بنیادی چیز تھی۔

اس کے علاوہ تھوڑا سا جذباتی مسئلہ بھی تھا کہ اپنی فکر، کاوش اور موے قلم سے جو چیز تیار ہوتی ہے، اسے آدمی ایسے آسانی سے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ 'مقدمہ دستور' پر بڑی بحث ہوئی، ڈیڈلاک [تعطل] پیدا ہوگیا۔ شوریٰ کی نشست میں رات تین بجے تک بحث چلتی رہی۔ پھر آخر یہ مقام آگیا کہ ہم نے کہا کہ ''ٹھیک ہے، اگر آپ نہیں مانتے تو دستور کا یہ سارا مسودہ بھی اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں''۔ آخرکار سب لوگوں نے اسے تسلیم کیا اور وہ تحریر دستور کا حصہ بن گئی۔

ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم لوگ تو بہرحال ایک دو سال میں جمعیت چھوڑ کر چلے جائیں گے، ہمارے بعد جمعیت کون چلائے گا؟ چنانچہ دستور بناتے ہوئے یہ سوال بار بار سامنے آیا، کہ کیا کوئی ایسا مستقل انتظام کیا جائے کہ جس سے قیادت مستقل رہ سکے؟ اس پر

بہت زوردار بحث ہوئی۔ بالآخر ہم نے اس کو مسترد کر دیا کہ کوئی مستقل قیادت جمعیت کے لیے بنائیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے، یہ ہماری راہ نمائی تھی۔ اگر ہم بھی وہی راستہ اختیار کرتے، جو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور کانگریس اسٹوڈنٹس کی تحریک نے اختیار کیا تھا، یعنی اساتذہ صدر ہوا کرتے تھے، اس کے پردے میں وہ اسٹوڈنٹس کی تنظیم میں بڑوں کو کرتا دھرتا بنا دیتے تھے، جس سے ایک جنریشن گیپ پیدا ہو جاتا اور نئے لوگوں کے آنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔ بعد میں ۶۰ اور ۷۰ کے عشرے میں، جس طرح طلبہ کا بہاؤ جمعیت کی طرف ہوا، شاید وہ ممکن نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو جمعیت کے منتظم حضرات کا تعلق جماعت سے ہوتا اور یوں اس قیادت کا رویہ جماعت کے ساتھ بہت زیادہ فدویانہ ہو جاتا۔ ہمارے ذہن میں یہ بات آئی کہ مستقل قیادت کا اصول جمعیت کی ترقی اور نمو میں رکاوٹ بنے گا، اس لیے اس کو مسترد کر دیا۔ خود ہم میں سے کوئی تیار نہیں تھا کہ وہ جمعیت میں مستقل طور پر ٹھیرے۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص اس بات پر یکسو تھا، کہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی جماعت سے وابستہ ہوگا، بلکہ ہر ایک اس کے لیے بے چین تھا، پر تول رہا تھا اور مطمئن تھا۔

البتہ ہم نے جمعیت سے نکلے ہوئے افراد کے لیے 'حلقۂ احباب' قائم کرنے کی تجویز دی، اور خود جمعیت کی بہتری اور مفاد کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ میں حلقۂ احباب کو نمایندگی دی، تاکہ پرانے لوگ ہمیشہ جمعیت کی شوریٰ میں شریک رہیں، اس طرح ماضی کی دانش اور روایت کے سفر سے مستقبل کی جمعیت استفادہ کر سکے۔ ہرچند کہ حلقۂ احباب صحیح معنوں میں چل نہیں سکا، تاہم حلقۂ احباب جمعیت کو بڑے عرصے تک معتمدِ عام فراہم کرتا رہا اور ساتھ ہی شوریٰ میں بھی لوگ شریک رہے۔

۵۲ء کی کچھ یادیں

اس کے علاوہ ۱۹۵۲ء میں جمعیت کی حد تک کوئی خاص کام مجھے یاد نہیں ہے۔ اسی

دوران میں آٹھ نکاتی دستوری مطالبہ بھی زور شور سے چلتا رہا۔ جسے ۷ جون ۱۹۵۲ء کو مولانا مودودی نے پیش کیا تھا۔

۱۹۵۲ء کے دو واقعات اور بھی یاد آتے ہیں جن کی نوعیت ذاتی ہے:

اس سال میں انجینیرنگ کے تیسرے سال میں تھا، جب کہ ہمارا بی ای (BE) کا کورس ساڑھے تین سال کا ہوتا تھا۔ آخری ڈیڑھ سال کے دوران پارٹ ون اور پارٹ ٹو کے امتحان دو حصوں میں ہوتے تھے۔ اسی پر ڈگری اور طالب علم کی مجموعی پوزیشن کا تعین ہوتا تھا۔ پہلے دو سال کے نتائج شامل نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں، انجینیرنگ سال اول کے دوران میں فیل ہوا تھا، یعنی سپلیمنٹری آئی تھی، جسے بعد میں پاس کیا تھا۔ البتہ دوسرے سال میں بہتر سیکنڈ کلاس تھی۔ لیکن اب تیسرا سال تو جمعیت کی نظامتِ اعلیٰ کا سال تھا، بہت سرگرمی کا سال تھا، ساتھ ہی کراچی جمعیت میں بھی اسی طرح سے فعال رہا تھا۔ اس امتحان کے لیے دو مہینے کی چھٹی لے کر تیاری کی۔ امتحان دیا اور آکر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میرے کلاس فیلو جو جمعیت سے متاثر تھے، بے چارے بہت خیال رکھتے تھے، خدمت اور محبت کرتے تھے۔ میرے ان دوستوں میں دو سب سے زیادہ ممتاز ساتھی تھے۔ ایک تو پنجاب سے عبدالمجید چودھری تھے۔ انھوں نے میرے ساتھ ڈگری لی۔ بعد میں واپڈا میں انجینیر بنے اور سپرنٹنڈنٹ انجینیر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ جب میں ۱۹۸۷ء میں لاہور آیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔

دوسرے مرغوب احمد تھے۔ وہ میرے بہت ہی گہرے دوست تھے۔ اس عرصے میں میرے دو ٹھکانے ہو گئے تھے۔ ایک تو خورشید بھائی کا گھر اور دوسرا مرغوب کا۔ وہیں کھانا کھایا اور بیٹھ گئے۔ کلاس ورک کے لیے ڈرائنگ تیار کرنے کی مجھے فرصت ہی نہیں ہوتی تھی، جسے یہی لوگ بنا دیا کرتے تھے۔ لیکن آخر کار امتحان تو مجھے خود ہی دینا تھا۔ امتحان کی تیاری کے دوران ہم ایک دوسرے کو پڑھاتے بھی تھے۔

اللہ کے دین کی معمولی سی خدمت کے نتیجے میں ذہن کو جو بھی روشنی ملی تھی، تھوڑی سی محنت نے اس میں زیادہ برکت رکھ دی۔ چنانچہ پہلے حصے کا نتیجہ آیا، یہ نتیجہ اخبار میں نہیں آتا تھا۔ صرف اتنا پتا چلتا تھا کہ پاس ہو گئے۔ مجھے یہ بھی فرصت نہیں تھی کہ جا کر اپنے نمبر نکلواؤں اور دیکھوں کہ نمبر کیسے آئے ہیں۔ جب ایک دن اپنے انجینیرنگ کالج گیا تو میرے ایک استاد بڑے خوش گوار اور پُرجوش انداز میں ملتے ہوئے کہنے لگے: ''کیا آپ کو معلوم نہیں آپ کا رزلٹ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''جی پاس ہو گیا ہوں''۔ کہنے لگے: ''بھئی، آپ کی فرسٹ کلاس ہی نہیں بلکہ فرسٹ پوزیشن بھی آئی ہے اور نمبر ۷۰ فی صد کے قریب ہیں''۔ میں نے کہا: ''یہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا''۔

کچھ ایسا ہوا کہ میں نے جن چیزوں کی تیاری کی، اتفاق سے بیش تر سوال انھی میں سے آ گئے۔ یہ نمبر اصل ڈگری میں شمار ہونے والے تھے۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگلی دفعہ بھی اول آنا چاہیے، تاکہ فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہو جاؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی زندگی میں دنیوی کامیابی کے لیے اللہ کی رحمت بہت زیادہ شاملِ حال رہی ہے۔ میں نے خود کبھی اس کی فکر اپنے اُوپر طاری نہیں کی ہے۔ بس اتنی سی بات ذہن میں تازہ رہتی: ''جو آدمی خود فکر نہیں کرے گا تو وہ اس کی فکر کرے گا، جو سب کا مالک ہے''۔ مگر اس کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں، کہ فرد خود محنت ہی نہ کرے۔ اس نتیجہ سے میرا کیریئر بڑا شان دار رہا۔ اگر وہاں پر میری تھرڈ ڈویژن آ جاتی تو آگے چل کر بڑی مشکلات پیش آتیں۔ ملازمت کے ساتھ جماعت کا کام کرنے کے جو مواقع مجھے ملے، وہ نہیں مل سکتے تھے۔

اس امتحان میں کچھ چیزیں کرشماتی بھی ہوئیں، مثلاً ایک پرچہ جیالوجی (ارضیات) کا ہوتا تھا۔ جیالوجی انجینیروں کو اس لیے پڑھائی جاتی ہے کہ ڈیم، واٹر سپلائی وغیرہ میں علمِ ارضیات جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مضمون ہمیں ایک پارسی پروفیسر صاحب پڑھاتے تھے، جو بہت تیکھے، زبان کے تیز مگر خوش مزاج آدمی تھے۔ اپنی تعریف بہت زیادہ کرتے تھے۔ واقعی ان کا شمار پاک و ہند کے اچھے ماہرینِ ارضیات میں ہوتا تھا۔

جب جیالوجی کا پرچہ سامنے آیا تو مجھے وہ بہت کم آتا تھا اس لیے اب میں کیا کرتا؟ تین گھنٹے کا وقت تھا۔ میں بیٹھ کر تھیوری لکھنے کے بجائے، سوالوں سے متعلق لمبے لمبے اسکیچ کھینچنے لگا۔ ان میں رنگ بھرتا اور کہیں پر ایک دو جملے لکھ دیتا۔ مطلب یہ کہ لکھا بہت کم اور اسکیچ بہت زیادہ بنائے۔ ان پروفیسر صاحب نے مجھے سو میں سے بہتّر (۷۲) نمبر دیے۔ انھوں نے اب تک کسی کو اتنے زیادہ نمبر نہیں دیے تھے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ ان استاد محترم کو تو یہی اسلوب پسند تھا، کہ آپ مختصر لکھیں، اور جواب زیادہ نقشوں کے ذریعے ظاہر کریں۔ میں نے کہا کہ ''یہ تو میری جہالت تھی، اگر مجھے زیادہ آتا ہوتا تو میں لازماً لمبا لکھتا''۔ بہرحال یہ اللہ کی خاص مدد تھی۔ اس امتحان کے بعد میں پھر جمعیت کے کاموں میں مصروف رہا۔

غالباً جولائی ۵۲ء کے دوران مجھ پر ٹائی فائڈ کا شدید حملہ ہوا۔ اس زمانے میں ٹائی فائڈ آج کل کی طرح نہیں ہوتا تھا، کہ چھے دن میں اینٹی بایوٹک کھائی اور آدمی اُٹھ بیٹھا۔ اگرچہ اینٹی بایوٹک موجود تھی، مگر اتنی مؤثر نہیں تھی۔ یہ معیادی بخار سات دن، گیارہ دن یا اکیس دن رہتا تھا۔ مجھے اکیس دن رہا، جس میں بہت ہی زیادہ کمزور ہو گیا تھا۔ اگرچہ دورے نہیں کرتا تھا، لیکن کام تو کرنا تھا، اس بیماری میں اور بعد میں بیماری کے اثرات سے کام کا نقصان ہوا۔ دوسرے پڑھائی بھی نہیں ہوئی۔ چھے مہینے بعد انجینیرنگ حصہ دوم کا امتحان تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سابقہ نتیجہ کا معیار برقرار رکھنے کے لیے میں اگلا امتحان، چھے ماہ تاخیر سے دوں گا۔ یوں چھے ماہ ضائع کیے۔ ورنہ اس زمانے میں تعلیمی وقت کا ضیاع ہماری لغت میں نہیں تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ وقت پر پڑھنا چاہیے، وقت پر کامیاب ہونا چاہیے، وقت پر تعلیمی ادارے اور پھر جمعیت سے باہر نکل جانا چاہیے۔

اسٹوڈنٹس یونین انتخاب میں

اگرچہ ۱۹۵۷ء میں جمعیت نے کراچی کے کالج یونین کے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا، لیکن اس سے قبل ہم مختلف کالجوں کی سوسائٹیوں یا مختلف نشستوں پر انتخابات میں حصہ

لیتے رہے۔

این ای ڈی کالج میں ۱۹۵۲ء کے دوران ریڈنگ روم سیکرٹری کے طور پر ہم نے مرغوب احمد کو کھڑا کیا اور ان کی انتخابی مہم خوب چلائی۔ اگرچہ اس وقت میں ناظمِ اعلیٰ تھا، لیکن اس پوری انتخابی مہم کا منصوبہ بنایا۔ انجینیرنگ کالج میں جمعیت کی شاخ بڑی مضبوط تھی، چنانچہ مرغوب، ریڈنگ روم سیکرٹری منتخب ہوگئے۔ ریڈنگ روم میں، ہم نے پہلی دفعہ اپنا لٹریچر رکھوایا۔ نئی جدت پیدا کرتے ہوئے وال پیپر کا آغاز کیا۔ مرغوب خوش خط تھے اور ڈرائنگ بھی اچھی بناتے تھے۔ وال پیپر کا ڈیزائن اور اس کی کتابت وہ خود کرتے تھے، ہر پندرہ، بیس دن میں وال پیپر کا شمارہ آتا۔ جس میں کوئی آیت، حدیث، واقعہ یا مختصر تبصرہ ہوتا اور یہ پیپر ریڈنگ روم میں لگایا جاتا۔ کوشش کر کے نصابی اور حوالے کی کتب بڑی تعداد میں فراہم کر کے ریڈنگ روم کو بہت بہتر بنا دیا۔ جس سے عام طلبہ اور اساتذہ پر جمعیت کی دعوت کا خاصا مثبت اثر ہوا۔

انتخابات میں اصل کامیابی ہمیں اُردو کالج میں ہوئی۔ اُردو کالج کا دستور دوسرے ہی طرز کا تھا۔ وہاں پر ایک مجلس شوریٰ منتخب ہوتی تھی، جس میں ہر کلاس کے نمایندے ہوتے تھے۔ دستور کے مطابق یہ مجلس شوریٰ ہی اسٹوڈنٹس یونین کے عہدے دار منتخب کرتی تھی۔ اُردو کالج کے اساتذہ اور طلبہ میں بھی ہمارے بہت سے ہمدرد موجود تھے۔ تمام پڑھنے والے طلبہ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں یہاں پر آئے تھے۔ یہ لوگ معاشی طور پر سخت پریشان تھے۔ اسی لیے دن بھر ملازمت کرتے تھے۔ شام کو کالج میں آ کر پڑھتے تھے۔ اُردو کالج کی کارکردگی صبح چلنے والے بہت سے کالجوں کی کارکردگی سے بہتر تھی۔ اس لیے کہ وہاں پر اُردو ذریعہ تعلیم تھا۔ اس کالج میں جمعیت کے بہت اچھے اثرات تھے۔ اُردو کالج کے ہال میں بہت عرصے تک ہمارا اجتماعِ عام ہوتا رہا۔ شرافت علی ہاشمی صاحب، پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب ان دنوں اُردو کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے ہم خیال اساتذہ کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ ہمارے لوگوں نے منصوبہ بندی کر کے کلاس کے نمایندگان کھڑے کیے۔ کالج کی

منتخب طلبہ کونسل میں ہماری اکثریت آ گئی۔ ان انتخابات میں ہمارے جن کارکنوں نے نمایاں طور پر حصہ لیا، ان میں ایک تو افتخار الاحد مرحوم تھے۔ وہ ایک بے مثال کارکن تھے۔ جمعیت سے فارغ ہونے کے بعد وہ پی آئی اے میں ملازم ہوئے۔ ساٹھ کے عشرے میں وہاں پر مزدور یونین 'پیاسی' کو بنوانے اور اس کا لوہا منوانے میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ کمیونسٹ مزدور تحریک کی پُرتشدد کارروائیاں بھی برداشت کیں۔ ان کا جوانی کے عالم میں انتقال ہو گیا۔ وہ تحریک کا ایک بہت قیمتی اثاثہ تھے۔ دوسرے اہم نمایندے جو کامیاب ہوئے وہ ممنون احمد مرغوب تھے۔ وہ ہمارے رشتے دار تھے۔ اگرچہ انتخاب کے وقت وہ جمعیت میں نہیں تھے، لیکن ہمارے قریب تھے۔ کامیاب ہونے کے بعد وہ پوری طرح ہمارے ساتھ آ گئے۔

اسی طرح وحید اللہ نظمی مرحوم بھی تھے۔ وہ پیر کالونی میں رہتے تھے۔ اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ مؤثر تقریر کرتے تھے، سیاسیات کے طالب علم تھے۔ انھی کو ہم نے صدر منتخب کرایا تھا۔ یہ غالباً ۵۲ء کا واقعہ ہے۔

ان دنوں اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں کمیونسٹ لابی کے لوگ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن (DSF) کے نام سے غالب تھے۔ خاص طور پر ڈاؤ میڈیکل کالج تو ان کا مضبوط گڑھ تھا۔ کراچی کے تمام کالجوں کی اسٹوڈنٹس یونینوں کی بنیاد پر انھوں نے 'انٹر کالجیٹ باڈی' (ICB) کے نام سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنایا تھا۔ ہم اس وقت تک طلبہ سیاسیات کے پیچ وخم سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے طلبہ کا ایک چارٹر آف ڈیمانڈ تیار کیا تھا: ''فیسیں کم کی جائیں، تعلیمی معیار بہتر کیا جائے، اور طلبہ کو سہولتیں دی جائیں''۔ اس زمانے میں وفاقی وزیر تعلیم فضل الرحمٰن صاحب تھے، جو فکری اور عملی اعتبار سے دین پسند انسان اور بڑے دبنگ آدمی تھے۔ کمیونسٹ فکر رکھنے والے لوگ انھیں ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا چارٹر آف ڈیمانڈ انھیں پیش کرنے کے بجائے، مطالبات کے حق میں ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو جلوس نکالا۔ اس جلوس پر کراچی صدر میں فائرنگ ہوئی۔ اس واقعے کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ فائرنگ کے نتیجے میں آٹھ افراد ہلاک ہوئے، جن میں زیادہ تعداد

طالب علموں کی تھی۔

اس سانحے کے نتیجے میں کراچی اور حیدرآباد کے تعلیمی اداروں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، ہڑتال ہوئی اور پنجاب میں بھی اس کے اثرات محسوس کیے گئے، مگر وہاں پر اس حوالے سے وہ کوئی تحریک نہیں برپا کرسکے۔ اسرار صاحب نے کراچی میں اس واقعے کو 'ہماری غفلت' کا نتیجہ قرار دیا۔ اور پنجاب میں اس کے اثرات کی عدم صدائے بازگشت کو وہاں کی طلبہ برادری پر اپنی 'گرفت' سے موسوم کرتے ہوئے کئی مرتبہ یہ کہا کہ 'ہم نے اپنی حکمت اور فراست سے، کراچی سے اُٹھنے والی سرخ آندھی کو روک دیا' حالانکہ مسئلہ کچھ اور تھا۔

دراصل اس وقت بھی کراچی پڑھے لکھے لوگوں کا شہر تھا، جب کہ ان دنوں لاہور میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب خاصا کم تھا۔ کراچی میں پورے ہندستان سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ جن میں تجربہ کار کمیونسٹ بھی تھے۔ ویسے یہاں پر مزدوروں میں ان کا پرانا کام تھا۔ ذرائع ابلاغ میں بھی انھیں گہرا رسوخ حاصل تھا۔ سول انتظامیہ کے بااثر لوگوں میں ان کی اپنی اصطلاح کے مطابق 'حریتِ فکر' کے حامل افراد بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان حوالوں سے کراچی میں اشتراکی تحریک کا اثر ورسوخ ملک کے دیگر حصوں کی نسبت کہیں زیادہ تھا۔ یہ زمانہ ویسے بھی کمیونزم کے عروج کا زمانہ تھا۔ اشتراکی انقلاب نوجوانوں کا رومانس تھا اور اس سے وابستگی فیشن کا روپ دھار چکی تھی۔ ہر غیر اشتراکی حکومت، اشتراکی تحریک سے خائف تھی۔ امریکا بھی اپنے آپ کو اشتراکی روس کے سامنے دبا دبا محسوس کرتا تھا۔

کراچی کے تعلیمی اداروں میں اشتراکی فکر کے اثرات کم کرنے میں جمعیت کو بارہ برس لگے۔ سب سے پہلے کراچی ہی میں جمعیت نے مربوط اور مسلسل انتخابی کامیابیاں حاصل کیں، اس کے بعد مغربی پاکستان کے کم وبیش بہت سے تعلیمی اداروں پر جمعیت چھا گئی۔

کالج کا بہترین مقرر

تنہائی پسند طبیعت کے سبب ابتداً کسی مجمع میں کھڑے ہوکر بات کرنا میرے لیے ممکن

نہ تھا۔ اتنی عمر گزر جانے کے بعد، آج بھی مجلسی گفتگو کا عادی نہیں ہوں۔ دوست بولتے رہتے ہیں اور میں سنتا رہتا ہوں۔

شروع کی زندگی دیکھتا ہوں تو اس میں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کبھی تقریر کروں۔ لیکن دل میں یہ محسوس کرتا تھا کہ تقریر کرسکتا ہوں اور مجھے بولنا چاہیے۔ شروع شروع میں خیال کی ترنگ میں آ کر زبان سے الفاظ ادا کیے بغیر دل ہی دل میں تقریر کیا کرتا تھا۔ الیگزینڈر رہائی اسکول بھوپال میں ایک ڈبیٹنگ ٹیم ہوا کرتی تھی۔ وہ کہیں سے انعام لے کر آئی، تو ان کے اعزاز میں ایک محفل ہوئی، جسے دیکھ کر خواہش پیدا ہوئی کہ مجھے بھی تقریر کرنی چاہیے۔ ابھی نہم کلاس میں پڑھ رہا تھا، کہ مجھے استاد صاحب نے بلایا، اور تقریر کرنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ بمشکل دو جملے ہی منہ سے نکلے تھے، کہ پسینے چھوٹ گئے اور منہ بند ہو گیا، چنانچہ بیٹھ گیا۔ اس کے بعد جمعیت کے ابتدائی زمانے میں عموماً لکھ کر پڑھتا تھا۔ اُردو کالج کے اساتذہ کے سامنے اس نوعیت کی پہلی تقریر کی۔ اس کے بعد تربیت گاہوں یا اس سے پہلے اسٹڈی سرکل میں اور جمعیت کے ہفتہ وار اجتماعات میں، لٹریچر سے تیار کر کے تقریریں کرتا رہا۔ پھر جمعیت کا ناظمِ اعلیٰ منتخب ہونے کے بعد چوتھے سالانہ اجتماع میں ۴ نومبر کو پہلی قابلِ ذکر فی البدیہہ تقریر کی تھی۔

۱۹۵۲ء این ای ڈی انجینیرنگ کالج میں میرا آخری سال تھا۔ اس وقت مجھے شوق پیدا ہوا کہ کالج کے تقریری مقابلے میں حصہ لوں، اور یہ دیکھوں کہ جو صلاحیت جمعیت کے اجتماعات میں استعمال کرتا ہوں، وہ عام طلبہ کے اجتماع میں کس حد تک مؤثر ہے۔ ہمارے کالج کے بہترین مقرر کا انتخاب، تین مقابلوں کے بعد ہوا کرتا تھا۔ ان میں سب سے پہلے تین منٹ کی فی البدیہہ تقریر کرنا ہوتی تھی۔ روسٹرم پر جاتے ہی جو پرچی نکل آتی اس پر تقریر ہوتی۔ دوسرے مرحلے میں فرد اپنی مرضی سے موضوع منتخب کر کے پانچ سے سات منٹ تک تقریر کرتا تھا۔ اس میں طرزِ بیان، فصاحت، بلاغت، نفس مضمون پر گرفت اور زورِ خطابت کے نمبر دیے جاتے تھے۔ تیسرے مرحلے میں دو گروپوں کے مابین روایتی مباحثہ ہوتا تھا۔

فی البدیہہ مقابلہ ہو رہا تھا تو میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کالج میں ہمارا لباس پتلون قمیص ہی تھا۔ میں معمولی پتلون اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ پرچی کھولی تو اتفاق سے موضوع نکلا: ''پاکستان کا قومی لباس شیروانی ہونا چاہیے''۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس کی حمایت کرنا تھی۔ اب یہ ایک نازک مسئلہ پیدا ہو گیا، کہ میں نے خود تو شیروانی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے تین منٹ بھی بہت لمبے لگے، بہرحال تقریر کر دی، جس میں اول آ گیا۔ پھر اس سے اگلے مرحلے یعنی، فصاحت و بلاغت کے مقابلے میں، میں نے موضوع لیا: 'اسلام کی دعوتِ انقلاب'۔ خود ہی اپنی تقریر لکھی اور اس کا اختتام علامہ محمد اقبال کے ان اشعار پر کیا:

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیر اُم کیا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

موضوع، تقریر اور زبان و بیان چونکہ اپنا تھا، اس لیے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس تقریر میں بھی اول آ گیا۔ ہمارے کالج کے ایک بہت اچھے مقرر ظفر چودھری ہوا کرتے تھے، جو ہر جگہ کالج کی نمایندگی کیا کرتے تھے۔ ان کی خطابت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہکا بکا دیکھ رہے تھے کہ یہ چیلنج کرنے والا اچانک کس گوشے سے نکل کر سامنے آ گیا ہے۔ کالج میں مباحثے کا مرحلہ آیا تو دو تقریری مقابلوں میں اول آنے کے باعث میں 'لیڈر آف دی ہاؤس' قرار پایا، جب کہ ظفر چودھری 'لیڈر آف دی اپوزیشن' مقرر ہوئے۔ مباحثے کا موضوع عورتوں کے حوالے سے تھا۔ دوسرے کالجوں سے ہمارے کئی ساتھی بہ شمول ظفر اسحاق آئے ہوئے تھے۔ اس مباحثے میں بھی اول آیا۔ یوں تینوں مقابلوں میں اول آنے کے باعث

کالج کا بہترین مقرر منتخب ہوا۔اس پر ریڈیو پاکستان، کراچی نے ریڈیو اسٹیشن پر آنے کی دعوت دی، جو اس زمانے میں بڑے اعزاز کی بات ہوا کرتی تھی۔ مجھے وہاں سے پچیس روپے ملے، جو بڑی دولت تھے۔ وہ لا کر میں نے والدہ محترمہ کو دے دیے، جنھوں نے ان سے میری چھ قمیصیں تیار کر دیں اور دو سفید پتلونیں لے کر دیں۔

ان دنوں کراچی کے مرکزی انٹر کالجیٹ مباحثے میں سامعین کا بہت بڑا مجمع ہوا کرتا تھا۔ این ای ڈی کی طرف سے میں گیا، کیونکہ بہترین مقرر منتخب ہوا تھا۔ مگر وہاں پر اتنی زبردست ہوٹنگ ہو رہی تھی، کہ میں نہیں بول سکا۔ مقررین لڑکیوں کی زیادہ پذیرائی حاصل ہو رہی تھی۔ اتفاق سے ماموں زاہد حسین صاحب مہمان خصوصی تھے اور بعد میں ان کو انعامات تقسیم کرنے تھے۔ انعام تقسیم کرنے کے بعد جب بولنے کے لیے کھڑے ہوئے، تو اس مجمع میں وہ بھی نہیں بول سکے۔ ان کو لڑکوں نے اتنا ہوٹ کیا کہ وہ غصے میں روسٹرم پر ہاتھ مار کر چلے گئے۔ اس تجربے سے مجھ پر یہ بات عیاں ہوئی کہ عام طلبہ کے سامنے بھی بات کر سکتا ہوں۔

چند سبق آموز یادیں

والدہ محترمہ کی طرف سے گھر میں مجھے جو حمایت ملتی تھی، وہ بہت نمایاں تھی۔ والد صاحب نے بھی میری کبھی کوئی مخالفت نہیں کی تھی، مگر کبھی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی تھی۔ لیکن جب انھوں نے سمجھا کہ جمعیت کے کام کی وجہ سے میرے کیریئر اور تعلیم کو نقصان پہنچ رہا ہے، تو ان کو تشویش اور پریشانی ہوتی تھی۔ خالد بھائی کے انتقال کے بعد جن دنوں ہم گاندھی گارڈن میں مقیم تھے، میں رات کو دیر تک باہر نہیں رہا کرتا تھا۔ عام طور پر عشاء تک گھر آ جاتا تھا۔

ایک دن جمعیت کا اجتماع ختم ہوا تو ہم پروفیسر جلیل الدین احمد خان صاحب کے ساتھ پیدل چل پڑے۔ وہ لمبی، مفید اور معنی خیز گفتگو کرنے والے محترم مربّی تھے۔ خورشید بھائی کے گھر سے ہم چلے، ہر موڑ پر رک کر پندرہ بیس منٹ کھڑے ہو کر ان کی بات سنتے، اپنی

کہتے اور آگے بڑھتے۔ اس طرح چلتے، رکتے اور بات کرتے کرتے، میں کہیں رات کے ڈیڑھ دو بجے اپنے گھر پہنچا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بغیر اطلاع اور بغیر اجازت کے گھر سے اتنی دیر باہر رہا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ میرے انتظار میں اماں جاگ رہی تھیں اور سخت پریشان تھیں۔ مجھے ان کی پریشانی اور اس پریشانی پر خاموشی دیکھ کر بڑی شدت سے ندامت کا احساس ہوا۔ بعد میں بھی ہم بہت باہر رہے، لیکن اس دن کے بعد سے میں نے یہ عادت بنالی کہ گھر والوں کو ضرور بتا دینا چاہیے۔ کہیں ایمرجنسی ہو جائے تو وہ الگ بات ہے۔ لیکن جانے سے پہلے معلوم ہو تو ضرور بتا دینا چاہیے۔ اب تک میں اس اصول کی حتی الامکان پابندی کرتا ہوں۔

مشاہدہ ہے کہ، ہمارے تحریک کے بہت سے لوگوں کے اہلِ خانہ کو یہ پتہ بھی نہیں ہوتا کہ صاحبِ خانہ اور صاحبزادے کہاں گئے ہیں، کس کام سے گئے ہیں اور کب آئیں گے؟ میں خود اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں۔ بچے گھر سے نکل جاتے ہیں، پتا نہیں ہوتا کہ کہاں گئے اور کب آئیں گے۔ ان کی والدہ بار بار کہتی رہتی ہیں، شکایت کرتی ہیں، مگر افسوس کہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے اسی ایک واقعے کے بعد سے اپنی عادت بنالی تھی۔

جس طرح پہلے کہہ چکا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے میں نے اپنی ذاتی زندگی کے لیے مستقل اصول بنالیے ہیں۔ مثال کے طور پر صبح اُٹھ کر سلام کرنا ہم کو گھر پر نہیں سکھایا گیا تھا، اس لیے یہ عادت بھی نہیں تھی۔ ایک روز میں خورشید بھائی کے گھر پر رات کو رُک گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو انھوں نے فوراً مجھے کہا: ''السلام علیکم''۔ مجھے ان کا یہ عمل بہت پسند آیا۔ اب مجھے کسی وعظ سننے یا کتاب پڑھ کر تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اور دل کو لگا کہ ہاں یہ بات صحیح ہے۔ بعد میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی پڑھیں کہ ہر غیر حاضری کے بعد سلام کرنا چاہیے۔ گویا کہ سو کر اُٹھنے کے بعد تو کرنا ہی چاہیے۔ اس روز کے بعد سے مجھے سو کر اُٹھنے کے بعد سلام کرنے کی، گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی عادت پڑ گئی۔ یہ چھوٹے چھوٹے سبق آموز واقعات بڑے اہم ہوتے ہیں۔

جمعیت کے زمانے میں ہمارے معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ گھر میں اکثر شام کے

وقت ایک بار دال پک جاتی تھی، جس سے گزارا چلتا تھا۔ ممکن ہوتا تو صبح کے وقت کبھی کبھی انڈا آملیٹ بن جاتا، جو ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہوتا تھا۔ سالن میں دو تین بوٹیاں ہوتیں، جن سے ترکاری کا ذائقہ کچھ تبدیل ہو جاتا تھا، جب کہ ہم کھانا کھانے والے دس بارہ افراد ہوتے تھے۔ ابھی تک میری ملازمت نہیں ہوئی تھی۔ سعید بھائی کو الاؤنس ملتا اور والد صاحب کی پنشن برائے نام آتی تھی۔ انھی محدود وسائل میں اماں کھینچ تان کر، مگر بڑے سلیقے اور کفایت شعاری سے مہینے بھر کا گھریلو نظام چلاتیں۔

ایک زمانے میں تو جمعیت کا دفتر بھی میرے گھر پر تھا، ظاہر ہے کہ اس حوالے سے بھی ساتھیوں کی آمد برابر رہتی تھی۔ ساتھی وقت بے وقت آتے تھے۔ ان سب کی معمولی سی خاطر مدارات اسی بجٹ میں ہوتی تھی۔ چار آنے، یعنی ۲۵ پیسے میں ایک کلو انگور آ جاتے تو وہی میزبانی کے لیے کافی ہوتے تھے۔ بہرحال، میرے گھر والوں نے ان دوستوں کی آمد و رفت پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہیں کہا۔ جو کچھ اور جتنا کچھ ہوتا، اسی میں ہمارے گھر میزبانی کی روایت قائم رہی۔ کوئی بہت زیادہ تکلف نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح نہ کوئی تکلف وہاں پر ہی ہوتا تھا، جہاں میں جاتا تھا۔ بعض اوقات ظفر اسحاق کے ہاں کھانے کا وقت ہوتا تو، وہ بھی بلاتکلف دہی میں نمک اور کالی مرچ ملا کر روٹی کے ساتھ رکھ دیتے، اور ہم اسے خوشی سے کھا لیتے تھے۔ ان کے حالات بھی ہماری طرح کچھ بہتر نہیں تھے۔

سب سے بہتر یہی اصول ہے کہ مہمانوں کے آنے سے آدمی پریشان نہ ہو، اور نہ ان کی خاطر اپنے گھر والوں کو پریشان کرے۔ جو کچھ بھی گھر میں میسر ہو، وہ پیش کر دے اور یہ بات مہمان کو بھی سمجھنا چاہیے۔ ہمارے گھر میں یہی طریقہ تھا، اس لیے میں نے اپنی زندگی میں اسی کو اپنایا اور بہتر پایا۔

چند مفروضے، کچھ حقائق

مولانا مودودی نے حکومت پاکستان سے اسلامی دستور کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت وزیراعظم خواجہ ناظم الدین صاحب [م: ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء] خود دین پسند اور دینی شعائر سے

ہمدردی رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے قبل وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے جو دستوری سفارشات پیش کی تھیں، انھیں جماعت نے مسترد کردیا تھا، کیونکہ یہ غیرجمہوری اور غیراسلامی سفارشات تھیں۔ بعدازاں خواجہ صاحب نے جو سفارشات پیش کیں، ان میں ہمارے مطالبات اور کافی چیزیں شامل تھیں۔ کچھ چیزیں ۵۶ء کے دستور میں شامل ہوئیں، اور پھر ۷۳ء کے آئین کا حصہ بھی بنیں۔ بنیادی نقائص ہونے کے باوجود ہم نے ان دساتیرِ پاکستان کو احترام کی نظر سے دیکھا اور قبول کیا۔

اس زمانے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ ''پاکستان کا اصل مسئلہ اسلام اور سیکولرزم کی کش مکش ہے''۔ بعض اوقات ہم محسوس کرتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ ''عوام نے اسلام کو ووٹ نہیں دیے''، لیکن مطالعے، مشاہدے اور غوروفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کے سیاسی عمل میں فی الواقع اسلام اصل مسئلہ کبھی رہا نہیں۔ ۱۹۵۲ء وغیرہ میں، تدوینِ دستور کے زمانے میں بھی اسلام مسئلہ نہیں تھا۔ مقتدر سیاسی اور غیرسیاسی قوتیں باہمی اتفاق سے، ہماری اشک شوئی کے لیے چند بے ضرر سے کام کر کے اپنے بنیادی اقدامات کو قابلِ قبول بنا دیتے ہیں۔ اپنے دل میں 'قراردادِ مقاصد' کا تمام تر احترام رکھنے کے باوجود میں اسے آنسو پونچھنے کا اقدام سمجھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود خوش قسمتی سے اس قرارداد میں وہ جوہر موجود ہے، جس کو کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے اس کو قبول کیا، اس کے بعد اور کئی نیم دلانہ اقدامات کو بہ چشمِ احترام قبول کرتے رہے ہیں۔

میرے نزدیک اس وقت پاکستان میں بنیادی مسئلہ سیاسی تھا۔ دوسرے لفظوں میں مسئلہ پنجاب اور بنگال کے درمیان قوت اور اقتدار کی کش مکش کا تھا۔ اگر آبادی کی بنیاد پر عام انتخابات ہوتے تو بنگال کی اکثریت ہوتی۔ صوبہ پنجاب اور یہاں کے چاروں صوبے ملاکر بھی اپنی تعداد کے لحاظ سے بنگال سے کم تھے۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ اسی لیے اس زمانے میں جمہوری انتخابات نہیں ہوئے۔ قائداعظم کے انتقال [۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء] کے بعد خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنایا گیا، جب کہ لیاقت علی خان وزیراعظم تھے۔ اس طرح دونوں

بازوؤں کے درمیان شراکت اقتدار کا ایک عارضی سا توازن پیدا کر لیا گیا تھا۔ راولپنڈی کے جلسۂ عام میں لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا تو خواجہ ناظم الدین صاحب نے گورنر جنرل کا منصب چھوڑ کر وزارتِ عظمیٰ سنبھال لی، جو قوت کا اصل سرچشمہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح بنگال کو اس کا حق مل سکے گا۔

مگر المیہ یہ ہوا کہ دوسری مقتدر قوتوں نے اس وقت کے ایک طاقت ور بیوروکریٹ وزیر خزانہ ملک غلام محمد کو گورنر جنرل بنا کر طاقت کا توازن اپنے حق میں کر لیا۔ ملک غلام محمد، لاہور (پنجاب) سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کش مکش، اقتدار کی تقسیم، صوبائی حقوق کو سلب کرنا اور زبان کے مسئلہ پر غیر حکیمانہ ردعمل وغیرہ ہی وہ چیزیں تھیں، جو پاکستانی دستور بننے کی راہ میں اصل رکاوٹ تھیں۔ اگر سادہ لفظوں میں بات کی جائے تو اس کے پس منظر میں دراصل بنگال اور پنجاب کے مفادات کا تصادم تھا، جب کہ سندھ اور بنگال میں اُردو بولنے والوں کے فطری حلیف مقتدر اہلِ پنجاب تھے۔ مفادات کے تحفظ کے لیے اس عملی اتحاد نے بنگال میں ردعمل کو تیز کیا۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت

۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں چلنے والی تحریک ختم نبوت کے دوران خواجہ ناظم الدین جیسے دین پسند انسان اپنی جگہ، قادیانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو ہٹانے کا استدلال تو سمجھتے تھے، مگر اس کے پس منظر میں کارفرما سیاسی طوفان اور محلاتی سازش کو بھی جانتے تھے۔ اسی طرح ظفر اللہ خان کو ہٹانے کی راہ میں رکاوٹوں اور مجبوریوں کا بھی انھیں سامنا تھا۔ اس وقت پنجاب میں وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ [م: جون ۱۹۹۵ء] تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور ختم نبوت پر ہم اور ہمارے ماں باپ قربان ہوں۔ ختم نبوت کی حرمت پر ہمیں زندگیاں ملیں اور ہم نثار کرتے چلے جائیں، اس سے بڑھ کر سعادت کی اور کیا بات ہوگی، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ کم از کم سیاسی سطح پر ۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک کا ہدف ایک بنگالی وزیر اعظم کی حکومت کو برطرف کرنا

بھی تھا۔ ختمِ نبوت سے محبت دولتانہ صاحب کے دل میں نہ کبھی پہلے گھر کر سکی اور نہ بعد میں اس محبت نے کوئی اضطراب پیدا کیا۔ مگر مرکز اور صوبے کی کش مکش میں یہ ایک اچھا شکنجہ ان کے ہاتھ آ گیا تھا، اس لیے انھوں نے پسِ پردہ کردار ادا کیا۔ لاہور میں خوں ریزی ہوئی اور نتیجے کے طور پر لاہور میں مارشل لا نافذ [۶ مارچ ۱۹۵۳ء] کر دیا گیا۔ یہ پاکستان میں پہلا مارشل لا تھا، جب فوج نے قدم بڑھایا۔ آخرکار مرکزی حکومت کی ناکامی کا بہانہ بنا کر لاہور کے ملک غلام محمد صاحب نے بنگال سے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین صاحب کو برطرف [۱۶ اپریل ۱۹۵۳ء] کر دیا۔ اس وقت بھی ہمارا خیال تھا: ''بہت غلط کارروائی ہوئی ہے، جس کے پاکستان کے مستقبل اور سیاست پر بڑے گہرے منفی اثرات پڑیں گے''۔ اس کے بعد ملک ایک کے بعد دوسرے ہنگامے کی لپیٹ میں آتا چلا گیا۔

یہ ایک اہم سوال ہے کہ مجلسِ احرار نے یک لخت اس مسئلے کو انتہا پر پہنچا دیا۔ مگر جب ان جذبات سے استفادہ کرنے والی سنگ دل سیاسی قوت کا پسِ پردہ 'سیاسی ہدف' حاصل ہوگیا تو پھر بہت سے معصوم مسلمانوں کا بہنے والا لہو بھی ان بزرگوں اور سیاسی عقابوں (Hawks) کو ختمِ نبوت سے متعلق کسی مربوط عمل پر نہ اُبھار سکا۔ محض لاہور کا مارشل لا پوری تحریک کی بساط لپیٹ کر رکھ دینے کا باعث بنا۔ اس زبردست طوفان خیزی اور پھر مدتوں تک کی سکون سی کیفیت کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا کوئی بڑا مشکل کام نہیں۔

قادیانیت کے خلاف تحریک چل رہی تھی، جس میں اس تحریک کے لیڈروں نے راست اقدام (direct action) کیا۔ جماعت اسلامی اس بات کو سمجھتی تھی کہ فی الوقت بنیادی مسئلہ دستور کی تدوین کا ہے، اگر اس میں اسلامی شقوں کو رکھ لیا جائے اور قرآن وسنت کے مطابق آئین اور قانون کی تشریح کا راستہ نکال لیا جائے، تو ٹھوس انداز سے ختمِ نبوت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اسی لیے مولانا مودودی کی یہ نپی تلی رائے تھی کہ اس مرحلے پر مسئلے کو اس انداز سے حل کرانے کی کوشش، درحقیقت اسلامی دستور سازی کے سارے کام کی بساط لپیٹ دے گی، یا پھر اسے شدید نقصان پہنچائے گی۔ مگر مذہبی طبقے نے

صوبہ پنجاب میں اس مسئلے کو اتنا اُبھار دیا کہ مولانا مودودی نے اسلامی دستور کے اپنے آٹھ نکاتی مطالبے میں قادیانیت کے بارے میں ایک نکتے کا اضافہ کیا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت کس قدر مشکل صورت حال میں گھر چکی تھی۔

حالانکہ ہم سب جانتے تھے کہ اس شکل میں یہ تحریک، دستور اور اسلامی دستور کے اصل مطالبے سے توجہ ہٹانے کا باعث بن رہی ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی معلوم تھی کہ پنجاب اور بنگال کی سیاسی لڑائی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن اس بات کو کہہ نہیں سکتے تھے، کیونکہ ختم نبوت کا مسئلہ اتنا نازک تھا کہ اس سخت گرم فضا میں کوئی بات کہنا بھی ممکن نہ رہا تھا، تاہم جماعت اسلامی نے بڑی جرأت کر کے راست اقدام (direct action) کی مخالفت کی، لیکن ڈائرکٹ ایکشن شروع ہو گیا۔ کسی مسلمان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم رسالت کے تحفظ کے لیے ہونے والی جدوجہد سے الگ رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جماعت نے راست اقدام سے الگ رہنے کے باوجود اس تحریک میں بڑی دانش مندی اور محتاط انداز سے اپنا حصہ ادا کیا۔ اس ہنگامہ خیز صورت حال میں گورنر جنرل کے ہاتھوں وزیر اعظم کی بلا جواز برطرفی کو مسلم لیگ پارٹی نے سر جھکا کر قبول کر لیا اور محمد علی بوگرہ کو امریکا سے طلب کر کے نیا وزیر اعظم مقرر [۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء] کر دیا گیا۔

مئی کے آخر میں میرے آخری امتحان ہونے والے تھے۔ ایک طرف اس امتحان کا بھوت سوار تھا، مگر دوسری جانب اس صورت حال میں سخت اضطراب تھا۔ ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا لگا، اور ۲۸ مارچ کو مولانا مودودی کی گرفتاری ہوئی تھی۔ شیخ سلطان احمد صاحب جو پیر کالونی میں رہتے تھے، وہ قائم مقام امیر جماعت مقرر ہو گئے تھے، کیونکہ پنجاب سے جماعت کے بیش تر لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔

مولانا مودودی کو سزائے موت

میرے امتحان میں مشکل سے دو ہفتے باقی رہ گئے تھے اور اپنے گھر بیٹھا ہوا تھا کہ عبداللہ جعفر بھائی میرے گھر پہنچے۔ انھوں نے آ کر بتایا کہ ''لاہور میں مارشل لا کی فوجی

عدالت نے پمفلٹ **قادیانی مسئلہ** لکھنے کے جرم میں آج [۱۱مئی ۱۹۵۳ء] مولانا مودودی کو سزائے موت سنا دی ہے''۔ اس خبر کا مجھے شدید صدمہ ہوا۔ ہر چند کہ ایک قسم کا صدمہ پروف آدمی ہوں، اس لیے رونے کے بجائے شدید قلق اور غم کو اندر ہی اندر نگل لیتا ہوں۔ لیکن میری زندگی کا یہ پہلا سب سے بڑا صدمہ انگیز واقعہ تھا۔

اس غم واندوہ کی کیفیت میں مختلف مناظر ذہن میں اُبھرتے۔ کبھی 'اخوان المسلمون' کے مرشدعام حسن البناء کی شہادت کا واقعہ آنکھوں کے سامنے آتا، اور کبھی لاہور میں ہم وطن مسلمانوں کے لہو سے کھیلی جانے والی ہولی کی تصاویر سامنے آتیں، کہ کس طرح ہم وطن، مسلمان فوجیوں نے ان بے گناہ لوگوں کو بھون کر رکھ دیا۔ مولانا مودودی نے ایک کتابچہ لکھا، جس میں ختم نبوت کے مسئلے پر استدلال کی دھار تو تھی، لیکن اس میں تشدد اور لاقانونیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود فوجی عدالت نے انھیں سزائے موت کا سزاوار ٹھیرادیا۔

یہ سب چیزیں ایک بڑے ہولناک منظر کی کڑیاں دکھائی دیتیں، جس میں اسلامی دستوری سفارشات تسلیم کرنے والے بنگالی وزیراعظم کو سیاسی منظر سے ہٹانا اور اسی ریلے میں مولانا مودودی کی جان کے خاتمے کا اقدام تک کر گزرنا کوئی اَن ہونی بات نہ تھی۔ لاہور کا مارشل لا محض دستور کا راستہ روکنے کا نہیں، بلکہ ترکی کے مانند فوج کی زیرنگرانی سیکولر دستورسازی کی بنیادوں کو استوار کرنے کا ایک بہانہ معلوم ہوتا تھا۔

چنانچہ یہ ساری چیزیں میرے ذہن میں اُبھر اُبھر کر آتیں اور سخت اضطراب میں مبتلا کر دیتیں۔ میں نے پہلے ہی بہتر پوزیشن حاصل کرنے کے لیے چھے ماہ تک اپنا فائنل امتحان مؤخر کیا تھا، اور اب جب کہ امتحان کا وقت آیا تو یہ قیامت خیز گھڑی آ گئی۔ میں نے چند منٹ سوچا اور سوچنے کے بعد فیصلہ کیا، کہ یہ دونوں چیزیں ساتھ نہیں چل سکتیں، یعنی پڑھائی بھی اور مولانا مودودی کی سزا کے خلاف احتجاج بھی۔ اس لیے اس صدمے اور پریشانی کی حالت میں امتحان کا نتیجہ تو معیاری نہیں آسکے گا۔ زندگی میں جب کبھی ایسے

مواقع آئے ہیں مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ کس چیز کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ساری کتابوں اور نوٹس کو اُٹھایا، سمیٹا اور الماری میں بند کر دیا۔ گھر سے نکلا اور ساتھیوں سے رابطہ کیا۔

احتجاج کا راستہ

اس سے اگلے دن کراچی میں بطور احتجاج، مظاہرے اور ہڑتال کا پروگرام بنایا۔ ہڑتال کو مؤثر بنانے کا کام ہم اہلِ جمعیت نے اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ صبح سویرے پیرالٰہی بخش کالونی بس اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔ اگرچہ جماعت کے کارکنان ہمارے ساتھ تھے، تاہم اس پروگرام کی قیادت ہم کر رہے تھے۔ ہم نے بسوں کو رکوانے کی کوشش کی، لیکن اس کے باوجود لوگ بیٹھ بیٹھ کر دفتر جا رہے تھے، کیونکہ صبح ہی صبح دفتر شروع ہو جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہ میرے دل میں کیا خیال آیا۔ میں نے کہا کہ ''ہم زبردستی تو لوگوں کو روک نہیں سکتے اور ویسے بھی ہم تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ لوگوں سے اپیل کریں''۔

چنانچہ مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس میں، مَیں داخل ہو گیا۔ دل کو چوٹ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ان کے سامنے پانچ سات منٹ کی گفتگو رکھی، کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور یہ کہ ''اگر ہم اس ظلم پر خاموش رہے اور احتجاج نہ کیا تو اس کے کیا اثرات ہوں گے؟ بحیثیت مسلمان اور پاکستانی آپ کا یہ فرض ہے کہ اس ظلم و زیادتی پر احتجاج میں شرکت کریں۔ آپ سے ہماری صرف یہ ذرا سی درخواست ہے''____ وہ سب مسافر بس سے اُتر گئے، بغیر اس کے کہ ہم پتھراؤ، گھیراؤ، جلاؤ اور دھمکی کا راستہ اختیار کرتے۔ اسی طرح دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں بس میں گیا اور اپیل کامیاب رہی۔ اس کے بعد وہاں پولیس آ گئی اور ہم ذرا اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اس لیے کہ ہم کسی مزید گرفتاری کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ اس طرح وہ مہم بھی متاثر ہوتی جو ہم چلا رہے تھے۔ مجھے اس تجربے سے بڑی خوشی ہوئی۔ ہم سارا دن یہ کرتے رہے۔

اس سے یہ بات ذہن پر نقش ہوگئی، کہ بلاشبہ بعض لوگ ضدی اور مان کر نہ دینے والے ہوتے ہیں، بعض میں تعصب اور عناد ہوتا ہے، کچھ واقعی جاہل ہوتے ہیں، لیکن بالعموم حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کی صحیح حِس کو صحیح چیز پر اُبھارا جائے تو اس کے مثبت اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس بات پر اب تک میرا یقین ہے۔ جب ہم میں سے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں، کہ ''عوام مان کر نہیں دیں گے''۔ تو میں سمجھتا ہوں، اس مایوس کن تبصرے میں خود ہمارا بھی قصور ہے۔ ہم ان لوگوں سے ان کی سطح پر اور ان کی سوچ کے دائرے میں اُتر کر بات نہیں کرتے، اسی لیے اب تک جماعت عام لوگوں کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکی۔ خیر، یہ تجربہ ہمیشہ میرے ذہن میں محفوظ رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہڑتال کامیاب رہی۔

اس مہم کا دوسرا محاذ یہ تھا کہ مسلم ممالک کے سفیروں کی جانب سے مولانا کی سزائے موت ختم کرانے کے لیے دباؤ ڈلوایا جائے۔ سعودی عرب کے سفیر عبدالحمید خطیب صاحب کے بیٹے فواد خطیب سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ہم فواد خطیب کے ذریعے عبدالحمید خطیب صاحب سے ملے۔ اس وفد میں جماعت کے لوگ تھے، میرے علاوہ جمعیت کے چیدہ چیدہ رفقا بھی شامل تھے۔ دوسرے مسلم ملکوں کے سفیروں سے بھی ہمارے وفد نے اسی طرح مل کر یادداشت پیش کی۔ ان سب سفیروں نے اپنی اپنی حکومتوں کی جانب سے دباؤ ڈالا کہ مولانا مودودی کی سزائے موت ختم کی جائے۔

خواجہ ناظم الدین صاحب کی برطرفی کے بعد نامزد وزیراعظم محمد علی بوگرہ صاحب واشنگٹن سے آرہے تھے۔ ان کے طیارے کو تقریباً ایک بجے کراچی کے ہوائی اڈے پر اُترنا تھا۔ ہم نے ہنگامی طور پر پروگرام بنایا کہ ایئرپورٹ پر ہی ان کے خلاف مظاہرہ کیا جائے۔ چنانچہ پورے کراچی سے جمعیت اور جماعت کے کارکن جمع ہوئے۔ یہ نہیں ہوا تھا کہ ہمارے اس پروگرام میں عام لوگ آئے ہوں۔ ہماری کمزوری کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہماری اپیل پر اکثر اور بیش تر وہی لوگ لبیک کہتے ہیں، جو پہلے سے ہمارے حامی اور کارکن

ہوتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے کارکن ایئرپورٹ پر آ گئے۔

ہم نے اس مظاہرے کو منظّم کیا تھا۔ اسٹار گیٹ سے ایئرپورٹ کی بلڈنگ کے درمیان تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر حصے کو انتظامیہ نے استقبال کرنے والے لوگوں کے لیے رکھا تھا، اس جگہ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہمارے لوگ بینرز چھپائے کھڑے تھے۔ جیسے ہی بوگرہ صاحب کا جہاز اُترا اور وہ باہر نکلے تو یک دم سارے بینرز کھلے اور فضا میں لہرانے لگے۔ پوری فضا ''مولانا مودودی کو رہا کرو...... مولانا مودودی کو رہا کرو'' کے نعروں سے گونجنے لگی۔ نام زد وزیراعظم صاحب، گاڑی میں بیٹھ کر پیچھے کی جانب سے نکل گئے۔ ہم آمنے سامنے مظاہرہ کرنے کے منتظر ہی رہے۔ اگلے دن یعنی ۱۳ مئی کو لاہور کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے یہ اعلان کر دیا کہ ''مولانا مودودی کی سزائے موت کو چودہ برس کی قید بامشقت میں بدل دیا گیا ہے''۔

امتحان اور نتیجہ

جب یہ اعلان ہو گیا تو میں نے دوبارہ غور کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ مجھے خیال آیا کہ فوری طور پر اس سے زیادہ تو کچھ حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے سردست معمول کے مطابق سرگرمیاں شروع کر دینی چاہییں۔ چنانچہ میں نے دوبارہ الماری کھولی، نوٹس اور کتابیں نکالیں، پڑھنے میں مگن ہو گیا، اور مئی کے آخر میں امتحان دے دیا۔ اللہ کا شکر ہے جو بہت اچھا ہوا۔

ایک پرچہ ایڈوانسڈ کنسٹرکشن کا تھا۔ اس کے لیے میں نے نو سوالات کے جوابات کی تیاری کی تھی کہ اگر یہ آ گئے تو فرسٹ کلاس آ جائے گی اور اگر نہ آئے تو جو قسمت سو ہو۔ ان نو میں سے سات سوال آ گئے جو حل کر دیے۔ میری ورک بُک تو مرغوب احمد اور دوسرے ساتھیوں کی مدد سے تیار ہوئی تھی کہ ڈرائنگ سے مجھے چڑ سی تھی۔ پراجیکٹ میں زبانی امتحان (viva) کا مرحلہ درپیش تھا۔ سول انجینیرنگ میں ہمارے پروفیسر صاحب مذہبی اعتبار سے پارسی تھے۔ وہ جمعیت سے میرے تعلق کو جانتے اور اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ

دوسرے فرد پاریکھ صاحب مسلمان تھے۔ یہ چیف انجینیر اور صوبہ سندھ کے رہنے والے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرا یہ کام فرسٹ کلاس کے معیار کا نہیں۔

زبانی امتحان کے دوران انھوں نے پوچھا: ''آپ کے پارٹ ون میں کتنے نمبر تھے؟'' میں نے بتایا کہ اتنے تھے۔ پھر پوچھا: ''اب کیسے پرچے ہوئے ہیں''۔ میں نے بتایا کہ ''ایسے پرچے ہوئے ہیں کہ فرسٹ کلاس آجائے گی''۔ چنانچہ انھوں نے چند مزید فنی نوعیت کے سوال کر کے رخصت کر دیا۔

تحریری امتحان کے بعد زبانی امتحان کا مرحلہ بھی ختم ہوگیا تو پھر نتیجہ کا انتظار شروع ہوا۔ نتیجہ میں میری فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن تھی۔ دستور جمعیت میں یہ چیز میری تجویز پر رکھی گئی تھی کہ ''تعلیمی زندگی ختم ہونے کے چھے ماہ بعد تک رکنیت برقرار رہے گی''۔ اس کے بعد کیا کرنا ہوگا؟ یہ ہم نے واضح نہیں کیا تھا۔ لیکن خود ہمارے ذہن میں یہ واضح تھا کہ تعلیمی زندگی ختم ہونے کے بعد ہم جمعیت سے فارغ ہوجائیں گے اور جماعت میں چلے جائیں گے۔ جب امتحان سے فارغ ہوا تو میں نے سوچا کہ ابھی دستور کا تقاضا پورا کرتے ہوئے مجھے چھے مہینے جمعیت میں گزارنے ہیں۔ اس وقت تک یہ ساری چیزیں ہوچکی تھیں: ملک میں ہنگامہ، قادیانیت کے خلاف تحریک، لاہور میں مارشل لا، ناظم الدین وزارت کی برطرفی، جماعت کے زعما کی گرفتاری اور مولانا مودودی کے لیے پھانسی کی سزا اور پھر عمر قید میں تبدیلی وغیرہ ـــــ بلاشبہہ ہم ان حادثات سے متاثر تھے، لیکن ہمارے ذہن میں دُور دُور تک یہ خیال نہیں تھا کہ اس سے نصب العین کے ساتھ ہماری کمٹ منٹ، ہمارے کام یا حیثیت میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

ایک ساتھی

اس وقت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے میرے بہت اچھے اور گہرے تعلقات تھے۔ ابتدائی گفتگو میں رشتے داری بھی نکل آئی تھی۔ ان کے والد اور میرے والد آپس میں پھوپھی زاد اور ماموں زاد بھائی تھے۔ اسرار صاحب کے بڑے بھائی جماعت کے رکن تھے۔

چھوٹے بھائی بھی جمعیت میں تھے۔ وہ خود کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور کے طالب علم تھے۔ میری نظامت اعلیٰ کے زمانے میں وہ صوبہ پنجاب کے ناظم تھے۔ شاید اسی زمانے میں جمعیت کا اُردو رسالہ عزم لاہور سے جاری ہوا تھا۔ انھوں نے لاہور میں جمعیت کا بڑا کامیاب دس روزہ تربیتی کیمپ کیا تھا۔ اس کیمپ میں مولانا مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی شریک ہوئے تھے۔

وہ بہت اچھی تقریر کرتے اور مؤثر درس قرآن دیتے تھے۔ اس کے ساتھ دعوت، تنظیم اور تربیت کا کام بھی بہت اچھا کرتے تھے۔ ان میں قیادت کی صلاحیت بھی تھی۔ ان کی یہ صلاحیت تو اب بھی ظاہر ہے، کہ وہ لوگوں کی ایک تعداد کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ کسی بڑے گروپ، بڑی ٹیم یا کسی بڑی تنظیم کو غالباً نہیں چلا سکتے۔ اس کی وجوہ بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔

نومبر ۱۹۵۰ء میں لاہور میں جب ان سے تعارف حاصل ہوا، تو میرے کراچی آنے کے بعد ان سے خط و کتابت رہی، جو بڑی دل چسپ، محبت بھری اور بڑی مفید چیز تھی۔ اس میں ہم نے آپس میں مشترک چیزیں تلاش کی تھیں۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب وہ جمعیت کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے تو اس موقعے پر یہ محسوس ہوا تھا کہ بے وجہ انھیں کراچی جمعیت سے کچھ رقابت سی پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے اس موقع پر دستور جمعیت کی تمہید (مقدمہ) کے بارے میں بہت سخت موقف اختیار کرتے ہوئے مخالفت بھی کی تھی، جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اسی سالانہ اجتماع میں ۲ نومبر کو جمعیت کا دستور منظور کرایا تھا۔

۱۹۵۲ء میں جمعیت کے پانچویں سالانہ اجتماع میں، میرے بعد اسرار احمد صاحب، اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوگئے اور جمعیت کا مرکز دوبارہ لاہور چلا گیا۔ اس اجتماع میں، میں نے جمعیت کی رپورٹ پیش کی جس کا عنوان تھا: ''ہمارے قدم آگے بڑھ رہے ہیں''۔ اسٹوڈنٹس وائس میں یہ We March On کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

اسرار صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کی بڑی اچھی صلاحیت بخشی ہے۔ اگرچہ طول کلام کے عادی ہیں، تاہم لوگ دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے تک ان کی تقریر اور درس دل چسپی سے سنتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کے پروگرام بہت کامیاب رہے۔ ہمارے زمانے میں بھی وہ جمعیت کے ایک بہترین مقرر تھے۔ اسی زمانے میں ان کی دو تقریریں ایسی ہوئیں، جو بعد میں کتابی صورت میں چھپیں اور جمعیت کے لٹریچر کا حصہ بنیں۔ میری مراد هم اور همارا کام اور همارا پیغام سے ہے۔ انھوں نے اچھے انداز میں جمعیت کی دعوت کو پیش کیا تھا اور اس پر ہم سب بہت خوش تھے۔

ان کی طوالت خطاب کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ ان کے ناظم اعلیٰ منتخب ہونے سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے۔ اجتماع میں پروفیسر علاء الدین صدیقی صاحب (جو بعد میں پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے) کو بلایا، وہ بڑے دین پسند آدمی تھے۔ شروع شروع میں جمعیت نے اپنے اجتماعات میں بیرونی حلقے کے لوگوں کو بڑے تسلسل سے بلانے کی روایت قائم کی۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر عمر حیات ملک، مولوی تمیز الدین [م: ۱۹ اگست ۱۹۶۳ء]، اے کے بروہی صاحب [م: ۱۳ ستمبر ۱۹۸۷ء] وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ علاء الدین صدیقی صاحب جمعیت کے اجتماع میں آئے۔ ان سے پہلے اسرار صاحب نے شاید ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر کی۔ صدر جلسہ بے چارے بیٹھے ہوئے صبر کے ساتھ سن رہے تھے اور دیر ہوتی جا رہی تھی۔ جس طرح عموماً مقرر حضرات، صدر جلسہ کے بولنے کا وقت نہیں چھوڑتے، اسی طرح یہاں پر بھی ان کے بولنے کا وقت نہیں بچ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسٹیج پر صدیقی صاحب کی نظر میں تو کالج کا ایک لڑکا ہی بول رہا تھا۔

جب اسرار صاحب کی تقریر ختم ہوگئی اور پروفیسر صدیقی صاحب صدارتی کلمات کہنے کے لیے اُٹھے تو انھوں نے ماحول کو ذرا خوش گوار بناتے ہوئے لطیف انداز میں تنقید بھی کر دی۔ انھوں نے اپنی بات ایک لطیفے سے شروع کی: ''ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کی پہلی رکعت میں امام صاحب نے پوری سورۂ بقرہ پڑھ ڈالی۔ پیچھے مقتدی حیران پریشان تھے،

ایک مقتدی بہت ہی بے چین اور بے قرار ہوتا رہا کہ کھڑے ہوکر ڈھائی پارے سننے پڑے ہیں۔ اس کے بعد جب دوسری رکعت شروع ہوئی تو امام صاحب نے الم تر کیف فعل ربك باصحب الفیل کہا۔ تب اس 'سخن فہم' مقتدی نے نیت توڑ دی اور چل دیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بھائی، نیت کیوں توڑ دی؟ وہ کہنے لگا کہ البقرہ اتنی لمبی تھی تو خود ہی اندازہ لگا لو، الفیل کتنی زیادہ لمبی ہوگی'' —— ان کا اشارہ تھا کہ میں الفیل ہی کی طرح مختصر رہوں گا اور واقعی انھوں نے مختصر سی تقریر کی، مگر ہلکا سا طنز بھی کر دیا۔

یہ واقعہ اسرار صاحب کی برائی کے لیے نہیں بیان کر رہا، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ عمر، سامعین اور موضوع کے حوالے سے اگر طول کلامی سے بچا جائے تو جامع کلام یقیناً مؤثر ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال ہمارے رفقا اور خاص طور پر نوجوانوں کو ضرور رکھنا چاہیے۔

جمعیت میں اختلافات

جب میرا نتیجہ آیا ان دنوں اسرار صاحب ہی ناظم اعلیٰ تھے۔ میں امتحان سے فارغ ہو چکا تھا۔ غالباً جولائی ۵۳ء میں لاہور میں جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ اسی اجلاس کے دوران جمعیت میں ایک تفرقہ پیدا ہوا تھا۔ یہ بدمزگی اسرار صاحب کی خاص سوچ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ آج ذہن میں اس سارے قضیہ کی مبہم سی یاد باقی رہ گئی ہے۔ بہرحال میں ان دنوں جمعیت سے فارغ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

شوریٰ کے اس اجلاس میں اسرار صاحب کا یہ موقف تھا کہ ''ملک میں اس وقت شدید نوعیت کی ہنگامی صورت حال ہے۔ مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائے جانے کے بعد اب عمر قید میں بدل دیا گیا ہے۔ اس موقع پر جمعیت کو آگے بڑھ کر اپنا تنظیمی تشخص ختم کر کے، اپنے آپ کو پوری طرح جماعت اسلامی کے حوالے کر دینا چاہیے''۔ شوریٰ میں ان کی اس رائے کے کچھ حامی بھی موجود تھے۔ مگر اس کے برعکس ہماری رائے یہ تھی کہ ''ان حالات کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے۔ اگر واقعی جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ملک میں کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو چکی ہے، جس میں نفیرِ عام کی صورت پیش آ گئی ہے تو وہ نفیرِ عام دے۔

تب جمعیت کی شوریٰ اپنی جگہ پر خود یہ سوچے اور یہ طے کرے کہ اس نفیرِ عام کے جواب میں اسے اپنا سب کچھ لپیٹ میں دینا ہے یا نہیں۔لیکن جماعت تو کوئی ایسی کال نہیں دے رہی ہے، اس لیے ہم کیوں خواہ مخواہ جمعیت کے کام کو سمیٹ کر اسے ختم کر دیں''۔

لوگوں نے سلطان احمد صاحب (قائم مقام امیر جماعت) کے پاس جا کر یہ بات رکھی۔انھوں نے ہمارے مفصل مثبت یا منفی دلائل سننے سے پیش تر ہی یہ بات کہہ کر معاملہ صاف کر دیا کہ ''اگر ضرورت پڑی تو ہم کال دیں گے اور پھر یہ توقع رکھیں گے کہ سب لوگوں کے ساتھ آپ بھی ہماری پکار پر لبیک کہیں، لیکن تب بھی یہ طے کرنا کہ آپ آئیں یا نہ آئیں، آپ کی اپنی صوابدید پہ منحصر ہوگا۔لیکن ہم کوئی ایسی صورت حال نہیں دیکھتے کہ ایسی کال دیں اور آپ لوگ جمعیت کا کام لپیٹ دیں، جو آپ کے کام ہیں وہ کرتے رہیں، پڑھائی کریں، علم حاصل کریں، تاکہ اس لائق بنیں کہ مستقبل میں تحریک کی خدمت کر سکیں''۔

اس مسئلہ پر شوریٰ میں خاصا اختلاف پیدا ہوگیا۔غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے دل میں اضطراب اور بے چینی محسوس کی۔جس سے طبیعت میں افسردگی سی پیدا ہوگئی۔مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ ملکی مسائل کے حوالے سے ہمارے درمیان کبھی بحث اور جھگڑے ہوں گے۔یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے لاہور میں سیر کی۔حالانکہ ہم تو پہلی بار ۵۰ء میں لاہور گئے تھے، پھر ۵۱ء اور اس کے بعد ۵۲ء میں گئے تھے، جب اسرار احمد صاحب کا انتخاب ہوا تھا۔اب یہ ۵۳ء کا سال تھا۔

ہم جب بھی لاہور جاتے تھے تو وہاں پر جمعیت کے کارکن کہتے تھے کہ ''یہاں بہت سی تاریخی عمارتیں دیکھنے کی ہیں: شالامار باغ ہے، شاہی قلعہ ہے، بادشاہی مسجد ہے، عجائب گھر ہے، جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ ہے''۔ہر بار میں اپنے میزبان دوستوں کو جواب دیا کرتا تھا کہ ''ہمیں آثار قدیمہ کے ان کھنڈرات سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ہم تو آثارِ جدیدہ کے قیام کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور اسی میں اپنا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔بوسیدہ اینٹ، پتھر

اور چونے سے زیادہ ہمیں زندہ انسان پیارے ہیں۔ اس لیے جو وقت اپنے ہم مقصد دینی بھائیوں کے ساتھ ہوسٹلوں میں تحریکی گفتگو اور بات چیت میں گزر جائے، وہ ہم کو زیادہ عزیز ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم جا کر ان زبوں حال عمارتوں کو دیکھیں''۔ شوریٰ کا اجلاس ختم ہو گیا تھا لیکن اس کے اثرات بعد میں بھی باقی رہے۔ اس بار شاید اُکتاہٹ اور اضطراب کے مداوا کے طور پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس بار سنگ وخشت کے لاہور کو بھی دیکھا جائے۔ چنانچہ ہم ان مقامات پر سیر کے لیے گئے اور لاہور کی لسی بھی پی، جو واقعی پُرلطف مشروب ہے۔

کراچی میں سالانہ اجتماع

شوریٰ کے اسی اجلاس نے یہ طے کیا کہ جمعیت کا اگلا سالانہ اجتماع کراچی میں ہوگا۔ یہ پہلا اجتماع تھا، جو کراچی میں ہونا طے پایا تھا۔ یہ ہم سب کے لیے بڑی خوشی اور مسرت کا مقام تھا۔ اس لیے ہم آتے ہی ہمہ تن اجتماع کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ابھی جمعیت ہی میں تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ یہ اجتماع ہر اعتبار سے منفرد ہونا چاہیے۔ کراچی صدر میں ایک گراؤنڈ نوید کلینک کے قریب ہمیں اجتماع کے لیے مل گیا۔ بعد میں یہاں پر 'جمعیت الفلاح' کی عمارت تعمیر ہوئی۔

اسرار صاحب نے عارضی طور پر امتحان کے لیے یا کسی اور وجہ سے رخصت لی اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ہی سے جمعیت کے ایک رکن سید مراد علی شاہ صاحب کو ناظمِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ مراد علی شاہ صاحب سالانہ اجتماع سے کچھ عرصہ پہلے کراچی آئے، تاکہ اجتماع کی تیاریوں کا جائزہ لے سکیں۔ اسی دوران انھوں نے چند ساتھیوں سے اسرار صاحب کے بارے میں اپنے عدمِ اطمینان کا اظہار کیا، مگر ان کی ایسی کوئی بات مجھ سے نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں بھی میں نے کبھی اس بات میں کوئی دل چسپی نہیں لی، کہ کیا وجہ تھی اور اسرار صاحب کیا کرنے جا رہے تھے۔ نہ ڈاکٹر مراد علی شاہ صاحب سے کبھی یہ معلوم کیا کہ آپ نے ان کی کس بات سے 'جمعیت کو بچایا'۔

تاہم، ابھی گذشتہ چند برسوں کے دوران اسرار صاحب نے جو موقف بیان کیا ہے، وہ کچھ اس طرح ہے کہ کراچی سے ایک گروپ نے جمعیت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس میں، میرا، ظفر اسحاق اور خورشید بھائی کا نام لیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ اسی گروپ نے پھر جماعت پر بھی قبضہ کرلیا، جس میں خورشید اور خرم وغیرہ آگے آگئے ہیں۔ خیر ان کی یہ ایک الگ تھیوری ہے جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہر فرد چاہے لاکھ سخن سازی کرے آخر اسے مرنا ہے اور منصفِ حقیقی کے سامنے پیش ہونا ہے، جہاں سُوءِ ظن کی ایک ایک رمق تک کا حساب دینا ہوگا۔ اس میں کیا دیر ہے؟ یہ وقت بس آیا ہی چاہتا ہے۔

مجھے اب یاد نہیں ہے کہ لاہور کی مذکورہ شوریٰ میں اس تنازعے کے علاوہ اور کون سا مسئلہ زیر بحث آیا۔ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن تھا کہ ہمیں اجتماع کے انعقاد میں اپنی بھرپور صلاحیت لگانی ہے۔ اجتماع کی تیاری ہوئی اور بہت لگن کے ساتھ ہم نے پورا انتظام کیا۔ ایک رات ہم پنڈال وغیرہ کے شامیانے لگوانے میں اتنے مصروف رہے کہ رات کے دو بج گئے۔ سڑک پر آئے تو ساری ٹرانسپورٹ بند ہو چکی تھی، سڑک سنسان تھی۔ صدر سے پیر الٰہی بخش کالونی تقریباً پانچ چھے میل کا فاصلہ ہوگا۔ یہ ہم نے پیدل طے کیا۔ فجر سے کچھ پہلے گھر پہنچے، نماز پڑھی اور کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ پھر اجتماع گاہ کو بنانے، سنوارنے چلے گئے۔

خورشید بھائی کا انتخاب

۶، ۷، ۸ نومبر ۱۹۵۳ء کو جمعیت کا چھٹا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں نظامِ تعلیم پر ایک بھرپور مذاکرہ ہوا، جس سے ڈاکٹر عمر حیات ملک، پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ، پروفیسر جلیل الدین احمد خان اور پروفیسر ڈاکٹر ایم ایم احمد، صدر شعبہ فلسفہ کراچی یونی ورسٹی نے خطاب کیا۔ جہانگیر پارک میں جمعیت نے ایک شان دار نمائش کا اہتمام کیا، جس کا افتتاح سعودی سفیر عبدالحمید خطیب نے کیا۔ اس اجتماع کی ایک خاص بات اخوان کے مرشدِ عام حسن الہضیبی کا پیغام تھا۔ علاوہ ازیں یہ اجتماع اس وقت تک جمعیت کا سب سے بڑا، بھرپور

اور مؤثر اجتماع تھا۔

اجتماع کے وقت تو مراد علی شاہ صاحب ناظم اعلیٰ تھے، تاہم اس بات کا امکان تھا کہ اسرار احمد صاحب دوبارہ ناظم اعلیٰ منتخب ہو جائیں یا، پھر خورشید بھائی ناظم اعلیٰ منتخب ہوں۔ خورشید بھائی پر لوگوں کی نظر دو سال پہلے سے تھی، جب کہ پہلی بار مجھے اور دوسری مرتبہ اسرار صاحب کو منتخب کرلیا گیا۔ ان کی صلاحیتیں بھی بھرپور تھیں۔ اسٹوڈنٹس وائس کی وجہ سے ان کا علمی وزن بھی تھا، پھر کراچی جمعیت کو وہ جس بہترین انداز سے چلا رہے تھے، لوگ اس چیز کے معترف تھے۔

جب (۷ نومبر کو) انتخاب کا نتیجہ آیا، تو ارکان نے خورشید بھائی کو ناظمِ اعلیٰ منتخب کرلیا۔ اس انتخاب پر میرے ذہن میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک منتخب ہوگا۔ بلاشبہہ جولائی کی مرکزی شوریٰ میں اسرار صاحب نے جو موقف اپنایا تھا، اس کی وجہ سے میری رائے ضرور متاثر ہوئی تھی، اس لیے گذشتہ سال کے برعکس اس مرتبہ میں نے بحیثیتِ رکن ان کے حق میں اپنی رائے نہیں دی تھی، بلکہ میری رائے بھی خورشید بھائی کے حق میں تھی۔

افسوس ناک واقعہ

ناظمِ اعلیٰ کے منتخب ہونے کے بعد ارکان کا اجتماع ہوا، جو ایک لحاظ سے تاریخی اجتماع شمار ہونا چاہیے۔ اس میں خورشید بھائی کے بعد اسرار صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے ایک بہت لمبی تقریر کی۔ یہ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ میں تو دم بخود، ہکا بکا ان کی تقریر سن رہا تھا۔

اس تقریر کی سماعت کے دوران اپنے تاثرات کو میں الفاظ میں نہیں بیان کرسکتا۔ اسرار صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا یہ ایک سازش کی گئی ہے، جس میں مراد علی شاہ، کراچی جمعیت والے اور کچھ دوسرے لوگ، شریک ہیں اور اس سازش کا ماحصل یہ تھا کہ مجھے منتخب نہیں ہونے دینا''۔ پھر انھوں نے یہ الزام لگایا کہ ''کراچی جمعیت کا مزاج جماعت اسلامی کا

مزاج نہیں ہے، بلکہ یہ 'اخوان المسلمون' اور 'تبلیغی جماعت' کا مزاج ہے۔ مزید یہ کہ کراچی جمعیت کا پورا مزاج وہی ہے جو خرم نے بنایا ہے اور خرم کا مزاج جماعت اسلامی کا مزاج نہیں۔ یہ ذہنی و عملی طور پر جماعت اسلامی کے آدمی نہیں، اسی لیے انھوں نے کراچی جمعیت کا مزاج اور طریق کار بھی 'اخوان المسلمون' اور 'تبلیغی جماعت' کے طرز پر ڈھال دیا ہے''۔

اسرار صاحب کی جانب سے یہ دو بڑے شدید نوعیت کے الزامات تھے۔ ان کے موقف سے متاثر اور ہم نوا افراد کا بھی ایک گروپ تھا، جو ایسی باتوں پر بلا تحقیق یقین کرلیا کرتا ہے۔

بہرحال، کراچی جمعیت، شب بیداریوں کے اہتمام، اخوت اور باہمی تعلقات کے حوالے سے پاکستان بھر کی جمعیت میں ایک نمایاں امتیاز رکھتی تھی۔ اس میں میرا ہی نہیں اور لوگوں کا بھی عمل دخل تھا۔ البتہ کراچی جمعیت کے افراد کی تربیت میرے ذمے تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ساتھیوں کے کردار، مزاج اور تربیت میں ہم سب برابر کے شریک تھے، اور سبھی حصہ دار تھے۔ مولانا مودودی کی کتابوں کو تو میں نے ۱۹۴۸ء سے خوب پڑھا تھا، بلکہ اپنی تقریروں میں مولانا کے پورے پورے جملے دہراتا تھا۔ اسی طرح ہم مولانا مودودی کے علاوہ دوسرے اہلِ علم حضرات کی تحریریں پڑھتے تھے۔

چنانچہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ساری کتابیں ہم نے پڑھیں اور ان کو جذب کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی تحریروں کا انداز، اسلوبِ بیان اور مضامین ہمیں اپنی طرف کھینچتے تھے۔ یہ چیزیں بھی میری تقریروں کا ایک حصہ بن گئیں۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی پڑھا، اور ان سے ایمانی حرارت حاصل کی۔ پھر سعید رمضان کی مجلسوں اور محفلوں سے ہم نے اثر قبول کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی جماعت کے مزاج کے خلاف نہیں تھی۔ بلکہ اس دور میں ہم نے تربیت کرنے اور دعوت پھیلانے کے نئے نئے راستے اور طریقے تلاش کیے۔ جن راستوں کو اختیار کیا، الحمدللہ وہ

بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔

میرے ذہن میں یہ بات بڑی پختگی سے بیٹھی ہوئی تھی، کہ ہماری سرگرمیوں اور ہمارے تربیتی نظام میں آخرت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہونا چاہیے۔ اس احساس کو جتنا راسخ کریں گے، اتنا ہی ہمارا کام بہتر ہوگا۔ اسی لیے جمعیت کے 'نصب العین' میں، میں نے 'اور' کے بجائے 'ذریعے' کا لفظ استعمال کر کے اپنی دانست میں اس چیز کو واضح کیا تھا۔ فکرِ آخرت کی بیداری کے لیے قبرستان میں جانا، شب بیداری کرنا، آخرت کے موضوع پر درسِ قرآن دینا، یہ سب میرے ہی ذمے تھے۔ اس کے علاوہ تو کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ یہ بات بھی بتا چکا ہوں، کہ اسلامی دستور کی مہم اور مولانا مودودی کی رہائی کے لیے مظاہروں کی تنظیم اور قیادت کے لیے بھی ہم کسی سے پیچھے نہ تھے۔

جب اسرار صاحب نے تقریر ختم کی تو میں سکتے کے عالم میں تھا۔ سخت صدمہ تھا، بڑی اذیت اور شدید کرب کی کیفیت تھی۔ اس صدمے کا ایک سبب یہ تھا کہ ان سے میرے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا کھلے اور چھپے میں معترف تھا، اور انھیں تحریک کا سرمایہ سمجھتا تھا۔ اس حوالے سے صدمے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بے بنیاد طور پر اپنے 'خلاف سازش' کا الزام لگایا۔ ایسی سازش ہوئی بھی تھی یا نہیں، یہ الگ مسئلہ ہے۔ میں چونکہ رکن تھا، اس لیے اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنے میں آزاد تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایسی کسی سازش کا وجود ایک بے معنی بات ہے۔ کجا یہ کہ اس میں کسی درجہ شریک ہوتا۔ اسی طرح مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کبھی اس مسئلہ پر ہمارے درمیان گفتگو ہوئی کہ ناظمِ اعلیٰ کون بنے گا اور کون نہیں بنے گا، یا اس کے لیے کوئی کنویسنگ ہوئی ہو۔

بلاشبہہ اس سے پہلے دو اجتماعات میں ایک طرح سے یہ ہوا تھا۔ اس وقت جمعیت کا دستور نہیں بنا تھا۔ ۵۰ء میں ظفر اللہ خان صاحب کی جگہ ڈاکٹر محمد نسیم صاحب منتخب ہوئے تھے، اور عبداللہ جعفر صاحب نے اس کے لیے کوشش کی تھی جس میں اور لوگ بھی شریک تھے۔

اس سے اگلے اجتماع ۱۹۵۱ء میں ان کی کوشش تھی کہ خورشید بھائی ناظمِ اعلیٰ نہ بنیں، بلکہ میں (خرم) بنوں تا کہ خورشید بھائی کراچی جمعیت کو چلائیں۔ اس کے لیے انھوں نے کوشش کی، اور لوگوں سے بات چیت بھی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان معنوں میں کنویسنگ کی تعریف میں نہیں آتی جسے نجویٰ کہا جائے۔ دستور اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لوگ آپس میں گفتگو کریں، مگر جتھابندی کرنا ممنوع ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے اجتماع کے دوران مجھے ایسی بھی کوئی بات یاد نہیں۔

چنانچہ ان کی اس بات کا مجھے صدمہ تھا کہ جو کام میں نے نہیں کیا، جس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں ہے، انھوں نے اس بات کا بے دھڑک الزام میرے اُوپر تھوپ دیا ہے۔ تمام تعلقات کے باوجود بے بنیاد اور بلاثبوت الزام لگا دیا اور جمعیت میں انتشار کی سی ایک کیفیت پیدا کردی۔ اپنی تقریر ختم کر کے وہ اجتماعِ ارکان سے نکل گئے اور جاتے ہوئے غالباً اپنی تقریر کے نوٹس پھاڑ کر شدید غصے کے عالم میں باہر نکلے تھے۔ اجتماعِ ارکان میں سارے لوگ اسی اضطراب میں بیٹھے ہوئے تھے، جن میں ان کے موقف کو ماننے والے بھی تھے اور اختلاف رکھنے والے بھی۔ یہ وہ صورت تھی جس میں جمعیت تقریباً دو گروہوں میں بٹ گئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس انتشار پر قابو پالیا گیا۔ اسرار صاحب کے الزامات کی تحقیق کے لیے نومبر یا دسمبر میں ایک کمیٹی بنی، جس نے سب کے بیانات سنے۔

میرے بھائی

ایک اور چیز کا ذکر ضروری ہے۔ کراچی جمعیت نے ہی سب سے پہلے اسکولوں میں کام شروع کرتے ہوئے 'حلقہ مدارس' قائم کیا تھا۔ جمعیت کے جتنے بھی رفقا تھے، ان سب کے چھوٹے بھائی تقریباً جمعیت میں تھے۔ میرے دو چھوٹے بھائی مسلم سجاد، اور اسامہ اسماعیل مراد، الحمدللہ اب تک تحریک کے ساتھ نمایاں حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔

ابتدائی زمانے میں میرے چھوٹے بھائی حسن قاسم مراد نے بڑی سرگرمی اور لگن کے ساتھ جمعیت کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور وہ رکن بھی بن گئے۔ ان کی ذہانت، یکسوئی اور

محنت قابلِ داد ہے۔ دینی جدوجہد میں مجھے ان سے بے پناہ توقعات وابستہ تھیں، لیکن شاید اللہ کو منظور نہ تھا، کہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے کچھ ہی عرصہ بعد دُور ہوتے چلے گئے۔ اس دوری کو میں اپنا ذاتی ہی نہیں بلکہ تحریک اسلامی کا بھی نقصان سمجھتا ہوں۔

ان کے بعد مسلم سجاد، پاکستان جمعیت کے سیکرٹری جنرل رہے۔ گورنمنٹ سروس کی وجہ سے جماعت کے رکن تو نہیں بنے، لیکن اس دوران ماہ نامہ چراغِ راہ میں احمد انس کے نام سے لکھتے رہے۔ اب ترجمان القرآن میں میرے معاون ہیں۔ اس وقت ترجمان تقریباً وہی مرتب کرتے ہیں۔ اسامہ، جمعیت کے زمانے میں ادارہ مطبوعات طلبہ کے انچارج اور مرکزی شوریٰ کے رکن رہے ہیں۔ بعد میں کراچی جماعت میں بیت المال کے ناظم رہے ہیں، خدمت خلق کے بھی ناظم ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ ان دونوں کو جمعیت میں لانے کے لیے میرا براہِ راست کوئی حصہ نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں کبھی ان سے گفتگو کی ہو یا بٹھا کر انھیں سمجھایا ہو یا کچھ پڑھایا ہو، لیکن گھر کا فرد تھا، کام کر رہا تھا، شاید انھوں نے اس چیز کا کوئی اثر لیا ہو۔ ان کو جمعیت میں لانے کے لیے اصل کردار عبداللہ جعفر صدیقی صاحب کا تھا، جنھوں نے اور بھی بہت سارے نوجوانوں کو جمعیت سے وابستہ کیا، جن میں محبوب علی مرحوم، اور ان کے دو چھوٹے بھائی تھے۔ اسی طرح طلعت سلطان اور خورشید کے چھوٹے بھائی انیس احمد تھے۔ ان کے علاوہ بھی اسکولوں کے لڑکے تھے جو اب اچھے اچھے مقامات پر موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ اعلانیہ طور پر اور کچھ پیچھے رہ کر تحریک کا ساتھ دے رہے ہیں۔

جمعیت سے فراغت

میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جیسے ہی میری تعلیم کو ختم ہوئے چھے مہینے پورے ہوں گے، اپنے آپ کو جمعیت سے الگ کرلوں گا، اور جماعت میں چلا جاؤں گا۔ جوں ہی چھے ماہ کی مدت ختم ہوئی تو میں نے جماعت کی رکنیت کا فارم پُر کیا اور سید منور حسن بھائی کے الفاظ میں پلیٹ فارم پر ایک ٹرین سے اُترے اور دوسری ٹرین پر جا کر بیٹھ گئے۔ پیر الٰہی بخش کالونی

میں جماعت کے ناظم یعقوب عرفان صاحب تھے۔ جماعت کی رکنیت کا فارم پُر کر کے میں نے انھیں دیا۔ بحیثیت کارکن اپنے آپ کو رجسٹر کرایا اور جماعت کا کام شروع کر دیا۔ میرا خیال ہے یہ جنوری ۵۴ء کے شروع یا دسمبر ۵۳ء کے آخر کی بات ہے۔ لیکن میرے جمعیت سے فارغ ہونے اور جماعت میں درخواست دینے کے درمیان ایک دن کا بھی وقفہ نہیں آیا۔

یہ نتیجہ تھا اس فکر کا، کہ جماعتی زندگی ایک شرعی ضرورت ہے۔ مولانا مودودی کے نزدیک دعوت دین کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج جس طرح فرض ہے، اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد بھی اہلِ ایمان کے لیے ایک ضروری ذمہ داری ہے۔ یہ جدوجہد جماعتی زندگی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس لیے جماعتی زندگی بھی اس لحاظ سے ایک لازمی چیز ہے۔ اس جماعتی زندگی سے الجماعت یا اُمت میں کوئی تفرقہ نہیں پڑتا۔ بہر حال میں سمجھتا تھا کہ اقامت دین ہی کا کام کرنا ہے، اور اس کے لیے جماعتی زندگی اختیار کرنی ہے، الا یہ کہ کوئی شرعی عذر مانع ہو۔ اجتماع کے بعد جمعیت کی سرگرمیوں سے عدمِ تعلق کر لیا تھا، اگرچہ ابھی رکن تھا، تاہم جماعت کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگا تھا۔

قرطاس وقلم سے ناطہ

جمعیت کے ساتھ تعلق کے پہلے باب کو ختم کرتے ہوئے اس دور کی چند باتوں کو یاد تازہ کرنا مناسب ہوگا۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک چار سال کے دور کو اپنے مضمون 'میں نے جمعیت سے کیا پایا؟' میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ تحریر اس زمانے کی بہت ساری کیفیات اور جذبات کی آئینہ دار ہے۔ اسی عرصے میں میری ذاتی صلاحیتوں کو جلا ملی، تقریر کرنا سیکھی، قرآن سے ربط ہوا، قرآن کا مطالعہ ہوا، دین کے مطالعہ میں وسعت آئی، بین الاقوامی پیمانے پر تعلقات قائم ہوئے، لوگوں سے ملنا جلنا ہوا، اس سے ذہن وسیع ہوا، تنظیم کو چلانے کا تجربہ بھی حاصل ہوا۔ یہ ایک ایسا دور تھا کہ جس سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

اس زمانے میں سید اسعد گیلانی صاحب [م:۱۳ اپریل ۱۹۹۲ء]، کراچی سے جہانِ نو نکالتے تھے۔ یہ اچھے معیار کا ایک ہفت روزہ تھا، جس کو ہم شوق سے پڑھا کرتے تھے اور ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے ایک مضمون لکھنے کے لیے بڑا زور دیا۔ چونکہ تحریر کے میدان کا کچھ تجربہ نہیں رکھتا تھا، اس لیے مجھے اس میں بڑا تامل تھا۔ جب ان کا اصرار بڑھا تو حسبِ عادت، تقریروں کی تیاری کی مانند اس تحریر میں بھی میں نے نقل مارنے کی کوشش کی۔

میں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق اور کچھ دوسری کتابوں سے اخذ کر کے بنیادی حقوق کے بارے میں ایک مضمون تیار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب سیفٹی ایکٹ کے تحت جماعت کے کارکنوں اور لیڈروں پر بار بار ہاتھ ڈالا جا رہا تھا، لوگ گرفتار کیے جاتے تھے۔ اس تناظر میں بنیادی حقوق کا معاملہ ہمارے ذہنوں میں بڑا نمایاں تھا۔ اگر آج بھی میں اس معاملے میں صریح اور تیز حس رکھتا ہوں، تو یہ اسی زمانے کے مطالعے، اس دور میں دیکھے اور محسوس کیے گئے کرب کا نتیجہ ہے۔ میری طبیعت میں پائی جانے والی حسِ انصاف کا بھی تقاضا ہے۔ بہرحال جہانِ نو میں یہ مضمون چھپ گیا۔ اسعد گیلانی صاحب نے اس مضمون کی بہت تعریف کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس تعریف سے بڑی شرم آئی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ مضمون میرا اپنا نہیں بلکہ یہاں وہاں سے نقل کردہ ہے۔ بہرحال، یہ مضمون میری پہلی شائع شدہ تحریر ہے۔

مجھے اپنی آٹھویں کلاس کا واقعہ بھی یاد آتا ہے، کہ ہمارے اُردو کے استاد نے کلاس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وقفے وقفے سے ان دو گروپوں کے باہم مقابلے ہوا کرتے تھے، کبھی قواعد پر، کبھی شاعری پر، کبھی نثر پر اور کبھی مضمون نگاری پر۔ ایک بار مضمون نگاری کا مقابلہ ہوا۔ میں نے ایک ناول میں ایک آدمی کا قصہ پڑھا تھا، کہ وہ ٹرین میں گیا اور اس دوران اس پر کیا گزری اور اس نے لوگوں کی کس طرح خدمت کی۔ اپنے گروپ کا

لیڈر ہوتے ہوئے میں نے اس قصے کو ویسے کا ویسا ہی اپنے الفاظ میں لکھ کر مضمون بنا دیا اور 'ریل کا سفر' کے عنوان سے وہاں پیش کر دیا۔ اس مضمون پر استاد محترم نے مجھے بیس میں سے بیس نمبر دے دیے۔ لہٰذا دوسروں سے اخذ کر کے لکھنے کا اس سے پہلے بھی یہ ایک تجربہ تھا۔ اگر سوچا اور دیکھا جائے تو یہ عادت اب تک چلی آ رہی ہے۔ کیونکہ ہم اسلامی فکر کی علمی روایت ہی سے وابستہ اور اسی کو پیش کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ میں نے چاروں ائمہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ پر ایک کتابچہ مرتب کیا۔ اس کتابچے کے لکھنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ انٹرمیڈیٹ کے اسلامیات کے نصاب میں ان چاروں ائمہ کرامؒ کی زندگی کے احوال شامل تھے۔ اس وقت تک طلبہ کو کوئی ایسی کتاب دست یاب نہیں تھی، جس میں مختصراً چاروں کی زندگی کا حال موجود ہو۔ جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں، کہ ایس ایم کالج ہال میں جمعیت کے ہفتہ وار اجتماعات میں، میں نے مجددین کے احوال پر تقاریر کی ایک سیریز پیش کی تھی، جس میں یہ چاروں امام بھی شامل تھے۔

دوستوں کا تقاضا ہوا کہ اس کی روشنی میں ایک ایسا کتابچہ مرتب کر دوں جس سے اسلامیات کے طلبہ کو بھی فائدہ پہنچے اور ان تک ہماری دعوت بھی پہنچے۔ چنانچہ میں نے سیرت ائمہ اربعہ کے نام سے مختصر سا کتابچہ مرتب کیا۔ وہ ایک کامیاب کوشش قرار دی گئی۔ ان چھوٹے چھوٹے مضامین میں ہر امامؒ کی سوانح حیات کے بنیادی تاریخی واقعات بھی آ گئے تھے۔ اپنے اپنے زمانے میں ان کا جو مقام تھا، اس کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی تھی، فقہ اور اشاعت دین میں ان کی جو خدمت تھی، اس کا بھی ذکر ہو گیا تھا اور خاص طور پر اقامت دین کے سلسلے میں ان کا جو کام تھا، اس کا تذکرہ بھی آ گیا تھا۔ پھر ان کے علم و فضل، اخلاق و تقویٰ اور تعلق باللہ کا بھی ذکر تھا۔ یہ چیزیں متوازن اور متناسب انداز سے جمع کر دی تھیں۔ اگرچہ اس کے بعد اور بھی چیزیں لکھیں، تاہم یہ میری پہلی تصنیف بھی اس زمانے کی یادگار رہے۔

۵

عملی زندگی میں قدم

اگرچہ امتحان بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کرلیا تھا، لیکن اس کے باوجود جمعیت میں قیام کے چھے ماہ کے دوران میں نے کوئی ملازمت تلاش نہیں کی۔ ہر چند کہ گھر کے حالات کا بھی تقاضا تھا کہ ملازمت کروں اور گھر والوں کو سپورٹ دوں۔ لیکن جب جمعیت سے باقاعدہ دستوری طریقے سے فارغ ہوگیا تو پھر ملازمت کی تلاش شروع کی۔

پہلی ملازمت

اس زمانے میں گیمن پاکستان لمیٹڈ، ایک بڑی تعمیراتی انجینیرنگ کمپنی تھی۔ پیر کالونی سے پندرہ میل دُور ماری پور میں ان کا صدر دفتر تھا۔ وہاں پر جمعیت کے ایک رکن جناب ان شاء اللہ خان اس کمپنی کے فنانس ایڈوائزر تھے۔ ایک پولش انجینیر ان کا چیف ڈیزائننگ انجینیر تھا۔ اس کے علاوہ بھی دو اور پولش انجینیر تھے۔ خان صاحب نے مجھے وہاں لے جاکر بات کی اور یکم جنوری ۵۴ء سے میں نے گیمن لمیٹڈ میں زندگی کی پہلی ملازمت شروع کر دی۔

یہاں پر یہ بھی بتادوں، کہ جمعیت کے زمانے میں ہم سب دوستوں کا یہ خیال تھا کہ ہمیں کوشش کر کے تعلیمی شعبے میں جانا چاہیے۔ ہمارا خیال تھا گورنمنٹ کی ملازمت کے دروازے تو ہم لوگوں کے لیے بند ہیں۔ پھر چونکہ ہم جماعت میں جانا ضروری سمجھتے ہیں، اس صورت میں سرکاری ملازمت اور جماعت ساتھ ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ جماعت اس زمانے میں زیرِ عتاب تھی، اس لیے خیال تھا کہ تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے کہ جس میں خود

ہماری اپنی بھی علمی ترقی ہوسکتی ہے اوراس کے ذریعے ہم آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرسکتے ہیں۔اسی سوچ کا نتیجہ ہوا، کہ بعد میں خورشید بھائی، ظفراسحاق اور بہت سے ساتھ تعلیمی شعبوں میں گئے۔انجینیر نگ کالج میں لیکچررز کی ضرورت تھی، میری پوزیشن بھی اچھی تھی، اس لیے وہاں لیکچررشپ کے لیے کوشش کی۔لیکن این ای ڈی انجینیرنگ کالج کے ہندو پرنسپل صاحب جو ہمارے نظریاتی پس منظر سے خوب واقف تھے، انھوں نے مجھے لیکچرر منتخب نہیں ہونے دیا۔

اس زمانے میں انجینیرنگ کے جو طالب علم فرسٹ کلاس آتے تھے، ان کو گورنمنٹ کی جاب سے اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینیر کی کلاس ون پوسٹ ملتی تھی، جب کہ باقی لوگ کلاس ٹو میں ایس ڈی او لیے جاتے تھے۔البتہ دوسرے لوگ مقابلے کا امتحان پاس کر کے کلاس ون ملازمت حاصل کرسکتے تھے۔اگر کوشش کرتا تو یہ کلاس ون ملازمت مجھے مل جاتی۔لیکن مجھے پہلے ہی سے یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ کی ملازمت نہیں کرنا، کیونکہ یہ جماعت کی رکنیت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوگی۔ دوسرا یہ کہ رشوت ستانی کے نظام میں اگر کسی کی راہ میں رکاوٹ بنوں گا،تو مسلسل مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور خاموش رہنا غلط ہوگا۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ سرکاری ملازمت سے دُور رہوں۔

چنانچہ میں نے ایک پرائیویٹ فرم کی ملازمت اختیار کی۔اس وقت ۲۷۰ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔صبح ہی صبح کمپنی کی بس پیرالٰہی بخش کالونی سے اٹھاتی، اور وہاں سے ماری پور جاتی تھی۔شام کو تقریباً پانچ چھے بجے فارغ ہوتے اور سات بجے تک گھر پہنچتے تھے۔اس طرح جماعت کے کام، مطالعے اور گھر کی طرف توجہ دینے کے لیے صرف اتوار کا دن ہوا کرتا تھا۔لیکن اس کے باوجود آدمی اگر چاہے تو فاضل وقت میں تحریک کا کام کرسکتا ہے۔ چنانچہ ملازمت کی مصروفیت اور مجبوری کے باعث کام نہ کرنا کوئی حقیقی عذر نہیں ہے، بس شرط یہ ہے کہ اگر آدمی کام کرنا چاہے تو کام کے بیسیوں راستے۔ ورنہ دل کو مطمئن کرنے کے لیے عذر تلاش کرنا سب سے آسان کام ہے، جس سے دوسروں کو مطمئن کیا جاسکتا ہے۔لیکن ایسی صورت میں اس فرد کو اطمینان نہیں مل سکتا، جس نے

مقصدِ زندگی کا شعور پالیا ہو۔ اس لیے میرے سامنے جب کوئی ساتھی کام نہ کر پانے کا عذر پیش کرتا ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں، اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتا ہوں۔ بہرحال ملازمت شروع ہوگئی، جمعیت سے تعلق ختم ہوگیا اور جماعت سے براہِ راست تعلق بھی جڑ گیا۔ اس طرح ۱۹۵۴ء کا سال شروع ہوا۔

جماعت سے تعلق اور سرگرمیاں

۱۹۵۴ء میں جب میں نے جماعت کے ساتھ بطور امیدوار رکنیت اپنے تعلق کا آغاز کیا تو میری ساری سرگرمیاں پیر الٰہی بخش کالونی کے حلقے تک محدود تھیں۔ ہوسکتا ہے کسی دوسرے فرد کو یہ بات تعجب خیز نظر آتی ہو، کہ جو فرد جمعیت کا ناظم اعلیٰ اور کراچی جمعیت کا ناظم رہ چکا تھا، اس کو شہر کی سطح پر استعمال کرنا چاہیے تھا۔ اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہونی چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ میں ایک عام کارکن کی حیثیت سے ہی جماعتی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کی کوئی خواہش نہیں تھی کہ میری سابقہ حیثیت کی وجہ سے مجھے کوئی ذمہ داری سونپی جائے۔ پھر یہ بھی تھا کہ ملازمت کی بے پناہ مصروفیات تھیں، جو صبح سے شام تک بارہ گھنٹے نچوڑ لیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد حلقے کا کام تھا، اب اس سے بڑھ کر شہر کی سطح پر پروگراموں میں شریک ہونا مشکل تھا۔ یوں بھی مجھے قائدین سے ذاتی روابط قائم کرنے کی نہ کبھی خواہش رہی اور نہ زندگی میں کبھی کوشش کی۔ اب بھی جب کہ میں جماعت کا نائب امیر ہوں تو امیر جماعت سے جا کر بلاوجہ ملاقات کر کے ان کا وقت ضائع کرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بات یہ تھی۔

دوسری بات یہ کہ اس وقت جماعت کا پورا نظام رکنیت پر قائم تھا۔ جس طرح میں نے بتایا ہے کہ جمعیت سے فارغ ہوتے وقت میں نے فوراً رکنیت کی درخواست دی اور امیدوارِ رکنیت بن گیا تھا، اس لیے کہ جب تک رکن نہ بنتا میں ارکان کے اجتماع میں شریک نہیں ہوسکتا تھا، اور نہ شوریٰ میں منتخب ہوسکتا تھا۔ حلقے میں سارے لوگ جاننے والے تھے، ان میں

غلام قادر صاحب تو آخر وقت تک جماعت کے بڑے سرگرم کارکن رہے اور اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔ انور یار خان صاحب تھے جو کسی کمپنی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے، وہ بھی اچھے فعال کارکن تھے۔ حکیم اقبال حسین صاحب کراچی کی سطح پر نظم میں تھے۔

ہمارے حلقے کے ناظم یعقوب عرفان صاحب بڑی اچھی پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ سانولے رنگ کے دراز قامت فرد تھے۔ وہ میرے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ میں حلقے میں کام کر رہا ہوں، لہٰذا رکنیت کی درخواست تو دے دی، لیکن رکن نہیں بنا تھا۔ حالانکہ ناظم حلقہ نے تو درخواست کو فوراً ہی اُوپر بھجوا دیا تھا۔ لیکن مجھے اس پر کوئی بے چینی یا اضطراب نہیں تھا، بلکہ میں اطمینان سے حلقے کے اندر مختلف کاموں میں لگ گیا تھا۔

ناظمِ حلقہ نے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت، دعوتی کام اور بیت المال کا نظم میرے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ معاونین کی فہرست، ان سے اعانتیں وصول کرنا، نئے معاون بنانا یہ کام بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ جماعت کی مہمات تھیں۔

کارنر میٹنگز

پاکستان میں دستور سازی کا کام جاری تھا، اس لیے اس زمانے میں ہماری جانب سے اسلامی دستور کی مہم چل رہی تھی۔ اس ضمن میں کارنر میٹنگز کا سلسلہ شروع تھا اور پاکستان کا دستور ہی ان کا موضوع تھا۔

طریقہ یہ تھا کہ ہم لوگ دفتر سے آنے کے بعد عموماً مغرب کے وقت ہی نکال سکتے تھے۔ ہم چند کارکن مضافات کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں، اور پیر الٰہی بخش کالونی کے مختلف مقامات پر نکل جایا کرتے تھے۔ ہمارے پاس چند بینرز، کچھ پمفلٹ، تھوڑا بہت لٹریچر، ایک اسٹول، اور ایک بھونپو قسم کا مائیک ہوتا تھا۔ وہاں جا کر کسی ایسی جگہ یہ اسٹول رکھ دیتے تھے، جہاں بیس پچیس آدمی جمع ہو سکتے۔ پھر کھڑے ہو کر ہم میں سے ایک فرد تقریر کر دیا کرتا تھا۔

میں نے ایسی بہت سی میٹنگز میں تقریریں کیں۔ عام لوگوں تک پہنچنے کا یہ بہت سستا اور مؤثر ذریعہ تھا۔ مجھے اب تک اس بات کا افسوس ہے، کہ بعد میں ہم نے بڑے اجتماعات کی خواہش میں یہ آسان طریقہ ترک کر دیا۔

پھر ہم نے مہمات چلانے کے پروگرام بنائے۔ ان میں یہ ہوتا تھا کہ ہفتے بھر میں ایک بڑا سا پروگرام ہو جاتا۔ ایک جلوس نکالتے جس کی تصویر بن جائے، پھر اسی طرح خاموش مظاہرے کرتے، جس میں لوگ گھنٹوں تک پلے کارڈز لیے سڑک پر کھڑے رہتے تھے۔ اس طرح ہزاروں لوگ گزرتے ہوئے دیکھتے تھے اور جماعت کے بارے میں ایک رائے قائم کرتے تھے۔ کارنر میٹنگز کے ذریعے ہماری بات بالکل نچلی سطح (grass root) تک پہنچ جاتی تھی۔

اس زمانے میں اور جمعیت میں کام کے زمانے میں بھی، مسجدوں میں جا کر قومی موضوعات پر بات کرنا ہمارے لیے کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں آج کی طرح فرقہ واریت نہیں پائی جاتی تھی۔ اگرچہ بریلوی، دیوبندی، اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات کی الگ مساجد تھیں۔ ہمارے ذہن میں کبھی یہ نہیں تھا کہ کسی مسجد میں جا کر اپنی بات نہ کہہ سکیں گے۔ ان دنوں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی، کہ بغیر اجازت کوئی تقریر نہ کرے۔ چنانچہ میں بے شمار مسجدوں میں گیا، نماز کے بعد کھڑا ہو گیا اور تقریر کی۔ پیر کالونی کے وسط میں بریلوی حضرات کی مکرانی مسجد تھی۔ وہاں پر جمعیت کے زمانے میں فجر کے بعد ایک عرصے تک میں درسِ قرآن دیتا رہا۔ اس وقت میری حیثیت کیا تھی؟ لیکن کسی نے مجھے نہیں روکا ٹوکا، کہ یہ کام کیوں کر رہے ہو؟ آج کل تو یہ ناممکن سی بات لگتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان گزرے وقتوں میں بڑی رواداری تھی، فرقہ واریت اور تنگ نظری کی اتنی گہری چھاپ نہیں تھی جتنی آج کل ہے۔

مولانا کی رہائی کے لیے مظاہرے

مولانا مودودی کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد مولانا کافی

عرصے تک جیل میں رہے۔ اس دوران اگرچہ میں جمعیت میں نہیں رہا تھا، لیکن ہماری طرف سے ان کی رہائی کے لیے مہمات چلتی رہتی تھیں۔ جماعت جو مہمات چلاتی تھی، ہم اس میں بھی برابر شرکت کرتے تھے۔ ہم نے اپنے طور پر دو ایسی مہمات چلائیں، جو حافظہ میں محفوظ ہیں۔

بڑے سرکاری افسر، عہدے دار اور سیاسی لیڈر پولو گراؤنڈ میں عید کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کراچی کے دیگر بہت سے لوگ پولو گراؤنڈ جایا کرتے تھے، جہاں مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم عید پڑھاتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں عید کے دن ہم نے مولانا مودودی کی رہائی کے لیے مظاہرے کا پروگرام بنایا۔ طے کیا کہ اس پروگرام کو آخری وقت تک خفیہ رکھا جائے، اور عین وقت پر مظاہرہ کیا جائے، تاکہ کسی کو روکنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ اسکیم کے تحت ہمارے بہت سے کارکن پہلی، دوسری اور تیسری صفوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ یہ صفیں صدر، وزیر اعظم اور اس طرح کے لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی تھیں۔ لیکن اگر کوئی بیٹھ جائے تو اس کو اٹھایا بھی نہیں جاتا تھا۔ ہم نے کچھ کچھ جگہ چھوڑ دی تھی، تاکہ بالکل ایسی صورت نہ بن جائے کہ وہ اٹھانے پر مجبور ہو جائیں۔ اس طرح ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے۔

ہمارے پاس ایک پمفلٹ تھا، جس میں مولانا مودودی کی رہائی کا مطالبہ تھا اور باہر جماعت کے کارکن موجود تھے۔ جن کے پاس بینرز اور پلے کارڈز تھے اور ان پر بھی رہائی کا مطالبہ تھا۔ نماز شروع ہونے سے کوئی پانچ سات منٹ پہلے ہم نے کھڑے ہو کر پہلی، دوسری اور تیسری صف میں وہ پمفلٹ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ باہر ہمارے کارکنوں نے چاروں طرف بینرز اور پلے کارڈز کھول دیے۔ عیدگاہ کے اردگرد یہ خاموش احتجاج ایک مؤثر مظاہرے کی صورت میں نمایاں ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق اس مظاہرے کو صرف چار منٹ تک رہنا تھا۔ نماز کا وقت ہو گیا، تو ہم نے آنِ واحد میں بینرز اور پلے کارڈز لپیٹ لیے۔ مگر اتنے مختصر مظاہرے کو گورنمنٹ کے عہدے داروں، افسروں اور وزیروں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا

اظہار کیا۔ ان کو اتنا غصہ آیا کہ وہ نماز پڑھنے میں غلطی بھی کر گئے۔ ہمیں اپنی جگہ بڑا اطمینان تھا کہ ایک حساس جگہ پر ایک کامیاب مظاہرہ کیا۔

انعام اللہ خان صاحب نے جنوری ۵۴ء میں دنیاے اسلام کے نوجوانوں کا ایک کنونشن 'فرسٹ انٹرنیشنل اسمبلی آف مسلم یوتھ' (IAMY) کے نام سے بلایا۔ تمام مہمانوں کو ہوٹل میٹروپول میں ٹھیرایا گیا تھا۔ اسی ہوٹل کے لان میں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس بھی ہونا تھا۔ انھوں نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ خود اپنے ملک پاکستان سے مسلمان نوجوانوں کی سب سے بڑی تنظیم 'اسلامی جمعیت طلبہ' اس کانفرنس میں نہ آنے پائے۔ اسی لیے جمعیت کو نہیں بلایا گیا۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس کھلا پروگرام تھا، اور شاید ان کی ضرورت بھی ہوگی، کہ حاضرین کی تعداد زیادہ ہو۔ افتتاح کرنے والی شخصیت وزیراعظم محمد علی بوگرہ تھے۔

اگرچہ ہمیں نہیں بلایا گیا تھا، تاہم کانفرنس میں جانے کا ہم نے بھی راستہ پیدا کرلیا تھا۔ (جس کا تذکرہ آگے کروں گا) افتتاحی اجلاس کے شروع ہونے سے پہلے ہم پنڈال کے مختلف کونوں میں جاکر بیٹھ گئے۔ ہماری جیبوں میں ایک پمفلٹ 'اخوان المسلمون' پر مظالم کے خلاف تھا جس کا عنوان Why Oppression on Brotherhood تھا۔ اس زمانے میں ابھی تلاشی کا رواج نہیں ہوا تھا اور سیکورٹی بھی اتنی سخت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے ہم تھوڑے تھوڑے پمفلٹ ہاتھوں میں تھامے اجتماع گاہ میں آچکے تھے۔ جیسے ہی وزیراعظم محمد علی بوگرہ صاحب پنڈال میں داخل ہوئے اور ان کے احترام میں لوگ کھڑے ہوئے، اسی وقت ہم نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ پمفلٹ تقسیم کرنا شروع کردیا۔ صرف دو منٹ کے اندر تمام شرکا کے ہاتھوں میں وہ پمفلٹ پہنچ گیا تھا۔ بلکہ ایک کارکن نے تو جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے، وہ پمفلٹ وزیراعظم بوگرہ صاحب کے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ خوش قسمتی سے کوئی ناخوش گوار صورت حال پیدا نہیں ہوئی، اور منتظمین خاموشی سے اس واقعے کو برداشت کر گئے۔

اس طرح مولانا مودودی کی رہائی، اخوان پر مظالم اور دوسرے مسائل پر مختلف وقتوں

میں اور مختلف انداز سے ہماری تحریکیں چلتی رہیں۔ یہ تحریکیں اور کوششیں مولانا مودودی سے ہماری محبت، عقیدت، تعلق اور نیازمندی کی علامت تھیں۔

ایک امدادی مہم

۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں زبردست سیلاب آیا۔ مرکز جماعت کی طرف سے وہاں پر کام پھیلانے کے لیے چودھری علی احمد خان صاحب متعین تھے۔ انھوں نے فنڈز اور کپڑوں کے لیے امداد کی اپیل کی۔ کراچی جماعت نے اس کے لیے بھرپور مہم چلائی۔

اس کے لیے جماعت کے کارکن گھر گھر جاتے تھے۔ اگرچہ ہمارا اثر وسیع نہیں تھا، تاہم لوگوں کو جماعت پر اعتبار اور بھروسا تھا۔ کالونی کے علاقے کو جماعت کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لیے ایک طریقہ ہم نے یہ نکالا تھا کہ شام کو ایک ٹرک لے کر اس پر مائک لگا لیتے تھے۔ آبادیوں میں جگہ جگہ ٹرک کھڑا کر کے مختصر سی تقریر کرتے، پندرہ بیس کارکن ٹرک سے نکل کر، سڑک پر پھیل جاتے، دروازوں پر دستک دیتے، کہیں پر لوگ کپڑے دیتے، اور کہیں پر رقوم دے دیتے۔ بعض لوگ چاول، آٹا بھی لا کر ٹرک میں ڈھیر کر دیتے۔ ہم آگے بڑھ کر دوسری جگہ بھی یہی عمل دہراتے۔

اس طرح چلتے ہوئے ہم جمشید روڈ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ جمشید روڈ قبل تقسیم کراچی کا سب سے زیادہ پوش علاقہ تھا۔ جہاں بڑی اور کشادہ سڑکیں، عمدہ کوٹھیاں اور خوش نما بنگلے تھے۔ وہاں پر رہنے والے سب لوگ خوش حال اور صاحبِ ثروت تھے۔ جب ہم وہاں گئے تو شروع شروع میں سخت ناکامی ہوئی۔ لوگوں نے تقریریں کیں، اپیل کی، پھر دروازے کھٹکھٹائے۔ دروازے پر جانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ ہماری پیر کالونی جیسے علاقے میں تو سو گز میں بیس مکان تھے، وہاں دو سو گز میں ایک مکان ملتا تھا۔ پھر دوسری مشکل یہ کہ دروازوں پر کتے موجود تھے۔ لوگوں کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔

میں نے یعقوب عرفان صاحب سے کہا کہ ''آپ ذرا مجھے مائک دیں'' اب تک اس

مہم میں، میں نے کوئی تقریر نہیں کی تھی۔ یعقوب صاحب نے مائک دیا، اور میں نے تقریر میں خلافِ معمول ذرا سی تندی اور تیزی اختیار کرتے ہوئے کہا: ''مشرقی پاکستان میں آپ کے بھائیوں کا یہ حال ہے، کہ ان کے سر پر چھت نہیں، وہ پاؤں سے ننگے ہیں، بدن پر کپڑا نہیں اور کھانے کے لیے خوراک نہیں۔ ان کے بچے بیماری میں تڑپ رہے ہیں، مگر ان سسکتے جگر گوشوں کے لیے دوائی نہیں ہے۔ وہ سیلاب کا شکار ہوئے ہیں، اور آپ یہاں عیش کر رہے ہیں۔ آپ کے مکانوں میں سارا ساز وسامان موجود ہے۔ یاد رکھیں، آپ خود خوش دلی سے اپنے مجبور بھائیوں کو نہیں دیں گے، تو جان لیجیے ایک سیلاب آئے گا اور آپ کا سب کچھ بہا لے جائے گا۔ اگر آپ آگے بڑھ کر اللہ کی راہ میں دیں گے تو معاشرے میں ایک توازن پیدا ہوگا'' وغیرہ وغیرہ۔

معلوم نہیں کس داخلی جذبے اور کس کرب میں یہ اور اس طرح کے الفاظ کہے تھے کہ اس کے بعد دروازے کھل گئے، امدادی سامان کا ڈھیر لگ گیا اور ہمارا ٹرک کپڑوں اور اشیا سے بھر گیا۔ اس دن پیسے بھی بہت زیادہ جمع ہوئے تھے۔ ناظمِ حلقہ بہت خوش ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اس محبت کا انھیں اجر دے، انھوں نے میری خوب ہمت افزائی کی۔ اس طرح ہم نے دوسرے محلوں میں بھی جا کر امدادی سامان اکٹھا کیا۔

سرزمین بنگال، تعلق کی خوشبو

مشرقی پاکستان سے اپنے جذباتی تعلق کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس لیے وہاں پر رونما ہونے والے سیاسی واقعات، قدرتی آفات اور تحریکی پیش رفت کے بارے میں عام طور پر زیادہ دل چسپی لیا کرتا تھا۔ جماعت نے ۵۲ء میں ایک وفد وہاں بھیجا تھا، جس میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب، چودھری علی احمد خان صاحب، اور باقر خان صاحب وغیرہ تھے۔ اس وفد کے ذمے یہ تھا کہ وہاں جا کر دعوت دین پھیلانے کے لیے کوئی حکمت عملی تجویز کرے، کہ جس سے مشرقی پاکستان جماعت کا کام بڑھ سکے۔

وفد واپس آیا تو مولانا مودودی نے چودھری علی احمد خان صاحب کو مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کا امیر مقرر کر کے وہاں بھیج دیا۔ چودھری صاحب اگرچہ رسمی طور پر زیادہ

پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن بہت سمجھ دار اور معاملہ فہم تھے، مطالعہ بڑا وسیع تھا، بڑے اَن تھک اور سرگرم کارکن تھے۔ ان میں کارکنوں کو آپس میں جوڑ کر رکھنے کی بڑی عمدہ صلاحیت تھی اور دعوت کو بڑھانے کی بھی بھرپور صلاحیت تھی۔ ان میں ایک اور صلاحیت بھی تھی، اور وہ یہ کہ بڑے سے بڑے نظریاتی مخالف سے وہ بڑا خوب صورت مکالمہ کرسکتے تھے اور ان کے اعتراضات کا مسکت جواب دے سکتے تھے۔ مولانا مودودی نے ''چودھری صاحب کے انتقال پر انھیں جو 'تحریک اسلامی کا بہترین کارکن' کہا تو یہ کوئی مبالغہ نہیں کیا۔ چودھری صاحب نے مشرقی پاکستان میں جاکر کام شروع کردیا اور وہاں سے کام میں پیش رفت کی خوش گوار رپورٹیں بھی آنا شروع ہوگئیں۔

جماعت کے دفتر کے پاس پاکستان چوک کے قریب ایک ہوٹل میں مرکزی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ چودھری علی احمد مشرقی پاکستان سے آرہے تھے، ایئرپورٹ پر ان کا بڑا شان دار استقبال کرتے ہوئے ان کو لایا گیا تھا۔ انھوں نے آکر مشرقی پاکستان کے مفصل حالات بیان کیے تھے۔ جہاں تک کسی کے استقبال کے لیے جانے کا تعلق ہے، اس ضمن میں میرا مزاج متردّد رہتا تھا، یہاں تک کہ جب مولانا مودودی کراچی آئے تو میں استقبال کے لیے نہیں گیا۔ مگر اس کے برعکس چودھری علی احمد صاحب کے استقبال کے لیے میں خاص طور پر ایئرپورٹ گیا تھا۔ پھر ان کے ساتھ رہا، بیٹھا، دلی محبت اور پوری توجہ سے ان کے تاثرات اور حالات کا تجزیہ سنا۔

اس سے میری اس رائے کو اور بھی زیادہ تقویت ملی کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین تحریکِ اسلامی کی دعوت کے لیے بڑی زرخیز ہے۔ اگر توجہ دی جائے تو وہاں پر تحریک کا کام بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے۔ وہاں کے سیاسی حالات سے بلاشبہ تشویش کا پہلو سامنے آیا۔ جس میں علاحدگی، بنگالیت اور بنگلہ زبان کے پردے میں ہندو ہاتھ کی کارفرمائی بھی سامنے آئی۔ لیکن یہ کہ ان باتوں کو سن کر مشرقی پاکستان سے اور زیادہ تعلق مضبوط ہوا۔

اسعد گیلانی صاحب گیمن کمپنی میں کام کرتے تھے۔ وہ بھی کراچی جماعت کے

رکن ان شاء اللہ خان صاحب فنانس ایڈوائزر کی وجہ سے وہاں پر ملازم تھے۔گیلانی صاحب، چودھری علی احمد خان صاحب کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔تحریک میں بھی ان کے ساتھ بہت گہری رفاقت تھی۔ گیمن کمپنی میں گیلانی صاحب سے میری روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔دوپہر کا کھانا اور ظہر،عصر کی نمازیں بھی اکٹھے پڑھتے تھے۔

چودھری علی احمد خان صاحب چاہتے تھے کہ مغربی پاکستان سے کچھ مزید لوگ جائیں اور مشرقی پاکستان میں کام کو بڑھائیں۔ چنانچہ ان کی نظرِ انتخاب سید اسعد گیلانی صاحب پر پڑی۔ جب انھوں نے دعوت دی تو اسعد گیلانی صاحب نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ وہ ملازمت چھوڑ دیں گے اور مشرقی پاکستان میں جا کر ہمہ وقت کارکن بن کر جماعت اسلامی کا کام کریں گے۔اسعد گیلانی صاحب نے جب وہاں جانے کا فیصلہ کیا تو امرِ واقعہ ہے کہ مجھے ان پر بڑا رشک آیا۔ارادہ میرا تھا،لیکن میں تو اب تک یہیں پر ہوں اور یہ وہاں پر جارہے ہیں۔

گیلانی صاحب کا وہاں پر جانے کا فیصلہ بھی جذباتی طور پر میرے ارادے کے لیے مہمیز کا کام کرگیا، کہ مجھے ضرور مشرقی پاکستان جانا ہے۔گویا کہ علی احمد خان صاحب اور اسعد گیلانی صاحب بھی مشرقی پاکستان جانے کی آتشِ شوق کو تیز کرنے کا محرک بنے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کونور سے بھر دے۔

ملازمت میں تبدیلی

۱۹۵۴ء کے دوران ہی میری ملازمت میں بھی تبدیلی آ گئی۔اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس سے مجھے اپنے اوقات میں کچھ تھوڑی سی فراغت ملی۔ معاشی طور پر بھی میری حالت تھوڑی سی بہتر ہوئی۔ گیمن کے اندر تنخواہ دوسوستر روپے تھی،بارہ گھنٹے کا کام تھا، اور مطالبات بھی بڑے سخت تھے۔جس شدت سے کمپنی والے میری وابستگی اور لگاؤ چاہتے تھے، اس وقت تک انجینیرنگ کے ساتھ اس درجہ کا لگاؤ مجھ میں پیدا نہیں ہوا تھا۔اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کے خیال میں، مَیں ایک کامیاب انجینیر نہیں بن رہا ہوں گا۔

اس وقت میری ساری توجہات جماعت اور تحریک کی طرف تھیں۔ جو دو سو ستر روپے تنخواہ ملتی تھی، اس میں دو سو روپے والدہ محترمہ کے ہاتھ میں رکھ دیتا تھا، وہ شاید اسے میری بہن عطیہ کی شادی کے لیے جمع کر رہی تھیں۔ ۳۰ روپے جماعت کو اعانت دیا کرتا تھا اور ۴۰ روپے جیب خرچ کے لیے رکھ لیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ۴۰ روپے بھی میرے لیے بہت کافی تھے۔ جماعت کے پروگراموں میں بسوں پہ آنا جانا، لٹریچر خریدنا اور دوستوں کی خاطر مدارات کرنا، انھی پیسوں سے بہ آسانی ہو جاتا۔

اسی دوران مجھے کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (KESC) میں اسسٹنٹ انجینیر کی جگہ مل گئی اور تنخواہ دو سو ستر سے بڑھ کر یک لخت ساڑھے چار سو روپے ہو گئی۔ تنخواہ ہی نہیں بڑھی، بلکہ اوقاتِ کار بھی انسانی اور معقول ہو گئے۔ میرے سینیر حیدر علی ڈیری صاحب ایگزیکٹو انجینیر تھے۔ وہ میری پوزیشن کو سمجھتے تھے۔ کسی اجتماع یا جلسے میں جانا ہوتا تو ان کو کوئی اعتراض نہ ہوتا، ان کی طرف سے میرے لیے یہ سہولت تھی۔ ٹھیکیداروں سے کچھ لین دین کا کام وہ خود ہی کر لیتے تھے، اس میں مجھے نہیں ڈالتے تھے۔ اس طرح مجھے تحریک کے اندر کام کرنے میں خاصی سہولت ملی۔ قید سے رہائی کا احساس ہوا اور تحریکی سرگرمیوں میں وسعت آئی۔

۱۹۵۴ء میں ملکی حالات بڑے دگرگوں ہو گئے تھے۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا تھا۔ اسلامی دستور کے سلسلے میں وہ سارا کام جو ہم کر رہے تھے، بظاہر یہ محسوس ہوا کہ یہ بھی رخصت ہو گیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو ویسے ہی مسلم لیگ کا تختہ اُلٹ چکا تھا۔ عوامی ووٹوں کے اس نتیجے کے بعد مسلم لیگ کے جو ارکان اس وقت قومی دستور ساز اسمبلی کے اندر موجود تھے، اخلاقی طور پر وہ مشرقی پاکستان کی نمایندگی کے حق دار نہیں تھے۔

اسی زمانے میں مولوی تمیز الدین اسپیکر اسمبلی نے دستور ساز اسمبلی ٹوٹنے پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس طرح عدالت کے ذریعے انصاف کے حصول سے بڑی گہری دل چسپی

پیدا ہوئی۔ سندھ ہائی کورٹ نے گورنر جنرل کے فیصلے کے خلاف حکم دیا، مگر سپریم کورٹ نے گورنر جنرل کے احکام کو قانونی جواز فراہم کر دیا۔ اگرچہ ریٹائرمنٹ کے بعد، اس وقت کے چیف جسٹس محمد منیر [م: ۲۶ جون ۱۹۸۰ء] نے اعتراف کیا کہ ہمارا یہ فیصلہ ''قانونی سے زیادہ سیاسی تھا''۔ یہی صاحب پاکستان میں سیکولر لابی کے لیے ایک قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں۔ اس اکھاڑ پچھاڑ اور دستور ساز اسمبلی کے ختم ہونے کے نتیجے میں ایسا قانونی سقم پیدا ہو گیا، کہ جس سے پاکستان کی عدالت عظمیٰ نے وہ سارے قوانین ہی باطل کر دیے کہ جن کے تحت مارشل لا کو جواز دیا گیا تھا، چنانچہ ۱۹۵۵ء میں مولانا مودودی بھی رہا ہو گئے۔

لیکن اصل جھگڑا تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تھا۔ مغربی پاکستان نے اس کا حل یہ سوچا کہ 'ون یونٹ' (وحدت) بنایا جائے۔ مغربی پاکستان کے چار صوبوں اور یہاں کی ریاستوں کو ختم کر کے صرف ایک صوبہ بنایا جائے، تاکہ وہ مشرقی پاکستان کے مدمقابل ہو۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان parity (نیابتی مساوات) کا ضابطہ بنایا جائے۔ حالانکہ مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ تھی۔ ون یونٹ بنانا خود ایک بڑا نازک سیاسی مسئلہ تھا۔ حتیٰ کہ سندھ، سرحد، بلوچستان اور بہاول پور کو اس کے لیے راضی کرنا سخت دشوار کام تھا۔ یہ کارنامہ چودھری محمد علی صاحب کی قیادت میں ہوا۔ جنھیں مغربی پاکستان میں ہیرو کا درجہ دیا جاتا تھا، اور مشرقی پاکستان میں انھیں father of disparity کہا جاتا تھا۔

جمعیت: فاصلہ اور قربت

۵۴ء میں جمعیت سے میرا تعلق برائے نام ہی تھا۔ خورشید احمد بھائی جمعیت کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ ان سے گہرے ذاتی تعلقات کے باوجود اب میرا آنا جانا، زیادہ ملنا جلنا اور اجتماعات میں شریک ہونا، وغیرہ یہ پورا سلسلہ ہی منقطع رہا اور شاید کسی پروگرام میں شریک نہیں ہو سکا۔

البتہ اتنا یاد ہے کہ اکتوبر (۲۸-۳۰) ۱۹۵۴ء کے دوران جمعیت کا ساتواں اجتماع لاہور میں ہو رہا تھا۔ وہاں پر خورشید بھائی مزید ایک سال کے لیے ناظمِ اعلیٰ منتخب ہو گئے۔

جمعیت کے لوگ واپس کراچی آئے تو میں ان کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر گیا تھا۔ چار سال کی رفاقت میں اس وقت خورشید بھائی کے چہرے پر پہلی بار چھوٹی سی خوب صورت داڑھی دیکھی۔ حالانکہ وہ ایک سال پہلے بھی ناظم اعلیٰ منتخب ہو چکے تھے۔ خورشید بھائی اور ظفر اسحاق سے میرا بڑا قریبی تعلق تھا۔ ۵۳ء میں اسرار احمد صاحب کے روّیے کی وجہ سے جمعیت میں جو حادثاتی بدمزگی رونما ہوئی تھی، اس کا میرے اعصاب، طبیعت اور مزاج پر بڑا گہرا اثر ہوا تھا، بلکہ صدمے کی کیفیت تھی، حالانکہ اس المیہ میں خورشید بھائی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مگر صدمہ اتنا شدید تھا کہ تمام تر محبت اور ان کے بے قصور ہونے کے باوجود، جمعیت سے ایک فاصلے پر رہنے کے لیے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ نظامتِ اعلیٰ کے پہلے سال خورشید بھائی سے وہ گرم جوشی برقرار نہ رہی، جو بہرحال رہنی چاہیے تھی۔ اسی لیے ان کے دوبارہ ناظمِ اعلیٰ منتخب ہونے پر استقبال کے لیے جانے کا میں نے ذکر کیا ہے۔

۵۴ء کا سال بھی گزرنے میں آیا، کہ میں ابھی تک رکن نہیں بن سکا تھا۔ ہمارے ناظمِ حلقہ یعقوب عرفان صاحب کو اس پر تشویش ہوئی۔ انھوں نے خود ہی امیر جماعت کراچی، چودھری غلام محمد صاحب کے پاس جا کر اس بارے میں ملاقات کی۔ میرے خیال میں رکنیت شرعی طور پر ایک ضروری چیز ہے، جو تحریک سے ہمدردی رکھنے والے آدمی کو اختیار کرنی چاہیے۔ میرے ذہن کی منطق یہ تھی، کہ جب اپنے آپ کو پیش کر کے فرض ادا کر دیا ہے، تو اس کے بعد اب رکن بنانا یا نہ بنانا جماعت کے نظم کا کام ہے۔ اس کی میرے اُوپر کیا ذمہ داری؟ تحریک کے بے شمار معاملات میں میرا رویہ رہا ہے، کہ اپنا فرض میں نے ادا کر دیا، اب دوسروں کو کیا کرنا چاہیے، اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ نہ اس میں بہت زیادہ پڑتا ہوں کہ اس پر لکھوں اور احتجاج کروں۔ اجتماعی اور جماعتی زندگی میں ان چیزوں سے باہمی جذبات اور تعلقات میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اپنے رکن نہ بننے پر بالکل مطمئن تھا۔

جب کراچی نظم سے پیغام ملا، تو میں چودھری غلام محمد صاحب کے پاس چلا گیا۔ یہ غالباً

نومبر ۵۴ء کی بات ہے۔ چودھری صاحب نے کہا: ''جمعیت یہ چاہتی ہے، کہ تم کچھ عرصہ جمعیت کے رہایشی حلقوں کے نظم کی مدد کرو''۔ کراچی جمعیت کی تربیت کرنے اور اس کا مزاج بنانے کا سزاوار تو اسرار صاحب مجھے پہلے ہی قرار دے چکے تھے۔ دس مہینے تک میں جمعیت سے بالکل لاتعلق رہا، اور اب جمعیت کی خواہش پر چودھری صاحب نے فرمایا کہ ''جمعیت کے ساتھ کام کرو''۔ میں نے کہا کہ ''اپنی خدمات جماعت کے سپرد کر چکا ہوں، اب اگر آپ ڈیوٹی لگا دیں کہ وہاں کام کروں تو مجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہاں، اس صورت میں اگر آپ مجھے فوری رکن بنانے والے ہیں تو پھر اس دوران اسے ملتوی کر دیں، کیونکہ جماعت کا رکن بننے کے بعد اس طرح لگ کر جمعیت کے ساتھ کام کرنا مناسب نہیں ہوگا''۔ چودھری صاحب نے کہا کہ ''جب ہم کو ضرورت ہوگی، آپ سے کہیں گے کہ آ جائیں اور پھر رکن بنا لیں گے''۔ چنانچہ اس طرح ۵۴ء کے آخر میں میری سرگرمیوں کا یہ دائرہ جماعت کے حلقے سے ہٹ کر واپس جمعیت کی طرف چلا گیا۔

جمعیت کے ساتھ یہ تعلق دستوری طور پر حلقہ احباب کی جانب سے جڑا اور میں نے جمعیت کے رہایشی حلقوں میں کام شروع کر دیا۔ پھر یہ کام ۵۴ء کے آخر سے ڈھائی سال تک جاری رہا۔ یہ تعلق اس وقت ختم ہوا، جب میں ۱۹۵۷ء میں مزید تعلیم کے لیے امریکا گیا۔ اس پورے عرصے میں بڑے پیمانے پر کراچی جمعیت کے تربیتی پروگرام ترتیب دیے۔ اس کام کے لیے کہیں دعوتی نشست، کہیں پر شب بیداری اور کبھی اسٹڈی سرکل ہوتا۔ کبھی ناظم آباد اور چاکیواڑہ میں، کبھی لالوکھیت اور بندر روڈ پر اور کبھی پاکستان چوک پر۔ اس زمانے میں جمعیت کے پاکستان چوک حلقے میں، ظفر آفاق انصاری، انیس احمد، عبدالوہاب (جو بعد میں کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے) وغیرہ اچھے کارکن ہوا کرتے تھے۔ ناظم آباد میں بڑا فعال حلقہ تھا۔ چاکیواڑہ اور لیاری حلقہ میں ملک محمد طوقی بلوچ بہت سرگرم کارکن تھے۔ دس گیارہ ماہ جماعت کے ایک حلقے میں کام کرنے سے جو تنہائی سی محسوس ہونے لگی تھی، وہ پورے کراچی کی جمعیت میں کام کرنے سے ختم ہوگئی۔ یہ مشق اور سرگرمی بڑی خوش گوار لگی۔

عشا کی نماز گھر کے پاس مسجد ہاشمی میں پڑھتے تھے۔ اس کے فوراً بعد کالونی میں پڑوس کے لڑکے آجایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ نشست جماتے تھے۔ ان ساتھیوں سے ذاتی تعلقات بڑے گہرے تھے۔ ان کی ڈائری اور انفرادی رپورٹیں چیک کیا کرتا تھا۔ یہ بڑی پُرلطف زندگی تھی۔ مشکل سے تین چار گھنٹے سونے کا موقع ملتا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر عموماً کالونی میں درس دیا کرتا تھا۔ لیکن بعض اوقات کسی دُور دراز حلقے میں بھی جانا ہوتا تھا۔

انورالسادات سے آمنا سامنا

یہ بات تو پہلے بتائی جاچکی ہے کہ انعام اللہ خان صاحب نے انٹرنیشنل اسمبلی آف مسلم یوتھ، کراچی میں منعقد کرائی تھی۔ جس میں انھوں نے بڑی کوشش کی تھی، کہ عرب دنیا سے اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والے اور پاکستان سے اسلامی جمعیت طلبہ کے لوگ اس میں نہ آسکیں۔ بہرحال ہم اس لیے فکرمند تھے کہ مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی اہم کانفرنس ہو رہی ہے۔ جس کا انعقاد تو خوشی کی بات ہے، مگر تشویش یہ ہے کہ اس میں ہماری کوئی نمایندگی نہیں۔ اس لیے بھی ہم کانفرنس میں شرکت کے راستے تلاش کر رہے تھے تاکہ مولانا مودودی کی عمر قید کے مسئلے کو بھی مندوبین تک پہنچایا جاسکے۔

ہمیں اپنے اخوانی دوستوں سے معلوم ہوا، کہ لبنان کی تنظیم **عباد الرحمٰن** ان کے ہم خیال لوگوں پر مشتمل ہے۔ میٹروپول ہوٹل ہی میں یہ لوگ ٹھیرے ہوئے تھے اور وہیں پر کانفرنس کے اجلاس ہوئے تھے۔ ہم نے **عباد الرحمٰن** سے رابطہ کیا اور ان کے کمرے کو اہلِ جمعیت نے اپنا مرکز بنایا۔ میں ان دنوں کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں ملازم تھا۔ اپنے دفتری اوقات سے فارغ ہوکر سیدھا وہاں پہنچ جاتا تھا۔ وہیں پہ بیٹھ کر ہم نے مولانا مودودی کی رہائی کے لیے، وزیراعظم بوگرہ کی تقریر کے دوران پمفلٹ تقسیم کرنے کی اسکیم بنائی تھی۔

دوسری طرف مصر میں ۷ دسمبر ۱۹۵۴ء کو 'اخوان المسلمون' کے رہنماؤں کی مظلومانہ شہادت اور قید و بند میں کارکنوں پر مظالم بھی ہمارے لیے اتنا ہی بڑا رنج و الم کا مسئلہ تھا۔

اس مسئلہ پر ہم پہلے سے احتجاج کر رہے تھے۔ احتجاج، مظاہرے، ٹیلی گرام، سفارت خانوں کو یادداشتیں وغیرہ، اور پاکستان کے دانش ور طبقے تک مسئلے کی نوعیت کا ابلاغ، یہ سب کام جمعیت کے پلیٹ فارم سے کیا تھا۔ میٹروپول ہوٹل کے بینکویٹ ہال میں عشائیہ تھا۔ اس عشائیہ میں مہمان خصوصی مصر کے وزیر انوار السادات [جو بعدازاں ۱۹۷۰ء میں مصر کے صدر بھی بنے۔م: ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء] تھے۔ ہم نے اس اجلاس میں شرکت کے لیے خاص طور پر عباد الرحمٰن کے ساتھیوں سے مدد حاصل کی۔ انوار السادات وہ فرد تھے جن کی سربراہی میں ایک فوجی عدالت نے 'اخوان' کے چھے قابلِ قدر قائدین کو پھانسی کی سزا دی تھی، ان شہداء میں سابق جسٹس عبدالقادر عودہ شہید بھی شامل تھے۔

کانفرنس میں شریک ہونے والی شخصیات میں سرکاری سطح پر ویسے بھی مسٹر سادات واحد اہم فرد تھے۔ انھوں نے مسلم یوتھ کانفرنس کے شرکا کو مصری ڈکٹیٹر اور اخوان کے قاتل حکمران جمال عبدالناصر [م: ۲۸ستمبر ۱۹۷۰ء] کا پیغام پڑھ کر سنانا تھا۔ ہال میں بڑا مجمع تھا۔ میں سرکتے سرکتے حاضرین کے تقریباً درمیان میں پہنچ گیا۔ جمعیت کے کچھ کارکن بھی ہال میں موجود تھے۔ جوں ہی مسٹر سادات کھڑے ہوئے، اچانک میں بھی کھڑا ہوگیا۔ سادت نے ابھی ایک جملہ ہی پڑھا تھا، کہ میں نے پوری قوت سے چلّا چلّا کر کہا: ''ہم تمھاری بات نہیں سنیں گے، تمھارے ہاتھ 'اخوان المسلمون' کے رہنماؤں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، تم قاتلوں کے ساتھی ہو''۔ لوگوں نے مجھے پکڑ کر ہال سے باہر گھسیٹنا شروع کیا، لیکن میں اپنے جملے اُردو اور انگریزی میں دہراتا رہا۔ آخر انھوں نے مجھے ہوٹل سے باہر نکال دیا۔ اس سے ایک مرتبہ تو پورے اجلاس میں تہلکہ مچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں عباد الرحمٰن کے کمرے میں گیا، جہاں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب اور جمعیت کے ناظم اعلیٰ خورشید بھائی بھی موجود تھے۔ ان میں سے کسی فرد نے میری اس جرأت رندانہ کی کوئی تعریف یا حوصلہ افزائی تو نہیں کی۔ ان کا یہ ردعمل ہماری امن پسند اور قانون کا احترام کرنے کی تربیت کا ایک اچھا نتیجہ تھا۔ بلکہ خورشید بھائی نے مجھے یہ کہا کہ ''تو کیا ہوگیا تھا بھئی تم کو''۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں جذبات سے بالکل

مغلوب تھا، اس لیے کہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف میری طبیعت ہمیشہ بغاوت کرتی ہے اور 'اخوان' کے بے چارے نہتے کارکنوں کے ساتھ مصری حکومت جو کچھ ظلم و زیادتی کر رہی تھی، اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنا ممکن نہیں تھا، اور پھر جب ایک قاتل فوجی جج میرے سامنے کھڑا، نوجوانوں کو امن کا پیغام دے رہا ہو تو میں اسے کیسے مان سکتا تھا؟

جب 'اخوان' کے رہنماؤں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی، تو اس پر ہم نے زبردست احتجاج کیا تھا۔ سعودی عرب کے عبدالحمید خطیب صاحب اور شام کے عمر بہاء الامیری جیسے جید سفارت کاروں کے ہاں جا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ پھر مصری سفارت خانے جا کر پھانسی کی سزا ختم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ جلوس نکالا اور پلے کارڈ لے کر مختلف شاہراہوں پر گھنٹوں کھڑے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ فوجی عدالت سے سزا سنائے جانے کے بعد، ایک شام ہم ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ریڈیو نے یہ مختصر سی خبر سنائی کہ ''قاہرہ میں 'اخوان المسلمون' کے چھے افراد کو پھانسی دے دی گئی ہے''۔ اس لمحے ہم پر غم و اندوہ کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا اور جذبات کی تپش کا جو عالم تھا، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ سادات کے منہ پر احتجاج کرنے سے میرے رنج و الم کا کچھ تو مداوا ہوا اور کچھ تربیت بھی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ راہِ حق میں 'اخوانی بھائیوں' کی شہادتوں اور قربانیوں کو قبول فرمائے اور اس دعوتِ حق کو برگ و بار عطا کرے۔

مسعود عالم ندوی، ایک محسن

مناسب ہوگا کہ یہاں مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا کچھ ذکر ہو جائے۔ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد پاس ہونے کے بعد وہ عراق اور حجاز مقدس کے دورے پر چلے گئے تھے۔ اس طویل سفر کے بعد واپس آئے تو ۱۹۵۰ء میں میری ان سے ملاقات ہوئی، جس کا تاثر بڑا خوش گوار تھا۔ پھر وہ جب بھی کراچی آتے تو ان سے ملاقات ہوتی۔ ان ملاقاتوں میں انھوں نے میرے ساتھ بہت محبت اور شفقت کا برتاؤ رکھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً انیس، بیس سال کی تھی۔ یہ ایسی عمر ہے کہ جس میں کسی کی بھی نظرِ محبت قریب لاتی ہے، چنانچہ میں بھی

اپنے آپ کو ان سے بہت قریب محسوس کرنے لگا____

ان کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا تھا، کہ وہ بڑے سخت مزاج ہیں۔ میرا پہلا مشاہدہ کچھ ایسا ہی تھا، جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جب پہلی مرتبہ آرام باغ، لوٹیا بلڈنگ میں جماعت اسلامی کے دفتر پہنچا تو وہاں اجلاس میں 'قرارداد مقاصد' کے حوالے سے بحث کے دوران مسعود عالم صاحب تیز اور تلخ لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ان کے برعکس قاضی حمیداللہ صاحب بڑی نرمی سے توسع اور تحمل کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ یہ تو پہلا تاثر تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے، میرے چھوٹے بھائی حسن قاسم مراد (کراچی یونی ورسٹی میں تاریخ اسلام کے پروفیسر) جمعیت کے بڑے اچھے کارکن تھے۔ مسعود صاحب اس فکر میں تھے کہ عربی کے کاموں میں محمد عاصم الحداد صاحب کا ایک ساتھی تیار کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ عاصم صاحب عرب دنیا میں جا کر تحریک کے کام کی نمایندگی کریں۔ انھوں نے مختلف ذرائع سے اپنی اس طلب کا اظہار کیا تھا، کہ ایک ایسا نوجوان ہو، جو ان کے پاس رہے، عربی سیکھے، عربی پڑھے اور پھر دارالعروبہ کے کام کو سنبھالے۔ حسن قاسم کو اس کی بہت طلب ہوئی کہ ''ہاں میں چلا جاتا ہوں، تاکہ اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دوں''۔

اگرچہ میں، قاسم کا مشیر نہیں تھا، تاہم ظفر اسحاق انصاری اور خورشید بھائی سے ان کے زیادہ قریبی تعلقات تھے۔ ان دونوں ساتھیوں کا خیال تھا کہ ''مسعود عالم ندوی صاحب کی سخت مزاجی کے ساتھ قاسم کا گزارا نہیں ہوگا۔ یہ وہاں سے تنگ دل اور دل برداشتہ ہو کر واپس آئیں گے''۔ میرے خیال میں یہ بہت زیادہ غلط بات بھی نہیں تھی۔ لیکن بعد میں قاسم، اسلامی تحریک سے فکر و عمل کے اعتبار سے دُور ہوتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر آج تک بارہا دل میں خیال آتا ہے، کہ شاید قاسم وہاں ٹک ہی جاتے تو بہتر ہوتا۔ بہرحال جیسا اللہ کو منظور ہو، ویسا ہی ہوتا ہے۔ درحقیقت مسعود صاحب کے بارے میں اس سے پہلے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ شفیق، مربّی اور محبت کرنے والے انسان ہوں گے۔ لیکن جب قریب

ہونے کا موقع ملا، اپنے ساتھ ان کا برتاؤ دیکھا تو وہ سارا منفی تاثر ختم ہوگیا، بلکہ اس کی جگہ پُرکشش محبت نے لے لی۔ عمر میں کم ہونے کے باوجود وہ مجھے اکرام سے نوازتے، اور ہر موضوع پر بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔

مسعود صاحب سے ہماری صحبتوں کا تقریباً وہ زمانہ ہے، جب مصری حکمرانوں اور 'اخوان المسلمون' کے درمیان کش مکش بڑھتی جارہی تھی۔ خود 'اخوان المسلمون' میں، حسن الہضیبی صاحب کو مرشد عام بنائے جانے پر اختلاف تھا۔ اختلاف کی یہ خبریں ہمارے لیے سخت تشویش کا باعث تھیں۔ ایک بار جب مسعود صاحب میرے یا سلطان صاحب کے گھر پر قیام پذیر تھے، اسی دوران وہ ایک روز خورشید بھائی کے گھر پر بھی آئے۔ خورشید بھائی، ظفر اسحاق اور غالباً انوار الحق بھی وہاں موجود تھے۔ یہ نومبر ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔

وہاں پر میں نے ان کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ''وہ جماعتیں جو خالص اللہ کے نام پر جمع ہوتی ہیں، ان کے لوگوں میں اتنا افتراق اور اختلاف کیوں پیدا ہوتا ہے؟'' جواب دینے سے پہلے ان کے کہنے پر میں نے کمرے کی سٹکنی لگا دی۔ پھر فرمایا کہ ''مجھے جن دو چار نوجوانوں پر اعتماد ہے، وہ آپ لوگ ہیں۔ اس کے بعد وہ کہنے لگے: ''دیکھو، میں تمھیں ایک بات بتاؤں، مگر اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا''۔ اللہ کا شکر ہے اسے میں نے ہمیشہ یاد رکھا ہے، اگرچہ بعد میں اس موضوع پر مطالعہ اور سوچ بھی معاون رہے ہیں۔ ان کی یہ بات آج تک یاد ہے۔ کہنے لگے: ''سنو، جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ میں، میں لیڈر آف دی اپوزیشن ہوں''۔ اس روز انھوں نے مجھ سے جماعت کے اندر فکر و نظر کے اختلافات کے بارے میں کئی ایسی باتیں کیں، جو میری عمر کے لحاظ سے وہی آدمی کر سکتا ہے، جو یہ بھروسا اور اعتماد رکھتا ہو کہ وہ سننے والے کو ہضم ہو جائیں گی۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ''مولانا مودودی کا مزاج ذرا تنہائی پسند ہے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کی رائے میں وہ کچھ تھوڑا سا اشرافی مزاج رکھتے ہیں۔ داعی تحریک ہوتے ہوئے جس طرح انھیں افراد میں گھل مل جانا چاہیے، وہ ایسا نہیں کر پاتے''۔ مسعود صاحب کی طبیعت میں

جو کچھ تھوڑا سا اضطراب تھا، وہ مولانا مودودی کے ساتھ ان کی خط و کتابت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔اس خط و کتابت کو خطوطِ مودودی جلد اوّل میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور سلیم منصور خالد نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

خیر، وہ کہنے لگے کہ ''ہر شوریٰ میں، مَیں لیڈر آف دی اپوزیشن ہوتا ہوں، اور عموماً میری رائے مولانا مودودی کی رائے کے خلاف ہوتی ہے۔ 'قراردادِ مقاصد' کے بارے میں مجھے شدید ذہنی تحفظات تھے، مگر اس بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی رائے منوا رہے ہیں''۔ پھر فرمایا کہ ''بحث میں ہمیشہ میں ہی ہارتا ہوں اور مولانا مودودی ہمیشہ جیتتے ہیں، اور انھیں جیتنا ہی چاہیے۔اس لیے کہ لوگ ان کی دعوت پر جمع ہوئے ہیں اور میں ان کے اس داعیانہ مقام کو بھی پہچانتا ہوں، لیکن یہ کہ جس دن میں اس بات پر اصرار کروں گا، کہ نہیں میری ہی رائے چلنا چاہیے، باوجود اس کے کہ جماعت میں میری رائے نہ مانی جائے یا میں ہار جاؤں، مگر وہ اپنی بات پر اڑ جاؤں، اس دن جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے گا، ہوسکتا ہے کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں، اس لیے تم یاد رکھنا کہ بہرحال بات پوری دلیل سے کرنا، مگر جماعت جو فیصلہ کرلے اس سے خواہ مخواہ ٹکرانے کی کوشش نہ کرنا''۔

ان کے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ ''رائے کچھ بھی رکھو، اس کو مناسب پیرائے میں بلاکم و کاست پیش کرو، خواہ لیڈر آف دی اپوزیشن رہو، لیکن یہ کہ ہار جاؤ تو پھر بھی جماعت کو اس رائے پر چلنے دو، جس رائے کو جماعت قبول کرلے''۔

انھوں نے مولانا مودودی کی بہت تعریف کی، مگر بس، بہت زیادہ کھلنے ملنے کی کمی کا ذکر بھی کیا۔ ویسے اس بات کو ہم جمعیت والے بھی محسوس کرتے تھے، کیونکہ ہم نے حسن البناء شہید کی اپنائیت اور یگانگت کا جو تذکرہ 'اخوان' سے سنا تھا، اس سے مولانا کا موازنہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ البتہ چودھری غلام محمد صاحب میں بڑی اپنائیت تھی۔ ایک دفعہ ظفر اسحاق نے پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا مودودی کو خط لکھ کر اس احساس کا

ذکر بھی کیا تھا۔ حسن البناء کی مثال دے کر کہا تھا، کہ اس میں سے کچھ آپ اختیار کریں۔ تاہم مولانا نے کچھ اس طرح جواب دیا کہ: ''حسن البناء مودودی نہیں بن سکتے، اور میں حسن البناء نہیں بن سکتا''۔

میں یہ بات ان پر تنقید کے نقطۂ نظر سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا مزاج علمی تھا اور علمی مزاج کی مخصوص فضا سے نکل کر انھوں نے تحریک چلائی، اس کو سنبھالا، اس کو ترقی دی، اتنا بڑھایا کہ وہ اب تک چل رہی ہے۔ اپنی جگہ یہ ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک یہ بھی عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے حکمت، بالغ نظری، ایثار اور اعتدال کے ساتھ اتنے لوگوں کو جوڑے رکھا۔ بلاشبہہ کچھ لوگ الگ بھی ہوئے جو بڑے قابلِ قدر افراد تھے، مگر اس سے مجموعی طور پر ان کی عظمت اور محنت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

جس زمانے میں ہم اجتماعات میں شرکت کے لیے لاہور جاتے تھے۔ اس دوران غالباً ۵۳ء کی بات ہے، ان کے ہاں ان کا سب سے چھوٹا بیٹا خالد فاروق پیدا ہوا تھا۔ ہم لوگ ان کے سر ہوگئے کہ ''ہم کراچی والے آپ کے ہاں بیٹے کی خوشی میں کھانا کھائیں''۔ ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے بہت آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا ہو۔ بہرحال انھوں نے ہماری دعوت کر دی۔ میں اور خورشید، ظفر اسحاق اور کراچی کے چار پانچ لوگ تھے۔ ہم نے ان کے گھر ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ ان سے دل چسپ بات چیت ہوتی رہی۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے ایسی نجی قسم کی محفل، نشۂ محبت والفت تیز تر کرنے کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب میں ڈھاکہ جماعت کا امیر تھا، تو مولانا مودودی اس دوران کئی مرتبہ ڈھاکہ آئے تھے۔ وہ ڈھاکہ میں جماعت کے کام کو بے انتہا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ خورشید بھائی نے مجھے ان کی روایت سنائی کہ ''بھائی، جماعت کا کام تو ڈھاکہ 'شوہر' میں ہو رہا ہے'' (شہر کو انھوں نے ذرا بنگالی لہجے میں ''شوہر'' کہا)۔ ڈھاکہ میں جماعت کا کام اپنی رفتار اور گہرائی کے لحاظ سے اچھا تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی خود مجھ سے براہِ راست نہیں کہا کہ

''کام اچھا ہو رہا ہے''۔ میں سوچتا ہوں کہ اس عمر میں مولانا محترم کی جانب سے تعریف کے دو کلمات بھی میری ہمت افزائی کے لیے بہت بڑی چیز ہوتے۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ویسے جو لوگ ان سے قریب رہے، وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ میں ان سے بہت دُور رہا ہوں، اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ دوسروں کی بھی یہی رائے ہو۔

مسعود عالم ندوی صاحب کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان کا انتقال بھی میرے ہی کمرے میں ہوا۔ کالونی میں ہمارے گھر پر، میرا جو کمرہ جمعیت کا مرکزی دفتر رہا، بعد میں وہ اہلِ جمعیت کا بھی مسکن تھا۔ اگرچہ میں جمعیت سے فارغ ہو چکا تھا، لیکن وہ اس وقت بھی اہلِ جمعیت اور میرے آرام کا گوشہ تھا۔ یہ مارچ ۵۴ء کی بات ہے، مولانا مودودی جیل میں تھے، ان دنوں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب قائم مقام امیر جماعت تھے۔ کالونی میں ہمارے گھر سے تقریباً متصل ایک احاطے میں خیمہ لگا ہوا تھا جہاں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس چل رہا تھا۔ مسعود عالم صاحب دمے کے پرانے مریض تھے، اس لیے انھیں خاصی احتیاط اور آرام کی ضرورت تھی۔ ان کا قیام میرے اسی کمرے میں تھا اور وہ میرے بستر پر ہی سوتے تھے۔ اسی اجلاس کے دوران ۱۶ مارچ کو عشاء کے وقت ان پر دمے کا شدید دورہ پڑا۔ انھوں نے ہچکی لی اور بے ہوش ہو گئے۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو ہم انھیں اپنے گھر لے آئے۔ وہ بڑے نڈھال تھے۔ میں نے بھاگ کر ڈاکٹر کو بلایا، مگر ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی کہا: ''یہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں''۔ ان کا انتقال میرے لیے سخت صدمے کا باعث تھا۔ وہ ساری رات ان کے قریب بیٹھ کر گزاری اور صبح نماز جنازہ ہوئی اور پنجابی سوداگران دہلی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ اس طرح اس مادی دنیا میں ان سے ہر تعلق اختتام کو پہنچا۔

ان کے انتقال پر مولانا مودودی نے بڑے خوب صورت پیرائے میں اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''مولانا مسعود عالم صاحب کی وفات پر میں اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ شاید جسم کا بازو ٹوٹنے کی بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی، جتنی روح کے اس بازو کے ٹوٹ جانے پر محسوس ہو رہی ہے'' ـــــ خود ہمارا بھی یہی حال تھا۔

انجینیرنگ کالج میں لیکچررشپ

۱۹۵۵ء میں، مَیں کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں کام کر رہا تھا۔ این ای ڈی کالج کے پرانے اساتذہ، جو جمعیت کی مدد کرتے تھے اور اعانت بھی دیتے تھے، ان میں ابوحنیف صاحب، عزیز الحسن خان صاحب اور تیسرے کا نام مجھے یاد نہیں، یہ تینوں اچانک ایک دن دوپہر کے وقت میرے آفس میں آئے۔ ان کے پاس محکمہ تعلیم کا ایک پروانہ تھا۔ جس میں این ای ڈی انجینیر نگ کالج میں بطور لیکچرر میری تقرری کا اعلان تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ پرنسپل نے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ تدریسی اسٹاف نہیں مل رہا، لوگ پڑھانے کے لیے آنا ہی نہیں چاہتے۔ فرسٹ کلاس فرسٹ ہوتے ہوئے لیکچرر کے لیے میری درخواست پہلے سے وہاں موجود تھی، چنانچہ محکمہ تعلیم نے مجھے لیکچرر مقرر کر کے تنخواہ ساڑھے تین سو روپے مقرر کر دی۔ آنے والے اساتذہ کا کہنا تھا کہ ''کالج میں آجائیں''۔ مجھے اس وقت ساڑھے چار سو مل رہے تھے۔ ساڑھے چار سو سے ساڑھے تین سو پر جانا ایسے ہی تھا، جیسا آج کل کوئی آدمی ۲۵ ہزار چھوڑ کر ۱۶ ہزار پر چلا جائے۔

یہ تو اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا، لیکن اہم تر بات یہ تھی، کہ کیا میں سرکاری ملازمت میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ میں نے ان سے کہا کہ ''اچھا سوچوں گا، مشورہ کروں گا، اور پھر آپ کو بتاؤں گا۔ میرا دل وہاں جانے کو چاہتا ہے لیکن سوچنا تو پڑے گا''۔

چنانچہ میں سیدھا چودھری غلام محمد صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ''یہ پیش کش آئی ہے اور مجھے شروع ہی سے شوق تھا کہ پڑھاؤں۔ اس طرح سے فرصت بھی میسر آئے گی اور وقت ملے گا، جس میں جماعت اور تحریک کا کام کر سکوں گا اور آپ نے جمعیت کا کام سونپا، اس میں بھی استاد ہونا مفید ہوگا''۔ یہ بھی کہا کہ ''ان حالات میں سرکاری ملازمت کے ساتھ جماعت کی رکنیت نہیں چل سکے گی، اس لیے اگر آپ مجھے جلد رکن بنالیں گے، تو پھر مجھے یہ ملازمت چھوڑنا ہوگی اور اگر آپ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ کالج میں

پڑھانے کے دوران مجھے جمعیت کے ساتھ ربط رکھنا چاہیے، تو پھر فی الحال رکنیت جماعت کے بغیر ہی اس ذمہ داری کو قبول کر لیتا ہوں''۔

چودھری صاحب نے میری ساری بات سن کر خوشی سے اجازت دے دی، کہ ''ٹھیک ہے، لیکچررشپ اختیار کرلو''۔ یہاں پر یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں، کہ تحریک کے بارے میں اپنے تعلق سے متعلق فیصلے تو میں نے اپنی صواب دید پر کیے، تاہم ان کے لیے چودھری صاحب سے مشورہ ضرور کیا کرتا تھا۔

اس معاملے میں، مَیں نے چودھری غلام محمد صاحب کو بڑا وسیع النظر اور بڑا وسیع القلب پایا۔ چودھری صاحب کے برعکس جماعت کے بعض ذمہ داران کو عموماً اپنی مرضی یا دستوری حکم سے کام چلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ لیکن چودھری صاحب تحریکی معاملات پر long range view (طویل المیعاد پیش منظر) رکھتے تھے۔ ان کی دُور اندیش نظر نے اندازہ کیا ہوگا کہ یہ اچھا موقع ہے، جس میں انجینیرنگ کالج میں ہمارا ایک ساتھی کام کر سکے گا اور تحریک کے کام میں بھی معاونت کرے گا۔ اسی لیے انھوں نے کہا: ''ٹھیک ہے لیکچررشپ اختیار کرلو''۔ اگر وہ یہ بات نہ کہتے تو میں رکنیت جماعت کو مؤخر نہ کرتا اور مغربی پاکستان ہی میں جماعت میں باقاعدہ شامل ہوجاتا۔ قانونی تعلق قائم نہ کرنے کے باوجود تحریک سے گہرا قلبی تعلق رہا اور ایک مختلف میدان میں جماعت کے کام کی زیادہ بہتر خدمت کا موقع ملا۔

اس طرح اگست ۵۵ء میں، میں نے این ای ڈی انجینیرنگ کالج میں لیکچررشپ اختیار کی، جس سے اور زیادہ فرصت مل گئی۔ پڑھانے کا شوق تھا اور یہ خیال تھا کہ اچھا پڑھا سکوں گا۔ ہفتے کے دوران پندرہ سولہ لیکچر دینا پڑتے تھے، مگر میں نے کوشش کر کے کالج میں اپنا ٹائم ٹیبل ایسا بنوایا، کہ یہ سارے لیکچر تین دن میں رکھوا لیے تھے، یعنی روزانہ پانچ پانچ لیکچر۔ ان کے علاوہ بعض پریکٹیکل ہوتے اور کچھ فیلڈ ورک میں شمار ہوتے تھے۔ بعض اوقات میں صبح سے کلاسیں لینا شروع کرتا، تو لنچ تک بالکل نڈھال ہوکر سٹاف روم میں آ بیٹھتا تھا۔

اس خود اختیاری مشقت کا مجھے یہ فائدہ ہوتا، کہ دو دن فارغ مل جاتے تھے۔

اس زمانے میں یہ پابندی نہیں تھی کہ اگر کوئی کلاس نہیں تو پھر بھی آپ جا کر دفتر میں ضرور حاضری لگائیں۔ چھٹی کے دن گھر پر گزارتا تھا، پڑھتا تھا کہ یہ فرصت کا بڑا قیمتی زمانہ مل گیا تھا۔ جمعیت سے ربط و تعلق میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ یہ تو دن اور رات کا تعلق تھا۔ اس دوران تربیت کی ذمہ داری رہی۔ این ای ڈی میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک میں نے پڑھایا۔ مگر نام کے ساتھ لیکچرر یا پروفیسر لگانا کچھ پسند نہ آیا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، کہ جلد ہی میرا شمار کالج کے چند مقبول اساتذہ میں ہونے لگا۔ یہ مقبولیت: اساتذہ، انتظامیہ اور طلبہ میں تحریکی مقاصد کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

پاک نیوی کے ساتھ

دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح پاکستان نیوی (پاک بحریہ) میں بھی جماعت کی دعوت کے حامی لوگ موجود تھے۔

اگرچہ ان میں باقاعدہ ارکانِ جماعت نہ تھے، تاہم چند رفقا بہت فعال اور قریبی تعلق رکھتے تھے۔ نیوی کی 'بہادر اسٹیبلشمنٹ' منوڑا وہ جگہ تھی، جہاں پر نیوی کے لوگوں کو پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی تھی۔ وہاں کمانڈر سرور صاحب (جو اس وقت کمانڈر نہیں تھے) ہمارے فعال اور ذمہ دار ساتھی تھے۔ انھوں نے مجھے کہا کہ ''یہاں آ کر جمعہ پڑھایا کریں''۔ اب میں جمعیت میں رہا نہیں تھا، اسی طرح جماعت کا رکن بھی نہیں تھا اور اس وقت این ای ڈی کالج میں لیکچرر تھا۔ جماعت میں ہوتا تو شاید رکاوٹ ہوتی کہ جماعت کا آدمی کیوں جمعہ پڑھا رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھی کسی ذہنی دباؤ کے بغیر مجھے وہاں لے جانے کا فیصلہ کیا۔

جمعہ کے روز میں لانچ میں بیٹھ کر کیماڑی سے منوڑا جایا کرتا تھا۔ وہاں پر کمانڈر فضل الٰہی صاحب (آج کل لاہور جماعت کے رکن اور حلقے کے ناظم) کے گھر پر میرا کھانا ہوتا، کیوں کہ کالج سے سیدھا وہاں جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد جمعے کی نماز پڑھاتا۔ وہاں پر آہستہ آہستہ کمانڈنگ آفیسر اور دوسرے افسروں سے تعارف ہوا۔ یہ سلسلہ بہت کامیابی سے چلتا رہا۔

اور غالباً میرے امریکا جانے تک برقرار رہا۔ یوں نیوی میں ایک تحریکی ربط کا ذریعہ بنا۔ میرے لیے بیرونی حلقے میں کام کا یہ ایک یادگار حوالہ ہے۔

ٹیوشن پڑھانا

این ای ڈی انجینیرنگ کالج میں جانے کا فیصلہ اللہ کے فضل سے ایک صحیح فیصلہ ثابت ہوا۔ اگرچہ میری تنخواہ ایک سو روپے کم ہوگئی۔ اس زمانے میں ایک سو روپے کی کمی بہت بڑی بات تھی۔ گھر کی معاشی حالت بھی بہت زیادہ پتلی تھی۔ لیکن میں نے اس ملازمت کو اس لحاظ سے خوشی خوشی قبول کرلیا تھا کہ دین کا تقاضا یہ ہے کہ اس ملازمت کو اختیار کروں، باقی اللہ اسباب پیدا کرے گا۔

ابھی میں نے لیکچرشپ شروع ہی کی تھی کہ میرے پاس دولڑکے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ''ہم انسٹی ٹیوٹ آف سول انجینیرز کا امتحان دے رہے ہیں۔ (انسٹی ٹیوٹ آف سول انجینیرز پروفیشنل لوگوں کی تنظیم تھی اور اس کے امتحانات کو ڈگری کے مساوی سمجھا جاتا تھا)۔ سٹرکچرل انجینیرنگ میں ہم لوگ کامیاب نہیں ہو رہے۔ سنا ہے آپ اچھا پڑھاتے ہیں، اس لیے آپ ہمیں پڑھا دیں''۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے آپ ہفتے میں تین دن آجائیں۔ ایک گھنٹہ وقت نکال لوں گا۔ لیکن فی کس پچھتر روپے لوں گا، یعنی دونوں کے ایک سو پچاس روپے''۔ یہ ڈیڑھ سو روپے میری مہینے بھر کی آدھی تنخواہ کے برابر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''یہ تو ہمارے لیے بہت زیادہ ہیں، ہم نہیں دے سکتے''۔ میں نے کہا کہ ''میں اپنے وقت کی قیمت کم نہیں لوں گا، ہاں البتہ اگر یہ نہیں تو میں آپ کو خوشی سے مفت پڑھادوں گا، بجائے اس کے کہ کم قیمت پر پڑھاؤں۔ مفت پڑھانے کا مجھے اجر ملے گا، لیکن میں سستے داموں پڑھاؤں، اصولی طور پر یہ کام نہیں کرسکتا''۔ بعد میں بھی میرا ہمیشہ یہی اصول رہا کہ آدمی مفت میں کام کرے، یا جب کرے تو پھر اپنے بھرپور معاوضے پر کرے۔ انھوں نے کہا کہ ''ٹھیک ہے''۔

اس کے بعد انھوں نے آکر پڑھنا شروع کردیا۔ جب پہلا مہینہ پورا ہوا تو میں ان کو

مفت سمجھ کر پڑھا رہا تھا، مگر مہینہ ختم ہوتے ہی انھوں نے میرے ہاتھ پر ایک سو پچاس روپے رکھ دیے۔ شاید ان کو خود محسوس ہوا کہ وہ مفت کیوں پڑھیں۔ پھر اللہ کے فضل سے وہ دونوں پاس ہوگئے اور پاس ہونے کے بعد دونوں جماعت اسلامی سے متعلق بھی ہوگئے۔ اس کے بعد ان کا مجھ سے تعلق تو نہیں رہا، لیکن جب میں بھارت کی قید سے واپس آیا، اور مارچ ۷۴ء میں لاہور منعقد ہونے والے اجتماع ارکان میں گیا تو وہ دونوں آ کر ملے۔ اس وقت وہ جماعت کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے بیٹے بہاول پور اسلامی یونی ورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر بھی ہیں۔ حالانکہ میں نے سوائے پڑھانے کے ان سے خاص طور پر کوئی دعوتی گفتگو نہیں کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میں نے معاوضے کی کمی کے ساتھ جو ملازمت قبول کی تھی، اس رازق نے وہ کمی بہت جلد پوری کر دی۔ میرا یہ تجربہ بعد میں بھی زندگی بھر رہا ہے۔

نظامِ اسرہ کا خاتمہ

ہم نے سعید رمضان سے اخوان کے 'نظامِ اسرہ' کا ذکر سنا تھا، لیکن وہاں جا کر اس کا مطالعہ نہیں کیا تھا کہ یہ نظام کیسے چلتا ہے۔ بس ہمارے ذہن میں ایک تصور سا تھا، جس نے ہم کو اپیل کیا تھا، کہ کارکنوں اور حامیوں کے پانچ، چھے افراد پر مشتمل چھوٹے چھوٹے مستقل گروپ قائم کیے، جنھیں 'اسرہ' کہا جاتا۔ ہم رہایشی حلقہ جات اور کالجوں میں ان کی بنیاد پر بڑی مضبوط بنیاد بننے کے امکانات محسوس کرتے تھے۔ اللہ کا نام لے کر ہم نے اسے کراچی جمعیت میں متعارف کرایا تھا۔ ہر رہایشی حلقے یا تعلیمی ادارے میں 'اسرہ جات' قائم کر کے انھیں صحابہ کرامؓ کے ناموں سے موسوم کیا۔ 'اسرہ جات' کے ارکان اپنے تمام سماجی تعلقات، تربیت، تنظیمی ذمہ داریاں، سرگرمیاں، مطالعہ اور رپورٹیں، یہ چیزیں اسی چھوٹے سے گروپ میں بڑی خوبی سے چلا رہے تھے۔ یہ نظام پورے کراچی میں قائم ہوگیا اور بہت کامیابی کے ساتھ چلنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔

لیکن اسرار صاحب کراچی میں بھی صور پھونک گئے تھے، کہ ''یہ لوگ 'اخوان

المسلمون' سے متاثر ہیں اور یہ انھی کا نظام ہے"۔ میرے خیال میں فی الواقع یہ کوئی اعتراض نہیں تھا۔ البتہ ان دنوں مصر میں 'اخوان المسلمون' پر داروگیر کا سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس چیز نے کچھ لوگوں کے ذہنوں میں پائے جانے والے اخوان گریز تصور میں وزن پیدا کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ قوتیں جن کو تحریک کا راستہ روکنا تھا، وہ ویسے بھی مصروف تھیں اور آج بھی مصروفِ کار ہیں۔ بہرحال ہر فرد کی بات پر یقین کرنے والے موجود تو ہوتے ہیں، جن کی باتوں کا ان پر اثر بھی ہوتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ "اس نظامِ اسرہ میں لوگ دعوت کے بجاے اپنی ذاتی یا داخلی اصلاح میں بہت زیادہ مصروف ہوگئے ہیں، اپنے برادرانہ تعلقات میں مگن ہوگئے ہیں اور یہ چیز ایک اجتماعی تحریک کے لیے موزوں نہیں ہے"۔ لیکن میرے خیال میں تھوڑی سی کوشش سے اس کی اصلاح ہوسکتی تھی، یا آج بھی اگر اسے اختیار کیا جائے تو اصلاح کا پورا امکان موجود ہے۔ اور تیسرا یہ کہ "اس سے جمعیت کا کام بھی متاثر ہو رہا ہے"۔

یہ قضیہ چلتا رہا اور شوریٰ کے دو اجلاسوں میں اس پر بحث بھی ہوئی۔ ان دنوں کراچی جمعیت کے ناظم شاید محمد عمر چھاپرا تھے اور ناظم اعلیٰ حسین خان صاحب تھے۔ یہ نظام کراچی کی حد تک قائم تھا۔ اس لیے پہلے کراچی کی شوریٰ میں اور پھر اجتماع ارکان میں اس پر بحث ہوئی۔ چونکہ رکن نہیں تھا، اس لیے ان اجلاسوں میں خصوصی دعوت پر میں بھی شریک ہوا۔ جو لوگ نظامِ اسرہ کے مخالف تھے، انھوں نے سخت اعتراض کیے۔ اگرچہ میں ان سب اعتراضات کی صداقت کا قائل نہیں تھا۔ لیکن میرا اپنا انداز ہے کہ تحریک کے اندر غیرضروری جھگڑوں، نزاعات اور ہنگاموں کو پروان نہیں چڑھانا چاہیے۔ ایسے ایڈونچر یا ایسی مہم جوئی مول نہیں لینی چاہیے کہ جس کے نتیجے میں کام، بہتری کے بجائے، خرابی، بددلی یا گروہ بندی یا وضاحت در وضاحت کی دلدل میں پھنس کر رہ جائے۔ جب بحث نے طول پکڑا اور اسے ختم کرنے کا فیصلہ ہوا تو میں نے یہ ذمہ داری لے لی کہ 'نظام اسرہ' کو بہ حسن وخوبی ختم کردوں گا۔

کافی سوچنے کے بعد میں نے طے کیا کہ اس خاتمے کے لیے اپنی گفتگو تحریری شکل میں پیش کروں گا۔ کاپی کے ۳۶ صفحات پر مشتمل یہ میری دوسری تحریر تھی۔ جس میں، مَیں نے تربیت کی اہمیت، ضرورت اور تصور کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''تربیت کے لیے نہ کسی لمبے چوڑے پروگرام کی ضرورت ہے اور نہ کسی مربوط نظام کی، تربیت کا اصل موضوع یا ہدف فرد ہے۔ فرد میں اگر مقصد کی لگن پائی جاتی ہے، احساسِ ذمہ داری کا وجود ہے، اور اخلاص کے ساتھ جدوجہد کا ذوق موجود ہے تو وہ صحیح راستے پر گام زن رہے گا۔ لیکن اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو آپ چاہے اس کو کتنے ہی درس اور کس قدر تقریریں سنا لیں، اس میں زندگی کی رَو نہیں دوڑ سکتی''۔

پھر میں نے تربیتی ذرائع اور طریقے کے بارے میں کہا تھا کہ ''یہ ذکر، نماز، نوافل، مطالعہ اور باہمی تعلقات وغیرہ، سب دعوت ہی کے کام ہیں''۔ کراچی کا اجتماع ہوا، جس میں تقریر پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ''تحریک کے کام میں اپنی جگہ کوئی مخصوص نظام اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر اس نظام کی وجہ سے ہمارے درمیان اتفاق نہیں پایا جاتا، تو ہم اس کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے بدلے کارکنوں کا یونٹ، متبادل نظام ہوگا۔ آپ جتنے کارکن بناتے جائیں گے وہ اس میں شامل ہوتے جائیں گے۔ البتہ وہ کام جاری رہیں، جو آپ اسرہ کے تحت کر رہے تھے''۔

یہ تقریر، میں نے بہت سنبھال کر رکھی تھی، مگر ڈھاکہ کے حادثے کی نذر ہوگئی۔ اس تقریر سے مجھے اس لیے بھی انس تھا کہ یہ جمعیت کے براہِ راست مشاہدے اور اس پر ہونے والے تربیتی تجربے کی خود احتسابی پر مبنی ایک بے لاگ روداد تھی۔ میرا آج بھی یہ احساس ہے کہ تربیت کے لیے محض تقریری پروگراموں کی بیساکھیاں وہ کام نہیں دے سکتیں، جو ایمان، آخرت میں اجر کی امید اور کمٹ منٹ کام کر سکتی ہے۔ اگر فرد میں یہ سدا بہار احساس پیدا کر دیا جائے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے کے بعد لازماً جواب دینا ہے تو سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ 'نظامِ اسرہ' کا قیام اور پھر اس کی بساط لپیٹنا ایک اہم واقعہ تھا۔

شادی

شادی کے بارے میں میرا یہ تصور ہے، کہ تعلیم مکمل ہو جائے اور ملازمت وغیرہ مل جائے تو شادی میں تاخیر نہیں کی جانی چاہیے۔ خواہ مخواہ ۲۹، ۳۰ سال کی عمر تک ملتوی کرنا کوئی مناسب بات نہیں۔ میری ملازمت شروع ہوئی، تو گھر میں رشتے وغیرہ دیکھنے کی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئیں۔ ہماری بڑی بہن [نویدہ خاتون] جو بھوپال میں تھیں، ان کے شوہر، وہاں پر جماعت اسلامی کے امیر سید ظہیر الحسن صاحب سے میل جول رکھتے تھے۔ ظہیر صاحب نے ان سے اپنی بیٹی کے حوالے سے رشتے کی بات کی۔ ہماری بہن نے یہ تجویز، خط میں لکھ کر ہماری والدہ کو روانہ کی۔

شادی کرنا بڑا اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی دوران ایک روز میں اپنے گھر، ظفر اسحاق کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ پانی لانے کے لیے اندر گیا۔ اماں نے روک لیا۔ ان کی عادت تھی کہ جو بات کرنا ہوتی، بلا تاخیر چلتے پھرتے کر لیا کرتی تھیں۔ انھوں نے بھوپال سے آنے والے خط اور اس میں مجوزہ رشتے کا ذکر کیا۔ میں نے ایک منٹ بھی سوچے بغیر کہہ دیا: ''ٹھیک ہے''۔ اور پانی کا گلاس لیے ظفر اسحاق کے پاس واپس آ گیا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ سید ظہیر الحسن صاحب کے ساتھ میں نے بطور کارکن کام کیا تھا۔ ان کے معزز، محترم اور دین پر عمل کرنے والے گھر سے نسبت کا طے ہونا، ہر اعتبار سے میرے لیے باعث اطمینان تھا۔

پھر میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں، بھوپال اپنے بڑے بھائی [فضل احمد سعید صاحب] اور ہمشیرہ کے ہاں گیا۔ ان دنوں سید ظہیر الحسن صاحب بھوپال کے اور انعام الرحمٰن خان صاحب اس پورے علاقے میں جماعت کے امیر تھے۔ ان سے بڑی خوش گوار ملاقاتیں رہیں۔

اگلے برس جون ۱۹۵۶ء کے دوران شادی کے لیے دوبارہ بھوپال گیا۔ یہ سفر کھوکھراپار کے راستے ریل گاڑی کے ذریعے ہوا تھا۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ خورشید بھائی اور میرے چھوٹے بھائی مسلم سجاد تھے۔ ظفر اسحاق بھی جانا چاہتے تھے، لیکن وہ جا نہیں سکے۔

۸ر جون کو عقد ہوا۔ جون ہی میں ہم واپس کراچی آ گئے۔

اس شادی کے میری ذاتی اور تحریکی زندگی پر بڑے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ اپنے بچوں کو دیکھ کر میں اللہ تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کرتا ہوں، کہ اس نے، میرے علم کی حد تک، انھیں صالح بنایا ہے اور دین کے لیے سرگرم بھی رکھا ہے۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے اعمال کی بنا پر نہ بھی بخشا جاؤں، تو امید رکھتا ہوں کہ آخرت میں شاید میری اولاد کے اعمال میری مدد کریں گے۔ اگرچہ انھیں جمعیت اور تحریک میں لانے کے لیے میں نے کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ البتہ ان بچوں نے میرے رویوں، سرگرمیوں اور میری دل چسپیوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہو تو الگ بات ہے۔ بلاشبہہ ان کے اندر دین کے لیے محبت پیدا کرنے میں براہِ راست حصہ میری اہلیہ کا ہے۔ جنھوں نے بڑی محنت کے ساتھ اس کٹھن کام کو سرانجام دیا، ان کی تربیت کی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت دی۔

'کارکنوں کے باہمی تعلقات'

اسلامی جمعیت طلبہ میں کام کرتے وقت ہی میرے خیال میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت و اہمیت پیدا ہوگئی تھی، جس میں ایک طرف تو اس محبت بھری فضا کو قائم و دائم رکھنا مطلوب تھا، جو اللہ کی محبت، دین سے لگاؤ اور اس کی راہ میں دن رات کام کرنے والوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔ دوسری جانب اس چیز کی ضرورت تھی، کہ ایک دینی تحریک کے طور پر، انسانوں کے باہم میل جول سے، صلاحیتوں کی کمی بیشی سے، اور مزاجوں کے اُتار چڑھاؤ سے فطری طور پر جو خرابیاں پیدا ہو جاتی تھیں، ان سے بچاؤ کے لیے اپنے دفاعی نظام کو مضبوط بنایا جائے۔ اس محبت کو پروان چڑھانے اور برگ و بار عطا کرنے کے لیے درحقیقت واحد چیز تو دین اسلام ہے، مگر میں نے سوچا کہ ایک ایسی کتاب ہونی چاہیے، جو دین اسلام ہی کے بنیادی سرچشموں، یعنی قرآن و سنت کی روشنی میں ان تعلقات کی باہم مضبوطی کا سامان مہیا کرے۔

عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد، جب انجینیرنگ کالج میں بطور معلم پڑھا رہا تھا،

ان دنوں کراچی جمعیت کا تربیتی نظام اور رہایشی حلقہ جات کا نظم میرے سپرد کیا گیا تھا۔ 'نظام اسرہ' کا پاکستانی ماڈل بھی، مَیں نے بنایا تھا، اور اسے ختم کرنے کا کام بھی مجھے ہی سونپا گیا تھا۔ 'نظامِ اسرہ' کے خاتمے کے وقت میں نے تربیت کی ضرورت اور اہمیت کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے، باہمی اخوت اور تعلقات کی پختگی کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ حسین خان صاحب ان دنوں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ تھے۔ حلقۂ احباب کی جانب سے میں جمعیت کی شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہوا۔ یہ کراچی یا مرکز کی شوریٰ کا اجلاس تھا۔ اس میں تجویز آئی کہ 'نظامِ اسرہ' کے خاتمے پر جمعیت کو اپنے حلقہ جات میں تربیتی نظام کی تشکیل و تعمیر کے لیے رہنما اصول مرتب کر کے دیے جائیں، اور اس مقصد کے لیے ایک رپورٹ مرتب کی جائے۔ میں نے ازخود یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔ رپورٹ لکھتے وقت ہی نہیں، بلکہ رپورٹ مرتب کر لینے کے بعد بھی میرے خیال میں یہ بات نہیں تھی کہ اسے شائع ہونا ہے۔

بہرحال یہ ۱۹۵۵ء کے رمضان کی بات ہے، میں نے رپورٹ مرتب کرنے کا کام شروع کیا۔ قرآن پاک کی آیات کو لکھ کر الگ کر لیا، احادیث نبویؐ کے مجموعے جمع کر لیے۔ حدیث میں بنیادی طور پر مشکوٰۃ شریف کو مآخذ کے طور پر سامنے رکھا۔ سب سے پہلے رپورٹ کا ایک خاکہ بنایا، بنیادی موضوعات کی تقسیم کے بعد اس کے ضروری ضمنی موضوعات لکھے۔ اس طرح ایک ڈھانچا بن گیا۔ پھر کچھ اصولی باتیں تحریر کیں۔ باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے والی اور کچھ انھیں کمزور کرنے والی باتیں لکھیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کے ساتھ اس کو مرتب کیا۔ اس میں استدلال کا حوالہ قرآن اور حدیث سے لیا۔ بہرحال رپورٹ مرتب کر کے جمعیت کے ناظم اعلیٰ حسین خان صاحب کے سپرد کر دی۔ جیسا کہ میری عادت ہے کہ تفویض شدہ کام پورا کر کے اس کے بارے میں بے فکر ہو جاتا ہوں، کہ اب اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ یہی معاملہ اس رپورٹ کے ساتھ بھی تھا۔

حسین خان، لاہور جاتے وقت وہ رپورٹ اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے ایک نظر ڈالنے کے لیے اسے مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے سپرد کیا۔ ورق گردانی کے

بعد انھوں نے اسے پسند کیا اور تسلی سے پڑھنے کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ حسین خان تو وہاں سے آگے دورے پر چلے گئے۔ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کی سہولت بھی نہیں تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے لاہور لے کر گئے ہیں۔ میں وہ رپورٹ دے کر بھول گیا تھا، کہ اب کہاں ہے؟ــــ جنوری ۱۹۵۷ء کا ترجمان القرآن آیا تو اس میں رپورٹ کی پہلی قسط 'کارکنوں کے باہمی تعلقات' کے عنوان سے چھپی ہوئی تھی۔ اپنی تحریر کو ترجمان میں چھپا ہوا دیکھ کر جو خوشی اور مسرت ہوئی، اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ ترجمان میں چھپنا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس وقت تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی اس کی ادارت کا بار بھی اٹھانا پڑے گا۔

اس کی قسطیں چھپ گئیں، تو کچھ عرصہ بعد جب میں امریکا میں تھا، خورشید بھائی نے دل چسپی لی اور چودھری غلام محمد صاحب نے اسے اپنے اشاعتی ادارے 'مکتبہ چراغِ راہ' کی جانب سے کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ میں نے اس کتاب کا انتساب سعید رمضان کے نام کیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ باہمی تعلقات، محبت اور آداب کی کیفیات کو ہم نے سب سے زیادہ انھی سے سیکھا۔ اگرچہ جمعیت میں اس فضا کو پروان چڑھانے کے لیے ظفر اسحاق انصاری، عبداللہ جعفر صدیقی اور خورشید بھائی جیسے رفقا کا بھی بڑا ہاتھ تھا، تاہم بنیادی طور پر میں نے یہ بات جماعت کے کسی فرد کے بجائے سعید رمضان ہی سے سیکھی ہے۔ اسے لکھا تو جمعیت ہی کے لیے تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد یہ جماعت اسلامی کے نصاب میں بھی شامل ہوگئی۔ میں نے یہ طے کیا کہ چاہے اس کو کسی دوسرے ادارے سے شائع کیا جائے، لیکن اس کی رائلٹی مستقل طور پر جمعیت ہی کے بیت المال میں جائے گی۔

اب تک اس کا ترجمہ بنگلہ، پشتو اور فارسی وغیرہ میں ہو چکا ہے۔ انگریزی میں ترجمہ کے لیے کئی احباب نے اصرار کیا، لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اس پر خاصی نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی نسبت آج میرے پاس معلومات بھی بہت زیادہ ہیں اور سوچ میں بھی بہرحال زیادہ وسعت آئی ہے۔ نیز جماعتی زندگی کے تجربات بھی خاصے وسیع ہوئے ہیں، یہ ساری چیزیں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن لانے میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

ویسے بھی اس کو محض تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے نہیں، بلکہ وسیع کر کے عام انسانوں کے لیے لکھنا چاہتا ہوں، اللہ کرے کہ یہ کرسکوں۔

غالباً ۸۵ء میں، مَیں اور خورشید بھائی جوہنسبرگ (جنوبی افریقہ) ایک پانچ روزہ تربیت گاہ میں شرکت کے لیے گئے۔ وہاں کی 'مسلم یوتھ موومنٹ' کے ساتھ ہمارے بڑے خوش گوار تعلقات ہیں۔ جمعہ کے روز، خطبہ سے پہلے اسی موضوع پر مجھے تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ خطاب انگریزی میں تھا۔ میں نے سورہ آل عمران کی آیات کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ سے آغاز کیا۔ اجتماع میں علما بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ تقریر کے بعد ایک عالم نے کہا، اگر ان کہی ہوئی باتوں پر ہی عمل کرلیں تو ہمارے سارے مسائل کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اسی طرح غالباً ۸۷ء کی بات ہے، جہاد افغانستان کے مجاہد رہنما گل بدین حکمت یار میرے گھر آئے اور کہنے لگے: ''میں آپ سے اپنے لڑکپن کے زمانے سے متعارف ہوں، جب میں نے باھمی تعلقات پڑھی تھی''۔

اس کتاب میں میری تحریر تو بہت کم ہے، زیادہ تر قرآن وحدیث کا متن اور ترجمہ ہے۔ ویسے بھی مجھے عبارت آرائی نہیں آتی۔ ریاضی اور سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے بلاوجہ طول کلامی اور رنگین بیانی کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین نے ابتدائی طور پر تحقیق وتخلیق کی تربیت کی اور اشاعت نے حوصلہ افزائی کی۔ یہ دراصل محنت اور یک سوئی کی تربیت تھی، جو بعد میں اعلیٰ تعلیم کے دوران اور پھر تحریک میں کام کرتے وقت بڑی مددگار ثابت ہوئی۔

مشرقی پاکستان کا پہلا سفر

۱۹۵۷ء میں پہلی بار میرا مشرقی پاکستان جانا ہوا۔ مشرقی پاکستان میں جمعیت کے کام کو بڑھانے کے لیے حسین خان صاحب نظامتِ اعلیٰ سے فارغ ہوئے اور صوبہ مشرقی پاکستان کے ناظم مقرر کیے گئے۔ وہ ایک باصلاحیت نوجوان اور اچھی سیاسی سوجھ کے مالک تھے۔ کام بڑی محنت سے کرتے تھے۔ انھوں نے وہاں جاکر کام کو آگے بڑھایا اور پندرہ روزہ

تربیت گاہ کا پروگرام بنایا جس میں مشرقی پاکستان سے جمعیت کی ساری لیڈرشپ شامل ہونے والی تھی۔

انھوں نے مجھے اور خورشید بھائی پر زور دیا کہ ہم دونوں ایک ہفتے کے لیے آئیں اور اس تربیت گاہ کو چلائیں۔ بہرحال مشرقی پاکستان سے میرا جذباتی تعلق تو ۱۹۵۱ء سے بنا ہی ہوا تھا اور میری منزل بھی وہی خطۂ پاکستان تھا۔ خورشید بھائی بھی جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ یہ جون کا مہینہ تھا۔ ہم دونوں ہوائی جہاز سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ خاصا رعایتی ٹکٹ ہوتا تھا۔ پانچ چھے گھنٹے کی پرواز تھی۔ ہم رات بھر سفر کر کے فجر کے بعد ۸ جون کو ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اُترے۔ یہ میرا دوسرا ہوائی سفر تھا۔ پہلا دہلی سے لاہور کا سفر تھا۔ سفر کے دوران رات کے وقت مجھے بہت تعجب ہوتا تھا کہ فضا میں جہاز کھڑا کیوں ہے؟ چاند چمک رہا تھا اور نیچے ریگستان تھا۔ بادل بھی اسی رخ پر جا رہے تھے۔ اس میں معلوم ہوتا کہ جہاز کھڑا ہے۔

جب ہم ڈھاکہ ہوائی اڈے پر اُترے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، موسم خوش گوار تھا۔ حسین خان، مشرقی پاکستان جمعیت کے ناظم سید محمد علی اور عبدالجبار کے علاوہ جمعیت کے ۲۵، ۳۰ پُرجوش کارکنان موجود تھے۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ مشرقی پاکستان کی دھرتی سے یہ میرا پہلا تعلق اور وہاں کے لوگوں سے براہِ راست تعارف تھا۔ وہاں سے ہم خواجہ محبوب الٰہی صاحب کے گھر پہنچے۔ ان کے والد محترم مقبول الٰہی صاحب اچھے تاجر اور کامیاب صنعت کار تھے۔

یہ تربیت گاہ ۹ رجون کی شام، جینگ روڈ پر 'نظام اسلام پارٹی' کے دفتر میں شروع ہوئی جس میں چالیس ساتھی شریک ہوئے۔ یہ تمام بنگالی طلبہ بڑے سادہ، سیدھے اور معمولی سے لباس میں تھے۔ ہم بنگلہ نہیں جانتے تھے، لیکن شریک ہونے والے طلبہ میں سے زیادہ تر مدرسہ عالیہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان میں اکثر اُردو جانتے تھے۔ ان میں کچھ طلبہ میٹرک، بی اے اور ایم اے کے طالب علم بھی تھے۔ آٹھ ساتھی ڈھاکہ سے اور

باقی ۳۲ شرکا ڈھاکہ سے باہر مختلف مقامات سے آ کر شریک ہوئے تھے۔

ہمارے پروگرام اُردو میں ہوتے تھے۔ قرآن، حدیث، سیرت اور تحریک سے متعلق روزانہ میرے پروگرام تھے۔ خورشید بھائی جمعیت کی دعوت، مقاصد، طریق کار کے علاوہ، اسلامی نظامِ حیات کے مختلف گوشوں، جدید تہذیب اور جدید علوم پر لیکچر دیتے تھے۔ تنظیم و تربیت کے کچھ پروگرام ہمارے مشترک تھے۔ یہ بڑا اچھا اور کامیاب پروگرام رہا۔ ہمارے میزبان ناظم ڈھاکہ جمعیت قربان علی تھے۔ ان کے علاوہ میزبانوں میں شاہ عبدالحنان بھی تھے جو بعد میں اسٹیٹ بنک کے ڈپٹی گورنر بنے۔ یہ تربیتی پروگرام مشرقی پاکستان کے رفقا کے لیے بڑی دل چسپ چیز تھی۔ کیمپ کا اختتام ۲۳ جون کو ہوا۔

تربیت گاہ کیمپ کے دوران اور اس کے بعد، مدرسوں میں آنے والے ساتھیوں نے بتایا، کہ ''دینی مدارس میں شیخ القرآن اور شیخ الحدیث ہمیں پڑھاتے ہیں۔ مگر قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے بارے میں وہ کوئی ایسی بات بتاتے ہی نہیں جیسی آپ بتاتے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کے درسوں میں گھنٹوں بیٹھتے ہیں۔ سیاست، معیشت، نفسیات اور انسانی تربیت کے بارے میں وہاں کچھ بات نہیں ہوتی، بلکہ چند مسائل پر پورا زور لگا دیا جاتا ہے۔ ایک مسلک کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دیا جاتا ہے''۔

میں نے انھیں بتایا کہ ''یہ چیز ہم نے اسی لٹریچر کو پڑھ کر حاصل کی ہے، جس کو وہ پڑھاتے ہیں۔ مولانا مودودی نے ایسی سوچ پیدا کی ہے کہ احادیث کے جس مجموعے کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں، وہ زندہ کلام کے طور پر ہمارے آج کے زندہ مسائل پر رہنمائی دیتا ہے۔ ایک ایک جملے کے اندر جہانِ معنی پایا جاتا ہے''۔ خیر، انھوں نے کیمپ کے دوران ڈھاکہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہال میں اجتماع عام بھی کیا، جہاں پر خورشید بھائی نے تین چار لیکچر دیے، جو اشتراکیت، سیکولرازم اور انتہا پسندی، مغربی تہذیب اور مسلم دنیا کے علاوہ پاکستان میں تحریکِ نسواں کے بارے میں تھے۔ ڈھاکہ یونی ورسٹی بند تھی، لیکن پھر بھی کافی تعداد میں

طلبہ سننے کے لیے آئے۔

اگلے روز ہم ڈھاکہ سے سلہٹ روانہ ہوئے۔ حسین خان اور قربان علی ہمارے ہمراہ تھے۔ سلہٹ کے جناح ہال میں ایک اجتماع عام ہوا۔ سلہٹ میں چائے کے باغات دیکھے۔ وہاں سے چٹاگانگ گئے، اور پھر باری سال پہنچے۔ باری سال میں اس روز بارش ہو رہی تھی۔ بی ایم کالج باری سال میں ہمارا پروگرام تھا۔ ہم کالج میں پہنچے تو دیکھا کہ لڑکے جوق در جوق پروگرام سننے کے لیے آرہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چھتری، تن پر معمولی سا کُرتا اور لنگی، اکثر ننگے پاؤں، یہ لڑکے بی اے یا ایم اے کے طالب علم تھے۔ انھیں دیکھ کر ہم حیرت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت یہ حیرت ختم ہوگئی، جب وہاں کے پڑھے لکھے اور بلند عہدوں پر فائز لوگوں کو بھی سادگی کا نمونہ پایا۔ کسی میں تکبر کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی تھی۔ باری سال کالج کے اساتذہ سے ان کے اسٹاف روم میں خطاب کیا۔ اس کے بعد ہم چٹاگانگ گئے۔ بڑی خوش گوار یادوں کے ساتھ ہمارا یہ دورہ ۲۹ رجون کو ختم ہوا۔ پھر بعد میں ہم ڈھاکہ واپس آئے۔ یکم جولائی کو میں واپس کراچی چلا آیا، اور خورشید بھائی ایک دو روز بعد آئے۔

اس تربیت گاہ اور دورے میں، میں نے اپنی توقعات کے مطابق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہاں کے ماحول اور وہاں کے لوگوں کو اچھا پایا۔

ایک اجتماع اور احساسِ کرب

جماعت کی تاریخ میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع (دسمبر ۱۹۵۶ء) کے حوالے سے کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

میں جماعت کے اس اندرونی ہنگامے سے دُور تھا۔ دُوری کا مطلب یہ ہے کہ براہِ راست نظم سے دُوری تھی، لیکن دل کی دُوری نہیں تھی۔ اس زمانے میں جماعت کی داخلی صفوں میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا، میں اس کرب میں برابر کا شریک تھا۔ ۵۵ء کے دوران مولانا مودودی رہا ہوئے۔ اگلے برس ۵۶ء کا دستورِ پاکستان پاس ہوا۔ پاکستان اسلامی

جمہوریہ قرار دیا گیا۔ اس پر ہم لوگوں نے خوشی منائی۔ پھر مخلوط انتخاب کے مقابلے میں جداگانہ انتخاب کی مہم چلی۔ ان سارے واقعات میں شریک رہا۔

البتہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں، مَیں موجود نہیں تھا، کیونکہ جماعت کا رکن نہیں تھا۔ اس اجتماع کے پس منظر میں ایک 'جائزہ کمیٹی' بنی۔ جس کی رپورٹ کے حوالے سے جماعت کی شوریٰ میں اختلاف پیدا ہوا، یہ چیزیں میں اخبار میں پڑھتا رہا۔لیکن آگے بڑھ کر معلومات کرید نے کی کوشش نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے صورت حال کی نزاکت کا اس شدّت سے علم نہیں ہوا۔ لیکن ایک روز اخباروں میں جناب سعید ملک مرحوم کا بیان بڑے نمایاں طور پر چھپا، جس میں انھوں نے ، مولانا مودودی، جماعت اسلامی کے نظام اور ہمہ وقتی کارکنوں پر سخت تنقید کی تھی۔ پھر مولانا نے جائزہ کمیٹی کے ارکانِ مرکزی شوریٰ سے استعفا مانگے۔ اس کے بعد دسمبر ۵۶ء کے شروع میں مولانا مودودی نے جماعت کی امارت سے استعفا دیا اور چودھری غلام محمد قائم مقام امیر بنے۔ پھر ماچھی گوٹھ کا اجتماع ہوا۔ ظاہر ہے ان تمام مرحلوں اور خبروں میں بڑا ذاتی کرب اور شدید بے چینی کا سامان تھا۔

البتہ ایک طرح سے میں اس مسئلہ میں شریک بھی رہا، کہ خورشید بھائی جماعت کے رکن ہی نہیں تھے، بلکہ اب ایک نمایاں رکن تھے۔ کراچی جماعت میں بھی ان کی ایک نمایاں حیثیت تھی اور نوعمر رکن ہونے کے باوجود ماچھی گوٹھ میں معاملات کو سلجھانے کے لیے بھی ان کا نمایاں کردار تھا۔ اس اجتماع کے دوران اور اجتماع کے بعد بھی، وہ خطوط لکھ کر مجھے اپنے فکرواحساس کی دنیا میں شریک رکھتے رہے، کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان کے یہ قیمتی خطوط بھی میرے پاس سقوطِ ڈھاکہ کے حادثے تک محفوظ تھے، اور اس وقت جو ساری متاع لُٹ گئی، اس کے ساتھ یہ خطوط بھی ضائع ہو گئے۔

ماچھی گوٹھ میں اجتماع کا ذکر آ گیا ہے، تو میں یہاں اپنے بعض احساسات، تاثرات اور خیالات کا مختصراً اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا، کہ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا مودودی کی فکر، اجتہاد اور راہ نمائی، میں جماعت اسلامی نے ملکی

سیاست میں جو حصہ لینا شروع کیا، جو دستوری مہم شروع کی، جس طرح ریاست کا رخ اور دستور کا ڈھانچا اسلام کے مطابق بنانے کی جدوجہد کی، وہ ایک بروقت اور بالکل صحیح اقدام تھا۔ مجھے اس بات میں بھی کوئی شبہہ نہیں تھا، کہ یہ سارا کام ہی اس وقت مطلوب تھا۔ یہ عمل مولانا محترم کا ایک ایسا اجتہاد تھا، جو جماعت کے رخ کو متعین کرنے والا تھا۔ البتہ جائزہ کمیٹی کے بارے میں اسرار صاحب کی مختلف تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے یا اس کے بعد امین احسن اصلاحی صاحب کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے جماعت کی اخلاقی اور دینی حالت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے، وہ خراب اور زوال یافتہ منظر تھا۔ لیکن میرا تاثر یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ کوئی ایسی شدید خرابی پیدا ہوگئی ہے۔

البتہ میرا یہ تاثر ضرور تھا، کہ جماعت کے دعوتی کام میں اور کارکنوں کے محرکاتِ کار میں آخرت کا، جنت کی طلب کا، دوزخ سے خوف کا اور اللہ کی محبت کا جو مقام ہونا چاہیے وہ اس درجہ نہیں پیدا ہو رہا۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تقسیم کے بعد جماعت کے عملی سیاسیات میں آنے کے اثر کی وجہ سے یکایک رونما ہوگئی تھی۔ بلکہ میرا یہ خیال تھا کہ جماعت کی اٹھان ہی میں کہیں اس کا خمیر موجود تھا۔ جماعت کی بنیادی دعوت، اللہ کی بندگی کی طرف بلانے اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں زندگی لگا دینے کی ہے، مگر کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ رفتہ رفتہ اس ذوق میں کمی آگئی تھی۔

اس وقت اور آج بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ کیفیت کوئی سیاست میں حصہ لینے کا ہی نتیجہ نہیں تھا، کہ بنیادی دعوت پھیلانے کا ذوق مدھم پڑ گیا یا اس کے محرکاتِ کار میں کوئی کمی آگئی۔ بلکہ جہاں بھی میرے ہاتھ میں جماعت کی زمامِ کار رہی ہے، اس کے لیے انھی محرکات سے کام لیا ہے، جس کے نتیجے میں اس میں نمایاں فرق پڑا۔ مثلاً اس بات کی وضاحت کے لیے ذرا آگے جانا پڑے گا۔ لیکن چاہوں گا کہ اس واقعہ کا ذکر یہیں پہ کردوں۔

یہ جنوری ۱۹۷۷ء کی بات ہے، جب میں سعودی عرب میں حرمِ کعبہ میں توسیع اور

برق و آب کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ ان دنوں 'پاکستان قومی اتحاد' کے نام سے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف حزبِ اختلاف کی ساری پارٹیاں متحد ہو کر عام انتخابات میں اُتری تھیں۔ ان پارٹیوں میں جماعت اسلامی کے ساتھ، بیگم نسیم ولی خان، اصغر خان سمیت مختلف فرقوں کے مذہبی اور سیکولر تمام عناصر موجود تھے۔ اگرچہ انتخابی مہم کے دوران جمعیت علمائے پاکستان نے 'نظامِ مصطفیؐ' کا نعرہ بلند کر دیا تھا، لیکن اپنی سرشت کے اعتبار سے یہ کوئی دینی اتحاد اور دینی تحریک نہیں تھی۔ اگر بھٹو صاحب الیکشن کے ذریعے چلے جاتے تو جو حکومت برسرِ اقتدار آتی، وہ اسلامی حکومت نہیں ہوتی اور نہ وہ جماعت اسلامی کی حکومت ہوتی۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جماعت کی جانب سے یہ دوسرا حصہ تھا، اور اس وقت تک دسمبر ۱۹۷۰ء کا مایوس کن تجربہ بھولا نہیں تھا۔ اس شکست کے اثرات لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھے۔ میں اگرچہ پاکستان سے دُور سعودی عرب میں تھا، لیکن اس انتخابی معرکے کے کیا نتائج نکلیں گے اور کیا ہونے والا ہے؟ اس بارے میں میرا ذہن بہت صاف تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ ''اس انتخاب کے نتائج ہمارے خیال میں کوئی بہت اچھے نہیں نکلیں گے۔ پاکستان قومی اتحاد، بھٹو صاحب کو غیر جانب دارانہ الیکشن میں واضح اور کھلی شکست نہیں دے سکے گا''۔ مارچ کے وسط میں جب ہنگامے شروع ہو گئے، تب اس بات کے لیے میں مستقل طور پر مضطرب اور بے چین تھا، کہ کہیں ان ہنگاموں کے نتیجے میں مارشل لا نہ لگ جائے، جس سے جمہوری سسٹم ہی ختم ہو جائے۔ مگر چار ماہ کے دوران یہ دونوں چیزیں ہی وقوع پذیر ہو گئیں۔ اس وقت گفتگو کا یہ موضوع نہیں ہے، کہ ایسا کیوں ہوا؟

مرکز جماعت نے وہاں پر ایک چھوٹا سا کام میرے ذمے لگایا، کہ جماعت کے لیے الیکشن فنڈ جمع کروں۔ سعودی عرب میں محنت، مشقت اور ملازمت کرنے والے پاکستانیوں سے یہ فنڈز اکٹھے کرنے تھے۔ اگرچہ وہاں پر میں نظمِ جماعت کا ذمہ دار نہیں تھا، البتہ اس حد تک ذمہ داری ضرور تھی، کہ سب رفقائے جماعت میرا احترام کرتے تھے۔ اس لیے میں نے یہ طے کیا، کہ لوگوں پر لازم تو نہ کیا جائے، مگر انھیں یہ ترغیب ضرور دی جائے

کہ وہ اپنی ایک مہینے کی تنخواہ الیکشن فنڈ میں دے دیں۔ چنانچہ مختلف مقامات پر ساتھیوں کے اجتماعات منعقد کیے۔ ریاض، ظہران، الخبر، جدہ پھر وہاں سے طائف گیا۔ مکہ سے ہوتا ہوا مدینے گیا۔ ہر جگہ کارکنوں کے اجتماع میں میرا پورا زور انفاق فی سبیل اللہ کے اجر پر تھا۔

الیکشن کے بارے میں ان سے میرا کہنا یہ تھا، ''اگر آپ یہ پوچھیں کہ کتنی سیٹیں ملیں گی؟ تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس لیے کہ پیسہ ہم سیٹوں کے لیے نہیں لے رہے کہ آپ کو یہ ضمانت دوں کہ الیکشن میں بہت ساری نشستوں پر کامیابی کے ساتھ جماعت اُبھر کر سامنے آئے گی، میں آپ کو ایسی کوئی ضمانت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں''۔ مگر یہ صاف کھری بات سننے کے باوجود بہت سے لوگوں نے ایک مہینے کی، بعض نے دو مہینے کی اور طائف میں ڈاکٹروں نے چار چار اور چھ چھ مہینے کی تنخواہ الیکشن فنڈ میں دی۔ الخبر اور ظہران میں رفقا نے کہا کہ ''آج تک ہم سے فنڈ کی اپیل اس طرح نہیں ہوئی۔ اس اچھے انداز نے فنڈ دینے کے لیے دل کو بالکل بے تاب کر دیا''۔

ریاض میں ہمارے ایک بڑے محترم اور عزیز رفیق تھے۔ اب ان کا نام لینے میں حرج نہیں ہے، یعنی ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا صاحب، وہ الیکشن میں جماعت کے حصہ لینے کے حق میں نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ کامیابی نہیں ہوگی۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے بھی اپنی مہینے بھر کی تنخواہ لاکر مجھے دے دی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا: ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ drain (نالے) میں جائیں گے، مگر اس لیے دے رہا ہوں کہ یہ جماعت کا مسئلہ ہے''۔ میں نے کہا: ''بھائی، یہ بھی ایک اچھا محرک ہے کہ آپ جماعت کو دے رہے ہیں۔ لیکن یہ تو بڑا غلط محرک ہے کہ آپ سمجھ رہے ہیں یہ drain میں جائیں گے، اس لیے آپ یہ رقم واپس رکھ لیں، میں نہیں لیتا۔ میں تو آپ سے صرف اس لیے لے رہا ہوں کہ ان شاء اللہ، آخرت میں آپ کو سات سو گنا ہو کر واپس ملیں گے۔ ممکن ہے وہ نتیجہ یہاں دنیا میں، آپ کی پسند کے مطابق نہ نکلے۔ ممکن ہے آپ کو تحریک کے کسی کام سے اختلاف ہو جو وہ کر رہی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کا اجر تو اللہ کے ہاں محفوظ ہے اور آپ کو بھی اسی محرک پر دینے چاہییں''۔ خیر انھوں نے اس بات کو محسوس کیا۔

اس وقت بھی میرا یہ خیال تھا اور اب بھی یہی سوچ ہے کہ جماعت میں اس محرّک کی صحیح طور پر نشو ونما نہیں کی جاسکی۔ خرابیاں تو دارالعلوم دیوبند میں بھی ہیں اور جماعت میں بھی ہوں گی۔ لیکن 'تبلیغی جماعت' نے آخرت کے اجر کو بہت مناسب مقام دیا ہے اور فضائل کا ایک پورا کورس بنایا ہے، جس نے اس سے وابستہ لوگوں کے دل جیتے ہیں اور ان کی کوششوں، کاوشوں کو آخرت کے لیے خالص ہونے کا شعور دیا ہے۔ اس حوالے سے ماچھی گوٹھ اجتماع میں زیر بحث آنے والی بات سے مجھے اختلاف نہیں، مگر یہ مقدمہ قائم کرنا کہ رفتہ رفتہ دعوت کے ذوق میں اس کمی کا باعث اسلامی دستور کی تحریک یا سیاسیات میں حصہ لینا ہے، ایک خلافِ واقعہ بات ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ اس مبینہ کمی کے ذمہ دار وہ تمام اکابرین بھی تھے، جو اس وقت یہ بات کر رہے تھے کیونکہ ان پہلوؤں پر توجہ دلانے سے تو انھیں کسی نے نہیں روکا تھا، ان کے قلم پر کسی نے زنجیر نہیں ڈالی تھی اور ان کی تقاریر پر کسی قسم کی قدغن نہیں لگی تھی۔

اسی طرح اجتماع میں ہمہ وقتی کارکنوں کے بارے میں کہا گیا، بلکہ بعد میں بھی کہا جاتا رہا اور اب بھی کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں میرا احساس اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے، کہ یہ تو جماعت اور مولانا مودودی کا بڑا منفرد contribution (کارنامہ) تھا۔ بجائے اس کے کہ قومی اور اجتماعی کاموں کے لیے لوگ چندے کھائیں اور بدنام ہوں۔ جیسا کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تک پر الزامات لگے۔ لیکن مولانا مودودی نے یہ ادارہ قائم کیا کہ چند ہمہ وقتی لوگ بیت المال سے اعزازیہ لیں اور تحریک کا کام کریں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان تنظیمی ذمہ داریوں پر فائز لوگ بڑے قلیل معاوضوں پر بڑی قربانی دے کر جماعت اسلامی کے اندر کام کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کی اس قربانی سے جماعت کا کام آگے بڑھا ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ آج جماعت کا جو کام بھی دکھائی دیتا ہے، اس میں ان ہمہ وقتی کارکنوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اپنے اُوپر افسوس ہوتا ہے کہ میں کمزوری کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں کر سکا، لیکن اس کو ہمیشہ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

ہم نے ۱۹۷۰ء میں جب ڈھاکہ سے پروفیسر غلام اعظم صاحب کو الیکشن کے لیے کھڑا کیا، تو ان کے حلقے میں میرپور علاقہ آتا تھا، جہاں کے زیادہ لوگ اُردو بولنے والے تھے۔ وہاں جلسوں میں مرکزی مقرر میں ہوتا تھا۔ مہم کے دوران غلام اعظم صاحب پر ایک بڑا الزام یہ تھا کہ ''وہ جماعت کے تنخواہ دار ملازم ہیں''۔ تقریر کے دوران میں نے اس آیت سے استدلال کیا کہ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (البقرہ۲:۲۷۳) یہ تو وہ تنگ دست لوگ ہیں، جو اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں کہ یہ تلاشِ معاش کا کام نہیں کرسکتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ملازمت تو نہیں ہے۔ ہم بیت المال سے محض ان کی کچھ تھوڑی سی ضروریات پوری کر دیتے ہیں۔ گویا کہ یہ الزام بھی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں، میں جماعت کے دینی اور اخلاقی معیار کے بارے کوئی ایسی خراب رائے نہیں رکھتا تھا۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں، میں دُور تھا، اس لیے یہ رائے تھی، لیکن بہرحال میں جماعت کا باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود جماعت کے اندر تھا۔ جماعت کے قائدین، ذمہ داران اور کارکنوں سے برابر ملاقات رہتی تھی۔

البتہ جس چیز سے مجھے اختلاف تھا اور جس کو اس وقت بھی نادرست سمجھتا تھا وہ مولانا کی جانب سے جائزہ کمیٹی کے ارکان سے شوریٰ کی رکنیت کا استعفا طلب کرنا تھا۔ اگرچہ مذکورہ افراد کی مرتب کردہ 'جائزہ رپورٹ' کا غیر متناسب انداز جماعت کے لیے نقصان دہ تھا، پھر بھی اس کی اچھائی یا خامی کا تعین شوریٰ ہی کو کرنا چاہیے تھا۔

اس کے بعد میں اگست ۱۹۵۷ء میں امریکا چلا گیا۔ اس دوران میں جماعت کے کچھ نمایاں لوگ اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے، وقفے وقفے سے جماعت چھوڑتے رہے اور بالآخر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب بھی الگ ہوگئے، جن سے مجھے بہت تعلق بھی تھا اور ان کو میں اپنا استاد سمجھتا تھا۔ میں نے ان کو وہاں سے ایک مفصل خط لکھا تھا۔ وہ واحد آدمی تھے جن کو میں نے اس سلسلے میں مخاطب کیا تھا۔ اصل میں مجھے یہ بات گراں گزر رہی تھی کہ

اختلاف اس حد تک کیوں جائے کہ جس کے نتیجے میں ساتھ مل کر کام کرنا ممکن نہ رہے۔ اپنی پوری تحریکی زندگی میں میری یہی سوچ رہی ہے کہ اختلاف کے باوجود ساتھ مل کر کام کرنا ممکن ہونا چاہیے۔ عقل وشعور رکھنے والے افراد کے لیے اختلاف سے کوئی مفر نہیں ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ اختلاف کے آداب اور حدود کو ملحوظ رکھا جائے۔ بہت سارے مسائل پر اختلاف کے باوجود بڑے مقصد کے لیے ساتھ مل کر کام کرتے رہنا چاہیے۔

میں نے اصلاحی صاحب کو یہ بھی لکھا تھا، کہ یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ''جو لوگ کفر کے لیے کام کر رہے ہیں، وہ کتنے بڑے بڑے اختلافات کو بھلا کر عظیم تر قومی اور دنیاوی مقاصد کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور حصولِ مقصد تک اکٹھے رہتے ہیں۔ روس، امریکا، برطانیہ جیسے متحارب ممالک بھی جرمن حکمران ہٹلر [م: ۱۹۴۵ء] کے خلاف اکٹھے رہے، حالانکہ یہ بڑے بڑے ممالک تھے، ان کی اپنی اپنی پالیسیاں تھیں۔ یہ معاشی اور سیاسی مفادات کی جنگ میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ لیکن پھر بھی یہ اکٹھے ہوگئے۔ یہاں آج بھی سیاست میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ قومی مقاصد کے لیے سب پارٹیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ محض اقتدار کے لیے جنگ ہوتی ہے۔ ان کی آرا میں اور پالیسی میں بھی بنیادی قسم کا اختلاف ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ تو کفر کے لیے اکٹھے رہتے ہیں، مگر اُخروی زندگی میں نجات پانے کے امیدوار اور اللہ کی رضا حاصل کرنے والے آخر کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں پھٹ پڑتے ہیں؟''

مولانا اصلاحی صاحب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ۵۹ء میں جب میں امریکا سے واپس آیا تو وہ کراچی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ''آپ کا خط مل گیا تھا، میرے خیال میں اس کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں تھی''۔ میں نے کہا: ''آپ کی مرضی، آپ جیسے مناسب سمجھیں''۔

جب میں امریکا گیا تھا، اس وقت تک ماچھی گوٹھ اجتماع کے مضمرات ظاہر نہیں

ہوئے تھے اور نہ مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ قیادت کے اندر اختلاف کتنا گہرا ہے؟ مباحث کیا ہیں؟ اور موضوعات نزاع کیا ہیں؟ امریکا سے آنے کے بعد جب مولانا مودودی اور اصلاحی صاحب کے درمیان حکمت عملی اور غیبت وغیرہ کے مسئلے پر تحریریں پڑھیں، تو اندازہ ہوا کہ کتنی زیادہ تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے فتنے کے دَور میں مجھے دُور رکھا۔

جماعت میں فتنوں کا دور بعد میں بھی آیا۔ خاص طور پر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات کے بعد۔ تب میں مرکز میں تھا۔ خود میرے خلاف بھی بہت کچھ کہا گیا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا خصوصی فضل تھا کہ جو تھوڑی بہت تربیت ہوئی تھی اس میں اللہ تعالیٰ نے، ان فتنوں کے ادوار میں استقامت کے ساتھ جادۂ مستقیم پر قائم رکھا۔ واقعہ یہ ہے ایسے تمام مرحلوں میں مجھے مسعود عالم ندوی صاحب کے ایک جملے [دیکھیں، صفحہ ۲۱۱] نے بڑی تقویت اور سہارا دیا جیسا کہ میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے جملوں کی طرف اشارہ کرتا رہتا ہوں۔ ایسے جملے اپنے دامن میں علم اور تجربے کا بحرِ بے کراں لیے ہوتے ہیں۔ ہر فرد کو عملی زندگی میں ایسے جملے نصیب ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان قیمتی باتوں کو محض سن کر ضائع نہ کر دیا جائے۔

٦

امریکا میں: تعلیم، سرگرمیاں اور مشاہدات

اپنی ذہنی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے کہ کسی دوسرے درجے کے کام پر مطمئن ہو جاؤں۔ اگرچہ انجینیرنگ کالج میں زبردستی داخل کرایا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہاں پہلے سال کے پہلے امتحان میں ناکامی دیکھنے کے بعد درجہ اول میں انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کی۔

انجینیر بن جانے کے بعد گیمن کمپنی میں پہلی ملازمت کی۔ مگر اس میں طبعی مناسبت پیدا نہ ہوسکی۔ اللہ نے سبیل پیدا کی اور دوسری جگہ آ گیا۔ پھر انجینیرنگ کالج میں آیا تو گویا اپنی من پسند دنیا میں آ گیا تھا۔ چونکہ بطور استاد کردار ادا کرنا مزاج سے مناسبت رکھتا تھا، اس لیے محنت کی۔ الحمدللہ، بہت جلد کالج کے ایسے اساتذہ میں شمار ہونے لگا جن کی قربت کا تذکرہ کرتے وقت طلبہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اگرچہ مجھے شعبۂ تدریس سے وابستہ رہنے کا شوق تھا، لیکن بڑے تعلیمی اداروں اور خاص طور پر انجینیرنگ کالجوں پر حکومت کا کنٹرول تھا۔ جس کا فطری نتیجہ، جماعت سے میرے تعلق پر زد کی صورت میں نکل سکتا تھا، جبکہ میں جماعتی زندگی سے علاحدگی کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ سرکاری ملازمت میں رہنا مشکل کام ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی ضرورت

ان دنوں کراچی جمعیت میں ہمارے تمام قابلِ ذکر رفقا اپنے اپنے شعبے میں محنت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ انجینیرنگ کے شعبے میں آگے بڑھنے کے لیے اعلیٰ تعلیم کا حصول

ضروری تھا، جس کے نتیجے میں پیشہ ورانہ ترقی کے دروازے کھل سکتے تھے۔ بلاشبہہ اس کے نتیجے میں ہمیں ذاتی سطح پر معاشی فائدہ پہنچنے کا بھی امکان تھا۔لیکن ہماری سوچ پر یہ یہی خیال غالب تھا کہ اس طرح معاش میں کشادگی آئے گی تو ہم ان شاء اللہ دین کا کام کرنے میں بھی سہولت پائیں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب داڑھی رکھ کر بحریہ، فضائیہ یا کسی حد تک بری فوج وغیرہ میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، جب کہ دوسری اچھی ملازمتوں میں بھی، ایسے فرد کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔فوج میں شراب عام تھی۔ جمعیت سے فارغ ہوکر مختلف شعبہ ہاے زندگی میں کام کرنے والے لوگوں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔

جانے کی تیاریاں

میرے محبوب دوست، مرغوب احمد، قاضی محمد انوارالحق اور محمد عمر چھاپرا، یونی ورسٹی آف مینی سوٹا [امریکا] میں پڑھ رہے تھے، اور وہاں پر اپنی تعلیمی اور دعوتی سرگرمیوں میں بڑے سرگرم تھے۔ ان کی پُرزور ترغیب تھی اور کچھ مستقبل کے حالات نظر آ رہے تھے۔ ان حالات کا بھی تقاضا تھا کہ موقع ملے تو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہیے۔ میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی۔ پولیس رپورٹ میرے حق میں نہیں گئی اور درخواست مسترد ہوگئی۔ کیونکہ پولیس کی نظر میں، مَیں ویسا ہی 'خطرناک' فرد تھا، جس طرح جماعت کے دوسرے افراد کو 'خطرناک' سمجھا جاتا تھا۔ ذرا کوشش کر کے معلوم کیا تو پتا چلا کہ پولیس کے ریکارڈ میں میری ذاتی فائل بڑی موٹی تازہ ہے، جس میں حکومت کے خلاف تقریروں اور مختلف احتجاجی تحریکوں میں حصہ لینے کا ریکارڈ درج ہے۔

میرے والد صاحب ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن میں انجینیر تھے۔ قرضہ ان لوگوں کو ملتا، جن کو کارپوریشن کا انجینیر سرٹیفکیٹ دیتا۔ ایک فرد والد صاحب کے پاس آئے اور اپنی غرض بتائی۔ یہ صاحب پاسپورٹ آفیسر تھے۔ والد صاحب نے ان سے میرے مسئلے کا ذکر کیا۔ جواب میں انھوں نے کہا ''پاسپورٹ بنا دوں گا''۔ انھوں نے میری پہلی

درخواست اور فائل پھاڑ کر ایک نئی درخواست لی اور چند روز میں پاسپورٹ جاری کر دیا۔

میرا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ اس کی بنیاد پر امریکا کی مختلف یونی ورسٹیوں میں اسکالرشپ کے لیے درخواستیں بھیج دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا، کہ مجھے ایک چھوٹا سا اسکالرشپ مل گیا۔ اس اسکالرشپ کے معنی یہ تھے کہ وہ مجھ سے بس اتنی ہی فیسیں لیں گے، جتنی وہ اپنے ہم وطن طالب علم سے حاصل کرتے تھے۔ اپنی جگہ یہ بہت بڑی سہولت تھی ـــــ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد میں چودھری غلام محمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو بتایا کہ ''کم از کم ایک سال کے لیے امریکا پڑھنے کے لیے جانے کا ارادہ ہے۔ اس ضمن میں یہ مرحلے طے کر چکا ہوں، اس سے میرا کیریئر بھی بہتر ہوگا اور تحریکی کام بھی زیادہ سہولت سے کرسکوں گا۔ اب آپ رہنمائی کیجیے''۔ انھوں نے سنتے ہی کہا: ''اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ضرور جانا چاہیے''۔ چودھری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ بصیرت دی تھی کہ وہ مستقبل کے حوالے سے منصوبہ سازی کرتے تھے۔ ہر فیصلہ، ہر مشورہ اور ہر بات کرتے وقت ان کے پیشِ نظر دین اور تحریک کا مفاد ہوتا تھا۔ دُور اندیشی کی یہ صلاحیت میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔

اس کے بعد ہوائی سفر کے لیے ٹکٹ لینے کا مرحلہ تھا۔ اگرچہ ہمارے گھر میں معاشی آسودگی نہیں تھی، تاہم والدہ محترمہ کے حسنِ انتظام سے گھر توکل، قناعت اور سکون کی دولت سے ضرور مالا مال تھا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ ''ٹکٹ کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے، آپ خود یا کسی دوست سے بندوبست کر کے مجھے بطور قرضِ حسنہ اتنے پیسے کا انتظام کر دیں۔ ان شاء اللہ جلد لوٹا دوں گا''۔ انھوں نے رقم کا انتظام کر دیا۔

ادھر ٹکٹ کا مسئلہ حل ہوا، ادھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلا بیٹا احمد عمر عطا کر دیا۔ جس کی پیدایش کے ساتویں یا آٹھویں روز، انجینیرنگ کالج کی ملازمت سے استعفا دے کر میں امریکا چلا گیا۔ بچہ کمزور تھا، اس لیے فوراً ہی اس کو یرقان نے آلیا۔ سال بھر پہلے شادی ہوئی تھی۔ اسی آزمایش میں بے بس بیوی اور بیمار بچے کو پاکستان چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ ظاہر ہے

کام کرنے کے لیے قربانی تو دینا پڑتی ہے۔ اب بھی سوچتا ہوں، کہ اگر اس وقت نہ جاتا تو پھر اس سفر کے نتیجے میں ترقی کے جو امکانات پیدا ہوئے، بھلا وہ کس طرح پیدا ہوتے؟ اللہ تعالیٰ نے صحیح وقت پر ایک درست فیصلہ کرنے کی توفیق دی۔ تجربہ اور مشاہدہ بار بار اس امر کی صداقت کو پختہ تر بناتا رہا ہے کہ اللہ پر بھروسا کرنے کا ہمیشہ انسان ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔

عیسائی مشنری کا خط

ایک دل چسپ بات یہ کہ امریکا جانے سے قبل مجھے ایک خط ملا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ ''مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو یہاں داخلہ ملا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے آ رہے ہیں۔ مجھے آپ کا برادر (بھائی) مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ کو جو بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوگا یا کسی بھی قسم کی پریشانی ہوگی، وہ مجھے بتایئے گا، میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس لیے آپ جوں ہی امریکا کے لیے روانہ ہوں، فوراً مجھ کو اطلاع کر دیں، میں آپ کا استقبال کروں گا، اور آپ کو یہاں پر سیٹ کرنے کے لیے جو بھی معاونت درکار ہوگی، وہ میں کروں گا''۔۔۔

ایک آدمی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک بالکل نئی دنیا میں جا رہا ہو، جہاں اس کا کوئی واقف کار نہ ہو، ایسے فرد کے لیے ایسی پیش کش تو بہت بڑی نعمت ہوگی۔ لیکن چونکہ وہاں پر پہلے سے میرے تین تحریکی برادر (بھائی) موجود تھے: مرغوب، انوار، عمر۔۔۔ انھوں نے ایک مکان بھی لے رکھا تھا، جہاں طعام و رہایش کا بندوبست تھا اور مجھے بھی انھی کے پاس رہنا تھا۔ اس لیے میرے نزدیک اس ان جان برادر کی پیش کش میں کوئی کشش نہ تھی، اور نہ اس کی کوئی قدر ہی تھی۔ کیونکہ وہاں پر میرے بھائی، بھائیوں سے بڑھ کر مدد اور عزت کرنے والے موجود تھے، دینی رشتے کے ان بھائیوں سے بڑھ کر کون سا بھائی ہوسکتا تھا!

میں نے اپنے ان ساتھیوں سے پوچھا کہ ''یہ خط کس قسم کے 'بھائی' کا آیا ہے؟''

انھوں نے بتایا کہ ''یہ مسیحی مشنری ہیں، جن کا لوتھرن فاؤنڈیشن سے تعلق ہے۔ یہاں پر ان کی اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور لوتھرن مشنری آرگنائزیشن بڑی مضبوط ہیں۔ مِنی سوٹا یونی ورسٹی میں ان کو بڑا رسوخ حاصل ہے۔ یہ ان طالب علموں کے پتے حاصل کرتے ہیں، جو باہر سے آرہے ہوتے ہیں، پھر آنے والے ایک ایک لڑکے پر اپنا ایک ایک نوجوان متعین کرتے ہیں کہ ''تم ان کے ساتھ رہو، ان کی مدد کرو، اور ان کا دل جیتو۔ اگر انھیں عیسائی نہ بنا سکو، تو کم از کم عیسائیت کے بارے میں ان کے دلوں پر گہرا مثبت نقش ضرور چھوڑ دو''۔ ظاہر ہے وہاں پڑھنے کے لیے جانے والے مستقبل میں اپنے اپنے ملکوں میں اہم مناصب یا اہم شعبوں پر فائز ہوتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ان عیسائی مشنریوں کا کام اتنا منظّم ہے۔ بہرحال میں نے اس کو صرف یہ اطلاع دی کہ ''پڑھنے آرہا ہوں''۔

جب وہاں پہنچا

میں کراچی سے لندن گیا، جہاں زیرِتعلیم جمعیت کے سابق رفقا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہاں سے کینیڈا، مانٹریال پہنچا۔ ان دنوں ظفر اسحاق انصاری میک گل یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مانٹریال سے بس کے ذریعے میناپولس پہنچا، جہاں مجھے لینے کے لیے تینوں ساتھی بس اسٹاپ پر موجود تھے۔

جب پاکستان سے روانہ ہوا تو اس وقت صرف ایک ہی خیال دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، کہ میری پہلی ترجیح یہ ہے کہ جلد سے جلد، اور بہترین معیار پر، بروقت اپنی تعلیم مکمل کروں —— دعوت و تبلیغ کا کام میری مصروفیات میں اس وقت ثانوی اہمیت کا حامل تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ مجھے ایک سال کے اندر اندر انجینیرنگ میں ایم ایس (MS) کرنا تھا۔ میرا معاشی پس منظر بھی ایسا نہیں تھا کہ وقت ضائع کر کے کسی پر بوجھ بنتا۔ نیا تعلیمی نظام اور منفرد معیارِ تعلیم بھی یہ تقاضا کرتے تھے کہ اپنے ایک ایک منٹ کو تعلیم پر صرف کیا جائے۔ اسی لیے یونی ورسٹی سے آ کر پڑھنے لکھنے بیٹھ جاتا تھا۔ گھر کی صفائی اور کھانا پکانے کے سوا مزید کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسی دوران وہ امریکی 'برادر' آ کر بات چیت کرنے پر زور دیتا، اس کی وقت بے وقت مداخلت طبیعت پر بڑی گراں گزرتی۔ آخر ایک روز اس سے چھٹکارا پانے کی منفی ترکیب سوجھی۔ میں نے کہا: ''آپ ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا کریں''۔ اس نے خوشی سے یہ پیش کش قبول کرلی۔ میں نے کھانا پکایا اور اس میں خاصی کراری مرچیں ڈال دیں، یعنی اتنی مقدار جو کبھی کبھار ہم کھالیا کرتے ہیں۔ میرے ساتھ اس نے کھانا شروع کیا، تو وہ بے چارا سی سی کر رہا تھا اور ویری نائس بھی کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ کبھی پلٹ کر مجھے ملنے نہیں آیا۔ بہرحال اگلے ہی لمحے مجھے اپنی اس حرکت پر سخت پشیمانی تھی۔ عام طور پر میں نے امریکی شہریوں کو بھلامانس پایا ہے، اگرچہ وہ سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں کتنے ہی جارح کیوں نہ ہوں۔

'محمدؐ کون ہیں؟'

اسی طرح میں یہ طے کر کے گیا تھا، کہ وہاں پر شرٹ پتلون اور کوٹ پہنوں گا۔ شادی کے موقع پر ہی پہلا سوٹ سلوایا تھا۔ جب لندن پہنچا تو ماموں زاہد حسین صاحب عارضۂ قلب کی وجہ سے وہاں زیرعلاج تھے۔ ماموں دینی مزاج اور پاکیزگی کا خیال رکھنے کے باوجود، مغربی لباس، مشرقی تہذیبی رکھ رکھاؤ اور آداب کے قائل تھے۔ ان کی عیادت کے لیے میں سوٹ پہنے ہوئے گیا، تو انھوں نے بے ساختہ کہا: ''آج پہلی بار تم ڈھنگ کے کپڑے پہنے دکھائی دے رہے ہو''۔ بہرحال یہ بھی طے کرلیا تھا کہ خصوصی پروگراموں میں کُرتا، پاجامہ اور شیروانی پہنوں گا۔ اس لیے جب ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے ہمارے شعبۂ تعلیم نے محفل منعقد کی تھی تو دوسرے سبھی لوگ سوٹ پہنے ہوئے تھے، مگر میں قومی لباس پہن کر شریک ہوا۔

یہ بات معلوم نہیں تھی کہ صرف اس لباس کی وجہ سے میں توجہ کا مرکز بن سکتا ہوں۔ اس مجلس میں خاص طور پر بوڑھی امریکی خواتین میری جانب متوجہ ہوئیں۔ انھوں نے ملک کا نام پوچھا اور پھر سوال کرتے کرتے مذہب کا نام دریافت کیا۔ میں نے اس نجی گفتگو میں کوئی

دس بارہ جملوں میں اسلام کا تعارف پیش کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آیا۔

جھٹ سے ایک خاتون نے سوال کر دیا Who is Muhammad? (محمدؐ کون ہیں؟) میں جس ماحول سے نکل کر گیا تھا، اس ماحول میں آنحضورؐ کا نام بڑا معروف اور رچا بسا تھا، مگر یہاں پہنچ کر پہلی ہی عام محفل میں ''محمدؐ کون ہیں؟'' کا سوال طبیعت پر بڑا گراں گزرا ___ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ نوے پچانوے فی صد امریکی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ہی واقف نہیں ہیں۔ وہ کون ہیں، ان کا پیغام کیا ہے، ان کی حیاتِ طیبہ کیسی تھی؟ ان ملنے والوں کے سامنے رسول پاکؐ کے بارے میں مختصراً تفصیلات بیان کیں، **فللہ الحمد وبیدہ التوفیق**۔

کچھ دعوتی سرگرمیاں

میرے جانے سے پیش تر، وہاں پڑھنے والے مسلمان طلبہ نے 'اسلامک کلچرل سوسائٹی' بنا رکھی تھی۔ ہمارے تینوں دوست اس میں بڑے سرگرم تھے۔ مصر کے احمد الاحمد اور عراق کے احمد راوی بھی اس کے ممبر تھے۔ اس زمانے میں وہاں آنے والے ترک اور ایرانی لڑکے کسی قسم کی بھی اسلامی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ شراب، عورت اور تعلیم ان کی دل چسپی کا محور تھے۔ شرق اوسط سے آنے والے طالب علم اس چیز کا برملا اظہار کرتے تھے کہ 'اخوان المسلمون' سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دنوں مصر میں 'اخوان' کے کارکن طرح طرح کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنائے جا رہے تھے۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ ان میں سے اکثر لڑکے فکری اعتبار سے 'اخوان' کی دعوت اور ان کی سرگرمیوں سے متاثر تھے۔ ان طلبہ کی دل چسپی اور ہمدردی اسلامی سرگرمیوں میں تھی۔

اس کے علاوہ 'پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن' تھی، جس کے روحِ رواں محمد سرور صاحب تھے، جو وہاں ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ پنجابی نژاد، بڑے گرم جوش اور ہنس مکھ انسان

تھے۔سبھی کے دوست اور ملنسار تھے۔تمام پاکستانی طلبہ اس سوسائٹی کی سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے۔ اجتماعات میں باقاعدگی تھی۔ یہاں پر مقیم سارے پاکستانیوں میں وحدت، یگانگت اور بھائی چارے کی فضا تھی۔اس سوسائٹی کی سرگرمیوں میں ہم برابر حصہ لیتے تھے۔ ۲۳رمارچ اور ۱۴راگست کا دن، قومی جذبے سے مناتے تھے۔ اسلامی تہواروں میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ اور یومِ ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر دینی جذبے سے پروگراموں کا اہتمام کرتے تھے۔

یونی ورسٹی میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا آغاز ہم ہی نے جا کر کیا تھا، ورنہ اس سے قبل وہاں جانے والے مسلمان طالب علموں نے یہ 'اجتہاد' کر رکھا تھا، کہ وہ نمازِ جمعہ، اتوار کے روز پڑھتے تھے۔ کلاسیں چھوڑ کر نمازِ جمعہ پڑھنے کی وہ ہمت اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ہم نے اس رسم کو تبدیل کیا اور جمعہ کے روز ہی جمعہ پڑھنے کو رواج دیا۔

مختلف جگہوں سے اسلامک سوسائٹی اور پاکستان سوسائٹی کو تقاریر کرنے کے لیے جو دعوت نامے موصول ہوتے، تو وہ ہم سے کہتے کہ آپ جا کر نمایندگی کریں۔ یہ دعوت نامے وہاں کے اسکولوں، مختلف سماجی اداروں اور مختلف گرجا گھروں (چرچوں) کی طرف سے آتے تھے۔ انگریزی میں تقریر کرنے کی مجھے کوئی مشق نہیں تھی۔لیکن اس چیلنج کو قبول کرنے سے، انگریزی میں تقریر کرنے کی مشق ہوگئی، اور روانی سے اپنا مافی الضمیر پیش کرنا شروع کیا۔ جب اسلامک سوسائٹی کی طرف سے بلایا جاتا تو موضوع اسلام ہوتا تھا اور جب پاکستان ایسوسی ایشن کی طرف سے بلایا جاتا تو موضوع پاکستان ہوتا تھا۔

اسلام پر بات کرنا تو بالکل واضح بات تھی، لیکن جب پاکستان پر بلایا جاتا تو میں اسے بھی کھینچ کر اسلام پر لے جاتا تھا۔ پاکستان ہے بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل انوکھا ملک۔محض پاکستان کے نام پر اس کا کوئی تاریخی یا جغرافیائی جواز تو نہیں بنتا تھا، لیکن دوقومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان بنا ہی اس لیے تھا کہ مسلمان یہاں پر الگ ملک حاصل کر کے رہنا چاہتے ہیں۔اس لیے پاکستان کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ خود اسلام کو سمجھا جائے، بس

یہاں سے گفتگو موڑ کر میں اسلام کے بارے میں بات چھیڑ دیتا۔ تقریر ۲۰، ۲۵ منٹ کی ہوتی اور اتنا ہی وقت سوال و جواب کے لیے مخصوص ہوتا۔ سوال و جواب بھی تقریر ہی کی طرح ضروری ہوتے ہیں۔ اس سیشن میں امریکی سامعین کی جانب سے، آغا خان، عورتوں، سعودی عرب میں بادشاہت، کثرت ازدواج وغیرہ کے بارے میں زیادہ سوالات ہوتے تھے۔ چار شادیوں کے مسئلے پر تو ہر محفل میں سوال ہوتا تھا۔ دہشت گردی وغیرہ اس زمانے کے موضوعات نہیں تھے۔ ایسے سوال و جواب کا سلسلہ بڑا دل چسپ پروگرام ہوتا تھا۔

عیسائیوں سے مکالمہ

اسی دوران عیسائیوں کے ساتھ ایک دل چسپ معرکہ ہوا۔ لوتھرن اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے ہمیں دعوت نامہ موصول ہوا کہ ''ہم عیسائی، آپ لوگوں سے اسلام کے بارے میں dialogue (مکالمہ) کرنا چاہتے ہیں''۔ مذہبی معاملات پر ڈائیلاگ (مکالمہ) میرے لیے بالکل انوکھا لفظ تھا۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ ''اس مقصد کے لیے چھے ہمارے افراد ہوں گے اور آپ بھی چھے لوگ ہوں گے''۔ شروع سے میری یہ رائے تھی کہ اسلام کا کام کرنے کے لیے گوشہ نشینی زہر قاتل ہے، اس لیے معرکہ کھلے میدان ہی میں ہوسکتا ہے۔ کچھ یہ بات تھی، اور دوسرا یہ احساس تھا کہ ہم تو انھیں اسلام کے بارے میں بتاسکیں گے، مگر یہ ہمیں عیسائیت کے بارے میں کیا بتائیں گے؟ بہرحال ہم نے ان کو دعوت نامہ قبول کرنے کی اطلاع دے دی۔

ہماری طرف سے میرے علاوہ قاضی محمد انوارالحق، احمد الاحمد، احمد راوی تھے۔ عمر چھاپرا امتحان کی وجہ سے نہیں جاسکتے تھے۔ عیسائیوں کی جانب سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ انھوں نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ''آپ اسلام کا تعارف کرا دیں''۔ میں نے کہا: ''ہم شکرگزار ہوں گے، اگر پہلے آپ عیسائیت کا تعارف کرائیں''۔

ان کے سینیر فرد نے ایک لڑکی سے کہا، کہ وہ عیسائیت کا تعارف پیش کرے۔ لڑکی نے تھوڑا سا شرماتے اور کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنی بات کی ابتدا کی، اور کہا ''مجھے معلوم نہیں کہ

میرے دوست، میری سب باتوں سے اتفاق کریں گے بھی یا نہیں کریں گے‘‘۔اس کے بعد لڑکی نے وہی تثلیث [باپ، بیٹا اور روح القدس] اورنجات کے حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا۔ نظامِ زندگی، اخلاقیات اور انسانوں کے باہمی معاملات پرکوئی بات نہیں کی۔اس کے بعد ڈائیلاگ اگلے دن تک کے لیے ملتوی کردیا گیا۔

دوسرے روز آغاز ہی میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ ’’ہم آپ سے اسلام کے بارے میں جاننا چاہیں گے‘‘۔ میں نے اسلام کے بنیادی تصورات ایک ایک جملے میں جامع طور پر بیان کیے۔اس کے بعد کہا: ’’ہم جولوگ یہاں بیٹھے ہیں، ان سب کا اسلام پر مکمل اتفاق ہے۔ اسلام میں شیعہ سنی اختلاف اور پھر خودسنی مسلک کے مسلمانوں میں فروعی اختلاف کے باوجود، ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ اللہ، رسولوں، آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور آخرت پر ایمان رکھے اور صالح عمل کرنے والا مسلمان ہی جنت میں جائے گا، چاہے اس کا کسی بھی فرقے سے تعلق ہو۔ یہ بات مسلمانوں کے تمام مسلکوں سے تعلق رکھنے والے علما اور ماہرین کے ہاں متفق علیہ ہے۔مگر دوسری جانب عیسائیوں کا ہرفرقہ دوسرے کو پکا جہنمی سمجھتا اوراسے جہنمی قراردیتا ہے‘‘۔

ان کے لیے یہ بڑی عجیب بات تھی۔ دراصل میں نے اس عیسائی لڑکی کے افتتاحی جملے کو پکڑ کر بات کو آگے چلایا تھا، تاکہ فرق واضح ہو۔ اس کے بعد ایک ایک جملے کے اپنے ابتدائی کلمات کوکھول کر بیان کیا، کہ توحید کیا ہے؟ رسولوں کو ماننے کا کیا مطلب ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب شریعت اور خاتم الانبیاء ہونے کی بنیادیں کیا ہیں؟ آخرت میں نجات کی منصفانہ اور عادلانہ سوچ اسلام کس طرح پیش کرتا ہے؟ اسلام، عدل اجتماعی کی بنیاد پر انسانوں کی زندگی کے سماجی اور معاشی امور میں کس طرح رہنمائی فراہم کرتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال، اس وقت جتنا علم اور جتنی استطاعت تھی، اس کے مطابق اپنی بات پیش کی۔ میرے ساتھی اس پیش کش اور موقف پر بڑے خوش تھے،لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ

خود عیسائی باشین بھی خاصے متاثر دکھائی دیئے، بلکہ اس چیز کا انھوں نے برملا اظہار کیا، کہ ''ہمیں پہلی بار اسلام کی اتنی مفصل اور مؤثر تصویر دیکھنے، سننے کا موقع ملا ہے''۔

اس کے بعد ہماری اور بہت سی نشستیں ہوئیں۔ ہم تثلیث کے مسئلے پر ان سے سوالات کرتے اور بائبل کے مختلف ایڈیشنوں میں تحریف کے ثبوت پیش کرتے۔ سینٹ پال سے لے کر لوتھر کی تحریکِ اصلاح تک سوالات اُٹھاتے۔ آخرکار ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ تنگ آ کر ڈائیلاگ سیشنا یعنی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو آخری نشست ہوئی، اس میں ان کا سربراہ، جو بعد میں پادری بنا، اس نے کہا: ''ہم نے آپ سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے''۔

اب ہماری طرف سے مجھے بولنا تھا۔ میرے لیے یہ بڑی مشکل بات تھی کہ جوابی طور پر مروّت اور وضع داری میں ان سے یہ کہوں کہ ''ہم نے بھی آپ سے عیسائیت کے بارے میں بہت سیکھا ہے''۔ خیر، اللہ کا نام لے کر میں نے کہا: ''ان نشستوں سے ہمارے باہمی تعلقات میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ یہ باہمی افہام و تفہیم کی بڑی مفید مشق رہی ہے۔ امید ہے اس سے بہتر فضا پیدا ہوگی''۔

یہ ڈائیلاگ تو ختم ہوگیا، تاہم ان کے گروپ لیڈر سے، جو لوتھرن اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر بھی تھا، میری دوستی ہوگئی۔ اور بڑے تپاک اور محبت سے ربط قائم رہا۔ اس کی گفتگو میں عیسائی تبلیغ کا کوئی عنصر نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ ہم کو دیکھ، سن اور سمجھ چکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے اپنی فیڈریشن کے سالانہ عشائیے میں مجھے بطورِ مہمان مقرر مدعو کیا۔ اس عشائیے میں تقریباً پانچ سو لڑکے لڑکیاں تھیں۔

مجھے اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ پادری بننے کی تربیت لے رہا ہے۔ بعد میں جب میں ڈھاکہ آ گیا تو اس کی جانب سے ایک کارڈ ملا، جس میں اس نے اپنے پادری بننے کی رسم میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں جا نہیں سکتا تھا، اس لیے شکریے کا خط لکھ دیا۔

یومِ پاکستان پر اجلاس

ہم نے ۱۴؍اگست کو پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام یومِ پاکستان کی تقریب منعقد کی۔ میں نے انوار اور عمر سے کہا: ''جب یہ تقریب پاکستان کے حوالے سے ہو رہی ہے، تو کھانا بھی پاکستانی ہونا چاہیے''۔ اب کھانے کے انتخاب اور مقدار کا مسئلہ اُٹھا۔ اگرچہ میں نے کبھی کھانا پکایا نہیں تھا، تاہم امریکا پہنچنے کے بعد مرغوب نے مجھے پکانا سکھا دیا تھا۔ جب پکانا شروع کیا تو وہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: ''اچھا ہی پکتا ہے''۔ اس موقع پر میں نے رفقا سے کہا: ''افراد کا اندازہ لگا لیجیے بریانی قسم کے چاول میں خود ہی پکاؤں گا، اس کی آپ فکر نہ کریں''۔ ساتھیوں نے تجویز مان لی۔ مرغی کی بریانی پکائی اور سب نے خوشی سے کھائی۔

اسی اجلاس میں پاکستان کے حوالے سے میری تقریر بھی تھی۔ حاضرین میں پاکستانیوں کے علاوہ دیگر مذاہب اور قوموں کے لوگ بھی موجود تھے۔ اس ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے، میں نے پاکستان سے اسلام، اسلام سے چرچ اور چرچ سے ریاست کے تعلق کو موضوع بنایا اور کہا کہ ''آپ سب کو چرچ، اسٹیٹ اور پاکستان کے تعلق کی بات سن کر حیرت ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ بات اس لیے تعجب خیز نہیں ہے کہ مغرب کا چرچ اور اسلام میں مسجد دو بڑی مختلف بلکہ بالکل ہی مختلف چیزیں ہیں۔ اسلام میں پوری زندگی ایک وحدت ہے، جس میں اللہ ایک ہے، اس کا پیغام ایک ہے، اور اسی ایک پیغام کو آخری رسولؐ نے تمام انسانوں کے لیے پیش کیا ہے۔ اسلام میں رنگ، نسل، نسب پر فوقیت، صرف تقویٰ اور نیک عمل کو حاصل ہے''۔ سب نے بڑی خاموشی سے بات سنی۔ حاضرین نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے روایتی طور پر تالیاں بجائیں اور تقریر کو سراہا۔

ایک ہندو اور ایک عیسائی لڑکے نے کچھ سوالات کیے کہ ''اسلام میں جہاد کا مطلب تشدد ہے، یہ تلوار کے ذریعے پھیلا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کا شافی جواب دیا۔ اگرچہ یہ اجلاس یومِ پاکستان پر تھا، مگر کوئی بات پاکستان پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ پاکستان کی اصل بنیاد

اسلام کو موضوع بنایا تھا۔ یہ اجلاس آج بھی، ایک خوش گوار یاد کے طور پر میرے ذہن میں تازہ ہے۔

اس کے بعد ہم نے ۱۲؍ ربیع الاول کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ ولادت بھی، دعوتی انداز سے منایا۔ جب تک امریکا میں رہا 'محمدؐ کون ہیں؟' کا جملہ میرے ذہن میں مسلسل گونجتا رہا۔ کم وبیش ہر ایسی مجلس یا محفل میں، انداز بدل بدل کر اس جملے کا جواب دیتا رہا۔

جس چیز کو آج کرسچین مسلم ڈائیلاگ کہا جاتا ہے، یہ مکالمہ آج سے چالیس برس پہلے کسی عنوان کے بغیر مینی سوٹا یونی ورسٹی میں ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس میں پہل عیسائیوں نے کی، مگر ہمیں اپنی بات پہنچانے کا نادر موقع مل گیا اور یہ ایک بڑا کامیاب سلسلہ رہا۔ ہم کو اکثر گرجا گھروں میں بلایا جاتا تھا۔ پہلے پہل، ایک چرچ میں تقریر کر کے میں واپس آیا تو دو روز کے بعد دس ڈالر کا چیک میرے نام موصول ہوا۔ مجھے یہ بڑی عجیب سی بات لگی۔ دوستوں سے مشورہ کیا کہ ''یہ کیا ہے بھئی؟'' انھوں نے بتایا: ''یہ یہاں کی روایت ہے کہ مقرر کو تھوڑا بہت اعزازیہ دیا جاتا ہے''۔ میں نے کہا: ''نہیں، میں تو اسے واپس کروں گا''۔ انھوں نے کہا: ''یہ واپس نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس طرح آنے والی انفرادی رقم کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے، اس کو اسلامک سوسائٹی کے بیت المال میں دے دیا جائے تاکہ ان کوششوں میں موصولہ رقم سے کہیں ذاتی مفاد کا مسئلہ پیدا نہ ہو، اور اجتماعی کاموں کے لیے مالیات بھی مضبوط ہو''۔ میں نے بھی اسی روایت کو اختیار کیا۔ حالانکہ میں خود بھی مفلوک الحال ہی تھا۔ یونی ورسٹی دو سو ڈالر وظیفہ دے رہی تھی۔ پہلی سہ ماہی میں فیس تقریباً برائے نام تھی۔ دوسری سہ ماہی سے مجھے جز وقتی کام کرنا پڑا، تاکہ اپنے آپ کو مالی سہارا دے سکوں۔ بہرحال پیسوں کے آنے پر جتنی حیرت ہوئی تھی، انھیں بیت المال میں جمع کرانے پر اس سے زیادہ خوشی ہوئی۔

تین امریکی مسلمان

اس وقت ہمارے علم کی حد تک میناپولس میں تین چار سے زیادہ امریکی مسلمان نہیں تھے۔

ان میں ایک ڈاکٹر ٹی بی اروِنگ صاحب تھے، جنھوں نے امریکن انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ بڑے معروف اسکالر تھے، اور بھی بہت سی کتب لکھی تھیں۔ مینی سوٹا یونی ورسٹی کے شعبہ ہسپانوی زبان وادب میں پروفیسر تھے۔ ان سے بڑا قریبی تعلق قائم ہوا۔ امریکا میں دعوتِ اسلام کے موضوع پر بڑی مفید اور دل چسپ گفتگوئیں ہوئیں۔ بعد میں جب میرا تعلق اسلامک فاؤنڈیشن، لسٹر (برطانیہ) سے ہوا، تب بھی یہ ربط برقرار رہا، اور میرے پاکستان جانے کے بعد بھی وہ خط لکھتے رہے۔

اسی طرح وہاں ایک سیاہ فام نومسلم ایڈورڈ مائیکل تھے۔ ہمارے ہاں ان کا آنا جانا تھا۔ تیسری ایک خاتون تھیں، مسز رینڈالف۔ ان کا تعلق بھی ہماری یونی ورسٹی سے تھا۔ ان کے بارے میں یہی خیال تھا کہ یہ ذہنی طور پر مسلمان ہیں، لیکن اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کرنا چاہتیں۔ انھیں پاکستانی حلقے سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں۔

مرغوب بھائی کی رحلت

میناپولس میں قیام کے دوران ہمارے بھائی مرغوب احمد کا ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کے گردے بے کار ہوگئے تھے اور علاج کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوگئی تھیں۔ مرغوب کے انتقال پر ہم نے ایک تعزیتی اجلاس رکھا۔ اس کے بعد مسز رینڈالف ہمیں اپنے گھر لے گئیں، کھانا کھلایا اور ہمارے آنسو پونچھے۔

مرغوب احمد میرے سب سے اچھے اور گہرے دوست تھے۔ ان سے بڑا گہرا قلبی ربط وتعلق تھا۔ انھوں نے مجھے وہاں پر سیٹ کرنے کے لیے پورا پورا انتظام کیا تھا۔ ان کے

انتقال کو خود یونی ورسٹی میں بھی محسوس کیا گیا۔ بعد میں 'اسٹوڈنٹس وائس' کے ایک خصوصی شمارے میں ہمارے مضامین کے ساتھ یونی ورسٹی کے اساتذہ کے تاثرات بھی شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے مرغوب یہاں پر آئے تھے، پھر انوارالحق اور عمر آئے۔ انھی کی وجہ سے امریکا جا کر پڑھنے کے لیے میرا ذہن بنا تھا۔

چند امریکی روابط

اسلامک سوسائٹی میں ہم فعال کردار ادا کر رہے تھے۔ ہمارے واپس آنے کے سات آٹھ سال بعد مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) بنی۔ ہم نے اسلام کی دعوت، عام سطح پر پھیلانے کے بجائے، سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ انفرادی روابط مستحکم ہوں اور ایک ایک فرد سے ربط قائم کر کے اس کے ذہن میں اسلام کی حقانیت کا نقش بٹھایا جائے۔

اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ عام امریکیوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ میرا یہ تاثر بنا کہ عام امریکی شہری کھلے دل کے مالک ہیں۔ ہمارے جو بھی عقائد اور روایات تھیں، اس سب کے باوجود ان کے ذہنوں میں دوسرے فرد کے لیے بطورِ انسان احترام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ مختلف مقامات پر یہ بات میرے مشاہدے میں آئی۔

ایم ایس انجینیرنگ کے دوران، تحقیق میں میرے سپروائزر پروفیسر اینڈرسن نے میرے کامیاب ہونے پر اپنے گھر میں دعوت کی۔ امتحان میں میرا نتیجہ اے پلس (+A) آیا تھا۔ کھانے کی اس دعوت میں قاضی محمد انوارالحق اور محمد عمر چھاپرا میرے ساتھی تھے۔ پروفیسر صاحب کو پہلے بتا دیا تھا کہ ''ہم گوشت ذبیحہ کھاتے ہیں''۔ انھوں نے بتایا کہ ''میں آپ کے لیے حلال گوشت نہیں لا سکا، البتہ مچھلی کا انتظام کیا ہے۔ آیندہ اگر تم آئے تو میں حلال گوشت کا بھی بندوبست کرلوں گا''۔

اسی طرح ایک یہودی طالب علم سے میرے ذاتی روابط ہوگئے۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے ملتا اور توجہ سے بات سنتا تھا۔ پہلی سہ ماہی کے دوران اسٹرکچرل انجینیرنگ میں

ایک پرچہ ایڈوانس اسٹرکچرز کا تھا۔ سول انجینیرنگ میں میرے پروفیسر اینڈرسن اس کو بھی پڑھاتے تھے۔ ہفتے میں تین دن صبح آٹھ بجے ان کا پیریڈ ہوتا اور نو بجے ختم ہو جاتا تھا۔ میرا یہ ٹیسٹ بھی بہت اچھا ہوا تھا اور اے گریڈ ملا، پھر دوسرا ٹیسٹ ہوا، اس میں بھی اے گریڈ ملا۔ مگر یہ یہودی لڑکا اس پرچے میں فیل ہو گیا تھا۔

ایک دن صبح سویرے جب درجہ حرارت منفی ۲۰ یا ۲۵ درجے تھا، اس کا ہمارے مکان پر فون آیا کہ ''میں پروفیسر اینڈرسن کے پاس گیا تھا، انھوں نے کہا تم اس مضمون میں کسی سے مدد لو۔ میں نے کہا: کس سے مدد لوں؟ تو پروفیسر نے کہا: مراد سے مدد لو۔ اسی لیے تمھیں فون کر رہا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟'' اپنی سخت تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے میں اس قسم کی مدد کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ باقی امتحان بھی اچھے گریڈ میں پاس کروں، کیونکہ اپنے گھربار، وطن اور ماحول کو صرف اسی کام کے لیے چھوڑ کر آیا تھا۔ دوسرا یہ کہ میری عادت رہی ہے، جو بھی ہدف ہو، اس کے لیے پوری توجہ صرف کر کے اپنے وقت کا غالب حصہ لگایا اور اس کو حاصل کیا جائے۔ انسان اپنے وقت اور اپنی قوت کو جگہ جگہ نہ ضائع کرتا پھرے۔ لیکن اس نے اتنا اصرار کیا اور استاد کا حوالہ بھی دیا، اس لیے میں نے کہا: ''تم آجاؤ، میں جو بھی تھوڑی بہت مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوا، کروں گا''۔ اس لیے وہ آتا رہا، میں اسے پڑھاتا اور سمجھاتا رہا۔ اگلا ٹیسٹ آیا تو وہ پاس ہو گیا۔ اس پر وہ بڑا شکرگزار تھا۔ اس نے ہمیں گھر پر بلایا، اس کی بیوی نے بڑے تپاک سے ہماری آؤ بھگت کی۔ اس طرح سماجی سطح پر ہمارا ملنا جلنا رہا۔

اس کے ساتھ بے تکلفی کی فضا میں فلسطین، اسلام، یہودیت، اسرائیل اور عرب دنیا جیسے مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ویسے وہ کوئی بہت زیادہ باعمل یہودی نہیں تھا، یومِ سبت، سور کا گوشت اور شراب وغیرہ میں اس کا رویہ آزادانہ تھا۔ جس طرح بہت سے بے عمل مسلمان بھی کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی تھی کہ اسرائیل کے بارے میں بحث نہ کریں، لیکن کسی نہ کسی شکل میں وہ زیرِ بحث آ ہی جاتا تھا۔

ایک روز بحث تلخی اختیار کر گئی۔ عمر چھاپرا بحث میں الجھ گئے اور وہ پاؤں پٹختا ہوا انھیں 'باسٹرڈ' کہہ کر باہر نکل گیا۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ اس نے ہمارے تمام تر حسنِ سلوک اور وقت کی قربانی کے باوجود یہ گالی دی ہے، اس لیے اس کا سماجی بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ جب ہمارے سماجی بائیکاٹ نے طول پکڑا تو اس نے آ کر معافی مانگی اور کہا کہ ''ہم امریکا میں اسے گالی نہیں سمجھتے، بلکہ پیار محبت میں بھی زچ ہو کر یہ لفظ کہہ دیا جاتا ہے''۔ ہمیں ان کے کلچر کا علم نہیں تھا۔ [بعدازاں بھارت میں قید کے دوران معلوم ہوا کہ اکثر معاشروں میں چند گالیاں اور کچھ سخت جملے ایسے ہیں، جو غصے اور محبت دونوں میں یکساں استعمال ہوتے ہیں]۔ چنانچہ ہم نے اس کی معذرت قبول کر لی۔

اس کے بعد ذاتی سطح پر ہمارے تعلقات اور زیادہ بڑھ گئے۔ جب میں واپسی کے سفر میں نیویارک پہنچا تو اس کی ماں اور بہن نے میری دعوت کی۔ اس سے خط و کتابت بھی رہی۔ ۸۳ء میں جب میں شکاگو گیا، اور اس کا پتا معلوم کر کے فون کیا، تو وہ صرف ملاقات کرنے کے لیے نیویارک سے شکاگو آیا۔ پھر اس کا خط ملا کہ ''تمھارا بیٹا شکاگو میں ہے، اسے کسی قسم کی مالی اعانت کی ضرورت ہو تو میں اس کے لیے ہر وقت حاضر ہوں''۔ ایک یہودی کی طرف سے مالی مدد کی پیش کش میرے لیے غیر متوقع چیز تھی۔ جب وہ ہم سے ملا کرتا تھا تو مجھے کہتا تھا: ''تم ذہین آدمی ہو، پاکستان میں ضائع ہو جاؤ گے، اس لیے امریکا ہی میں رہو''۔ بعد میں جب ۱۹۶۴ء میں میری گرفتاری ہوئی تو اس کا خط ملا۔ ''میں پہلے ہی کہتا تھا، وہاں مت جاؤ''۔ مختصر یہ کہ اس کے یہودی ہونے کے باوجود اچھے مراسم رہے۔ ہم نے دین کے بارے میں اور دینی موقف کے بارے میں ذرہ برابر مداہنت نہ برتی اور اس واقعہ کے سوا اس نے ہماری باتوں کو توجہ سے سنا۔

میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں سے انسانی اور سماجی بنیادوں پر اچھے تعلقات رہ سکتے ہیں اور رکھنے بھی چاہییں۔ یہ چیز دعوتِ دین کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کسی گروہ

سے مکمل مقاطعہ کرنا، یا اس کا ہمیشہ کے لیے سوشل بائیکاٹ کر دینا، کوئی کارنامہ نہیں، بلکہ ایک نوعیت کی پسپائی ہے۔ اس لیے بعد میں جب میں ڈھاکے میں تھا، تو عوامی لیگ کی جانب سے شدید دشمنی کے باوجود، شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی کے چار پانچ افراد سے میرے اچھے تعلقات تھے، اور یہ تعلقات میں نے خود شعوری طور پر بڑھائے تھے۔

اسی اصول کے تحت میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں بھی ہمیں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور دوسری لسانی، مذہبی یا سیکولر پارٹیوں کے ذمہ داران یا فعال لوگوں سے سماجی سطح پر لازمی طور پر روابط رکھنے چاہییں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی حیاتِ طیبہ میں یہ چیز اُبھر کر سامنے آتی ہے، کہ ان کے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے غیر مسلموں سے سماجی روابط تھے۔ پھر مدنی زندگی میں بھی یہ تعلقات رہے اور انھی کے ذریعے ان لوگوں تک دعوتِ حق پہنچنے کا عمل جاری رہا۔ سیرت پاکؐ کے تمام پہلو ہمارے لیے سبق آموز اور عمل کی راہیں بتانے والے ہیں۔ یہ تناظر پیشِ نظر رہے تو پاکستان کی تمام پارٹیوں کے پیرو جو مسلمان ہیں، آخر ان سے ربط رکھنے میں انقباض کیوں محسوس ہو؟

جب موسم گرما آیا تو میں نے یونی ورسٹی ہی کے شعبہ انجینیرنگ میں جز وقتی ملازمت اختیار کرنا چاہی، تاکہ اپنا مالی بار زیادہ بہتر طریقے سے اُٹھا سکوں۔ جو رقم بچ جائے، اس سے آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات بہ آسانی ہو سکے، اور واپسی کا کرایہ بھی نکل آئے۔ آنے کا کرایہ تو بطور قرضِ حسنہ لیا تھا، جس کی ادائیگی ضروری تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کل وقتی ملازمت مل گئی۔ (امریکا کے تعلیمی نظام میں اس چیز کی گنجایش موجود ہے)۔

میرا تحقیق کار ساتھی پیٹرسن اس پراجیکٹ کا انچارج بھی تھا۔ اس سے اچھے تعلقات ہو گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے بارے میں جاننا اس کی دل چسپی کا موضوع بن گیا۔ کافی پینے کے دوران یا جب کبھی وہ اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا، ان موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ کئی مرتبہ اس کی فیملی بھی اس گفتگو میں شریک ہو جاتی۔ اسی

پراجیکٹ میں ایک دوسرا آدمی کرسمس کے موقع پر مجھے پہلے گھر لے گیا اور پھر چرچ۔ وہاں سرمن سے پہلے اس نے احترام کے طور پر اعلان کیا کہ آج ہمارے ہاں ایک پاکستانی مسلمان مہمان بھی موجود ہے۔ گویا کہ طرح طرح کے لوگوں کو ملنے، دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس سے یہ بات تجرباتی اور واقعاتی طور پر راسخ ہوتی گئی کہ اچھے اخلاق، اچھی گفتگو، اچھے برتاؤ اور احترام سے دوسرے فرد کا دل جیتا جاسکتا ہے۔ یہی راہ نمائی قرآن سے بھی ثابت ہے۔

پاکستان ہاؤس میں

اس سے قبل 'پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن' کا ذکر کر چکا ہوں۔ ہم تین چار ساتھیوں نے اپنے لیے دو بیڈ روم کا فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہاں رہنے والے دوسرے پاکستانیوں کی نسبت یہ ایک بڑی رہایش گاہ تھی۔ منیاپولس کے تمام پاکستانی ہمارے ہاں آتے تھے۔ ہمارے بیڈروم ہی نشست گاہ بن جاتے، چائے کے دور چلتے، گفتگو ہوتی، بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان کی کوئی تفریق ہی نہ تھی۔ ہمارے اس گھر کو پاکستانی طالب علموں نے محبت سے 'پاکستان ہاؤس' کا نام دے دیا تھا۔ وہاں آنے والے دوست یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ عمر، انوار یا خرم سے ملنے جارہے ہیں، بلکہ کہتے ''پاکستان ہاؤس جارہے ہیں''۔ پاکستانیوں ہی کا نہیں بلکہ 'اسلامک کلچرل سوسائٹی' کا اجلاس بھی ہمارے ہاں منعقد ہوا کرتا تھا۔

ہم تینوں 'اہلِ خانہ' نے آپس میں ڈیوٹیاں بانٹ رکھی تھیں۔ چائے، کھانا اور آئس کریم سے آنے والوں کی تواضع کرتے تھے۔ کھانے کے وقت جو بھی میسر ہوتا، پیش کر دیتے، تکلف نہ کرنے سے ہمیں بھی سہولت تھی اور آنے والے دوست بھی جانتے تھے کہ ایک طالب علم اس سے زیادہ اور کیا تواضع کر سکے گا۔ اچھا، بُرا، تھوڑا، بہت جو بھی ملتا سب خوشی خوشی کھاتے، بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ ہم وطن کھانے کے لیے تو آتے ہی نہیں

تھے۔ یہ ہمارا اصرار ہوتا کہ جو موجود ہے، وہ حاضر ہے۔ البتہ اجلاسوں کے موقع پر اہتمام سے کھانا پکاتے تھے۔ لیکن چائے وغیرہ تو ہر ملاقات کا لازمی جزو تھی۔ جب قاضی انوارالحق چلے گئے، تو وہاں پر میں اور عمر چھاپرا رہ گئے۔ تب ہم نے تین تین دن کے لیے باورچی خانے کی ڈیوٹی بانٹ لی تھی۔ پاکستانیوں کے آنے پر ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی، اگرچہ دوسرے ملکوں سے مسلمانوں کی آمد پر بھی خوشی ہوتی، مگر اہلِ وطن کا رشتہ ہی کچھ اور تھا۔

ایک مرتبہ یومِ پاکستان منانے کے لیے ہم نے ذرا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔ نمایش لگانے کے لیے ہمارے پاس کوئی چیز نہیں تھی اور نہ کوئی لٹریچر تھا۔ بس تقریر ہی کر سکتے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے کو لکھا تو انھوں نے پاکستان میں زراعت اور صنعت پر ایک گھسی پٹی فلم بھیج دی۔ باقی جگہوں پر تو سب کو اپنا قومی ترانہ یاد ہوتا ہے، لیکن یہاں پر یہ مشکل آن پڑی کہ ترانے کا میوزک ریکارڈ کی صورت میں موجود تھا، مگر ہم پاکستانیوں میں سے کسی کو بھی پورا ترانہ یاد نہیں تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کا قومی ترانہ لکھا بعد میں گیا، پھر اس وقت ہم بڑی کلاسوں میں تھے یا فارغ ہو چکے تھے، اس لیے ترانہ اس طرح یاد نہ کر سکے، جس طرح عام طور پر طلبہ کو یاد ہو جاتا ہے۔ اس مجبوری میں ترانہ تو پھر ریکارڈ ہی سے میوزک میں سنایا گیا، بعدازاں مختلف موضوعات پر مختصر تقاریر ہوئیں۔ سننے والوں نے مجموعی طور پر اچھا تاثر لیا۔

جنرل ایوب کا مارشل لا

۱۹۵۸ء میں پاکستان میں پہلے عام انتخابات کی تیاریاں شروع تھیں۔ جماعت اسلامی نے چودھری محمد علی صاحب کی نظامِ اسلام پارٹی سے مل کر پہلا انتخابی اتحاد [۲۰ مئی ۵۸ء] قائم کیا مگر وہ انتخابات نہ ہو سکے۔

اسی زمانے میں جو سب سے اہم واقعہ پیش آیا، وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے دوران پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ تھا۔ اپنی سوچ اور فکری ساخت کے سبب، مجھے اس واقعے پر شدید رنج اور

سخت غصہ آیا۔ احساس ہوا کہ پوری قوم کے ساتھ بدترین ظلم کر دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ آفتاب رضا صاحب پڑھتے تھے۔ وہ ڈھاکہ سے آئے تھے۔ وہ بڑے ذہین، محنتی اور اچھا سیاسی ذوق رکھتے تھے۔ ان کے والدین بہار سے ہجرت کر کے ڈھاکہ جا بسے تھے۔ اس واقعے پر ان کا ردعمل بھی بڑا شدید تھا۔

یہ مارشل لا دو مرحلوں میں اپنے کمال تک پہنچا تھا۔ پہلے مرحلے میں صدر اسکندر مرزا نے [۷، اکتوبر] مارشل لا لگانے کا اعلان کیا، پھر چند دنوں کے بعد جنرل ایوب خان نے ان کو رخصت کر دیا، اور خود ہی صدر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر [۲۷، اکتوبر] بن گئے۔ ۱۹۵۶ء کا دستور منسوخ ہوگیا، جس میں 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' کا لفظ بھی گیا اور ساتھ ہی 'قراردادِ مقاصد' بھی گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگوں میں اتنا شدید ردعمل ہوا کہ ہم نے سنجیدگی سے آپس میں یہ تک بات بھی کی، کہ اپنے پاسپورٹ پھاڑ کر پھینک دیں۔ اب ہم اپنے ملک میں جا کر کیا کریں گے، جہاں بحیثیت شہری ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے، جہاں ہماری رائے کا کوئی مقام نہیں ہے، سارے اہلِ وطن ایک فردِ واحد سرکاری ملازم کے غلام ہیں، اب اس کی مرضی ہے، جو وہ چاہے کرے، کوئی قانون نہیں ہے۔ انسانی حقوق کا کوئی تعین نہیں ہے ___ یہ مارشل لا تو ۱۹۵۸ء میں لگا تھا، لیکن اس سے پہلے ۱۹۵۳ء میں لاہور کا مارشل لا ہم دیکھ چکے تھے، جس کی تلخی ختم نہیں ہوئی تھی۔

انسان کے بنیادی حقوق، انسان کے مقام و مرتبے، حکومت اور ریاست میں مسلم عوام کے عمل دخل کے بارے میں میری ایک سوچ تھی۔ فکر، حریت، آزادی، احترامِ آدمیت اور مارشل لا کے خلاف یہ رائے ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے وقت بھی پختگی کے ساتھ ذہن میں راسخ تھی۔ یہ سوچ، فکر اور مزاج کس چیز کا نتیجہ تھی، اس کا تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔ ابتدا ہی سے اپنے اندر احساس عدل کو محسوس کرتا ہوں۔ اپنے گھر میں، اولاد کے ساتھ، کاروبار،

کمپنی اور جماعت میں بھی اور کسی کے ساتھ معاملات کرنے میں یہ احساس مجھے سخت محتاط، بیدار بلکہ پریشان رکھتا ہے۔ کہیں بھی زیادتی یا ظلم ہو تو طبیعت پر یہ بہت ناگوار ہوتا ہے۔ اس احساس کو اُبھارنے میں مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے نکلی ہوئی چیزوں نے خاص طور پر بہت متاثر کیا۔ ان چیزوں نے فکری اُٹھان اور ذہنی ساخت میں بنیادی رول ادا کیا تھا۔

اس لیے مارشل لا سے میں کبھی مفاہمت نہ کر سکا، خواہ جنرل ایوب خان کا مارشل لا [۱۹۵۸-۶۲ء] ہو، جس کی لوگ بڑی تعریفیں کرتے تھے۔ جنرل یحییٰ خان کا مارشل لا [۱۹۶۹-۷۱ء] ہو یا مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی ہو یا پھر ۱۹۷۷ء میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کا مارشل لا [۱۹۷۷-۸۵ء] ان میں کبھی کوئی خیر نہیں دیکھ سکا۔ بلکہ پاکستان کی حالت انھی مارشل لاؤں کے سبب مسلسل بگڑتی چلی گئی۔ بہرحال، یہ مارشل لا لگنے اور اس کے انداز و اطوار دیکھنے کے بعد کا ردِعمل نہیں تھا، بلکہ مارشل لا لگنے کے فوراً بعد ہی کا ردِعمل ہے۔ اور ردِعمل بھی اس حد تک شدید کہ، ہم اپنے پاسپورٹ پھینک دیں اور ملک میں واپس ہی نہ جائیں۔ بہرحال یہ جوانی کا جوش اور ایک سنجیدہ احساس تھا۔ اس سے میرے مزاج کی ساخت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان دنوں پاکستان سے ہمارے حلقے اور اپنے گھر سے بھی جو خطوط ملتے تھے، ان میں کسی نہ کسی انداز سے ایوب خان کی تعریف ہوتی تھی ــــــ کوئی شخصیت سے متاثر تھا، کوئی ان کی وجاہت پر فدا تھا، کوئی اس بات پر گھائل تھا کہ اب لوگ قطار بنانے لگے ہیں اور کھانے والی چیزوں کے اُوپر یا دودھ کی دکانوں پر مکھیاں بھگانے کے لیے جالیاں لگ گئی ہیں۔ کوئی اس بات پر نثار ہوا جاتا تھا کہ فوجیوں نے دوپٹے اوڑھا دیئے ہیں اور نظریں نیچے کرا دی ہیں۔

مجھے اس وقت بھی ان خطوں میں کوئی دلیل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس لیے اپنے

دوستوں اور رشتہ داروں کو بڑی تفصیل سے لکھتا رہا کہ ''ڈنڈے کے زور پر دوپٹہ اوڑھا دینا یا نگاہیں نیچی کرا دینا ایسا بڑا کام نہیں ہے۔ اس سے کوئی دیرپا اور مثبت تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی، بلکہ رونا تو اس بات پر چاہیے کہ پوری قوم کو غلام بنا دیا گیا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس ظلم پر لوگ کیوں نہیں تڑپتے، کیوں پریشان نہیں ہوتے یا احتجاج کرنے کے لیے سڑکوں پر کیوں نہیں نکل آتے''۔ مارشل لا کی تعریف سے تو میرے تن بدن میں ایسی آگ لگ جاتی تھی، کہ بیان نہیں کرسکتا۔ ۱۹۶۲ء میں جب مارشل لا اُٹھا لیا گیا، تو پھر وہی باتیں سبھی نے کیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مدلل تنقید اور زوردار محاکمہ مولانا مودودی نے کیا۔

ڈاکٹریٹ کا ارادہ منسوخ

جب امریکا گیا تھا تو یہ ارادہ کر کے گیا تھا، کہ تعلیم مکمل کر کے جلد واپس آجانا ہے۔ وہاں تعلیم کے دوران میرے بہت اچھے گریڈ آئے تھے، اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ ڈاکٹریٹ کے لیے اسکالرشپ مل جائے، اور اگر ڈاکٹریٹ کے لیے رکوں، تو پھر اپنی اہلیہ اور اکلوتے بیٹے احمد عمر کو بھی اپنے پاس بلا لوں۔ میں نے یہ بات اہلیہ کو لکھی، مگر انھوں نے اس پروگرام کی تائید کے لیے دل سے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس طرح ڈاکٹریٹ کا جو تھوڑا بہت ارادہ بنا تھا، وہ بھی ختم ہوگیا۔

جب میں امریکا جارہا تھا تو مولانا مودودی ہماری دعوت پر ہمارے گھر پر آئے تھے۔ میری شادی تو ۵۶ء میں ہوئی تھی، لیکن وہ ولیمہ میں نہیں آسکے تھے کہ لاہور میں تھے۔ اور جب وہ کراچی آئے تو میں نے ان سے کہا کہ ''آپ ولیمہ میں نہیں آئے''۔ مولانا نے اپنی روایتی شگفتہ مزاجی میں جواب دیتے ہوئے کہا: ''آپ مجھے جلدی سے ولیمہ کھلا دیں، جب تک میں ولیمہ نہیں کھا لیتا، شادی رجسٹر نہیں کرتا۔ شادی رجسٹر ہوئے بغیر آپ کے ہاں بچے ہوگئے تو بڑی مشکل پیش آجائے گی''۔

میری اہلیہ اور خاص طور پر سسر صاحب کو مولانا مودودی سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ ہم نے ان کو گھر پر بلایا۔ میری اہلیہ نے کھانا پکایا۔ اس وقت تک میں نے امریکا جانے کی تیاری تقریباً مکمل کر لی تھی۔ میں نے مولانا سے پوچھا کہ ''اگر وہاں پر میرا زیادہ قیام ہو تو کیا اپنی بیوی کو وہیں بلالوں؟'' مولانا نے کہا کہ ''میں یہ رائے نہیں دوں گا کہ آپ عورتوں کو وہاں لے کر جائیں''۔ مولانا کا یہ کہنا بھی ذہنی طور پر ایک رکاوٹ تھا۔ مگر اہلیہ کی عدم آمادگی نے پوری طرح یکسو کر دیا تھا۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کام تو پاکستان میں رہ کر کرنا ہے اور ان شاء اللہ لمبے عرصے کے لیے کرنا ہے۔

انجینیرنگ میں ایم ایس، اے گریڈ میں پاس کر لینے کے بعد وہیں پر نو ماہ تک ملازمت کی اور واپسی کا کرایہ جمع کیا۔ جو پیسے بچ گئے ان سے ایک ریفریجریٹر وغیرہ خریدا اور واپسی کے لیے کمر باندھ لی۔ یہ سفر نیویارک سے لندن تک کوئن ایلزبتھ بحری جہاز میں کیا۔ اس لمبے سفر میں، مَیں اپنے چھوٹے سے کیبن میں اپنی کتابوں میں ڈوبا رہتا تھا

مغرب سے کیا سیکھا؟

اپنے قیام امریکا کے بہت سے پہلوؤں پر جب میں نظر ڈالتا ہوں، تو اسے کئی حوالوں سے مفید پاتا ہوں۔ اس سے زندگی کے معاملات اور حالات کو دیکھنے کے ایک سے زیادہ پہلو سامنے آئے۔

اگرچہ اس سے پہلے جب مغرب سے بجا طور پر ذہنی سطح پر مخالفت تھی، اس وقت بھی اس کی خوبیوں کا معترف تھا اور خرابیاں بھی میرے سامنے تھیں۔ لیکن اس قیام سے بہرحال ایک توازن پیدا ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی اندھی تقلید یا بے جا مذمت داخل نہیں ہوئی، بلکہ مغرب کو دیکھنے اور پرکھنے کا ایک متوازن تعلق قائم ہوا۔ عام طور پر لوگ مغرب میں جا کر بہک جاتے ہیں۔ میرے لیے بھی یہ ایک نازک تجربہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا، جیسا کہ خورشید بھائی نے لمعاتِ زنداں کے مقدمے میں لکھا ہے۔

کیونکہ یہ بات ان سے ہوئی تھی کہ ''میں اپنا ایمان صحیح اور سلامت لایا ہوں، کیونکہ میرے ایمان کی بنیاد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین و اعتماد پر قائم ہے۔ یہ ایک ایسی بنیاد ہے کہ جس میں کوئی دلیل بھی شکست و ریخت پیدا نہیں کرسکتی''۔ اس قیام کے بعد اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ اور زیادہ قوی ہوگیا۔

مزید یہ کہ میں نے مغرب سے جمہوریت، آزادی، استدلال، دوسرے کی سننے اور فرد کے احترام جیسی چیزیں حاصل کیں، جو مستقبل کی زندگی میں بھی میرے کام آئیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے کام کرنا سیکھا، اپنا کھانا اپنے ہاتھوں سے پکایا اور گھر کا کام خود کیا۔ دفاتر میں بھی دیکھا کہ بڑے بڑے لوگ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں، جس میں دوسروں کی میز پر خود چلے جانے میں انھیں کوئی عار نہیں محسوس ہوتا۔ اس کے برعکس پاکستان کے دفتروں میں خاص طریقہ یہ ہے کہ گھنٹی بجا کر دوسروں کو بلایا جاتا ہے۔ بعدازاں ڈھاکہ میں اپنی کمپنی میں جنرل مینیجر، ڈائرکٹر اور دوسرے بڑے عہدوں پر رہا لیکن ٹائپ کا کوئی کام ہوتا تو خود اُٹھ کر ٹائپسٹ کے پاس چلا جاتا۔ اکاؤنٹنٹ اور ڈرافٹس مین سے کوئی کام ہوتا تو اس کے پاس چلا جاتا۔ یہ سب کچھ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ لیکن مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے، کہ میں نے عملی دنیا میں انھیں پاکستان میں کہیں برتتے نہیں دیکھا۔ البتہ ان چیزوں کو مغرب میں برتتے ہوئے دیکھا اور یہ اپنی فطرت سے مجھے زیادہ ہم آہنگ نظر آئیں اور وہیں سے دیکھنے کے نتیجے میں ان کو اختیار کیا۔

میرا رجحان تحقیق کی طرف تھا۔ امریکا میں ایم ایس کے دوران بعض جگہ کورسوں کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالات اور بعض جگہ ٹرم پیپر لکھنے پڑتے ہیں۔ اپنے کورس میں بھی مجھے تین ٹرم پیپرز لکھنا پڑے۔ ان کے لیے بہت محنت کی۔ مفصل کتابیات بنائی اور تحقیقی جرائد کے مضامین تک رسائی حاصل کی۔ تحقیق کا جو ذوق وہاں پر نظر آیا، پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یونی ورسٹی کی بہت اچھی لائبریری تھی۔ سروس بھی بڑی اچھی تھی۔ ان وسائل سے معاونت حاصل کر کے میں نے

بڑی لگن سے پیپرز لکھے، جس پر A + ملا۔ اس مشق سے تحقیق، مواد جمع کرنے اور اسے ترتیب دینے کی بھی تر تیب ہوئی۔

وہاں جا کر مجھے دنیا پرستی تو نہیں آئی۔ ایک لحاظ سے دین میں دنیا کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مگر اس سے پہلے اس کی کوئی وقعت ہی نہیں تھی کہ دنیا میں کیا ہے، کیا نہیں ہے، یہ تصور وہیں سے حاصل کیا۔ اس لیے جب میں پاکستان واپس آیا تو الحمدللہ، وہاں سے کوئی خرابی لے کر نہیں آیا، بلکہ سماجی زندگی میں بہت سی اچھی چیزیں سیکھ کر آیا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں پر اس وقت میں ان کے نسلی امتیاز، کفر، اخلاق باختگی اور صلیبی تعصب کو زیر بحث نہیں لا رہا۔

۷

امریکا سے واپسی

اپریل ۱۹۵۹ء میں، مَیں پاکستان واپس آیا۔

واپسی سے پہلے یہ سوچتا رہا کہ اب جا کر کیا کرنا ہے۔ انجینیرنگ کالج کی ملازمت چھوڑ کر گیا تھا اور اب مارشل لا بھی لگ چکا تھا۔ مارشل لا کے باوجود جماعت کا کچھ نہ کچھ کام چل رہا تھا اس لیے یہاں آتے ہی ان محدود سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کام میں کبھی کوئی وقفہ نہیں آیا۔ مگر اب مغربی پاکستان میں شعبہ تدریس میں ملازمت ملنے کا امکان بہت کم تھا۔ یہ عزم موجود تھا کہ ڈھاکہ جانا ہے۔ اس لیے سوچا کہ مشرقی پاکستان کی انجینیرنگ یونی ورسٹی میں اگر لیکچرر شپ مل جائے تو ملازمت کے ساتھ دعوتی کام کرنا بھی آسان ہوگا۔ مگر یہ سب ارادے خواہشات تک محدود تھے۔ کچی پکی کوششیں ہوتی رہیں، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ملازمت دلا دی، جس کے ذریعے مشرقی پاکستان جانے کی راہ ہموار ہوئی، فھو المراد۔

انجینیرنگ کی ملازمت

ہمارے پڑوس میں حیدرآباد دکن کے عبدالصمد صاحب رہتے تھے۔ ان سے میرے والد صاحب اور خود میرے بھی بڑے اچھے تعلقات تھے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے خواجہ عظیم الدین صاحب نے Associated Consulting Engineers (ACE) کے نام سے ایک کمپنی قائم کی تھی۔ پاکستان میں شاید پہلی کنسلٹنگ (مشاورتی) کمپنی تھی۔

یہ کمپنی پانی اور توانائی کے ذخائر کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں راہ نمائی اور صلاح کاری

کا کام کر رہی تھی۔ عبدالصمد صاحب نے کہا کہ ''میں خواجہ عظیم صاحب سے آپ کا تعارف کرا دیتا ہوں''۔ وہ مجھے ان کے پاس لے گئے۔ اس وقت خواجہ صاحب امریکا سے آنے والے ایم ایس انجینیروں کو رکھ رہے تھے، اور ۸۰۰ روپے تنخواہ دے رہے تھے، جو ۵۸ء، ۵۹ء کے زمانے میں بڑی اچھی تنخواہ تھی۔ ملاقات میں انھوں نے یہ پیش کش کی اور میں نے اس کمپنی میں ملازمت قبول کر لی۔

دین کے ساتھ دنیا

مارشل لا کی وجہ سے جماعت کا تھوڑا بہت حسبِ معمول کام ہو رہا تھا۔ جنوری ۵۹ء میں جمعیت پر بھی پابندی لگ چکی تھی۔ اس زمانے کی تین چیزیں مجھے یاد ہیں۔ ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہمارے چھوٹے بھائی جمعیت سے متعلق تھے۔ وہ سب لوگ جن کی ہم نے جمعیت میں تربیت کی تھی، یعنی شیخ محبوب علی وغیرہ، یہ لوگ اب جمعیت میں اُوپر آ چکے تھے۔ جب میں واپس آیا تو دوستوں نے مختلف جگہوں پر تقریروں کے لیے بلایا۔

میں نے ان نشستوں میں اپنی دانست کے مطابق دعوت کے نقطۂ نظر سے وہی تقریریں کیں جو پہلے کرتا تھا۔ لیکن ایک دن میری بہن نے مجھ سے کہا کہ ''لوگ کہہ رہے ہیں کہ خرم امریکا سے بدل کر آئے ہیں''۔ میں نے پوچھا: ''کیوں؟ کیا ہوا؟'' دراصل جو چیز لوگوں کو محسوس ہوئی، وہ میرا یہ کہنا تھا کہ ''یہ کام مثلاً دریائے سندھ یا دریائے برہم پترا وغیرہ پر ڈیم بنانا، نہریں کھودنا، اور معدنیات تلاش کرنا وغیرہ بھی ثواب، عبادت اور دین و دنیا کے کام ہیں۔ یہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ ان کاموں کو اللہ کی رضا، بندگانِ خدا کی خدمت اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے کرنا کوئی سیکولر یا محض دنیاوی کام نہیں ہے۔ مگر اس کے لیے شعور کو زندہ و بیدار رہنا چاہیے'' وغیرہ وغیرہ۔

یہ رجحان، کہ دنیا کی ہر چیز کو رد کر دینا ہے، یا ان کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں ہے، ایک قطعی نامناسب رجحان ہے۔ چونکہ عمومی طور پر عوام الناس میں یہی چلن تھا، اس لیے میری یہ باتیں لوگوں کو 'تبدیلی' محسوس ہوئی۔ البتہ کسی اختلافی یا دینی مسئلے پر میری رائے

نہیں بدلی تھی، لیکن امریکا جانے کے بعد یہ ضرور ہوا کہ عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں کو بڑے پیمانے پر کرنے کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ یہ باتیں بھی میرے بارے میں 'تبدیلی' کے اس تاثر کو بڑھا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی ارتقا اور تغیر تو ہو ہی رہا ہوگا، جسے دوسروں نے محسوس کیا ہوگا۔ کیونکہ آدمی کو خود اپنی فکر کی حدودِ اربعہ کا پورا اندازہ نہیں ہوتا، جتنا دوسروں کو ہو جاتا ہے۔

سیٹر ڈے کلب

ہم چند دوستوں نے جو جماعت سے متعلق تھے، اور سب جمعیت کے سابق تھے، مثلاً خورشید، ظفر اسحاق، منظور، عبداللہ جعفر اور دوسرے احباب، ہم نے Saturday کلب کے نام سے مل بیٹھنے کا ایک سلسلہ بنا لیا تھا۔ ہفتہ کے دن زیلن کافی ہاؤس، صدر میں ہماری نشست ہوتی تھی۔ اسی ریستوران میں زیرزمین کمیونسٹ پارٹی کے دانش ور بھی آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ ہم لوگ یہاں پر چائے یا کافی پیتے تھے اور مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرتے تھے۔

ایک روز میں نے یہ تجویز پیش کی: ''ساتھی لکھ کر خیالات پیش کریں۔ جس میں بتایا جائے: ''تحریک کے کام کی اشاعت و ترویج، مارشل لا کی پابندی اور ان سماجی حالات وغیرہ میں جماعت، جمعیت کی کیا حکمت عملی ہونی چاہیے؟'' ساتھیوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ دوسروں نے بھی اپنے خیالات لکھ کر پیش کیے ہوں گے، بہر حال میں نے بڑی محنت اور سوچ بچار کر کے اپنا مضمون لکھا اور پھر وہاں پیش کیا تھا۔ یہ مضمون بھی سقوطِ ڈھاکہ کی نذر ہو گیا۔ بلا کسرِ نفسی، وہ ایک قیمتی چیز ہوتا اگر اس وقت سامنے ہوتا۔ اس مضمون میں اٹھائے گئے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے لیے کئی نشستیں ہوئیں۔

ہمارا یہ کلب کچھ عرصے تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ مکالمے کا معیار بہت بلند تھا۔ تحریک سے ہمدردی اور اس کام کے لیے دردمندی اور بے لوثی ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔

الیکشن میں حصہ

جنرل ایوب خان نے مارشل لا کے تحت بنیادی جمہوریتوں (BD) کا نظام نافذ کیا۔ سیاسی پارٹیوں پر پابندی تھی۔ اس لیے جماعت نے طے کیا کہ ہم اپنے نام سے تو انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے، تاہم ہمارے افراد کو حصہ لینا چاہیے۔

پیر کالونی کی لوکل باڈی ۱۷ ممبروں پر مشتمل تھی۔ اس کالونی میں جماعت اسلامی کی تنظیمی اور سیاسی پوزیشن کافی مضبوط تھی۔ جس کے ثبوت کے طور پر ۱۹۵۷ء میں کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن، الیکشن میں جماعت کی بھرپور کامیابی پیش کی جاتی تھی۔ اس پس منظر میں جماعت نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے بھی انتخاب میں حصہ لیا جائے۔ امریکا سے آنے کے بعد جماعت نے مجھے ذمہ دار بنایا کہ کالونی میں انتخابی مہم کا منصوبہ بناؤں۔ میں نے یہ پلان بنایا کہ ہم ۱۷ میں سے ۹ سیٹوں پر حصہ لیں۔

جماعت نے مجھے بھی بطور امیدوار نامزد کردیا۔ یہ میرا پہلا اور آخری الیکشن تھا۔ ہمارے پڑوس میں باقر صاحب حیدرآباد، دکن سے آئے تھے۔ ان کے بھائی جمعیت میں اور وہ خود جماعت میں تھے۔ وہ بھی امیدوار تھے۔ طلعت سلطان بھائی کے والد سلطان احمد صاحب مشہور ایڈووکیٹ تھے۔ ہمارے قریب ہی رہتے تھے، وہ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فرد کا ایک ایک ووٹ تھا اور یہ اصول مقرر کیا گیا تھا کہ سب سے زیادہ ووٹ لینے والے پہلے سترہ افراد منتخب کر لیے جائیں گے۔

ہم نے بہت اچھی مہم چلائی۔ لیکن الیکشن کے دن ہم پولنگ اسٹیشن پہنچے، تو معلوم ہوا کہ تین چار سو ووٹروں کی ایک قطار صبح سے لگی ہوئی ہے۔ ہم نے کالونی میں ان سب لوگوں کی کبھی شکل نہ دیکھی تھی۔ مسئلہ وہی تھا جو ہمیشہ سے جماعت کے ساتھ چلا آرہا ہے، یعنی یہ کہ شہری علاقوں میں کم درجے کی بستیوں اور وہاں کے لوگوں تک ہماری پہنچ نہیں ہوتی۔ بہرحال، وہ سب لوگ تو اپنا کھانا لے کر پہنچ گئے۔ جب کہ ان کے بالمقابل سفید پوش لوگ دُور ہی سے یہ لمبی قطار دیکھ کر چلے جاتے تھے کہ کون اتنی دیر کھڑا رہے۔

ہمارے پختہ ووٹرز تو کٹھن حالات کا سامنا کرنے کے لیے شریک تھے، لیکن معلوم ہوا کہ گنے چنے لوگوں کے علاوہ ہمارے تو ووٹ ہی نہیں پڑ رہے۔

پولنگ کے دن میرا خیال تھا کہ ہمارا کوئی ایک بھی امیدوار منتخب نہیں ہوگا۔ اس لیے میں نتیجہ سنے بغیر گھر چلا گیا۔ گھر جانے کے بعد رات کو یا صبح کے وقت باقر صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ ''ہم دونوں یعنی آپ اور میں منتخب ہوگئے ہیں''۔ میں نے کہا ''یہ کیسے ہوگیا''۔ انھوں نے تفصیل بتائی، جس سے معلوم ہوا کہ سولھویں نمبر پر میرا نام تھا اور سترہویں نمبر پر خود باقر صاحب کا نام تھا۔ اس کے بعد ہمارے باقی ساتوں امیدوار وہیں قریب لگے ہوئے تھے۔ اگر ہمارے دو نمایندے کم ہوتے تو ان کے ووٹ بھی ان کو مل جاتے۔ یوں ہمارے ساتوں امیدوار کامیاب ہوجاتے۔ یہ ہمارے اندازے کی بڑی سنگین غلطی تھی، جس کا میں ذمہ دار تھا۔

طلعت سلطان بھائی کے والد سلطان صاحب تو بہت خفا ہوئے، کیونکہ وہ ہار گئے تھے۔ وہ بہت نام ور وکیل تھے۔ ان کو شکایت تھی کہ ''تم خود جیت گئے، لیکن میں نہیں جیتا''۔ حالانکہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ میرے جیتنے میں میرے سسرال کا دخل زیادہ تھا۔ کالونی کے اندر میرے بہت سے سسرالی رشتہ دار رہتے تھے۔ اپنی جگہ وہ ہر قیمت پر مجھے جتانے کے لیے لائن میں کھڑے ہوئے تھے۔ باقر صاحب کو حیدر آبادی ہونے کے ناطے سے اور خاندانی تعلقات کی بنیاد پر ووٹ ملے تھے۔

اسی وقت مجھے یہ اندازہ ہوا کہ معاشرے میں نظریات کی اہمیت اور گرفت اپنی جگہ، لیکن اس کے ساتھ شخصی اور سماجی روابط اور خاندانی تعلقات بھی بڑے اہم ہوتے ہیں۔ ان عوامل کو ہم لوگ تحریک میں عموماً نظر انداز کردیتے ہیں۔ بس یہ سمجھتے ہیں کہ جب نعرۂ حق بلند کیا ہے، تو پھر اس کے لیے لوگ خود بخود جمع ہوجائیں گے۔ حالانکہ لوگ نظریات سے ہٹ کر بھی مختلف بنیادوں پر جمع ہوتے ہیں۔

اس الیکشن کے کچھ ہی عرصہ بعد میں ڈھاکہ چلا گیا اور جب قومی اسمبلی کے الیکشن

ہوئے تو میں نے وہاں سے کراچی آ کر اپنا ایک ووٹ دیا تھا، کیونکہ ہم اسمبلی الیکشن میں ایک ووٹ کو بہت قیمتی سمجھتے ہیں۔

کمپنی میں پیش رفت

کمپنی میں سب لوگ میری عمر ہی کے تھے، یا مجھ سے بھی کم عمر۔ ان میں سے اکثر لوگ امریکا کے پڑھے ہوئے تھے۔ بڑا خوش گوار ماحول تھا۔ ان انجینیروں میں خواجہ عظیم الدین صاحب کے بعض رشتہ دار بھی تھے۔ جو چار پانچ افراد مجھ سے سینیر تھے، ان میں سب سے نمایاں عبدالرزاق صاحب تھے۔ وہ ہمارے سیکشن کے افسرِ اعلیٰ تھے۔

اسی دوران میں ہماری کمپنی کو دریائے برہم پتر (گنگا)، کے آبی ذخیرے کے تحفظ کا ایک پراجیکٹ ملا۔ اس دریا کا راستہ تبدیل کر کے ایک نہر بنانا تھی۔ اس عمل میں جب آپ بند باندھ لیں تو پیچھے پانی جمع ہو جاتا ہے، جس کو بیک واٹر (back water) کہتے ہیں۔ ایسے منصوبے پر کام کے دوران اس 'بیک واٹر' کا اندازہ کرنا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ اس کے آگے بند بنانا ہوتا ہے۔ اس کے بڑے پیچیدہ calculations (تخمینے) ہوتے ہیں۔ اب صورت یہ تھی، کہ میں نے تو کبھی ہائیڈرالکس (آبی ذخائر پر کام کا علم) پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہ مٹی کے بندوں اور نہروں کے نظام کا بڑا فنی اور تکنیکی مضمون ہوتا ہے۔

میں کمپنی میں سبھی کام لگن سے کر رہا تھا۔ عبدالرزاق صاحب میرے کام سے بہت خوش تھے، بلکہ اب تک ان سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''بھئی، یہ کام کون کر سکتا ہے؟'' میں نے ہاتھ کھڑا کر کے کہا: ''یہ کام میں کروں گا، ان شاء اللہ''۔ انھوں نے کہا کہ ''ٹھیک ہے، یہ لیجیے، آپ کیجیے''۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے یہ تک نہ پوچھا، کہ یہ مضمون تو تم نے پڑھا نہیں ــــــ اور نہ مجھے ہی ہاتھ کھڑا کرتے وقت کچھ تردّد ہوا۔

اس کے بعد میں نے لائبریری سے ساری کتابیں نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں چونکہ جماعت کا کوئی پبلک کام نہ تھا، جلسے اور اجتماعات نہیں تھے، اس لیے رات کو

نو، دس بجے تک بیٹھ کر میں نے اس کو مکمل کرلیا۔ کمپنی میں کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔ اس کام سے میرے پیشہ ورانہ عروج کا راستہ نکل رہا تھا۔ اگر میں آگے بڑھ کر نہیں کہتا، کہ ہاں میں کرلوں گا، وہ کام جو میں بالکل نہیں جانتا تھا، تو پھر میں نہ سیکھ سکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس سے عبدالرزاق صاحب پر بڑا اچھا تاثر پڑا اور خواجہ عظیم الدین صاحب بھی خوش ہوئے۔ ان پر دوسرا تاثر اس وقت قائم ہوا، جب رپورٹ لکھنے کا مرحلہ آیا۔ جمعیت میں رہ کر محنت کی عادت ہوگئی تھی، جب کہ تحقیقی ذوق کی آبیاری امریکی یونی ورسٹی میں تعلیم کے دوران ہوئی تھی۔ اس تجربے کی بنیاد پر میں نے کہا کہ ''رپورٹ میں آپ کو لکھ دوں گا''۔ جب یہ رپورٹ لکھی تو وہ ان کو بہت پسند آئی۔

مشرقی پاکستان کی طرف

پاکستان میں برق وآب کے قومی ادارے 'واپڈا' نے وہ رپورٹ بھی منظور کرلی۔ جس کے نتیجے میں ACE کمپنی کو مشرقی پاکستان میں دو پراجیکٹ مل گئے۔ مشرقی پاکستان میں کمپنی کا معمولی سا دفتر تھا۔ اس لیے باقاعدہ دفتر کھولنے کا فیصلہ ہوا۔ عظیم الدین صاحب نے اس کا انچارج عبدالرزاق صاحب کو بنایا۔ عبدالرزاق صاحب نے کہا کہ ''میں کچھ لوگ یہاں سے لے کر جانا چاہتا ہوں''۔ عظیم صاحب نے ان سے کہا: ''آپ جس کو بھی لے کر جانا چاہتے ہیں، لے جایئے''۔ عبدالرزاق صاحب نے مجھ سے پوچھا: ''کیا تم چلو گے؟'' میرے ذہن میں یک دم یہ منظر اُبھر آیا کہ ۱۹۵۴ء میں سید اسعد گیلانی صاحب تو چودھری علی احمد خان صاحب کے بلانے پر گئے تھے، لیکن میرے دل کی آرزو کی تکمیل کا ذریعہ تو اللہ تعالیٰ میری کمپنی کو بنا رہا تھا۔

یہ سب اللہ کا فضل، اس کی رحمت اور اسی کی مشیت تھی۔ اس میں نیت کا خلوص تھا کہ اس نے وہاں جانے کا سامان پیدا کردیا۔ کمپنی کے انجینیروں میں سے کوئی اور وہاں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ سب کراچی میں بسے ہوئے تھے جہاں ان کے مکان تھے، فیملی تھی۔ میرا تو کراچی میں کوئی ایسا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ اہلیہ تھیں، سوا دو سال کے احمد تھے اور

۲،۳ماہ کے حسن صہیب تھے۔ میں نے ان کی پیش کش سنتے ہی فوراً: ''میں جاؤں گا ضرور، لیکن اتنے معاوضے پر نہیں جاسکوں گا''۔ کمپنی کی ضرورت بھی تھی، اس لیے انھوں نے مجھے ۸۰۰ روپے سے ایک دم ۳۵۰ روپے ترقی دیتے ہوئے ۱۱۵۰ روپے تنخواہ کردی اور سینیر انجینیر کے عہدے پر ترقی دے دی۔ پھر میں نے کہا: ''میرے پاس مکان نہیں ہے''۔ انھوں نے کہا: ''اچھا، ۱۵۰ روپے مکان الاؤنس دیں گے''۔ اس زمانے میں ۱۵۰ روپے مکان الاؤنس بہت زیادہ تھا۔ میں نے کہا: ''بس یہ ٹھیک ہے۔ آپ کے ساتھ چلوں گا''۔

اس وقت تک کمپنی میں کام کرتے ہوئے آٹھ نو مہینے ہو چکے تھے۔ اتنے عرصے سے میں مشرقی پاکستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اللہ کا بڑا شکر ہے کہ اس نے اپنے کرم سے اس کے لیے راستہ بھی نکال دیا، اور وہاں جاکر کام کرنے کا موقع بھی دے دیا۔ چنانچہ ہم نے سامانِ سفر باندھا۔ ہمارے دفتر میں لوگ اس نقل مکانی پر میری خوشی اور سرگرمی دیکھ دیکھ کر حیرت کرتے تھے۔ میری بڑی بہن [نفیسہ خاتون] اس وقت لائل پور (فیصل آباد) میں تھیں۔ میں نے سوچا کہ ڈھاکہ جاتے وقت ان سے ملتے ہوئے جائیں گے اور لاہور سے پرواز لیں گے۔ ہم ریل گاڑی سے فیصل آباد گئے اور وہاں سے لاہور پہنچے۔ لاہور سے یہ چھوٹا سا خاندان جو بیوی اور دو چھوٹے بچوں پر مشتمل تھا، ڈھاکہ روانہ ہوا۔

یہ طے شدہ بات تھی کہ ملک میں اگر تبدیلی آنا تھی تو جمہوری انداز سے آنا تھی۔ اگر جمہوری انداز سے آنا تھی، تو مشرقی پاکستان کی اکثریت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ جب چند سال پہلے ۲۰،۲۲ روزہ قیام (جون ۵۷ء) کے دوران ڈھاکہ میں لیڈروں اور عام لوگوں سے میری جو ملاقات ہوئی تھی، اس وقت سے یہ خیال تھا کہ بنگال کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ لوگ صاف دل ہیں، معیارِ زندگی اتنا بلند نہیں ہے اور نہ اس نوعیت کی مادی دوڑ میں ہلکان ہیں، جس کا منظر مغربی پاکستان میں ہر کوئی دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ یہاں پر زیادہ آسانی کے ساتھ دعوت کے بیج بوئے جاسکتے ہیں، جن سے اچھی فصل پروان چڑھ سکتی ہے۔ یہ تجزیہ غلط نہیں تھا۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا، کہ

دعوت کے لیے مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی سرزمین یقیناً بہت زیادہ زرخیز تھی۔

قدموں نے ڈھاکہ چھوا

یہ جنوری ۱۹۶۰ء تھا، جب ہمارا ہوائی جہاز ڈھاکہ کے ایئرپورٹ تیج گاؤں پر اُترا۔

مشرقی پاکستان میں ہمارا استقبال کمپنی کے افراد نے کیا۔ ایک نئی جگہ رہایش اختیار کرنے کے لیے مکان سمیت جو بنیادی ضروریات ہوسکتی تھیں، انھوں نے فراہم کیں۔

مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اُترتے وقت بنگال میں تحریک کا کام کرنے کی میری تمنا پوری ہورہی تھی اور یہ احساس تھا کہ سامنے ایک نئی زندگی ہے، جو امکانات اور مواقع سے بھرپور ہے۔ اس وقت دل میں ایک شادابی اور تازگی تھی، امنگیں اور ولولے جوان تھے، جذبات واحساسات میں بالیدگی تھی، عمر بھی جوانی کی تھی، یعنی ۲۷ سال کا تھا۔ اس زمانے کے برعکس جب میں انگلینڈ سے لاہور گیا اور اب لاہور سے یہاں پر آیا ہوا ہوں، اس دوران الحمدللہ اگرچہ کام تو کررہا ہوں، لیکن آج کل فرائض کا بوجھ دل ودماغ کو بوجھل کیے رہتا ہے۔ ۳۵ برس پہلے بھی فرائض سامنے تھے، مگر عمل کے لیے طبیعت میں ایک خاص طرح کی جولانی تھی۔ ہمت، حوصلہ، تازگی اور اُمنگیں موجود تھیں، کہ جو کچھ بھی ہے، جتنا بھی بڑا چیلنج ہے، اپنا فرض یہیں ادا کرنا ہے، اوران شاءاللہ اس کا موقع ملے گا۔

رفقاے جماعت

وہاں پہنچتے ہی جماعت سے میرا کوئی گہرا ربط قائم نہیں ہوا۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مارشل لا لگا ہوا تھا اور اس وجہ سے جماعت کا نظم برسرِ زمین موجود نہیں تھا، بلکہ 'تعمیرملت' کے نام سے محدود سا کام ہورہا تھا۔ نواب پور روڈ پر باڑی لین میں ایک گلی کے اندر چھوٹے سے دو تین تنگ وتاریک کمروں میں اس کا دفتر تھا، جس کے اُوپر ایک بڑا کمرہ تھا۔

مولانا عبدالرحیم صاحب ان دنوں کالعدم جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے امیر تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی، ان کی طبیعت میں سادگی، محبت، علم اور تحریک سے گہرے تعلق نے، اور جس قربانی کے ساتھ وہ جماعت کا کام کر رہے تھے، ان عوامل نے مجھے بہت متاثر کیا۔ تواضع اور انکسار تو تمام بنگالیوں کا قومی خاصا تھا۔

اسی طرح پروفیسر غلام اعظم صاحب تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت میں رچی ہوئی جاذبیت اور جذبات کی یورش نے دل، دماغ اور طبیعت کو محبت کے لیے استوار کر دیا۔ ان کی پیشانی، چہرے اور اطوار سے ان کی صلاحیتیں روشنی بکھیر رہی تھیں۔ ان کی اس باغ و بہار شخصیت نے میرے دل میں گھر کر لیا۔

سید فیاض الدین اس وقت پریس میں کام کرتے تھے۔ ۵۷ء کے سفر میں ان سے ڈھاکہ میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اب یہاں پہنچا تو انھی کے ساتھ میرا زیادہ ربط قائم ہوا تھا۔ ان کے گھر آنا جانا ہوا۔ پریس میں ان کے پاس جاتا، ان کے ساتھ بیٹھتا، اور گفتگو میں شریک ہوتا۔ وہ مجلسی آدمی ہیں اور محبت سے بات کرتے ہیں۔ یہ تعلق بہت گہرا ہوتا چلا گیا—— ان کے علاوہ جماعت کے اور بھی لوگ تھے، جن سے ملاقات رہی۔

پیشہ ورانہ دل چسپی

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، کہ ابھی یہ تعلق جماعت کی باقاعدہ سرگرمیوں تک نہیں گیا تھا، اس لیے اس وقت سرگرمیاں کوئی ویسی نہیں تھیں، کہ جن میں حصہ لیتا۔ یہ جنرل ایوب خان کا دورِ حکمرانی تھا۔ وہاں جانے کے بعد سیاست میں اس حد تک دخل رہا، کہ جب بھی جماعت کے رفقا سے ملاقات ہوتی تھی، تحریک کے کام کے بارے میں ہی بات ہوتی تھی۔

پہلی بات یہ ہے کہ واضح تحریکی اہداف رکھنے کے باوجود میرے ذہن میں اس وقت پہلی ترجیح کمپنی ہی کا کام تھا۔ بظاہر لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب لگی، کہ تحریک کا نمایاں

آدمی ہوتے ہوئے یہ شخص وہاں پہنچتے ہی پہلے روز سے کیوں اتنا سرگرم نہ ہوگیا؟ میرے ذہن میں ابتدائی طور پر اپنے پیشہ ورانہ کام اور ملازمت کی ترجیح تھی۔ اس کی ٹھوس وجوہ بھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ، جو کام بھی آدمی اپنے ذمے لے، اسے اچھی طرح اور احسن طریقے سے کرے۔ میری طبیعت میں یہ پہلو ہمیشہ حاوی رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے میری بیماری کی جو تحقیقات کی ہیں کہ اسے ہارٹ اٹیک کیوں ہوتے ہیں؟ تو اس میں سب سے بڑی وجہ یہ قرار دی ہے، کہ یہ آدمی اپنے ہر کام کو بہتر سے بہتر طریقے سے کرنا چاہتا ہے، اس کی فکر میں گھلتا ہے اور دل کو پگھلاتا ہے کہ پھر بیمار ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ تھی، کہ میرے نزدیک امانت اور دیانت کا تقاضا بھی یہ تھا، کہ جس کمپنی نے مجھے اتنا معقول مشاہرہ دیا ہے، اور اپنے کام کے لیے خاص طور پر یہاں بھیجا ہے، تو سب سے پہلے مجھے اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔

تیسری بات یہ تھی کہ پہلا تاثر ہی گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ میں نے کراچی میں آٹھ نو مہینے کے دوران بحیثیت انجینیر، کمپنی میں اپنا جو وقار اور ساکھ قائم کر لی تھی، اسی وجہ سے انھوں نے مشرقی پاکستان بھیجا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ایک امریکی انجینیرنگ کمپنی کے ساتھ ہماری کمپنی کا مشترک پراجیکٹ چل رہا تھا۔ پراجیکٹ کی پہلی رپورٹ میں نے کراچی سے لکھ کر دی تھی اور اسی کو اب آگے بڑھاتے ہوئے کام کرنا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ یہ کام کرنے اور سیکھنے کا موقع ہے۔ ویسے بھی آب و برق کے منصوبوں کی یہ لائن میرے لیے بالکل نئی تھی۔

اسی طرح یہ احساس بھی تھا، کہ اگر اپنے آپ کو پیشہ ورانہ طور پر منوا لوں گا، تو کمپنی میں رہتے ہوئے آیندہ مجھے تحریک کے کام میں بڑی سہولتیں مل سکیں گی۔ اس وقت چونکہ جماعت بحیثیت جماعت فعال نہیں تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ایک موقع ملنا تصور کیا۔ اگر جماعت بہت فعال ہوتی تو مجھے اس کام میں پوری طرح لگنا پڑتا۔ اس لیے سمجھا، یہ حسنِ قسمت کی بات ہے کہ اللہ نے ایک ایسے وقت یہاں پہنچایا اور موقع دیا ہے،

جس کا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ الحمدللہ میں نے اس موقع سے، اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی اور ان کا فہم حاصل کرنے کے لیے بھرپور استفادہ کیا۔

دو برسوں کے اس کام کا یہ نتیجہ تھا، کہ میں بہت تیزی سے کمپنی کے ٹاپ پر پہنچ گیا۔ پھر اس انداز سے کام کرنے کی سہولت مل گئی، جیسا کہ اکثر مواقع پر ہمہ وقتی کارکنان کو بھی میسر نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی میری پوزیشن اور کمپنی کے وسائل یعنی گاڑی، آفس اور ٹائپسٹ وغیرہ کا ایک حصہ جماعت کی خدمت کے لیے کفایت کرنے لگا۔ اس وقت وہاں پر جماعت خستہ حالت میں تھی۔ اگر میں کمپنی میں کوئی مقام نہ بناتا، تب بھی مجھے اپنے معاش کے لیے تو صبح سے شام کمپنی میں کام کرنا پڑتا اور ترقی نہ کرتا، حالت بھی بہتر نہ ہوتی اور شاید جماعت کا کام بھی اتنا نہیں کر پاتا۔

اس لیے جنوری میں وہاں جانے کے فوراً بعد میرے سامنے سب سے بڑا کام یہ تھا، کہ پراجیکٹ کی رپورٹ تیار کی جائے اور ڈیزائن تیار کیا جائے۔ امریکا اور باہر کے دوسرے انجینیروں کے ساتھ کام کی جگہیں (sites) جا کر دیکھی جائیں اور دورے کیے جائیں۔ اسی طرح کمپنی کا نیا دفتر بھی سیٹ کرنا تھا۔ میں، عبدالرزاق صاحب کا دست راست تھا، جو خاص طور پر مجھے ایڈمنسٹریشن میں لے کر آئے تھے۔ اس لیے ہر مشورے، فیصلے اور عمل میں شریک ہونا پڑتا تھا۔

چنانچہ یہاں پہنچ کر پہلے ڈیڑھ سال تک جماعت کے ساتھ میرا تعلق سرسری سا تھا۔ اگرچہ میں اس وقت تک جماعت کا رکن نہیں تھا، مگر ان کی مرکزی نشستوں میں شریک ہوتا تھا۔ گفتگو اور بات چیت ہوتی تھی۔ ستمبر، اکتوبر ۶۰ء تک ہم نے کمپنی کے منصوبے کا ڈیزائن مکمل کرلیا۔

دوبارہ امریکا روانگی

اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ "اس منصوبے کے ڈیزائن اور رپورٹ کو امریکا میں فائنل کیا جائے گا"۔ منصوبے میں شریک امریکن کمپنی کا صدر دفتر ڈینور شہر (کولوریڈو ریاست)

میں تھا۔ اس کمپنی نے بطور پراجیکٹ انجینیر مجھے امریکا آنے کی دعوت دی، تاکہ کام کا یہ مرحلہ مکمل کرسکوں۔ چنانچہ ایک سال کام کرنے کے بعد جنوری ۱۹۶۱ء میں ڈھاکہ سے امریکا گیا۔ اپنی بیوی اور بچوں کو کلکتہ چھوڑ گیا، جہاں سے ان کے بھائی انھیں بھوپال لے گئے۔ اس زمانے میں 'راؤنڈ دی ورلڈ' ٹکٹ چھے ہزار روپے میں آیا کرتا تھا۔

راستے میں بنکاک رُکا۔ وہاں پر، ڈھاکہ میں متعارف ہونے والے انجینیر نے میرا خیرمقدم کیا۔ ہانگ کانگ ٹھیرا اور کچھ خریداری کی۔ پھر ٹوکیو میں ایک رات دن گزارا۔ اس کے بعد سان فرانسسکو پہنچا اور وہاں سے ڈینور، ڈینور میں ڈھائی مہینے تک پراجیکٹ پر کام کرتا رہا۔ اس سے مجھے اضافی الاؤنس کے طور پر اچھا مالی فائدہ بھی ہوا اور خود امریکیوں پر بھی دھاک بیٹھی، جب کہ میں نے اپنے میدانِ کار سے متعلق مزید سیکھا بھی۔

واپسی کا سفر

کمپنی کا کام مکمل کرنے کے بعد واپسی کے دوران پہلے لندن رُکا۔ لندن سے میں جمیل احمد خان کو ملنے گیا، وہ کراچی جمعیت کے رکن اور ناظم بھی رہے تھے۔ اسی طرح اسٹوڈنٹس وائس کے بھی ایڈیٹر رہے تھے۔ ہمارے ربط کے دوران انھوں نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔ بعد میں وہ این ای ڈی انجینیرنگ یونی ورسٹی، کراچی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ان دنوں یہ میونخ یا لندن میں ہوتے تھے۔ وہاں ایک رات میں نے ان کے پاس گزاری۔ انھی کی رفاقت میں وہاں پر موجود 'اخوان المسلمون' سے متاثر عرب طلبہ سے واقفیت حاصل ہوئی۔ پھر میں جنیوا چلا گیا اور ایک دن سعید رمضان کے ہاں مہمان رہا۔ اس کے بعد ترکی میں استنبول گیا۔

یہاں سے لبنان کے شہر بیروت پہنچا۔ وہاں پر کراچی میں زمانۂ طالب علمی کا ایک عرب دوست مجھے ایئرپورٹ لینے آیا۔ اس کا تعلق 'عباد الرحمٰن' سے تھا۔ اس نے اپنے گھر پر مہمان رکھا، اس کے ہمراہ میں نے 'خالد بن ولید' فلم دیکھی۔ جمعیت کے زمانے میں فلم دیکھنا حرام تھا اور ایسے فرد کو جمعیت سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں کسی مذہبی فلم کا

تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ اس سے پہلے امریکا کے قیام کے دوران ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ "Ten Commandments کے نام سے ایک بہت ہی اچھی فلم آئی ہے۔ پلاٹ اور فوٹوگرافی کے لحاظ سے بھی دیکھنے کے قابل ہے، جس کا موضوع حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہے۔ چلو دیکھیں"۔ میں دیکھنے چلا گیا۔ اوپن ایئر سینما ہوتے تھے۔ تین گھنٹے کی یہ فلم ہم نے گاڑی میں بیٹھے دیکھی اور واقعی مجھے پسند آئی۔

اب بیروت میں یہ دوسری فلم تھی، جو میں نے دیکھی۔ تعجب ہوا کہ صحابہ کرامؓ پر فلم بن رہی ہے۔ اس فلم کے لیے ساتھی نے اصرار کیا تھا، جس پر مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں کس طرح انھوں نے پیش کیا ہے۔ اس کے بعد دمشق آ گیا۔ جہاں رضوان صاحب مقیم تھے۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے تعارف ہوا۔ اسی دوران، شام میں 'اخوان المسلمون' کے مرکزی رہنما جناب ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی سے بھی یادگار ملاقات ہوئی۔

عمرہ

دمشق سے جدہ گیا اور وہاں سے مکہ مکرمہ جا کر اپنا پہلا عمرہ ادا کیا۔ ۶۱ء میں یہ میرا پہلا عمرہ تھا۔ وہاں تین دن ٹھیرا۔ یہ تینوں رات دن میں نے مسجد الحرام ہی میں گزارے۔

۸

ڈھاکہ جماعت میں براہِ راست حصہ

ڈھاکہ آنے کے بعد میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں بنیادی کام کر چکا تھا۔ اس کے بعد ارادہ تھا، کہ اب مجھے جماعت کے کام میں کچھ زیادہ حصہ لینا چاہیے۔

ملکی حالات دگرگوں ہو رہے تھے، بے چینی اور اضطراب کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا، جب صدر ایوب خان نے مشرقی پاکستان جا کر یہ کہا تھا کہ ''کچھ لوگ علاحدگی کی بات کرتے ہیں، لیکن ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوں گے''۔ میرے خیال میں یہ بات ان کو بنگالیوں میں تسلیم ہی نہیں کرنی چاہیے تھی، کہ کچھ لوگ علاحدگی کی بات کر رہے ہیں، کیونکہ یہ اعتراف خود اپنی جگہ ایک ضرر رساں بات تھی۔

مشرقی پاکستان میں صدر محمد ایوب خان کے خلاف سخت نفرت اور بے زاری پائی جاتی تھی۔ مارشل لا کا سخت مخالف ہونے کی وجہ سے میں بھی ایک حد تک اس بے زاری میں شریک تھا۔ ایوب خان آہستہ آہستہ اپنا دستور نافذ کر رہے تھے۔ 'بنیادی جمہوریتوں' کے خودساختہ نظام کے تحت انتخابات ہو چکے تھے۔ اسی نظام کے تحت بی ڈی ممبروں سے انھوں نے اپنے آپ کو صدر بھی منتخب کرا لیا تھا۔ اب وہ قومی اسمبلی کے انتخابات کرانے کے بعد مارشل لا اٹھانے والے تھے۔

فعال تعلق

اس دوران ایک روز مولانا عبدالرحیم صاحب اور پروفیسر غلام اعظم صاحب میرے گھر آئے۔ عبدالرحیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''ہم کو آپ سے بہت سی توقعات تھیں،

مگر وہ پوری نہیں ہوئیں'۔ جیسا کہ میں کہتا ہوں، بعض چھوٹے چھوٹے جملے مجھے زندگی بھر مہمیز دیتے رہے ہیں۔ اسی طرح ان کے اس جملے سے بھی مجھے شرمندگی ہوئی، تاہم اس وقت تک میرے سامنے جو مقاصد تھے، وہ بڑی حد تک حاصل ہو چکے تھے۔ اگرچہ کمپنی کا خاصا کام تھا، لیکن اب ذاتی پوزیشن اتنی بن چکی تھی، کہ آرام سے کام کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے جماعت کے اجتماعات میں زیادہ باقاعدگی سے شریک ہونا شروع کیا۔ ۶۲ء میں مارشل لا اُٹھ گیا اور دستور نافذ ہو گیا۔ مارشل لا اُٹھتے ہی میں نے ڈھاکہ جماعت میں دوبارہ رکنیت کی درخواست دے دی۔

اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ 'رکن کب بنے؟' جب میں بتاتا ہوں کہ '۶۲ میں بنا' تو انھیں تعجب ہوتا ہے، کہ شاید میں خود ہی رکنیت کو اتنے سال ٹالتا رہا۔ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، میں نے جس دن جمعیت میں چھ مہینے کی مدت مکمل کر لی تھی، اسی دن کراچی جماعت کے سامنے رکنیت کی درخواست دے دی تھی۔ پھر جہاں بھی رہا، جو کچھ بھی کیا، جماعت کے امیر کی اجازت سے کیا اور جب واپس آیا تو ملک میں مارشل لا لگا ہوا تھا۔ اس لیے رکنیت سازی نہیں ہو رہی تھی۔ یوں رکن بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہی مارشل لا اُٹھا، میں نے دوبارہ رکنیت کی درخواست دے دی۔ رکنیت منظور ہونے میں چند ماہ لگ گئے، جس طرح کہ بعض اوقات جماعت کے دفتری نظام میں لگ ہی جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو افراد تحریک سے تعلق کا اطمینان بخش ریکارڈ رکھتے ہوں، ان کو بہت جلد رکن بنا لینا چاہیے۔ جس طرح میں نے لاہور میں اسلامی جمعیت طلبہ اور اسلامی جمعیت طالبات کے سابق ارکان کو درخواست دیتے وقت ہی رکن بنانے کی کوشش کی تھی۔ بہر حال اس کے بعد میں نے ڈھاکہ جماعت میں کام شروع کیا۔

اس وقت قومی اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے۔ اس انتخاب میں اپنا ایک ووٹ دینے کے لیے کراچی جماعت نے مجھے خاص طور پر ڈھاکہ سے بلایا تھا، کیونکہ میں دو سال پہلے بنیادی جمہوریت کے تحت ممبر منتخب ہو چکا تھا۔ اس انتخاب کی اہم بات یہ کہ مشرقی پاکستان سے جماعت کے چار آدمی رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے: مولانا یوسف صاحب،

عباس علی خان صاحب، شمس الرحمٰن اور اختر الدین احمد صاحب۔ اگرچہ جماعت کے سیاسی اثر ورسوخ اور گرفت کا دائرہ اتنا وسیع نہیں تھا، کہ وہ اس کے بل پر کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل کرلیتی۔ لیکن ذرا اور محنت ہوتی تو وہاں پر جماعت کے دو تین مزید افراد کامیاب ہوسکتے تھے۔ یہ لوگ بھی اپنی ذاتی کوششوں کی بنیاد پر کامیاب ہوئے تھے اور ایسی ہی کوشش سے مزید نشستیں حاصل کی جاسکتی تھیں۔ ہمارے یہ چاروں ساتھی کافی عرصے تک پوری استقامت کے ساتھ جماعت سے منسلک رہے۔ البتہ اختر الدین صاحب نے آخر میں کمزوری دکھائی۔ مشرقی پاکستان کے سیاسی میدان میں اس پیش رفت کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس واقعے سے مشرقی پاکستان کے بارے میں میرے اندازوں کی تائید ہوتی تھی۔ ان کے برعکس مغربی پاکستان میں تو صرف ایک ہی نمایندہ کامیاب ہوا تھا، اور وہ بھی زیادہ عرصہ جماعت میں نہیں ٹھیر سکا۔

ان دنوں رفیع احمد رضوی صاحب (جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں) ڈھاکہ جماعت کے امیر تھے۔ جماعت میں انتخابات اکتوبر میں ہوتے ہیں۔ تقریباً اسی دوران مَیں جماعت کا رکن بنا تھا۔ ڈھاکہ جماعت میں اس وقت ۱۷ ارکان تھے۔ پورے صوبے کے ارکان مرکزی شوریٰ کے لیے چار یا پانچ افراد کو منتخب کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے ارکان نے مجھے بھی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا رکن منتخب کرلیا تھا۔ اس وقت سے لے کر فروری ۶۳ء تک میں صوبائی جماعت کے کاموں میں مصروف رہا۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ڈھاکہ میں جمعیت کا کام بھی برابر دیکھتا اور سمجھتا رہا۔

مجھ پر کمپنی کے کام کا بھی اچھا خاصا دباؤ تھا۔ کمپنی کی طرف سے دیے ہوئے ایک اچھے مکان میں، مَیں رہ رہا تھا۔ جماعت کے لوگوں کا معاشی طور پر معیارِ زندگی خاصے کم درجے کا تھا۔ کسی کے پاس گاڑی یا اپنا مکان ہو، اس کا تصور بھی مشکل سے ہی کیا جاسکتا تھا۔ غلام اعظم صاحب آج بھی ٹین کے مکان میں رہتے ہیں اور اسی طرح جماعت کے اکثر لوگوں کے مکانات بڑے سادہ ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کمپنی کی طرف سے مجھے دیا ہوا مکان بہت اچھا تھا۔ یہ بھی اللہ کی بڑی رحمتوں میں سے ایک ہے۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ آدمی اپنے کام کی جگہ پر رہایش نہ رکھے، لیکن اس کے قریب ضرور رہے۔ مثلاً میں اگر اسلامک فاؤنڈیشن کے کام سے منسلک ہوں گا، تو مارک فیلڈ میں رہنا پسند نہیں کروں گا، لیکن بہرحال فاؤنڈیشن سے قریب رہنا پسند کروں گا، کہ اس مقام کار پر بہت زیادہ مسافت طے کر کے آنا جانا نہ پڑے ـــــ میں اس تلاش میں تھا کہ دفتر کے آس پاس گھر ملے، لیکن دفتر کے پاس جو مکان تھے، اس میں سے کوئی بھی تین چار سو روپے سے کم کرائے پر نہیں مل رہا تھا۔ اس پر خاصی پریشانی ہوئی، کیونکہ اس وقت کمپنی مجھے ڈیڑھ سو روپے ہاؤس الاؤنس دے رہی تھی اور اُس زمانے کے لحاظ سے ڈیڑھ سو اور چار سو کا فرق بہت زیادہ تھا۔ میں نے اپنے کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر خواجہ عظیم الدین صاحب کو کراچی فون کیا کہ ''میری ضرورت کے لیے ڈھاکہ میں مکان ڈیڑھ سو روپے میں تو نہیں مل رہا''۔ انھوں نے کہا کہ ''ٹھیک ہے، جتنے میں ملتا ہو، لے لو''۔ یوں چار سو روپے کا اچھا خاصا مکان مل گیا اور ہم اس میں منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں ڈھاکہ میں زندگی بڑی سستی، اچھی اور پُرسکون تھی۔ یہ حالت ۶۳ء تک رہی۔

اس زمانے میں صدر ایوب خان کے ساتھ جماعت کی کش مکش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مشرقی پاکستان میں تقریباً ہر سطح پر ایوب خان کے خلاف مہم چل رہی تھی۔ مغربی پاکستان میں حزبِ اختلاف کے رہنماؤں میں چودھری محمد علی اور مولانا مودودی سب سے نمایاں تھے۔

ڈھاکہ جماعت کی امارت

فروری ۶۳ء میں ہمارے ڈھاکہ جماعت کے امیر رفیع احمد رضوی صاحب نے ارکان کا اجتماع بلایا اور کہا کہ ''میں سمجھتا ہوں مجھ سے بہتر آدمی یہاں ہمارے درمیان موجود ہے، اور نظمِ جماعت کو یہ مجھ سے بہتر چلا سکتے ہیں۔ اس لیے میں امارت جماعت سے سبک دوش ہوتا ہوں۔ مناسب یہی ہے، کہ ہم ان کی قیادت میں کام کریں''۔ کافی بحث ہوئی، شوریٰ نے بھی ان سے کہا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ میں نے بھی انھیں بہت سمجھایا، صاف دکھائی دے رہا تھا کہ امارت کا رُخ میری طرف ہونے والا ہے۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ آخر کار ان کا

استعفا منظور ہوگیا۔ دوبارہ انتخاب ہوا اور میرے اوپر ڈھاکہ جماعت اسلامی کی امارت کی ذمہ داری آ گئی۔

اس سے کئی سال قبل اپنی امتحانی ضرورت کے تحت میں نے کراچی جمعیت میں اپنی جگہ خورشید بھائی کو کراچی جمعیت کا قائم مقام ناظم مقرر کیا تھا۔ مگر ان کی بہتر اور مؤثر کارکردگی دیکھ کر میں بعد میں ازخود اس ذمہ داری سے سبک دوش ہوگیا تھا۔ کیونکہ اپنے سے بہتر آدمی کے لیے جگہ چھوڑنے کا تصور، مولانا مودودی نے تاسیس جماعت کے اول روز ہی پیش کر دیا تھا۔ میرے مشاہدے کی حد تک جماعت کی تاریخ میں اس نوعیت کے چند واقعات میں سے یہ ایک واقعہ ڈھاکہ میں خود میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ ممکن ہے بعض مقامات پر، مختلف اوقات میں اور بھی مثالیں ہوں، تاہم ایسی باتیں میرے مشاہدے میں کم ہی آئی ہیں۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ گذشتہ دس برس کے دوران میں نے پاکستان میں یہ دیکھا ہے، کہ لوگ عام طور پر ذمہ داری سے نہ ازخود سبک دوش ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کے لیے جگہ چھوڑنے پر تیار ہوتے ہیں، اگرچہ وہ اپنی صحت، اہلیت، قوتِ کار اور صلاحیت کی کمی کی وجہ سے بھی جماعت کو نہ چلا سکتے ہوں۔ یہ رویہ اس وقت بھی برقرار رہتا ہے، جب ان کے علم میں یہ بات آجاتی ہے کہ بالائی نظم ان کے کام سے مطمئن نہیں ہے، یا پھر ان سے بہتر کسی آدمی کو لانا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں وضع داری، صحیح اسپرٹ اور اسلامی روایات کا تقاضا ہے کہ ایسے لوگ خود ان افراد کے لیے جگہ خالی کرنے کی پیش کش کر دیں، مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوتا۔ جماعت اسلامی میں باہم مشورے سے وحدانی نظام اختیار کیا گیا ہے، جس میں بیش تر مناصب، امیر جماعت کے اعتماد کی بنیاد پر لوگوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔

حالانکہ یہ روایت تو سیکولر اور عام جمہوری ملکوں میں بھی ہے، کہ وہاں اگر کسی عہدے دار کو یہ معلوم ہوجائے، کہ اب صدر مملکت، یا سربراہِ حکومت مجھے اس منصب پر

نہیں رکھنا چاہتا، یا مجھ سے بہتر کسی اور فرد کو سامنے لانا چاہتا ہے، تو وہ لوگ از خود استعفا دے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکا میں جب نیا صدر آتا ہے تو ہزاروں مرکزی ملازمین استعفا دے دیتے ہیں۔ صدر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ انھیں برقرار رکھے یا ان کی جگہ نئے افراد لے آئے۔

ہمارے ہاں اسلامی تاریخ میں بھی یہ روایت رہی ہے اور تربیت گاہوں میں آج بھی ہم جو تقریریں کرتے ہیں ان میں حضرت خالد بن ولیدؓ کا واقعہ پورے جوش و خروش سے سناتے ہیں اور سننے والے بھی اسے ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عین جنگ کے دوران میں ان کو سپہ سالار کے عہدے سے علاحدہ کر دیا تھا، اور ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو اس منصب پر مقرر کیا تھا۔ حضرت خالدؓ نے خاموشی کے ساتھ اس حکم کی اطاعت کی اور کوئی جھگڑا فساد برپا نہیں ہوا___ لیکن جماعت میں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے، کہ جب دستوری طریقوں اور بالکل جائز ذرائع سے بھی لوگوں کو ہٹایا گیا تو اس پر اتنا شور و غوغا اور واویلا ہوا کہ اس کا تصور کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ واقعات جماعت کے ابتدائی زمانے کے نہیں، بلکہ بعد کی چیزیں ہیں۔

جماعت اسلامی سے باقاعدہ وابستگی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مقامی جماعت کو چلانے کی ذمہ داری میرے اوپر آئی۔ ڈھاکہ ایک بڑا شہر تھا، مگر جماعت بہت چھوٹی تھی۔ دیکھا جائے تو پورے صوبے میں بھی جماعت بہت چھوٹی تھی۔ مشرقی پاکستان میں مشکل سے ڈیڑھ دو سو ارکان تھے۔ آج تو صرف ڈھاکہ شہر میں سات آٹھ سو ارکان ہیں۔ باڑی لین میں صوبائی جماعت کا دفتر تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں سترہ ارکان پر مشتمل ڈھاکہ جماعت صوبائی نظم کے زیرِ سایہ کام کر رہی تھی۔

جب ذمہ داری میرے کندھوں پر آ گئی تو میں نے اپنے مزاج اور عادت کے مطابق یہ سوچا کہ اس کام کو بڑھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ سب سے پہلا طریقہ یہ اختیار کیا کہ سوچنے، کام پھیلانے، بیت المال کے معاملات کو مستحکم کرنے، گویا کہ ہر ہر چیز میں سارے

کارکنان کو شریک کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی نوعیت کا فیصلہ تھا۔ اس سے قبل مقام کی سطح پر جماعت میں اس طرح کام کرنے کا تجربہ مجھے نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی مجھے اندازہ ہوا، کہ مشرقی پاکستان کے لوگ عام طور پر فراخ دل ہیں۔ مغربی پاکستان میں مجھے محسوس ہوا، کہ یہاں پر 'رکن' اور 'غیر رکن' کے درمیان تو بڑی سخت تقسیم ہے۔

جب میں ۱۹۸۷ء میں لاہور آیا تو یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی کہ لوگ فوراً ایک دوسرے سے یہ پوچھتے ہیں کہ ''آپ رکن ہیں یا نہیں؟'' گویا کہ رکن کے علاوہ کسی پر اعتماد کرنا، بھروسا کرنا، ذمہ داری دینا، بڑا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ اکثر معاملات مقامی شوریٰ کے سامنے ہی رہتے ہیں، جو بلاشبہہ ارکان ہی کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ ۷۵ فی صد ارکان کو براہِ راست پتہ نہیں چلتا کہ بیت المال میں کیا ہے، وہ کتنی مشقت سے جمع ہوا اور کس طرح خرچ کیا گیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ___ بہرحال میں نے فیصلہ کیا کہ کارکن کو کام کی بنیاد بنایا جائے۔

کارکن کون؟

اس لیے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ 'کارکن' کی تعریف متعین کی جائے، کہ کارکن کون ہے۔

میرا یہ خیال تھا کہ 'کارکن' کی وہ تعریف متعین ہونی چاہیے، جو نظروں سے دکھائی دے، وہ تعریف نہیں جو دل میں چھپی ہوئی ہو۔ مثلاً یہ کہ ''اس میں تقویٰ ہونا چاہیے، لگن ہونی چاہیے'' کیونکہ اس چیز کو تو میں ناپ تول نہیں کرسکتا تھا کہ کس میں کتنا تقویٰ اور کتنی لگن ہے۔ اسی طرح اخلاق کی اچھائی برائی کو بھی میں نہیں ناپ سکتا تھا۔

کارکن کے مقام اور حیثیت کے تعین کے لیے میں نے دو چیزیں طلب کیں:

ایک یہ کہ ''وہ ہفتہ وار اجتماع میں باقاعدگی سے آئے اور ساتھ ہی رپورٹ بھی دے''۔ کیونکہ وہ جب اجتماع میں باقاعدگی سے آکر رپورٹ دے گا، تو ظاہر ہے کہ وہ کام بھی

کرے گا اور ہمارے ساتھ اس کے روابط میں سنجیدگی ہوگی اور اس طرح نظم سے رابطہ بھی رہے گا۔

دوسرے یہ کہ ''وہ ہر حالت میں باقاعدگی سے ماہانہ اعانت دے گا''۔ اس میں رقم کا چھوٹا بڑا ہونا اہم نہیں، بلکہ اپنے مال کے ساتھ دین کے کام میں شریک ہونا اہم چیز ہے ــــ میں نے یہ طے کیا کہ جو فرد ان دو امور کو اختیار کرے گا، میں اس کو 'کارکن' تسلیم کروں گا۔

تنظیمی کام کی بنیاد

ہم نے جماعت کو منظّم کرنے اور کام کو پھیلانے کے لیے شہر کو مختلف حلقوں میں بانٹ دیا۔ جو لوگ پہلے سے کام کر رہے تھے، ان کارکنوں کی فہرست بنائی۔ یہ طے کیا کہ کسی بھی جگہ کارکنان کے اجتماع میں دس سے زیادہ لوگ نہ ہوں۔ اگر دس سے زیادہ کارکن ہوں تو ہم انھیں دو دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔ وہ کارکن مل کر اپنے محلے کی گلی کو ہدف بنائیں گے۔ اس عمل سے چھوٹے چھوٹے تنظیمی یونٹ بنتے جائیں گے۔ اس وقت یہ نقشہ پیشِ نظر تھا کہ پورے شہر میں نظمِ جماعت کا ایک جال بچھ جائے۔ اس کو آپ 'نظامِ اسرہ' کی یادگار کہہ لیں، یا کارکنوں کی اجتماعیت جس کے تحت کارکنوں کے چھوٹے چھوٹے سیل (CELL) بنتے جائیں۔ غرض یہ کہ میں نے 'کارکن' ہی کو جماعت کے کام کی بنیاد بنایا۔

اس منصوبہ کو عمل میں لانے کے لیے میں نے سب چیزیں خود سے طے کر کے نافذ نہیں کر دیں، بلکہ ابتدا میں اسے مقامی شوریٰ کے مشورے سے حتمی شکل دی۔ لیکن شوریٰ کے اجلاس سے قبل ایک سوال نامہ مرتب کیا، جس میں یہ سوال تھے، کہ یہ کام کیسے منظّم ہو؟ دعوت کا کام کیسے ہو؟ تربیت کا کام کیسے کیا جائے؟ بیت المال کی آمدنی کس طرح بڑھائی جائے؟ اور مزید کیا کام کریں؟ ــــ اس کے علاوہ اب تک کے کام کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوال شامل تھے کہ: ہمارے کام میں کیا کمی اور کمزوری ہے؟ ــــ

یہ سوال نامہ سارے کارکنوں میں تقسیم کیا اور سب سے کہا، کہ وہ مجھے براہِ راست جواب بھیج دیں۔ مزید یہ کہ وہ اپنے کارکنوں کے اجتماع میں بھی ان امور پر گفتگو کر کے جن نتائج پر پہنچیں وہ لکھ کر بھیج دیں۔ اس عمل سے بلاشبہہ تمام ہی کارکنوں میں بہت جوش و جذبہ اُبھرا اور ان میں شرکت کا ایک خوش گوار احساس پیدا ہوا۔ سب نے بڑی دل چسپی سے اپنی تجاویز دیں۔ ان تمام تجاویز کو میں نے مرتب کر کے مقامی شوریٰ کے اجلاس میں پیش کیا۔

شوریٰ کی یہ نشست دو دن تک ہوئی۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی شوریٰ اتنی لمبی ہوئی ہوگی۔ میں آٹھ سال تک ڈھاکہ جماعت کا امیر رہا۔ اس پورے عرصے میں کوئی بھی اجتماعِ ارکان ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہوا، جب کہ عام طور پر ہمارے یہاں مختلف جگہوں پر آٹھ آٹھ گھنٹے کے اجتماعات ہوتے ہیں اور اس کے باوجود لوگ کہتے ہیں: ''اطمینان نہیں ہوا''۔ اسی طرح ڈھاکہ میں ہماری مقامی شوریٰ کے اجلاس کبھی آدھے دن سے زیادہ نہیں ہوئے۔ ان سب کا وقت مقرر تھا۔ تقسیم کار ہی کچھ ایسی کر لی گئی تھی، کہ بہت کم وقت صرف ہوتا تھا، مگر مقابلتاً کام بہتر ہوتا تھا۔ ڈھاکہ جماعت کے چلانے کا یہ ایک بڑا منفرد تجربہ تھا جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ٹیم نے ساتھ دیا اور پورے نتائج دیے۔ یہ تجربہ آیندہ تحریکی زندگی میں ہمیشہ اور ہر جگہ میرے کام آتا رہا۔

بیت المکرّم کے زیرِ سایہ

جیسا کہ ابھی ذکر کیا ہے کہ کارکنان کی تجاویز مرتب کر کے مقامی شوریٰ کے اجلاس میں پیش کیں۔ نتیجہ کے طور پر ایک سال کا منصوبہ بنایا، جس میں بنیادی اہمیت دعوت کو دی گئی اور دعوت کے لیے بے شمار پروگرام بنائے گئے۔ بیت المال کی آمدنی مشکل سے، تین چار سو روپے ماہانہ تھی، جو ہماری سرگرمیوں کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ نواب پور روڈ پر ایک کوٹھری میں ہمارا دفتر تھا۔ شہر بہت پھیل چکا تھا اور نیا شہر بھی بن چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے یہ فکر کی کہ ذرا بہتر جگہ پر دفتر حاصل کرنا چاہیے۔ جناح

ایونیو وہاں کی سب سے بڑی اور نئی سڑک تھی۔ وہاں بیت المکرّم کے نام سے ایک بڑی، نئی اور مرکزی مسجد تھی جس کا ڈیزائن خانہ کعبہ سے ملتا جلتا تھا۔ یحییٰ باوانی صاحب نے مسجد بناتے ہوئے قریب ہی دکانیں بنوا کر تاجروں کو دی تھیں۔ اس طرح مسجد کے چاروں طرف ایک بڑا بازار بھی تھا۔

ڈھاکہ میں جماعت اسلامی کے ایک کارکن فضل الدین شمسی صاحب، تاجر تھے۔ وہ پرانے ڈھاکہ کے مین بازار میں کاغذ اور پرنٹنگ سیاہی کا کاروبار کرتے تھے۔ سنا تھا کہ پہلے وہ فعال ہوا کرتے تھے، لیکن جب میں گیا تو وہ کوئی زیادہ فعال نہ تھے۔ اجتماع اور کسی پروگرام میں نہیں آتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا، کہ مولانا مودودی صاحب ڈھاکہ میں ان کے ہاں ٹھیرتے ہیں۔ بہرحال، میں نے ایک آدھ مرتبہ جا کر ان سے ملاقات کرلی۔ ساتھیوں نے بتایا کہ ''بیت المکرّم مسجد کے علاقے میں ان کی ایک بڑی سی دکان ہے، جس کا ایک بڑا کمرہ ہے، مگر اس وقت وہ دکان خالی ہے''۔ اس وقت اگر ہم وہ دکان لینا چاہتے تو آٹھ دس ہزار روپے کی ضرورت پڑتی۔ جو نہ میرے پاس تھے اور نہ اتنی بڑی رقم جماعت کے بیت المال میں موجود تھی۔ تحریکی زندگی میں مجھے ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے، کہ میں کسی مطالبے کے لیے صرف اس فرد سے بات کروں، جو بات ماننے کی پوزیشن میں ہو۔

مجھے اس وقت تک شمسی صاحب کے بارے میں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری بات مانیں گے یا نہیں۔ دراصل میں ان سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ''آپ مجھے یہ دکان کرایہ پر دے دیں، مگر کرایہ ابھی فوری طور پر نہ لیں''۔ جماعت کے پرانے لوگ جو ان سے واقف تھے، میں نے انھی کے سامنے اپنے دل کی یہ بات رکھی اور ان سے کہا کہ ''آپ جا کر بات کریں''۔ وہ ملنے گئے اور آ کر خوش خبری سنائی کہ ''شمسی صاحب دکان دینے کو تیار ہیں، کہ آپ اسے لے کر جماعت کے لیے استعمال کریں، اور کرایہ دینے کی ضرورت نہیں ہے''۔

بظاہر یہ صرف ایک معمولی سا قدم دکھائی دیتا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل تھا کہ، جس سے ڈھاکہ جماعت کے کام میں بڑی اہم پیش رفت ہوئی۔ ڈھاکہ

کے ایک نمایاں مقام پر، بیت المکرّم مسجد کے قریب، اور مرکزی شاہراہ پر ہمارا بورڈ بھی لگ گیا۔ اب ہم ایک مرکزی جگہ پر آ گئے تھے۔ جہاں پر لوگوں کو آنے کی بھی آسانی ہوگئی تھی۔ پھر ہم صوبائی جماعت کے سائے سے بھی نکل آئے تھے۔

یہ بات کسی ذم کے نقطۂ نظر سے نہیں کہہ رہا۔ میں اس چیز کا قائل نہیں ہوں کہ بالائی نظم کے دفتر میں رہ کر کام کیا جائے۔ البتہ بالائی نظم سے تعلق بڑا مضبوط رہنا چاہیے۔ جب بڑا سایہ اُوپر موجود ہو، تو وہاں پودے کی فطری رفتار سے نشوونما نہیں ہوتی، یہی حال تنظیموں کا ہے۔ بڑے نظم کے معمولات اور مصروفیات ذیلی مقام کو متاثر کرتے ہیں۔ اور خود بالائی نظم کا وہ تاثر اور حیثیت متاثر ہوتی ہے، جو ذرا فاصلے پر رہنے سے پروان چڑھتی ہے ـــــ نئے دفتر، نئے مقام اور نئی فضا میں ہمارے اجتماعات ہونے لگے۔

بنیادی یونٹ

ہم نے ڈھاکہ جماعت کے کام کا جو منصوبہ بنایا، اس کے کچھ نمایاں پہلو تھے۔

پہلا یہ کہ ہم نے چھوٹے چھوٹے تربیتی پروگرام رکھے۔ تربیت پر میں اس لحاظ سے کوئی زیادہ زور نہیں دیتا تھا، کہ اس میں کوئی زیادہ نصیحت آموز تقریریں کرنا ہیں یا اسے اسٹڈی سرکل میں تبدیل کرنا ہے۔ اس کے برعکس میرا خیال تھا کہ کارکنان کا اجتماع ہی بنیادی طور پر تربیت گاہ ہوگا۔

کارکنوں کے اجتماع ہی میں اگر کام کی منصوبہ سازی ہوگی تو وہ اپنے مقام پر پاور ہاؤس کا کام کر سکے گا۔ وہیں سے قیادت، رہنمائی اور حکمت عملی ملے گی۔ ہمارے کام کے اعتبار سے ڈھاکہ چھوٹا شہر تھا، اس لیے میں چاہتا تھا کہ ڈھاکہ کے کارکنوں سے براہِ راست رابطہ رہے۔ کارکنوں سے ربط رکھنے اور ان کے چھوٹے یونٹوں پر زیادہ زور دینے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ وہ تربیت کے مضبوط سرچشمے بن گئے تھے۔ ان کے علاوہ شہر کی بنیاد پر ایک روزہ اور دو روزہ تربیت گاہیں بھی کیں۔

ایک تربیتی تجربہ

۱۹۶۳ء ڈھاکہ میں ہمارے کام کے اعتبار سے بڑا اہم سال ہے۔

اس سال کئی ایسے واقعات پیش آئے، جس سے کام میں بہت فرق پڑا۔ اس سال دو تربیتی پروگرام، ایک ایک روزہ رکھے گئے، اور دو شب بیداریاں منعقد کی گئی تھیں۔ ناظمینِ حلقہ جات کو میں کلیدی کارکنان (key workers) سمجھتا ہوں۔ اس لیے ان کی تربیت اور مشاورت کے لیے ایک سات روزہ پروگرام ترتیب دیا۔

یہ پروگرام ترتیب دیتے وقت خیال رکھا کہ جو لوگ دفاتر میں جاتے ہوں وہ ڈیوٹی پر جائیں اور جو تجارت کرتے ہوں، وہ رزقِ حلال کی تلاش میں اپنا کام کریں۔ پھر یہ سب لوگ مغرب کے وقت اس پروگرام میں پہنچ جائیں۔ میرا گھر چونکہ بڑا تھا، اس لیے وہیں ایک کمرے کو اجتماع گاہ بنا کر اس میں، مغرب سے رات دس بجے تک، یہ جزوقتی (part time) تربیتی پروگرام منعقد کیا۔ اکثر پروگرام اپنے ذمے لیے اور کچھ پروگرام جلیل اشرف ندوی صاحب نے کیے۔ اس وقت یہ سارے پروگرام اُردو ہی میں ہوئے۔ مجھے ابھی تک بنگلہ زبان نہیں آتی تھی، جو بعد میں سیکھی، ویسے بھی لوگ اُردو سمجھ لیتے تھے۔

سات دن کا یہ ایک بڑا مؤثر پروگرام ثابت ہوا۔ اس پروگرام نے افراد پر ہمہ وقتی اور بڑی تربیت گاہوں کی نسبت زیادہ اثر ڈالا۔ حالانکہ یہ جزوقتی پروگرام ایک نیا تجربہ تھا۔ جب میں ۱۹۸۷ء میں ڈھاکہ گیا تو وہاں پر اس زمانے کے ایک ممتاز رکن شوریٰ نورالزمان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ''ہم کو تحریک کرنا آپ نے اپنے گھر والے اس پروگرام میں سکھایا''۔ (لفظ 'تحریک کرنا' اور 'سیاست کرنا' وہ استعمال کرتے تھے)۔ اس میں قرآن، حدیث، سیرت، تحریک، باہمی تعلقات، انفرادی و اجتماعی اخلاق اور کام کے بارے میں پروگرام رکھے گئے تھے۔

اجتماعِ کارکنان میں برکت

مسجد بیت المکرّم کے زیرسایہ آنے کے بعد طے کیا، کہ ڈھاکہ شہر میں ہر ماہ مرکزی سطح پر کارکنوں کا اجتماع ظہر سے مغرب تک ہوا کرے گا۔ اس میں تربیتی نوعیت کی ایک آدھ تقریر ہوگی، لیکن اس میں اہم ترین نقطہ کام کی ماہانہ رپورٹ پیش کرنا ہوگا اور آیندہ ماہ کے کام کے لیے ہدایات بھی دی جائیں گی۔ پالیسی معاملات اور حکمت عملی وضع کرنے کے بارے میں بھی کھل کر گفتگو ہوگی۔

اس اجتماعِ کارکنان میں بیت المال کا حساب بھی سارے کارکنوں کے سامنے رکھا جائے گا۔ پچھلے مہینے کیا آمدنی ہوئی اور کیا خرچ ہوا؟ اس میں کوئی چیز کارکن کی دسترس سے باہر نہیں رکھی جائے گی۔ وہ آزادی سے جو چاہیں سوال کر سکتے ہیں۔ گویا کہ تربیتی، دعوتی اور تنظیمی اجتماع ملا کر یہ ایک قسم کا مرکب اجتماع بنایا تھا۔ یہ مرکزی پروگرام ۱۹۷۰ء کے آخر تک، بڑھتا اور پھیلتا رہا۔

کارکن کا جو معیار ہم نے متعین کیا تھا، اس کے مطابق ۱۹۶۳ء میں ہمارے کُل کارکنوں کی تعداد ۶۰ یا ۷۰ کے قریب تھی۔ ہمارے یہ سارے ہی کارکن ماہانہ اعانت دیتے، اجتماع میں آتے اور رپورٹ پیش کرتے تھے۔ اس اہمیت اور احساسِ شرکت سے کارکنوں میں بڑا جوش و جذبہ پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا، یہ تعداد دیکھتے ہی دیکھتے بڑھنی شروع ہوگئی اور پھر یہاں پر بھی ہمارے دفتر کا مرکزی کمرہ بھی تنگ پڑ گیا۔ اس کمرے میں تقریباً ڈیڑھ سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ پھر ہم نے اس کے برآمدے میں بھی دریاں بچھا دیں اور بعد میں یہ جگہ بھی کم پڑ گئی۔ اس کے علاوہ وہاں پر دیگر بہت سارے اجتماعی پروگرام بھی ہوا کرتے تھے۔

وقت کی تقسیم

میں نے اپنے لیے یہ لازم کیا، کہ سال میں دو مرتبہ سارے حلقوں کا دورہ کروں گا، تاکہ کارکنوں سے براہِ راست ربط قائم ہو سکے۔ کسی ہنگامی ضرورت سے قطع نظر، اس کے

علاوہ دورہ نہیں کروں گا۔ سال بھر کے دوران جو کارکن مجھ سے ملنا چاہیں، وہ دفتر آ کر مل لیں۔ اپنے وقت کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ ہفتے میں تین دن عصر سے عشا تک دفتر میں بیٹھوں گا۔ صبح کے وقت اپنی کمپنی کے دفتر جاتا تھا، اس لیے صبح کے وقت دفتر جماعت نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ جو ہمہ وقتی کارکن تھے، وہ صبح سے آ کر بیٹھتے تھے۔ عام طور پر ہمارے یہاں لوگوں کو اس پر بڑی حیرت ہوتی ہے، کہ اتنے کم وقت میں پوری جماعت کس طرح چل سکتی ہے۔

میرے ذہن میں پہلے دن سے یہ بات تھی، کہ کارکنوں سے کام لینا ہے۔ خود فیلڈ میں جا کر زیادہ کام نہیں کرنا اور نہ میں کر ہی سکتا تھا۔ ویسے بھی یہ زیادہ مناسب نہ تھا، کہ میں میدان میں بہت زیادہ فعال ہوتا، کیونکہ زبان اور نسل کے اعتبار سے میں یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ یہاں کے مقامی لوگوں کو تیار کر دوں، تاکہ بعد میں وہ آگے بڑھ کر کام کو سنبھالیں۔

بیت المال کے لیے کارکنوں کو یہ ہدف دیا تھا کہ ان میں سے ہر شخص معاون بنے، وہ خود بھی اعانت دے اور دوسروں کو معاون بنائے۔ اس مقصد کے لیے رجسٹر رکھے گئے۔ ہر مہینے یہ بات نوٹ کی جاتی، کہ کس کی اعانت آئی اور کس کی نہیں آئی۔ ڈھاکہ میں مارچ ہی سے اعانت بڑھانے کا منصوبہ شروع کیا تھا۔ اس وقت تقریباً تین چار سو ماہانہ آمدنی تھی، لیکن اکتوبر تک ہماری آمدنی پندرہ سو سے دو ہزار روپے تک پہنچ گئی تھی۔ اس زمانے میں چار گنا آمدنی کا بڑھ جانا بہت بڑی بات تھی۔ دو ہزار روپے ہمارے لیے ایک بڑی رقم تھی۔ اس رقم سے ہم بہت سے کام کر سکتے تھے۔

اس کے برعکس لاہور میں جب اکتوبر ۱۹۸۷ء میں مجھ پر امارت کی ذمہ داری آئی، تو یہ دیکھ کر مجھے بڑی پریشان کن حیرت ہوئی، کہ یہاں پر کارکنوں سے لازمی اعانت لینے کی کوئی روایت نہیں ہے نہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے، کہ اعانت دینے والوں کا مکمل ریکارڈ رکھا جائے۔ بس رسید بک کا ریکارڈ ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ صرف بڑے بڑے

معاونین سے اعانت لے کر کام چلا لیا جاتا ہے۔ ایک پھلتی پھولتی تحریک کے لیے یہ رویہ نامناسب ہے۔

اس دوران میں ہمارے متفقین میں اضافہ ہوا اور کام بہت تیزی سے پھیلا۔ ہر مہینے تقریباً سو نئے متفق بنتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈھاکہ جماعت کا ایک بلیٹن انگریزی اور بنگالی میں جاری کیا۔ اس کا نام سرچ لائٹ (Search Light) تھا، جسے میں خود ہی مرتب کرتا تھا۔ جماعت کے کارکن، فیاض احمد صاحب سے مل کر اسے خود ہی ٹائپ اور سائیکلواسٹائل کرتے تھے۔ بعد میں یہ پریس سے بھی چھپوایا جاتا رہا۔

ایک مرتبہ اس میں اشاعت کے لیے یہ رپورٹ آئی کہ ایک مہینے میں سو متفق بنتے ہیں، اس کو دیا جائے۔ میں نے کہا: ''آپ اسے اس طرح دیں کہ لوگ اس میں کشش محسوس کریں''۔ بات ہوتی رہی کہ سرخی کیا لگائی جائے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سرخی لگائیں: "Three persons join Jamaat everyday" کیونکہ جب آپ ماہانہ سو لوگوں کا ساتھ شامل ہونا کہیں گے، تو اس کا وہ اثر نہیں پڑے گا، لہٰذا یہ کہیں کہ روزانہ تین آدمی جماعت میں آرہے ہیں، اس کا ایک دوسرا تاثر بنتا ہے'۔ چنانچہ جب ہمارا بلیٹن شائع ہوا تو وہاں کے اخبار *Morning News* نے اس بات کو بھرپور انداز سے اٹھایا اور بحث کا موضوع بنایا۔

اللہ کا شکر ہے کہ کارکن برابر بڑھ رہے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں یہ تعداد دو سو تک پہنچ گئی تھی۔ اسی سال کے اختتام پر وہاں کے ایک بڑے ہوٹل ایڈن گارڈن کے ہال میں ہم نے اپنی پہلی تربیت گاہ منعقد کی۔ دو سو، ڈھائی سو کے قریب حاضری تھی۔ تمام ہی پروگرام بھرپور رہے۔ میں نے وہاں پر 'تعلق باللہ: مفہوم، تقاضے اور ذرائع' پر تقریر کی، جس کے نوٹس آج بھی موجود ہیں۔ اس وقت سے اس کا کتابچہ بنانے کا ارادہ ہے مگر یہ کام ٹلتا جا رہا ہے۔ اس زمانے کے کئی پروگراموں کے نوٹس محفوظ ہیں، اگرچہ بہت سے سقوط ڈھاکہ کے وقت ضائع ہوگئے۔ مثال کے طور پر میں نے ایک پورا سلسلہ تقاریر مغربی تہذیب پر

کیا تھا، جو بظاہر جماعت کے عمومی پروگراموں کی روایت سے مختلف تھا۔ تحقیق و کاوش میں اہلِ مغرب کی کامرانیوں اور سیاسی میدان میں مغربی تہذیب کی عیاری کے عناصر ترکیبی، اس کے ارتقا اور مسائل پر میں آج بھی اس سے بہتر پروگرام نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ارکان کا اجتماع بھی ہر ماہ ہوتا تھا۔ جس میں ایک بنیادی تبدیلی یہ کی گئی تھی، کہ ارکان کے اجتماع میں وہی کام ہونے چاہییں، جن کا تعلق 'عہد رکنیت' سے ہے، یا جو تنظیمی کام اس بات کے محتاج ہیں کہ وہ ارکان کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے مختصر ایجنڈا ہوتا تھا۔ دس منٹ کی کوئی تربیتی چیز ہوتی۔ عہد رکنیت کے حوالے سے کسی بات کی تذکیر ہوتی۔ اس کے بعد رپورٹ اور احتساب ہوتا، اور باقی کام پر ایک نظر—— ہمارا یہ اجتماعِ ارکان، عام طور پر مغرب سے عشاء تک، وگرنہ کبھی کبھار عشاء کے بعد آدھا پون گھنٹہ میں مکمل ہو جاتا۔ آٹھ سال تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

رکن سازی میں بھی بہت ساری چیزیں اختیار کیں۔ مثال کے طور پر جو بھی درخواست رکنیت مانگتا، اسے دے دیتے۔ بلکہ ہم خود فرداً فرداً کارکنوں کو بلا کر کہتے تھے کہ تم امیدوار بن جاؤ، تم اس لائق ہو۔ اس کے بعد میرا طریقہ یہ تھا، کہ درخواست آتے ہی بورڈ پر اس کا نام لگ جاتا تھا، کہ فلاں شخص نے رکنیت کی درخواست دی ہے، اور اگر کسی کے علم میں کوئی ایسی بات ہے جو اس کی رکنیت میں مانع ہے تو وہ ذاتی طور پر مجھے اطلاع کر دے۔ اگر دو تین مہینے تک کوئی بات نہیں آتی تھی، لٹریچر اس نے پڑھا ہوا ہوتا تھا تو میں شوریٰ سے کہتا کہ اسے رکن بنا لیا جائے۔

بعد میں لاہور آ کر دیکھا کہ نظم کا اطمینان ہی نہیں ہو رہا، اس لیے ایک امیدوار کو برسوں ٹال دیتے ہیں۔ سامنے درخواستیں پڑی ہوتی ہیں اور کوئی ان سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ لیکن وہاں پر ہم نے یہ ایک مؤثر اور خودکار نظام بنایا تھا، کہ رکنیت کی منظوری کا عمل کسی جمود کا شکار نہ ہو، نہ کسی بیوروکریٹک رویے کا شکار ہو اور نہ کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے غلط افراد کو رکن بنا لیا ہو۔ بعض افراد کو

رکن بنانے کا رسک (risk) بھی لیا۔ لیکن کچھ مثالوں میں صوبائی نظم نے ایسی سفارش کو نہیں مانا۔ یاد رہے اس وقت رکنیت کی منظوری کا اختیار صوبائی نظم کے پاس ہوتا تھا۔

نظم کی صورت یہ تھی کہ ڈھاکہ شہر کے اُوپر ڈھاکہ ڈویژن کا نظم تھا اور اس کے اوپر صوبائی جماعت تھی۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ جہاں بھی ایک واسطہ درمیان میں پڑے گا، وہاں پر بیوروکریسی بڑھے گی اور کام میں خرابی پیدا ہوگی۔ میں نے صوبائی شوریٰ کے سامنے یہ موقف پیش کیا کہ ''ڈھاکہ کی حیثیت مرکزی ہے، یہ صوبائی دارالحکومت ہے، اس اعتبار سے اس کی خاص اہمیت ہے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ دارالحکومت فتح ہوجائے تو ملک فتح ہوجاتا۔ آپ اس کو دوسرے تمام شہروں کی سطح پر تو نہیں رکھتے۔ اس لیے ڈھاکہ شہر کو حلقہ کا درجہ دے دیں۔ صوبائی شوریٰ نے اسے منظور کرلیا، اور ڈھاکہ کا براہِ راست صوبے سے تعلق بنا۔ یہ تعلق مضبوط اور مؤثر بھی تھا۔

ایک کامیاب دعوتی تجربہ

ایڈن گارڈن ہوٹل والی تربیت گاہ میں ہم نے دعوت کو عام کرنے کا پیغام دیا۔ دعوت کو عام کرنے کے لیے میرے ذہن میں 'گھر گھر رابطے کا منصوبہ' تھا۔ چنانچہ ہم نے شہر کے علاقے منتخب کیے۔ ساری ڈھاکہ جماعت کے کارکنوں پر لازم کیا کہ ''ہر تین ماہ بعد ایک دن کے لیے وہ ایک جگہ جمع ہوکر صبح سے ظہر تک گھر گھر جائیں گے، لٹریچر پہنچائیں گے، متفق بنائیں گے اور لوگوں کو جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دیں گے''۔

پرانا ڈھاکہ، نواب پور کی طرف، بانسال میں بااثر لوگ رہتے تھے۔ اس علاقے میں جماعت کا کام برائے نام تھا۔ اس لیے ہم نے سب سے پہلے اس علاقے کو ہدف بنایا۔ طے شدہ دن کو صبح آٹھ بجے سب کارکنوں کو وہاں پہنچ جانا تھا۔ چونکہ یہ پہلا پروگرام تھا اس لیے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ حاضری کتنی ہوگی؟ کتنے لوگ آئیں گے؟ کیا مسائل پیش آئیں گے؟ اور کام کیا ہوگا؟ یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے ایک خاص قسم کا asthma (دمہ) شروع ہوگیا تھا۔ یہ رات بارہ بجے کے بعد شروع ہوکر فجر تک چلتا تھا اور سورج طلوع

ہوتے ہی غائب ہوجاتا تھا۔ میڈیکل ریکارڈ پر اس بیماری کا تذکرہ موجود ہے۔ اس تکلیف کے دوران میں کبھی سونہیں سکتا تھا۔ بعض دفعہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوجاتا اور پھر تکلیف میں پوری پوری رات یونہی کھڑے، بیٹھتے یا ٹہلتے گزر جاتی تھی۔ جس رات کے بعد اگلی صبح یہ پروگرام ہونا تھا، اسی رات اس تکلیف کا حملہ ہوگیا۔ رات بھر تکلیف میں جاگتا رہا اور یہ دعا بھی کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس پروگرام کو کامیاب کرے۔

اگلے دن صبح وہاں پر گیا تو سب کارکن اکٹھے تھے۔ میں نے مختصر تقریر کی۔ کارکنوں کے جذبے کو اُبھارا اور انھیں دعاؤں کے ساتھ گلیوں، گھروں اور دکانوں کی جانب روانہ کیا۔ سب کو کام بتائے، لٹریچر دیا اور دو دو تین تین کا گروپ بنا کر پھیلا دیا گیا۔ علی اکبر صاحب کی موٹرسائیکل اس کام میں ہماری سب سے بڑی سواری تھی۔ اس پر میں ایک ساتھی کے پیچھے بیٹھ گیا۔ جگہ جگہ جا کر پورے بانسال میں کام کی نگرانی کے لیے پھرتا رہا۔ جب لوگ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ کل پانچ سو نئے متفق بنے ہیں۔ عام لوگوں نے بڑا خیرمقدم کیا۔ اس سے میری ہمت بندھ گئی اور سوچا کہ اس سلسلے کو چلنا چاہیے۔ اب حوصلہ ہوا کہ اگر ہم ان سے ربط رکھیں، دعوت اور تربیت کے لیے ان کو قریب لائیں، ان کو معاون بنائیں تو ہم تو ان شاء اللہ پانچ چھے سال میں ڈھاکہ شہر میں تحریک کی ایک مضبوط بنیاد قائم کرسکتے ہیں۔

اس کے بعد ایسا ہی پروگرام، چوک بازار میں رکھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق وہ بھی کامیاب رہا۔ یہ تجربات ۱۹۶۳ء کے دس مہینوں میں کیے گئے۔ اس عرصے میں یہ بھرپور دعوتی سرگرمیاں رہیں۔

مالی ایثار کا ایک واقعہ

رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو زکوٰۃ بھی اچھی مقدار میں جمع ہوئی۔ تاجروں نے ہماری دعوتی سرگرمیوں کا اچھا اثر لیا۔ اس دوران ایک بڑا دل چسپ تجربہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ ڈھاکہ جماعت کا ایک ادارہ مطبوعات بنایا جائے، جو دعوتی چیزیں شائع کرے،

مگر اس کام کے لیے ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا اور آغاز کرنے کے لیے ابتدائی طور پر پانچ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔

ہمارے رفقاء میں فضل الدین شمسی صاحب اور حاجی عبدالستار صاحب، اگرچہ بہت ہی چھوٹے یا اوسط درجے کے تاجر تھے، تاہم ہمارے لیے یہی افراد جماعت کے سیٹھ آدم جی اور باوانی تھے۔ ان دونوں کے ساتھ مزید چار پانچ صاحبِ حیثیت افراد کو جمع کیا۔ ان کے سامنے میں نے یہ بات رکھی کہ ''یہ کام پیشِ نظر ہے اور اس کے لیے پانچ ہزار روپے چاہییں۔ آپ مجھے قرضِ حسنہ کے طور پر ایک ایک ہزار روپیہ دیں۔ جوں ہی ادارہ چل نکلے گا تو ان شاء اللہ آپ کو واپس کر دوں گا''۔ اس میں، میں وقت کے تعین یا نفع ونقصان کی بنیاد پر کسی نفع وغیرہ کی کمٹ منٹ کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

سب سے پہلے فضل الدین شمسی صاحب نے بات کا آغاز کیا اور کہنے لگے کہ ''میں تو نہیں دوں گا''۔

ان کی بات سن کر میری تو زبان ہی سوکھ گئی، ایسے لگا جیسے پاؤں تلے زمین نہیں۔ سوچا کہ جب جماعت کا یہ فعال کارکن ہی ایسی بات کر رہا ہے تو گویا سارا کام ہی ختم ہو گیا۔ میں نے بڑے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: ''کیوں؟''

کہنے لگے: ''جب پہلے کام نہیں ہو رہا تھا، اس وقت میں نے کبھی جماعت کو قرض نہیں دیا، لیکن اب جب کہ کام ہو رہا ہے تو میں قرض کیوں دوں گا؟ میں تو پورے پانچ ہزار روپے ویسے ہی دینے کو تیار ہوں''۔

ان کی یہ بات سن کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ (پانچ ہزار کی مالی قدر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان دنوں چھے ہزار روپے میں راؤنڈ دی ورلڈ ہوائی سفر کا ٹکٹ آتا تھا)۔ ایک دو روز میں انھوں نے لا کر پیسے دے دیے۔

عوامی خطوط

اس کے بعد میں نے اُردو میں جماعت کا ایک عمدہ سا تعارف لکھا، جو تین صفحے کا پمفلٹ تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے ملے گا۔ اس کے بعد کھلے خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مثال کے طور پر جماعت کا خط شہریوں کے نام، امیر جماعت کا خط کارکنوں کے نام، تاجروں کے نام، اساتذہ کے نام، وغیرہ وغیرہ (یہ خطوط میرے پاس محفوظ نہیں، ممکن ہے ڈھاکہ سے مل جائیں)۔ شہریوں کے نام خط، کارکنان دعوتی سرگرمی کے طور پر ہر تیسرے مہینے پہنچاتے تھے۔ یہ خطوط بنگلہ اور اُردو یا انگریزی میں ہوتے تھے۔ چونکہ کام کا سارا زور دعوت کے پھیلاؤ پر تھا، اس لیے کارکنان، لوگوں تک پہنچنے، ان تک پیغام پہنچانے اور کام کی مضبوطی کے لیے چیزیں سوچتے رہتے تھے۔ یہ چیزیں صرف میں ہی نہیں سوچتا تھا، بلکہ مجھے اصل خوشی اسی بات پر تھی، کم و بیش ہر کارکن تجاویز دیتا اور اپنی تجاویز دلیل سے پیش کرتا تھا۔ سارے کارکن اس عمل میں شریک تھے۔

ارکان کا بھی کوئی خصوصی status (مرتبہ) نہیں تھا۔ صرف کام کی قدر ہوتی تھی۔ فیاض صاحب حلقہ کے ناظم تھے، اور نشر واشاعت، پریس کے سارے کام بھی انھی کے ذمے تھے۔ انھوں نے اخبارات سے بڑا اچھا ربط رکھا اور مؤثر ملاقاتوں کا اہتمام کیا۔

شخصی اعتماد کی اہمیت

کمپنی کی مصروفیت کی وجہ سے میں پورا وقت جماعتی سرگرمیوں میں لگا دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اس لیے ایک ہمہ وقتی قیم (سیکرٹری) کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنی ضرورت کا غلام اعظم صاحب سے تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا: ''نورالاسلام صاحب ایک نوجوان کارکن ہیں، ان کے سپرد یہ کام کرلیں''۔ انھوں نے آکر کام شروع کردیا۔ ہفتے میں تین دن جاکر میں کام دے آتا تھا کہ یہ کام کرنا ہے۔ پھر آکر پوچھ لیتا کہ یہ کام ہوا ہے یا نہیں؟ غلام اعظم صاحب نے ایک دن مجھ سے دریافت کیا؟ ''سلام صاحب کو کیسا پایا؟'' میں نے کہا: ''ٹھیک کام کررہے ہیں اور میری مرضی کے مطابق کرتے ہیں''۔ مسکرا کر کہنے

لگے کہ وہ تو کہہ رہے تھے کہ ''یہ آدمی نہیں جن ہے، ہر کام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وقت پر ہونا چاہیے، وقت پر نہ ہو تو پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اس لیے جتنا کام ذمے لگاتے ہیں وہ سب ہو جاتا ہے''۔ میں نے کہا: ''واقعی پیچھے پڑ جاتا ہوں کہ جو کام ذمے لگ گیا ہے وہ ہونا چاہیے''۔

اجتماعی زندگی کے لیے میں نے کچھ اصول بنائے تھے۔ ایک یہ کہ سارے کام میں خود نہیں کر سکتا۔ اس لیے جس ساتھی کو میں نے قیم بنا لیا تھا، کام اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتا تھا۔ بے فکر ان معنوں میں کہ خبر تو لیتا رہتا تھا، تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے سر پر سوار رہنے والی بات نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جس فرد کو جتنا کام دیا جائے اس کو اتنا اختیار بھی دیا جائے۔ تیسرا یہ امکان کہ وہ کام خراب بھی کرے گا یا پھر اتنا اچھا نہیں کرے گا، جتنا میں نے اپنے اس زعم میں رہوں، کہ اگر خود کر لیتا تو ہو جاتا۔ مگر اس میں حقیقت پسندی کا یہ تقاضا پیشِ نظر رہتا کہ ٹھیک ہے، دوسرا فرد کرے گا تو شاید کچھ کم درجے کا کرے گا، لیکن اس سے میرا وقت بھی تو بچے گا۔ اس لیے میں فرد کو کام، اختیار کے ساتھ دیتا یعنی delegate (تفویض) کرتا۔

اگر کسی فرد کو محض اپنی بتائی ہوئی لائن سے سرِ مو ہٹنے کا اختیار نہیں دیا جائے گا، تو ممکن ہے وہ آپ کی مرضی کو پورا کرے۔ مگر اس کا نقصان یہ ہوگا کہ اس فرد میں اعتماد، حریتِ فکر اور ندرتِ خیال کبھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ کسی فرد کی خود اعتمادی کا ختم ہونا، یا خود اعتمادی کو ختم کرنا میرے نزدیک تحریک میں کسی کام کے کم تر ہونے یا نہ ہونے سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ یہاں مغربی پاکستان آ کر دیکھا کہ لوگ کام سپرد کر کے اپنا دخل بھی رکھتے ہیں، اختیار نہیں دیتے، پھر جواب طلب کرتے ہیں۔ بہت بعد میں یہ چیزیں میں نے انتظامیات اور نفسیات کی کتب میں پڑھیں، لیکن اس سے قبل ان کو اختیار کر کے فائدہ مند پایا۔

اسی طرح اپنے ساتھ کام کرنے والے قیم کو اجتماعِ عام میں، دوسروں کے سامنے کبھی

تنقید کا نشانہ نہیں بناتا تھا۔ بلکہ ان کی کسی کوتاہی یا سستی کے باوجود جواز تلاش کرتا تھا۔ اس کے برعکس تنہائی میں سمجھاتا ضرور تھا کہ یہ غلط ہے۔ اس چیز سے براہِ راست معاونت کرنے والے لوگوں کی ہمتیں بندھی رہتی ہیں اور دوسرے لوگ اچھی طرح کام کرتے تھے۔ جو کام جن افراد کے سپرد کرتا، وہ خوشی سے کر دکھاتے تھے۔ میرے نزدیک یہ بات شخصی مروت اور احترام کے سراسر منافی ہے کہ کسی کو میں نے کام کے لیے اپنا نمایندہ بنایا اور اگر کوئی دوسرا بے وجہ اس کے پیچھے پڑ جائے، تو میں بھی دوسروں کے سامنے اس کے پیچھے پڑ جاؤں۔ لوگوں کی عزتِ نفس کا لحاظ رکھنا، ان کو مناسب مقام دینا اجتماعیت اور شرفِ انسانی کی بڑی ضرورت ہے۔

لاہور میں جا کر دیکھا کہ رپورٹیں آتی ہی نہیں۔ ایک اجتماع تو صرف رپورٹ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ ڈھاکہ میں مہینے کی ۵ تاریخ رکھی تھی کہ رپورٹ آ جانا چاہیے۔ اگر آنے سے کہیں رہ جاتی تو فون پر یاد دہانی کرا دی جاتی۔ اس طرح سو فی صد رپورٹیں آ جاتی تھیں۔ دس تاریخ کو ہمارا کارکنوں کا اجتماع ہوتا تھا، جس میں پورے شہر کی رپورٹ پیش ہوتی تھی۔ کارکنوں کا یہ اجتماع مختلف جگہوں پر مختلف وقتوں میں وقت کی پابندی کے ساتھ ہوتا تھا۔ حاضری کا اوسط ۹۵ فی صد تھا۔

ڈھاکہ جماعت تنظیمی لحاظ سے مضبوط تھی، کیونکہ ہمارے کارکنان کا نظم، ہماری مطبوعات اور بیت المال کا نظام مضبوط ہو گیا تھا۔ دعوت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تربیتی پروگرام بھی اچھے ہو رہے تھے۔ میں خود سیاست میں سرگرم نہیں تھا، بلکہ جو بھی سیاسی کام تھے، وہ صوبائی جماعت ہی کرتی تھی اور صوبائی جماعت سے میرا ربط بہت گہرا تھا۔ عبدالرحیم صاحب مرحوم، غلام اعظم صاحب اور عبدالخالق صاحب مرحوم کے ساتھ میں، تواضع، اطاعت، تابع داری اور مروت کا لحاظ رکھتا تھا۔ ان سب سے اس وقت بھی بڑے خوش گوار تعلقات تھے۔ صوبائی قیادت کے اخباری بیانات اور قراردادیں بڑے شوق اور احتیاط سے بروقت لکھ کر دیتا تھا۔ جماعت کے ہر فیصلے اور مشورے میں وہ مجھے بلاتے تھے۔

صوبائی نظم نے اس حد تک میرا خیال رکھا، کہ کمپنی میں میری مصروفیات کو ملحوظ

رکھتے ہوئے وہ صوبائی شوریٰ کا ایجنڈا اس طرح طے کرتے، کہ کس وقت میرا ہونا ضروری ہے۔ اور وہ وقت ایسا ہوتا جب میں اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں سے فارغ ہوجاتا۔ باقی وقت میں وہ شوریٰ میں معمول کی کارروائی جاری رکھتے۔ دفتر سے دو بجے فارغ ہوکر میں سیدھا جماعت کی شوریٰ کے اجلاس میں آجاتا۔ بعدازاں لاہور میں بھی محترم قاضی حسین احمد صاحب نے میری بیماریِ دل کے باعث مجھے اس نوعیت کی رعایت دی تھی، جس پر ان کا شکرگزار ہوں۔

جمعیت سے کیا پایا؟

۱۹۶۳ء کی اور کئی قابلِ ذکر چیزیں ہیں، خاص طور پر سیاسی امور۔ یہ سال کچھ ایسا بابرکت اور نتیجہ خیز سال تھا، کہ آج بھی جب ماضی پر نظر ڈال کر دیکھتا ہوں، تو اس ایک سال میں جتنی مقدار اور جتنی مختلف نوعیت کے کام ہوئے، ان کو یادداشتوں میں سمیٹنا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ کمپنی کی ذمہ داریوں کو باقاعدگی سے ادا کرنے کے ساتھ جماعت کے کام کو نبھانے پر اللہ کا بڑا شکر ادا کرتا ہوں، کہ اس نے اس زمانے میں مجھے اپنے دین کی خدمت کرنے اور سیکھنے کی توفیق دی۔

یہ ایک ایسا سال تھا، جس میں، میں نے تین اہم تحریریں لکھیں۔ پہلی: 'میں نے جمعیت سے کیا پایا؟' ہے۔ جمعیت کی طرف سے یہ ایک سوال ملا تھا۔ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے مسلم بھائی اور محبوب بھائی کا مسلسل اصرار تھا۔ میں تحریر کا آدمی نہیں تھا اور پھر اتنا زیادہ مصروف بھی تھا۔ اگرچہ کمپنی کے کاموں میں رپورٹیں لکھنا ہوتی تھیں۔

ڈھاکہ جماعت کے لیے تعارف، عوام کے طبقوں کے نام خطوط، سرکلر، بیانات اور پمفلٹ لکھ رہا تھا۔ اس وقت ایک کیف کا عالم تھا اور کام میں خوب طبیعت لگ رہی تھی۔ اسی اُمنگ اور آرزو میں لکھنے بیٹھ گیا، نتیجہ یہ کہ مشکل سے دو دن میں اس تحریر کو مکمل کرلیا۔ یہ تحریر کتابی صورت میں ادارہ مطبوعاتِ طلبہ کی جانب سے شائع ہوچکی ہے۔

اس کی کچھ باتوں کو میں نے دہرایا ہے۔ بہرحال اپنی تحریروں میں اب بھی اسے ایک اچھی تحریر شمار کرتا ہوں۔ جو میرے جذبات کے لحاظ سے، اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے اور اپنی تاثیر میں بھی، غالباً ایک اچھی تحریر ہے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل

پھر یہی سال تھا، جب ماہ نامہ چراغِ راہ کراچی کی طرف سے 'تحریک اسلامی نمبر' کے لیے خورشید بھائی نے بطور مدیر ایک سوال نامہ بھیجا۔ اس کا بھی تفصیل سے جواب لکھا۔ یہ مفصل جواب اس وقت چراغِ راہ میں چھپ گیا تھا اور اب مسائل و افکار (حصہ اول) میں شائع ہوا ہے۔ ملکی مسائل اور تحریکِ اسلامی کے مستقبل کے حوالے سے وہ میری سوچ اور فکرمندی کا آئینہ دار ہے۔

تحریک اسلامی کی حکمت عملی کے حوالے سے، گذشتہ دس برسوں کے دوران جو کہتا رہا ہوں، پھر ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے حوالے سے جماعت کی پالیسی پر میرا جو موقف رہا ہے، وہ کوئی اچانک نمودار نہیں ہو گیا، بلکہ یہ سوچ کا ایک تسلسل ہے۔ ۶۳ء کی اس تحریر میں پاکستانی فوج کی بالادستی کے رجحان کے بارے میں کھل کر لکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالادستی اب بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ بہت سارے لیڈر، جن میں بعض اوقات ہم بھی شامل ہو جاتے ہیں، یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ فوج آ کر ان بگڑے ہوئے سیاسی معاملات کی اصلاح کرے۔ جنرل ایوب خان کے دور میں فوج کی نفسیات کے گہرے مطالعہ کے بعد، جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اس لحاظ سے سمجھتا ہوں کہ مارشل لا کے اندر، پاکستان کے لیے نہ کبھی خیر رہی ہے اور نہ شاید آیندہ کبھی ہوگی۔ خواہ یہ مارشل لا ایوب خان کا سیکولر مارشل لا ہو، یا ضیا الحق صاحب جیسا مظاہرِ اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے مارشل لا ہو۔

اس تحریر میں، میں نے مستقبل میں آنے والی مادہ پرستی اور مادی ترقی کے نام پر دولت کی دوڑ کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اس طرح عورتوں اور نوجوانوں کے اندر دعوتِ دین کے کام کی اہمیت و ضرورت کا بھی ذکر کیا تھا۔ کارکنوں کے اندر للٰہیت، اخلاص، اخلاق اور

صحیح محرکات یعنی جنت کی طلب، اور دوزخ یعنی آگ سے بچنے کی فکر کی جانب بھی توجہ دی تھی۔

عربک اسلامک یونی ورسٹی رپورٹ

مشرقی پاکستان کے طول وعرض میں عربی مدارس کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ علما کا ایک طبقہ قدیم مدارس پر قانع ہے، اور دیوبند کی طرز پر کام کر رہا ہے، مگر ان کے ساتھ اسلامی مدارس کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو جدید مدارس، کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے نمونے پر مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ یہ مدرسے بڑی تعداد میں تھے اور یہاں پر طلبہ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔

ڈھاکہ میں علما اور مدرسین کا ایک اجتماع ہوا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس اجتماع میں وہاں کے بڑے بڑے علما آئے ہوئے تھے۔ اجتماع میں حکومت کے سامنے ایک 'عربک اسلامک یونی ورسٹی' قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ اس وقت منعم خان غالباً وہاں کے گورنر تھے۔ انھوں نے اس میں دل چسپی لیتے ہوئے کہا کہ ''آپ لوگ ایک منصوبہ بنا کر دیں۔ حکومت 'عربک اسلامی یونی ورسٹی' قائم کر دے گی''۔ وہاں پر یہ مدارس عربی نام ہی سے معروف ہیں، اس لیے اس کو نام کا حصہ رکھنے پر مصر تھے۔ اگرچہ میں اس کا قائل نہیں تھا۔ بہرحال مولانا عبدالرحیم صاحب کے ساتھ کئی دفعہ آنا جانا ہوا اور علما سے ملنے کا موقع ملا۔

انھوں نے ۵ افراد کی ایک کمیٹی بنا دی جس میں جماعت کی طرف سے مولانا عبدالرحیم صاحب اور میں شامل تھا۔ باقی تین افراد میں باریسال کے پیر صاحب اور چٹاگانگ مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس تھے۔ علما کو بالعموم باقاعدہ منصوبہ بندی کا تجربہ کم ہی ہوتا ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہ رپورٹ تیار کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جائے۔ رپورٹ میں اقتصادی تخمینہ بھی شامل کرنا تھا، کہ اخراجات کیا ہوں گے۔ اس رپورٹ کا کم از کم وہ حصہ جو عمارات، اخراجات اور سالانہ بجٹ کی ضروریات اور عمارتوں پر اخراجات

کے حوالے سے تھا، ایک انجینیرنگ کمپنی میں ذمہ دار منصب پر ہونے کے سبب یہ سب کام میرے دائرہ کار میں آتے تھے، اور ویسے بھی اب تک خاصا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔

اپنی عادت کے تحت میں نے اس پر قناعت نہیں کی، کہ دفتر میں بیٹھ کر ایک رپورٹ مرتب کر دوں، بلکہ دینی مدارس کے تعلیمی نظام کے بارے میں جتنی بھی کتابیں ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی لائبریریوں سے مل سکتی تھیں، وہ حاصل کیں اور انھیں پڑھا۔ ولیم ولسن ہنٹر کی Our Indian Musalmans سے لے کر مدرسہ عالیہ کلکتہ اور مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کی تاریخ اور بنگال میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام وغیرہ پر کتابیں پڑھیں۔ جب انگریز آئے تو کتنے مدارس تھے؟ کتنے طلبہ تھے؟ ان پر کیا بیتی؟ کس طرح ان کو جڑ سے اُکھاڑا گیا؟ کتنا ان کا اثر ختم ہوا؟ اصلاحات کے نام پر کیا کیا ظلم ہوا ہے؟ پرانے نصاب میں ان اصلاحات سے کیا فائدہ ہوا؟ــــــ گویا کہ اس کے پورے مسئلے اور موضوع کو پہلے اپنی گرفت میں لیا۔

اس کے بعد جو رپورٹ لکھی، اس میں تاریخی جائزہ لیا۔ پھر تعلیم کے مقاصد، ضروریات اور حالاتِ حاضرہ کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد یونی ورسٹی کا مقصد اور مشن متعین کیا۔ پھر اس کے لیے باقاعدہ نصاب پیش کیا۔ نصاب میں شروع سے لے کر آخر تک ہر طالب علم کے کیا مضامین ہوں؟ تعلیم اور نظام کس طرح کا ہو؟ یعنی تفصیل سے یہ ساری چیزیں متعین کیں۔ اس میں یہ تخمینہ بھی پیش کیا کہ یونی ورسٹی کو کتنی عمارتوں کی ضرورت پڑے گی؟ ہوسٹل کتنے ہوں گے؟ تنخواہیں کیا ہوں گی؟ کتنا اسٹاف لگے گا؟ طلبہ کتنے ہوں گے؟ اس کی کاپی میرے پاس موجود نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں دینی تعلیمی نظام کے بارے میں وہ بہرحال ایک جامع دستاویز ہے۔ اس خاکے کو دیکھ کر علما بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے مجھے بڑی محبت اور بڑے احترام سے داد دی۔ میرے ہاتھ اور پیشانی کو بھی چوما کہ ایسی رپورٹ تیار ہوگئی ہے۔ پھر یہ رپورٹ انھوں نے گورنر کے سپرد کر دی۔

یہ تین قابلِ ذکر چیزیں ہیںــــــ چراغِ راہ کے قلمی مذاکرے کی حد تک جو باتیں کیں، وہ میری حد تک پالیسی کا ایک حصہ بنتی رہیں اور بعد میں بھی ان پر کام کرتا رہا۔

میں نے جمعیت سے کیا پایا؟ لکھنے سے میرے جذبات کو بالیدگی حاصل ہوئی۔ عربک اسلامی یونی ورسٹی رپورٹ نے تحریک کے لیے دعوتی میدان کی ایک نئی دنیا تک پہنچنے میں مدد کی۔

جمعیت طلبہ عربیہ

عربک اسلامی یونی ورسٹی رپورٹ کی تیاری کے دوران مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہوگیا، کہ لاکھوں طلبہ ان مدارس میں پڑھتے ہیں۔ طلبہ کی یہ قوت ایک دینی بنیاد رکھتی ہے۔ اگرچہ ڈھاکہ کے مغربی انگریزی تعلیم کے اداروں میں، سیکولر قوم پرست اور اشتراکی عناصر غالب ہیں، لیکن اس کے برعکس یہ ایسا میدان ہے، جو ہماری دینی تحریک کے لیے بڑا سازگار ہے۔ ان کے مقابلے میں قدیم روایتی مذہبی مدارس میں بھی گنجایش نہیں ہے، جتنی کچھ ان جدید عربی مدارس میں گنجایش موجود ہے۔

چنانچہ وہیں سے میرے ذہن میں یہ بات بھی آ گئی، کہ ان مدارس عربیہ کے طلبہ کو منظّم کرنا چاہیے۔ اس قوت کو تحریک کے کام میں لگانا چاہیے۔ یہ خیال اس وقت پیدا ہوا مگر عملی جامہ اس نے بعد میں پہنا۔ ۱۹۶۳ء میں، میں نے جمعیت کو اس طرف متوجہ کیا۔ شیخ محبوب علی اس زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ تھے۔ وہ کراچی سے آئے تھے۔ ۲ جنوری ۱۹۶۴ء کو ڈھاکہ میں ان طلبہ نے بہت بڑا جلوس نکالا تھا، جس میں جمعیت نے بھی حصہ لیا۔ اس جلوس کی قیادت محبوب علی اور ڈھاکہ جمعیت کے ناظم ابوالبشر محمد ناظم نے کی۔

اس قوت کو دیکھ کر مجھے اور تقویت پہنچی۔ اس جلوس سے بھی ظاہر ہوا کہ یہ قوت بڑی آسانی کے ساتھ اقامتِ دین کے مقاصد کے لیے کام کر سکتی ہے، متحرک ہوسکتی ہے اور آیندہ جو بھی مراحل پیش آنے والے ہیں، ان میں یہ قوت ہمارے لیے بڑا سرمایہ اور بڑا اثاثہ بن سکتی ہے۔

بنگالی رفقا کی محبت

زندگی بڑی مصروف تھی۔ صبح سات، ساڑھے سات بجے کمپنی کے آفس پہنچنا ہوتا تھا، جو دوپہر تک چلتا۔ ایک زمانے میں تو صبح سے شام تک آفس میں رہتا تھا کہ جب ہفتہ میں پانچ دن کام ہوا کرتا تھا۔ بہرحال آفس سے آتے ہی فوراً جماعت کے دفتر چلا جاتا، جیسا کہ میں نے خود طے کیا تھا کہ تین دن ضرور جانا ہے۔ اس کے بعد پروگرام بھی ہوتے تھے۔ اتوار اور جمعہ کو بھی پروگرام ہوتے تھے۔ پھر صوبہ کے دفتر میں ضرور جاتا تھا۔ اور یہ سارے کام اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ۶۳ء کا پورا سال سخت مصروفیت میں گزرا۔ کمپنی کو، کہیں سے، کوئی ذرہ برابر بھی شکایت نہیں ہوئی۔ پیشہ ورانہ کام میں کوئی خلل نہیں پڑا، بلکہ وہ میرے کام سے خوش تھے۔ جماعت کے لوگ تو تھے ہی بہت خوش۔

مشرقی پاکستان میں جماعت کے لوگوں سے میرے جو تعلقات بنے، ان کی خوش گواری آج بھی میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ آج تک وہ لوگ مجھے محبت سے یاد کرتے اور محبت کرتے ہیں۔ بنگال سے تحریک کا جو ساتھی مل جائے، اس کے چہرے سے داخلی محبت اُمڈی پڑتی ہے اور آنکھوں سے اپنائیت چھلکتی ہے۔ وہاں پر ذکر بھی بڑی محبت و احترام سے ہوتا ہے۔ صرف ان میں نہیں جو میرے ساتھ تھے، بلکہ ان دوستوں نے ان لوگوں تک بھی یہ جذبہ منتقل کر دیا ہے، جو ہمارے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ کے دین کی جو حقیر خدمت کر سکا، اس کو قبول کرنے، اس کو مقبول بنانے اور اس کا بہترین فیصلہ کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ جیسی میری یاری اور دوستی خورشید بھائی اور ظفر اسحاق سے تھی اور ہے، ویسی اپنائیت اور بے تکلف دوستی کسی اور سے نہیں قائم کر سکا۔ ان کے علاوہ اگر کسی سے بہت قریب ہوا وہ فیاض بھائی ہیں، مگر اتنا نہیں۔ ہرچند کہ مشرقی پاکستان کے ساتھی مجھے بہت عزیز تھے۔ میں ۱۹۷۱ء کے شروع تک ڈھاکہ جماعت کا امیر رہا، اس وقت تک پوری جماعت کے اندر کبھی بھی کوئی خلفشار، کوئی جھگڑا، کوئی شکایت قسم کی چیز پیدا نہیں ہوئی۔

دراصل قرآن مجید اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے، میں نے جو بھی اخلاق سیکھے تھے، انھی کو مقدور بھر برتنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود میرے اور کارکنوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ حائل رہا۔ یہ فاصلہ بھی شاید کچھ مفید تھا۔ اگر بہت زیادہ بے تکلفی ہوتی ہے، تو پھر توقعات بھی زیادہ ہوتی ہیں اور خرابیاں بھی شاید زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس تھوڑے بہت فاصلے کے باوجود محبت اور اعتماد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کسی کو یہ شکایت نہیں تھی کہ کسی پر زیادہ توجہ دیتا ہوں یا کسی کو کم توجہ دیتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں، ڈھاکہ جماعت اور صوبائی جماعت کے تمام ذمہ داران آپس میں مضبوط تعلق اور گہری محبت رکھتے تھے۔

آٹھ سال کے عرصے میں، مجھے کسی فرد کو جماعت سے خارج نہیں کرنا پڑا۔ کسی کے خلاف بھی کوئی تادیبی کارروائی نہیں کرنی پڑی۔ عفو و درگزر، چشم پوشی، اعتراف، مفاہمت، عزت و احترام، نرمی اور پیار کے ساتھ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلا جائے تو لوگ بہت خوش دلی سے چلتے ہیں۔ سنجیدگی اور لگن کے ساتھ چلتے ہیں۔ محبت اور ایثار کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ چیزیں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مطالعے سے اخذ کر کے رفقا پر منطبق کرنے کی کوششیں کیں۔ نتیجہ یہ کہ جس کو میں نے جو کام دیا، اس نے ہمیشہ دل لگا کر کیا اور پورا کر کے دکھایا۔

قرآن مجید نے تجسّس اور کشف عیوب سے بھی منع کیا ہے۔ اس لیے ہماری نگاہ لوگوں کی خوبیوں پر ہونا چاہیے، نہ کہ خرابیوں پر۔ ایک ذمہ دار کی حیثیت، شخصیت اور تصور کے بارے میں جو کچھ میں نے سیکھا تھا، اس میں ایک حصہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے رسالے اسلامی ریاست میں کارکنوں کی ذمہ داریاں کا بھی تھا۔ وہ کتابچہ میں نے کئی دفعہ پڑھا تھا۔ اس کی بنیاد پر تقریریں بھی تیار کی تھیں۔ یہ رسالہ میرے سامنے بحیثیت ایک آئیڈیل کے رہتا تھا۔

اس دوران میں صرف ایک ایسا واقعہ ہوا جس کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ڈھاکہ

سے ذرا فاصلے پر ڈیمرہ ایک مقام تھا، وہاں کے ایک رکن اسحاق صاحب بالکل غیر فعال تھے۔ بار بار یہ مسئلہ ارکان کے اجتماع میں آیا کہ وہ اجتماع تک میں نہیں آتے اور کوئی کام نہیں کرتے۔ اس وقت نظم کا ایسا سسٹم بن گیا تھا، کہ ایسا رکن جو کام نہیں کر رہا ہوتا تھا وہ فوراً نمایاں ہوجاتا۔ جب بات زیادہ بڑھی تو میں نے کہا، کہ اچھا میں بُلا کر ان سے بات کرتا ہوں۔ میں نے ان کو بلایا اور سمجھایا۔ ان سے کہا: ''میں تو آپ کو ساتھ رکھنا چاہتا ہوں، لیکن آپ کی اس بے تعلقی کی وجہ سے خلفشار ہے۔ لوگوں کی انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ساتھ نہیں چلنا چاہتے تو پھر بہتر یہی ہے کہ آپ چھوڑ دیں، اور جب آپ کے حالات اجازت دیں تو پھر آپ آجائیے گا''۔ چنانچہ اس گفتگو کے بعد انھوں نے خود استعفا پیش کردیا۔ میں نے وہ استعفا منظوری کے لیے صوبہ میں بھیج دیا اور وہ منظور ہوگیا۔

اس کے بعد ان کو رکنیت چھوڑنے کا بڑا غم اور رنج ہوا۔ انھوں نے امیر صوبہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے پاس براہِ راست اپیل دائر کردی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے مجھ کو بلایا۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ فیصلہ کیسے ہوا۔ مجھے اس پر بڑا عجیب لگا کہ میں نے ان صاحب سے بات کی تھی۔ اگر وہ کام کرنا چاہتے تھے تو مجھ سے ہی کہتے کہ میں نہیں چھوڑنا چاہتا، لیکن انھوں نے ایک طرف استعفا دے دیا اور دوسری جانب بالائی نظم کے سامنے اپیل دائر کردی۔

اس موقع پر میں نے جم کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ساری صورت حال پر ایک تحریر لکھی، کہ ان کے کیا معاملات تھے، اثرات کیا تھے اور استعفا کیسے ہوا۔ اور تحریر لے جا کر عبدالرحیم صاحب کے سامنے پڑھی اور بتایا کہ یہ ذمہ داری میری اور ڈھاکہ جماعت کی ہے اور میں نے اس طریقے سے یہ پورا معاملہ کیا ہے۔ اس لیے اب اگر آپ اُوپر سے دخل دے کر کارروائی کریں گے تو اس سے میرے لیے کام چلانا مشکل ہوجائے گا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے سننے کے بعد ان کو مناسب جواب دے دیا، اور بات ختم ہوگئی۔

اس دور میں جماعت سے باہر کے سیاسی لیڈروں سے میرا کوئی ربط نہیں تھا۔ اگرچہ

اس زمانے میں سیاسی سرگرمیاں کچھ کم نہیں تھیں۔ ۶۳ء میں جماعت نے جمہوریت، بنیادی حقوق کی بحالی اور دستور میں ترمیم کے لیے زبردست مہم چلائی تھی۔ اس مقصد کے لیے لوگوں کے دستخطوں پر مشتمل نو میل لمبا محضرنامہ پیش کیا گیا۔ بالآخر صدر ایوب خان نے یہ ترامیم منظور کرلیں۔ اس طرح بنیادی حقوق اور پاکستان کے نام میں ''اسلامی'' کا لفظ بھی آ گیا اور قراردادِ مقاصد بھی دیباچے میں شامل ہوگئی۔ اسلامی دفعات بھی بحال ہوگئیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو ہمیں حاصل ہوئی۔ اس کے لیے ہم سب نے بہت محنت کی، لیکن اپنے دعوتی کاموں اور تربیتی کاموں کو متاثر نہیں کیا۔ بیت المال میں زبردست اضافہ ہوا، کارکنوں میں بھی اضافہ ہوا، اور روزانہ نئے متفقین بھی بنتے رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ڈھاکہ کے اندر بڑی کامیاب سیاسی مہم چلائی۔ پھر جب اسمبلی کے اندر جماعت کے لوگوں نے مولانا عبدالباری صاحب، مولوی فرید احمد صاحب وغیرہ کے ساتھ مل کر اسلامک ڈیموکریٹک فرنٹ بنایا، تو ان ارکان اسمبلی کو ڈھاکہ جماعت کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقع پر میں نے استقبالیہ خطاب انگریزی میں لکھ کر پڑھا۔ اس طرح یہ استقبالیہ جماعت سے باہر سیاسی لیڈروں سے روابط کا پہلا ذریعہ بنا۔

صوبائی اسمبلی میں ہمارے دو ارکان تھے۔ فرید پور سے مولانا عباس علی صاحب اور پبنہ سے مولانا عبدالسبحان صاحب۔ مولانا عبدالسبحان صاحب تو ۱۹۹۱ء میں بھی، بنگلہ دیش اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ ان ارکان اسمبلی کی خدمت کے لیے، معاونت اور راہ نمائی کے لیے جماعت نے صوبائی سطح پر شعبہ پارلیمانی امور قائم کرکے اسے میرے سپرد کردیا۔ حالانکہ پارلیمانی عمل کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس طرح پوائنٹ آف آرڈر، موشن، کٹ موشن وغیرہ جیسی اصطلاحات اور پارلیمانی رولز آف بزنس سارے پڑھنا پڑے۔ اجلاسوں کے دوران اور بعد میں بھی یہ ارکان اسمبلی میرے پاس آتے تھے۔ انھیں انگریزی میں قراردادیں لکھ کر دیتا تھا۔ اسمبلی میں پیش کی جانے والی موشن اور اٹھائے جانے والے سوالات تیار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ صوبائی جماعت کے جو کام ہوتے تھے، وہ بھی کرتا تھا۔

یہ وہ حالات تھے، جن میں ۱۹۶۳ء کے یہ آٹھ دس مہینے گزرے۔ جو میرے لیے

ہرلحاظ سے زندگی اور تحریکی زندگی کا بیش قیمت زمانہ تھا۔اس مختصر عرصے میں، میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔اس دوران وہاں پر جو تعلقات قائم ہوئے، وہ آج تک میرا سب سے قیمتی سرمایۂ حیات ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں، جماعت نے آگے بڑھ کر جو مہم چلائی،اس نے صدر ایوب صاحب کا ناطقہ بند کردیا تھا۔اس لیے وہ جماعت سے بہت زیادہ خفا تھے۔ان کے اقدامات سے معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ترکی کے سیکولر حکمران کمال پاشا کا سا ذہن رکھتے ہیں۔اگرچہ ان میں خوبیاں بھی تھیں، جن سے میں انکار نہیں کرتا۔میرے خیال میں مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا سب سے بڑا سبب فوج کی سیاسی بالادستی تھی۔ پھر فوج کے اندر ایوب خان کی مخصوص پالیسیاں، ان کا اندازِ حکمرانی اور مطلق العنانی تھی۔ اس وقت ایوب خان صاحب کے وزیرداخلہ خان حبیب اللہ صاحب مسلسل جلے کٹے بیان دیتے رہتے تھے۔

اس گرما گرم فضامیں، جو حکومت نے جماعت پر مسلط کر رکھی تھی، ہم لوگ دن رات یہ خدشہ محسوس کرتے تھے کہ کوئی کارروائی ہونے والی ہے۔اس تلخ فضا کو ہر آدمی محسوس کرسکتا تھا۔

۹

جماعت پر پابندی: گرفتاری اور قومی سیاست

اسی دوران نومبر ۱۹۶۳ء میں لاہور جماعت کا تاریخی اجتماع آ گیا۔

اجتماع میں ہم مشرقی پاکستان سے آ کر شریک ہوئے تھے۔ اس اجتماع میں حکومت کے ایما پر مولانا مودودی پہ فائرنگ ہوئی۔ جماعت کے ایک کارکن اللہ بخش شہید ہو گئے۔ اس پورے واقعے کی روداد میں بیان نہیں کر رہا، کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے **روداد جماعت اسلامی**، ہشتم]

یہ وہ زمانہ ہے، جب صدر ایوب خان صاحب نے جماعت کے خلاف پراپیگنڈہ مہم تیز کر دی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ۱۹۶۲ء کے دستور میں ترامیم کر کے عملاً ایک فردِ واحد کی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ بنیادی انسانی حقوق معطل کر دیے تھے۔ بالغ رائے دہی کا حق چھین لیا تھا۔ پاکستان کے نام کے ساتھ 'اسلامی' کا لفظ نکال دیا تھا۔ ''قرارداد مقاصد جو ۱۹۵۶ء کے دستور کا دیباچہ تھی، اسے دستور سے خارج کر دیا گیا تھا''۔

ان کے اس طرزِ عمل کے خلاف جماعت مہم چلا رہی تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس کے باعث ان کی جانب سے جماعت پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ نومبر میں ہم اجتماع سے واپس آئے۔ اس وقت یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں، کہ اب جماعت پر ہاتھ پڑنے والا ہے، اور جماعت کے خلاف کوئی کارروائی ہو گی۔ حکومت جس ہسٹیریائی کیفیت میں جماعت پر برس رہی تھی، اس سے ہم لوگوں نے بھی ایسے اقدام کا اندازہ لگا لیا تھا۔

داخلِ زنداں ہونا

یہ ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کی صبح تھی اور شعبان کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ۔ فجر کا وقت تھا۔ کسی نے باہر سے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دیکھا کہ باہر دفتر کا نائب قاصد مسلم کھڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ صبح ہی صبح وہ کیوں آیا ہے۔ جھانکا تو کچھ فاصلے پر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی، اس میں وردی والے دو تین افراد تھے۔ اس نے کہا کہ ''پولیس کے لوگ آئے ہیں''۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے ہی گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں۔

میں نے پولیس والوں سے پوچھا: ''کیسے آئے ہیں؟'' کہنے لگے: ''آپ کو ذرا آفس میں بلایا ہے''۔ میں نے کہا: ''اچھا میں تیار ہو جاؤں''۔ اہلیہ کو اُٹھا کر بتایا کہ جس بات کا خدشہ تھا، ہوگئی ہے۔ اس وقت تک ہمارے ہاں دو اور بچے پیدا ہو چکے تھے۔ یعنی فاروق اور بیٹی فرح۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں ان چار بچوں اور بیوی کے علاوہ گھر پر کوئی اور نہیں تھا۔ اہلیہ کو بتا کر میں نے کپڑے تبدیل کیے اور پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

ہماری پہلی منزل انٹیلی جنس بیورو (IB) کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ مجھے ان لوگوں کی اس بے خبری پر سخت حیرت ہوئی کہ وہ میرے گھر کا پتہ بھی نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے تو وہ دفتر سے نائب قاصد کو لے کر میرے گھر کا سراغ لگانے نکلے تھے۔ صبح سے شام تک، انٹیلی جنس بیورو کے آفس میں بٹھا کر انھوں نے مختلف سوالات کیے۔ گھر، خاندان، والدین، بھائیوں، بہنوں کے پتے معلوم کیے۔ اب یاد نہیں کیا کیا معلومات اکٹھی کرتے رہے۔ شام کے وقت انھوں نے مجھے ڈھاکہ سنٹرل جیل کی انتظامیہ کے سپرد کر دیا اور بتایا کہ ''تمھیں سیفٹی ایکٹ کے تحت تین ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا ہے''۔

جیل کی روداد تو ایک حد تک جیل سے لکھے ہوئے میرے خطوط لمعاتِ زنداں میں آ گئی ہے، جس میں میری اہلیہ کا تفصیلی پیش لفظ ہے، خورشید بھائی نے بڑی محبت کے ساتھ تعارف تحریر کیا ہے، اور میں نے بھی خطوط میں اشارے دیے ہیں۔ اس لیے ان باتوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

۶ جنوری کی شام، مجھے ڈھاکہ سنٹرل جیل میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں دوسری جگہ سے بھی لوگ آ چکے تھے۔ ان میں ایک حفیظ الرحمٰن صاحب تھے، جو رحمت اللہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ ڈھاکہ شہر کو چھوڑ کر باقی ڈھاکہ ڈویژن کے امیر تھے۔ بہت شفیق، بڑے بااخلاق، نہایت سمجھ دار، جماعت کے بڑے وفادار اور بڑے اچھے آدمی تھے۔

محض نفیس انسان تو میں نے بہت دیکھے ہیں، بلکہ یہ کہوں گا کہ ڈھاکہ کے سب ہی ساتھی بڑے نفیس انسان تھے۔ ان نفیس انسانوں میں بھی زیادہ بہتر انسان پروفیسر ہلال الدین صاحب تھے، جو مرکزی شوریٰ کے رکن نہیں تھے۔ حفیظ الرحمٰن صاحب بھی رکن شوریٰ نہیں تھے، مگر یہ کیوں گرفتار ہوئے؟ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا۔ ہلال الدین صاحب ڈھاکہ جماعت ہی کے رکن تھے اور ان کی بیوی بھی پڑھاتی تھیں۔

اس شام تک مجھے یہی اندازہ تھا کہ ہم تین آدمی اس جیل میں پہنچے ہیں۔ رات کو ہمیں ایک احاطے میں لے جایا گیا۔ وہاں پر پانچ کوٹھریاں تھیں۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دو کوٹھریوں میں سے، ایک میں شیخ محبوب علی صاحب، ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان ہیں اور دوسری کوٹھری میں ابوالبشر ناظم ڈھاکہ جمعیت یہاں پر پہلے ہی سے موجود ہیں۔ انھوں نے بہت ہی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ جب سے یہ گرفتار تھے، ہمیں خبر نہیں لگ رہی تھی کہ وہ ہیں کہاں؟ جیل میں آ کر ہمیں معلوم ہوا، کہ وہ تو یہاں پر موجود ہیں۔

جیل میں پہلی رات

جنوری کی رات تھی۔ سردی کا موسم تھا، لیکن یخ ٹھنڈے اور ننگے فرش پر تن بدن ڈھانپنے کے لیے صرف ایک کمبل تھا۔

پہنچتے ہی نماز پڑھی۔ اس کے بعد سیل (cell) میں بند کر کے تالا ڈال دیا گیا۔ سیل کے اندر ایک بستر تھا، یعنی صرف یہ ایک کمبل تھا، کمبل بچھایا، نہ کوئی گدا تھا، نہ تکیہ نہ کچھ اوڑھنے کا سامان۔ سردی بھی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز لگانے کی جگہ تھی۔

پیچھے کونے کے اندر ایک بیت الخلا کی سی جگہ تھی، یعنی ایک برتن تھا جس کو آدمی پیشاب، پاخانے کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ سیل کے اندر سلاخوں کے پیچھے سے کھانا مل جاتا۔ صبح دروازہ کھلتا تھا۔ مغرب کے وقت سب لوگ اپنے سیل میں بند ہو جاتے تھے۔

لیکن بس پاؤں پھیلاتے ہی اس رات ایسی نیند آئی، کہ میرے خیال میں ڈھاکہ جماعت کی امارت کے گذشتہ آٹھ مہینے میں ایسی نیند نہیں آئی ہوگی۔ جیسے ساری فکر دُور ہوگئی ہو۔ سر کے اُوپر کوئی بوجھ نہیں رہا تھا۔ بڑا اطمینان تھا کہ اپنے رب کی خاطر یہاں پہنچے ہیں۔ ہماری کوئی دنیوی غرض نہیں تھی۔ البتہ اس طرف ضرور ذہن گیا، کہ میری نوکری کے حوالے سے کمپنی کا ردعمل کیا ہوگا؟ مکان کمپنی کی طرف سے تھا، اس کا کیا ہوگا؟ گھر والوں کا خرچ کیسے چلے گا؟ بیوی بالکل اکیلی ہیں اور چار چھوٹے چھوٹے بچے، اتنے چھوٹے کہ جن میں ایک سوا سال کی بچی تھی۔ اس کے بعد فاروق ڈھائی سال اور احمد سات سال کے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھے ان کی کوئی فکر نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود بےفکری اس بات کی وجہ سے تھی کہ ساری فکرمندی اور حاجت روائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے، جو سارے اختیارات رکھتا ہے اور وہی سب مسئلے حل کرے گا۔

اگلی صبح ڈھاکہ سینٹرل جیل کے پاس ہی جامع مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی تو آنکھ کھلی۔ لاؤڈ اسپیکر پر کوئی قاری صاحب بڑے ہی دل کش لہجے میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت کر رہے تھے۔ بس، اس وقت کیا بتاؤں، دل پر کیا گزری، ایک سماں بندھ گیا: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اور فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ، هَلْ جَزَاۗءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ ہر چیز، ہر آیت گویا دل میں اُترتی جارہی تھی۔ قرآن سننے اور اثر لینے کا، ایسا کیف پہلے کبھی حصے میں نہیں آیا تھا۔ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن کے مقدمے میں سلوکِ قرآنی کی جو بات لکھی ہے، وہ اس وقت بالکل ایک حقیقت بن گئی۔ اگرچہ اس سے پیش تر بھی زندگی میں تجربات ہوتے رہے ہیں، لیکن اس وقت معلوم ہوا کہ شاید یہی سلوکِ قرآنی ہے۔ قرآن کی آیات زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ نمازِ فجر ادا کی۔

اس کے کچھ دیر بعد جیل کے کارندوں نے سیل کے دروازے کھولے، ناشتہ ملا، پھر

اخبار آئے۔ اخبار سے اپنی گرفتاری سے بڑھ کر روح فرسا خبر جماعت پر پابندی کی پڑھی۔ یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ مغربی پاکستان میں کیا ہوا؟ لوگوں پر کیا گزری؟ نورالاسلام صاحب، ڈھاکہ جماعت کے قیم تھے۔ ان کو اتنا موقع مل گیا تھا کہ انھوں نے بیت المکرّم کے آفس سے جماعت کا پورا ریکارڈ حفاظت سے اُٹھالیا تھا۔

قیدی ساتھیوں سے ملاقات

صبح اپنے اپنے سیل سے باہر آئے تو ہم سب کی باہم ملاقات ہوئی۔ سب نے اپنی اپنی داستانِ اسیری سنائی۔ حفیظ الرحمٰن صاحب، پروفیسر ہلال الدین صاحب، شیخ محبوب علی بھائی اور ابوالبشر نے اپنا حال بتایا۔ معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان میں کافی وسیع پیمانے پر کارروائی ہوئی ہے۔ محترم مولانا مودودی سمیت جماعت کی مرکزی شوریٰ کے سارے ارکان گرفتار ہوگئے ہیں۔ جیل میں یہ نئی زندگی شروع ہوئی اور اس عالم میں شروع ہوئی کہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ قیدوبند کا یہ زمانہ کتنا طویل ہوگا۔ جب ہم گرفتار ہوئے، اس وقت ایوب خان کے تیور اور جناب حبیب اللہ خان (وزیرداخلہ) کے بیانات دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ زمانہ خاصا لمبا ہوسکتا ہے۔

اگلی صبح سے میں نے سوچنا شروع کردیا کہ یہاں کس منصوبہ پر عمل ہو۔ ہم لوگ تو پانچ ہی ہیں، اس لیے ذہن یہ بنایا کہ تنہائی کا موقع ہے، کچھ جم کر مطالعہ کرلیا جائے۔ اس طرح بہت سی چیزیں تازہ ہوجائیں گی۔ دوسرا یہ کہ قرآن کے ساتھ وقت گزارا جائے۔ خوش قسمتی سے قرآن کا نسخہ میرے پاس موجود تھا، جب کہ دوسری کتابیں وہاں میسر نہ تھیں، کہ کوئی عمومی مطالعہ شروع کرتا۔ لمعاتِ زنداں میں یہ تفصیل موجود ہے، کہ کون سی کتب منگوائیں، کتابیں آتے آتے ہی وقت نکل گیا۔ شروع میں لکھنے کے لیے کوئی کاغذ بھی نہیں تھا۔ اس لیے خط لکھنے کا مشغلہ نہ اختیار کرسکا اور جب لکھے تو وہ بھی سنسر ہوکر کافی دیر بعد گھر پہنچے۔ اس وقت ان ظالم دیواروں اور آہنی دروازوں کے پیچھے بس قرآن ہی روشنی کا مینار تھا، قرآن ہی شجر سایہ دار تھا اور یہ اللہ کا بڑا فضل تھا۔

قرآن کے سائے میں

میرے پاس چونکہ قرآن مجید کا ایک نسخہ موجود تھا، اس لیے سوچا کہ قید و بند کے اس قیمتی وقت کو استعمال کرنے کے لیے اپنی پوری توجہ قرآن کے حفظ پر لگا دوں۔ حفظ کرنے کا مجھے شوق بھی تھا۔ پھر یہ کہ قرآن کے جو مضامین ذہن میں محفوظ تھے، میں چاہتا تھا، کہ ان کا متن بھی یاد رہے۔ قرآن سمجھنے کے لیے آدمی تفاسیر پڑھ کر بلاشبہہ معلومات کا بڑا قیمتی ذخیرہ اکٹھا کرسکتا ہے، مگر اس سے وہ بات نہیں بنتی کہ جو انسان کے پورے جسم، دل دماغ میں قرآن کو جذب کردے۔ چنانچہ یہ اللہ کا فضل ہے جب بھی درس دیتا ہوں تو میرے سامنے بے شمار مقامات اور وہ آیات ہوتی ہیں، ان کا مطلب اور مفہوم بھی سامنے ہوتا ہے۔ جس سے اس مخصوص آیت کے فہم اور وضاحت میں مدد ملتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہمیں تاکید کیا کرتے تھے کہ ''تہجد کی نماز میں آدمی قرآن پڑھے، تو قرآن کے تدبّر و فہم کے راستے کھلتے ہیں'' ـــــ اس لیے بھی اس وقت قرآن کے جو حصے یاد کیے تھے، وہ میری تربیت اور دوسروں کی تعلیم کا قیمتی ذریعہ ثابت ہوئے۔ یوں بھی درسِ قرآن دیتے وقت میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ حصہ یا تو حفظ کرلوں، ورنہ کم از کم توجہ سے اتنا پڑھ لوں کہ پڑھے بغیر بھی وہ ذہن میں موجود رہے۔ اپنی کتاب "The Way to the Quran" میں اسی کی تاکید کی ہے۔ لاہور میں فہم و تدریس قرآن کی کلاسوں میں، میں نے شرکا سے حفظ کا مطالبہ نہیں کیا کہ مشغول زندگی میں سب کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا، تاہم اس پر زور دیا کہ اسے بار بار پڑھیں، تاکہ اس کے مضامین ذہن پر نقش ہوجائیں کہ اس رواں دواں زندگی میں کوئی واقعہ، اور کوئی حادثہ رونما ہوتے ہی قرآنی آیات کی روشنی راستہ دکھا دے۔

میں نے اپنی توجہ قرآن مجید کی طرف لگائی۔ صبح کی ٹہل کے دوران بھی اسے یاد کرتا تھا، دوپہر میں کھانے کے بعد آرام کے دوران بھی یاد کرتا رہتا تھا۔ اس میں کوئی احتیاط نہیں کرسکتا تھا کہ لیٹ کر یاد کروں یا بیٹھ کر۔ حفظ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے لیے اگر

لیٹ کر، قرآن کے چھوٹے سے مصحف کو ہاتھ میں تھام کر آدمی پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مغرب کے بعد بھی وقت مل جاتا تھا، کہ جب وہ سیل میں بند کر کے تالا ڈال دیتے تھے۔ اس وقت بھی یاد کرتا تھا۔ پھر اپنے دوستوں سے ملاقاتوں اور آرام سے جو وقت بچ جاتا تھا، اس کو میں قرآن مجید کو یاد کرنے میں لگاتا تھا۔ اس طرح تین مہینے کی مدت میں بلکہ دو مہینے کی مدت کہہ لیجیے، کیونکہ آخری مہینہ تھوڑا کم ہی کام ہوا تھا، اس دوران سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران سمیت تقریباً چار پارے حفظ ہو گئے۔ سورۂ ق سے آگے اگرچہ بہت کچھ حصہ یاد تھا، مگر مسلسل یاد نہیں تھا۔ اس کے بعد سورۂ صافات سے سورۂ الناس تک میں نے ختم کر لیا۔ اس طرح ساڑھے آٹھ پارے حفظ ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے سورۂ عنکبوت اس وقت یاد کی تھی، جب وہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے پڑھی تھی۔ سورۂ لقمان اور سورۂ حم السجدہ کو بھی حفظ کیا تھا۔ سورۂ سجدہ اس نیت سے حفظ کی تھی کہ جمعہ کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر میں اس کو پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح سورۂ انفال، سعید رمضان نے یاد کرائی تھی۔ پھر سورۂ ہود حفظ کی۔ اس طریقے سے لگ بھگ پندرہ پارے مختلف مقامات سے یاد ہو گئے تھے۔ جیل میں قیام کا یہ بہت بڑا انعام تھا۔ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی تھی، سبحان اللہ!

اس کے بعد بھی جیل میں قیام بہت مفید ثابت ہوا۔ میری مراد بطور جنگی قیدی، بھارت میں ڈھائی برس کی گرفتاری سے ہے۔ لیکن اس دوسری قید میں حفظ نہیں کر سکا کہ عمر بڑھ چکی تھی اور حافظہ کمزور ہو چکا تھا۔ بات یہ ہے، کہ اب اس عمر میں مجھے یاد تو بڑی جلدی ہوتا ہے، لیکن بھول بھی جلد جاتا ہے۔ بار بار کے مطالعے سے مقامات ذہن میں ہوتے ہیں، اس لیے جلدی یاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے بعض مقامات ایسے ہیں کہ کئی بار دہرانے کے باوجود گرفت سے باہر ہو جاتے ہیں، لیکن بعض مقامات اس طرح ازبر ہو جاتے ہیں کہ کئی سال بعد بھی پڑھوں تو بالکل صحیح پڑھ جاتا ہوں۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق یاد کر کے بھولنا بھی بڑا وبال ہے، اس لیے میں نے مزید حفظ کرنے کے بجائے جتنا حفظ ہو گیا ہے، اسی کو یاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کوشش کے دوران اب

یہ عمر آ گئی ہے کہ کسی بھی لمحے قرآن کے مالک و خالق کے حضور پیش ہونے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔

عمومی مطالعہ اور فکری بحث

جب کتابیں آ گئیں تو ان کو پڑھنا شروع کیا۔ ان میں شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ اسی زمانے میں پڑھی۔ قرآن پر غور و فکر کا عمل بھی مسلسل جاری رہا۔ ثناء اللہ چودھری صاحب انجینیرنگ کالج میں مجھ سے چار پانچ سال جونیئر تھے۔ بہاولپور کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے بڑا گہرا ذاتی تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری کمپنی (ACE) میں کام بھی کرتے تھے اور بھائیوں سے بڑھ کر میری خدمت کرتے تھے۔ انھوں نے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے میرے بیوی بچوں کی بڑی مدد کی۔ میں نے ان سے کہا کہ ''مجھے قرآن مجید کا ایسا نسخہ لا کر دیں، جس میں ہر صفحے کے بعد دو سادے صفحے ڈال کر جلد بندی کی گئی ہو، تاکہ پڑھتے وقت جو کچھ میرے ذہن میں آئے اسے نوٹ کروں''۔ چنانچہ وہ قرآن مجید کی ایسی جلد تیار کروا کے دے گئے اور اس طریقے پر کچھ کام بھی ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ حدیث اور سیرت کا بھی مطالعہ ہوتا رہا۔

تھوڑے عرصے بعد شیخ محبوب علی بھائی اور ابوالبشر ناظم ہم سے الگ کر دیے گئے تھے۔ اس طرح اب ہم صرف تین رہ گئے تھے، یعنی حفیظ الرحمٰن صاحب اور ہلال الدین صاحب۔ ہماری آپس میں بات چیت ہوتی رہتی تھی، تحریک کے وہ مسائل و معاملات جو مطالعہ قرآن کے ساتھ میرے ذہن میں غور و فکر کا مطالبہ کرتے تھے، ان پر بھی گفتگو رہتی، لیکن اس تبادلۂ خیال سے مجھے اس قدر جواب یا اس سے بڑھ کر سوال نہیں ملتے تھے، کہ جو ذہنی طور پر میرے لیے مفید ہوتے۔ لیکن بہر حال مفید گفتگو تو ہوتی رہتی تھی اور مطالعہ قرآن کے ساتھ یہ سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اسی طرح اخبار آ جاتا تھا۔ ہم آپس میں سیاسی گفتگو کر لیتے تھے۔ یوں ہمارے شب و روز گزر جاتے۔

ایک سماجی سبق

'بی' کلاس قیدی ہونے کی وجہ سے ہمیں ایک خادم ملا تھا۔ وہ صبح کے وقت آتا اور مغرب سے پہلے چلا جاتا تھا۔ میس سے کھانا پکا کر لاتا تھا۔ اس پورے عرصے میں حفیظ الرحمٰن صاحب نے اپنے حسنِ عمل سے مساوات کے کافی درس دیئے۔ شام کو جب چائے آتی تھی، اسی وقت پہرے دار بھی آجاتے تھے۔ ایک ہی مگ ہوتا تھا۔ اسی مگ میں وہ خود بھی پیتے تھے اور سپاہیوں کو بھی پلاتے تھے۔ ان کا جھوٹا وہ خود پی لیا کرتے تھے۔ اس مشاہدے سے مجھے کافی سبق ملا، حالانکہ میں شاید یہ کبھی نہیں کر پاتا، لیکن اسی دوران یہ عمل میں بھی کرنے لگا۔

سیکھنے کی عادت تو وہی بھلی ہے کہ آدمی دوسروں کو دیکھ کے اچھی باتیں سیکھے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھ کو یہ بات اچھی لگی، اور دعوتی نقطۂ نظر سے یہ مفید عمل تھا۔ اس سے وہ لوگ متاثر بھی ہوتے تھے۔ اسی دوران ڈاکٹر کی ہدایت پر ہمیں سنگترے اور اضافی دودھ ملنے لگا۔ ہم چاہتے تو اپنا باورچی بھی الگ کر سکتے تھے۔ مگر میں اس کا قائل نہیں تھا کہ یوں سارا وقت محض اجناس منگوانے اور کھانے پکوانے میں ضائع ہو جاتا اور اس قیمتی وقت کو کھانے، سبزی اور چولہے کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب دو مہینے ہو گئے تو سیفٹی ایکٹ کے تحت ضروری تھا کہ حکومت نظر بندی کی وجوہ بتائے، اور تین مہینے کی پہلی نظر بندی مکمل ہونے سے پہلے وہ ٹریبونل کے سامنے ہمارے کیس پیش کرے۔ حسبِ ضابطہ یہ ٹریبونل صوبائی ہوم سیکرٹری اور صوبائی ہائی کورٹ کے ایک جج پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ دونوں مل کر فیصلہ کرتے تھے۔ عموماً ہوم سیکرٹری جو فیصلہ چاہتا تھا، وہی ہو جاتا تھا۔ یاد رہے کہ وجوہ نظر بندی بھی ہوم سیکرٹری کے دستخطوں سے جاری ہوتی تھیں۔ عام طور پر ایسے ٹریبونل میں ہماری ہائی کورٹ کے جج صاحبان گرفتاری اور نظر بندی کے معاملات پر حکومت کی منشا کا ''احترام'' کیا کرتے ہیں، ان میں سے بہت کم ہیں کہ جو حکومت کی مرضی کے خلاف کسی کو رہا کر دیں۔ اگرچہ پرچمِ عدل تھامنے والے

جج بھی ہوتے ہیں، مگر کچھ کم۔

ہمیں 'فردِ جرم' ملی، جس میں یہ جرم عائد کیا گیا کہ ''ہم حکومت کے خلاف بغاوت کا پروپیگنڈا کرتے ہیں، اس کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ برسرِ اقتدار حکومت شریعت کو قائم نہیں کر رہی، اسلام کے بارے میں مخلص نہیں ہے۔ اسی طرح ملک میں انتشار پھیلاتے ہیں، طلبہ کو حکومت کے خلاف اُکساتے ہیں، ہمسایہ ملک سے تعلقات خراب کر رہے ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔

دو دوستوں کی آمد

مغربی پاکستان میں بھی ارکانِ شوریٰ پر اسی قسم کی فردِ جرم فرداً فرداً عائد کی گئی۔ ان تفصیلات کو جاننے کے لیے خورشید بھائی کی لکھی ہوئی روداد اسیری تذکرۂ زنداں ایک بڑی مفید کتاب ہے، جو حال ہی میں دوبارہ شائع ہوئی ہے۔

جماعت کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے لیے پروفیسر غلام اعظم صاحب اور مولانا عبدالرحیم صاحب لاہور گئے ہوئے تھے، ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا، مگر ان کو چارج شیٹ (فردِ جرم) نہیں دی گئی۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد ان کو اس طرح رہا کیا گیا، کہ مغربی پاکستان کی پولیس انھیں اپنی نگرانی میں لاہور ایئرپورٹ پر لائی اور ڈھاکہ آنے والے ہوائی جہاز میں بٹھا دیا۔ جب جہاز ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اُترا تو یہاں کی صوبائی حکومت نے نئے احکام کے تحت ان کو گرفتار کر کے ڈھاکہ سنٹرل جیل میں پہنچا دیا۔ دوپہر کے وقت ہمارے ہاں غلغلہ بلند ہوا کہ نئے لوگ آنے والے ہیں۔ ہمیں حیرت تھی کہ اب ہمارے ساتھ کون سے قیدی لاکر رکھے جائیں گے؟ پھر خیال آیا کہ مشرقی پاکستان کے یہی دو آدمی آسکتے ہیں۔ یہ لوگ عشاء کے وقت جیل پہنچے۔ اس وقت ہم لوگ اپنے اپنے سیل میں بند ہو چکے تھے۔

پروفیسر غلام اعظم صاحب اور مولانا عبدالرحیم صاحب کے آنے سے ہماری افرادی قوت میں اضافہ ہوا۔

غلام اعظم صاحب سے تحریکی مسائل پر تبادلۂ خیال سے واقعی فوائد حاصل ہوئے۔

ہم دونوں میں یہ مشترک ذوق تھا۔ پھر روحانی اور دینی معاملات میں بھی مزاج کی ہم آہنگی تھی۔ اعظم صاحب کو مشہور بنگالی شاعر اور ڈرامہ نگار رابندر ناتھ ٹیگور [م:۱۹۴۱ء] کا کلام پسند تھا، اور یاد بھی تھا۔ وہ اس کے پہلودار اور گہرے ڈراموں کا بھی مطالعہ کر چکے تھے۔ نفسیات کے ان باریک اشاروں کا تذکرہ وہ گفتگو میں کیا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ ٹیگور مسلمان صوفیوں سے متاثر ہے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب چونکہ صاحبِ علم آدمی تھے، دینی علوم سے گہرا تعلق اور بامعنی ربط رکھتے تھے۔ اس لیے ہم نے ان کے ساتھ مل کر قرآن کے درس کا پروگرام شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ صرف ایک مہینے تک ہی چل سکا۔

اس عرصے میں ملاقاتی آیا کرتے تھے۔ ثناء اللہ بھی ایک بار آئے تھے۔ بیوی بچے بھی خیریت دریافت کرنے آتے تھے۔ جیل کا کھانا تو بہت ہی خراب ملتا تھا، اسی لیے جس روز گھر سے ٹفن میں کھانا آتا تھا تو گویا عید ہو جاتی تھی۔ خاص طور پر حفیظ الرحمٰن صاحب کے گھر سے تو بڑا پُرتکلف ٹفن آیا کرتا تھا۔ بھاری کھانوں پر مشتمل چیزیں ہوا کرتی تھیں، اور وہ ہمارا بہت ہی مزے کا دن ہوا کرتا تھا۔ میں نے لمعاتِ زنداں میں جیل سے جو خط لکھے ہیں، ان چیزوں کی طرف چند اشارے کیے ہیں۔ اگرچہ میرے ان خطوط میں واقعات کم ہیں اور نصائح زیادہ ہیں۔ یہ ہم جیسے 'خشک' اور غیر ادبی آدمی کی کمزوری اور خامی ہے، کہ واقعہ نگاری و واقعہ بیانی میں توجہ نہیں دے پاتے، یا اس کے فن سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے قاری کے لیے تحریر عموماً پُرکشش نہیں بنتی۔ یہ ہمارا ایک کمزور پہلو ہے۔

ٹریبونل کے سامنے پیشی

تقریباً دو ماہ بعد جب 'نظرثانی ٹریبونل' کے سامنے پیش ہونے کا وقت آیا، تو میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنا سارا کیس خود پیش کروں گا۔

میں نے حکومت کی جاری کردہ 'فردِ جرم' کا جواب ۲۵، ۳۰ صفحات میں لکھا تھا۔ بظاہر لکھنے پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی، لیکن اگر میں یہ کہتا کہ ''جواب لکھ رہا ہوں'' تو لازماً

روک ٹوک ہوتی۔ اس لیے میں نے اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ جس روز مجھے ہائی کورٹ جا کر پیش ہونا تھا، اس روز میں نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا کہ اپنی تحریر کو چھپا کر لے جاؤں۔ ڈھاکہ جماعت کے بہت سے کارکنان موجود تھے۔ دو مہینے بعد ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پولیس کے سپاہیوں کا رویہ بڑا نرم تھا۔ انھوں نے کارکنوں سے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ البتہ جب کوئی افسر آتا تھا تو کہہ دیتے، کہ ''ادھر ہو جائیں، جب وہ چلے جائیں تو پھر ملیں''۔

بہرحال، میں بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ جسٹس عبدالستار صاحب، ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جج اس بورڈ کے رکن تھے۔ (جو ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں چیف الیکشن کمشنر تھے اور پھر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش کے صدر بھی رہے ہیں)۔ یہ بنگالی نژاد تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے رکن، ہوم سیکرٹری صاحب بھی موجود تھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے کہا کہ ''آپ اپنا موقف بیان کریں''۔ میں اپنا تحریری بیان دے کر باہر آ گیا اور جیل پہنچا دیا گیا۔

جیل میں جیلروں اور ڈاکٹروں کا رویہ ہمارے ساتھ بڑا اچھا اور مہذب تھا۔ کیونکہ ان کی نظر میں ہم کوئی مسئلہ پیدا کرنے والے قیدی نہیں تھے اور ان کے نزدیک دین دار بھی تھے، جو نماز روزے میں مشغول رہتے تھے۔ شہاب الدین صاحب، ڈپٹی جیلر ہمارے اُوپر خاص طور پر تعینات تھے۔ اس روز وہ شام کو آئے اور کہا کہ ''میری نوکری خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ آپ نے کیا کیا جو بیان لکھ کر لے گئے''۔

میں نے کہا کہ ''جب چارج شیٹ (فردِ جرم) تحریری شکل میں آئے گی، تو اس کا دفاع آدمی لکھ کر بھی کر سکتا ہے۔ اس میں آخر کون سی غیر قانونی بات ہے؟ ہم نے اس کو کوئی چھپایا نہیں۔ اگر آپ منع کرتے تو پھر ضرور غور کرتے کہ کیا کیا جائے؟ اس وقت آپ نے منع نہیں کیا اور اگر آپ تلاشی بھی لینا چاہتے تو لے سکتے تھے''۔

کہنے لگے کہ ''نہیں، ہم نے آپ پر اعتماد کیا ہے''۔ میں نے کہا: ''آپ کس کس چیز میں ہم پر اعتماد کر رہے ہیں۔ ہمیں تو معلوم نہیں ہے''۔ خیر، انھوں نے تھوڑی بہت تلخی دکھائی،

مگر اگلے دن پھر اسی طرح نارمل ہو گئے۔

اُمید اور نا اُمیدی

تین مہینے پورے ہو رہے تھے۔ اب اس بات کا انتظار تھا، دیکھیں آیندہ کے لیے کیا ہوتا ہے؟ زیادہ توقع یہی تھی کہ ہماری نظر بندی میں توسیع ہو جائے گی۔ کیونکہ حکومت کے رویے میں تبدیلی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دوسری جانب اسی زمانے میں مشرقی پاکستان ہائی کورٹ میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف اے کے بروہی صاحب نے رٹ بھی دائر کر دی تھی۔ ان کے ہمراہ بیرسٹر اختر الدین صاحب بھی تھے، جو قومی اسمبلی کے رکن اور جماعت کے بڑے ہونہار کارکن بھی تھے۔ وہ اس رٹ میں ہمارا مقدمہ لڑ رہے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ میرے نام سے یہ رٹ جائے۔ ڈھاکہ جماعت کے امیر کی حیثیت سے میں یہ رٹ دائر کر سکتا تھا، لیکن اس میں دستخط لینے کا معاملہ لمبا تھا۔ اس کے لیے پہلے حکامِ بالا سے اجازت لینے کے لیے درخواست کرتے، پھر اس پر دستخط کرتا۔ اسی طرح وکالت نامے پر دستخط کرنے کا معاملہ تھا اور اس میں یہ مشکل تھی کہ حکومت روک سکتی تھی اور دیر بھی لگا سکتی تھی۔ چنانچہ تمیز الدین صاحب جو جماعت کے بیت المال کے ناظم تھے، ان کے نام سے رٹ دائر کر دی، جو سماعت کے لیے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد ہماری نظر بندی کو چیلنج کرنے کے لیے رٹ دائر کرنے کی تیاری کی گئی۔

تین مہینے اس طرح گزر گئے اور پانچ اپریل کی تاریخ آ گئی۔ اس روز صبح سے انتظار تھا کہ نظر بندی میں توسیع ہوتی ہے یا تین مہینے پورے ہونے کے بعد رہائی ہوتی ہے۔ بالآخر شام کو مغرب سے کچھ پہلے جیل کے حکام نے بتایا کہ ''مولانا عبدالرحیم صاحب اور پروفیسر غلام اعظم صاحب کے علاوہ ہم تینوں یعنی مجھے، پروفیسر ہلال الدین صاحب اور حفیظ صاحب کو چھوڑ دیا گیا ہے''۔ اس سے قبل جیل میں ناظم جیل خانہ نے ہمیں بتایا تھا کہ ''اگر نظر بندی میں توسیع ہوگئی تو پھر آپ مستقل قیدی بن جائیں گے، اور آپ کو جیل کے کپڑے

ملیں گے"۔ چنانچہ جیل کا درزی آیا اور ناپ لے کر چلا گیا تھا۔ اس وقت تک میں شلوار قمیص کے بجائے بنگالی کُرتا اور پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ درازی نے گھٹیا قسم کے لٹھے کے چار جوڑے تیار کر دیے تھے، وہ رہائی کے وقت ساتھ لے آیا تھا۔ بعد میں کئی مرتبہ وہ جوڑا پہنا کرتا تھا۔

رہائی

۵ اپریل ۱۹۶۴ء کی شام ڈھاکہ سنٹرل جیل کے حکام نے ہمیں رہا کر کے باہر لا کھڑا کیا۔ ثناء اللہ صاحب کے ہمراہ سائیکل رکشا پر اپنے گھر پہنچا۔ چونکہ میری اہلیہ کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ رہائی ہوگی، بلکہ غالب امکان یہی تھا کہ نظر بندی میں توسیع ہوگی، اس لیے جب ہم پہنچے تو وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ انھیں میرے آنے کی توقع نہ تھی۔ اس زمانے میں ہم سیگن باغیچہ میں رہتے تھے۔ پاس ہی پرانا پلٹن کا محلّہ تھا۔ وہاں پر ایک محترم اور معزز خاتون رئیسہ عزیز صاحبہ رہتی تھیں۔ وہ جماعت کی کارکن بھی تھیں۔ ان سے میری اہلیہ کے بڑے گہرے گھریلو تعلقات تھے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ ان کے بھائی ڈاکٹر اکرام صاحب، الہ آباد سے آئے تھے۔ ثناء اللہ صاحب نے ڈاکٹر اکرام صاحب سے مل کر ہمارے گھر والوں کی خبر پوچھی تو معلوم ہوا، کہ وہ رئیسہ عزیز صاحبہ کے ہاں ہیں۔ ایک بچے نے بھاگ کر اطلاع دی، وہ آئیں اور جلدی جلدی کھانے کا بندوبست کیا۔ اس طرح سے جیل کی مدت اختتام کو پہنچی۔

جیل سے پہلے کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو معلوم ہوتا ہے کہ سخت مصروفیات کا زمانہ تھا۔ اگرچہ پہلے دو سال کے بعد میں نے کمپنی کا کام کبھی گھر پہ نہیں کیا، بلکہ آفس میں ہی کرتا تھا۔ اِلّا یہ کہ کبھی کوئی ہنگامی صورت سامنے آ گئی ہو۔ بعض دفعہ کمپنی کے دفتر میں فرصت کے لمحات میں جماعت کا بھی کام کر لیتا تھا، دوسری طرف ۱۹۶۳ء کے سال میں ہر لحاظ سے بہت سارے کام ہوئے۔ سب کے لیے وقت نکلا۔ صوبے اور مرکز کی سطح پر بھی تمام پروگراموں اور شوریٰ کے تمام اجلاسوں میں شرکت کی۔ ڈھاکے کے تمام حلقوں کا

دورہ کیا۔ جماعت کا کام بھی کوالٹی کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھا۔ یہ سب باتیں محنت، توجہ اور وقت چاہتی تھیں۔

اس لحاظ سے ان بھرپور مصروفیات سے کٹ کر قید کے تین مہینے کا قیام تو ایک نعمت تھا۔ اگرچہ اس میں اہلِ خانہ سے دُوری تھی، مگر مجھے اطمینان تھا کہ بس اب میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ جس طرح بیماری میں صحت کے اعمال کا اجر ملتا ہے، اسی طرح میں یہ سمجھتا تھا کہ اب چونکہ حکومت نے کام سے روک دیا ہے اور ۱۹۶۳ء میں جس انداز سے کام کر رہا تھا، اس حال میں مجھے ان سب کاموں کا اجر ملے گا، ان شاء اللہ۔ کیونکہ اگر میں باہر ہوتا تو اللہ کے فضل سے لامحالہ یہی کام کر رہا ہوتا۔

میں نے ایک خط میں مولانا محمد جعفر تھانیسری کا واقعہ لکھا تھا، جن کو انگریزوں نے پھانسی کی سزا دی تھی۔ جب ان سزا یافتگان نے یہ سزا سن کر خوشی کا اظہار کیا، تو ان کو کالے پانی کی سزا میں بدل دیا۔ جمعہ کا دن آیا، انھوں نے غسل کیا، لوگوں نے کہا کہ ''آپ کہاں چلے''۔ جواب دیا: ''جمعہ پڑھنے''۔ کہا: ''آپ تو قیدی ہیں''۔ انھوں نے فرمایا: ''میرا کام تو یہ ہے کہ تیاری کروں۔ کیونکہ یہ کرنا میرے بس میں ہے''۔ اس کے بعد دروازے تک گئے تو پہرے دار نے انھیں روک دیا کہ آپ آگے نہیں جاسکتے، وہ واپس آ گئے، اور کہنے لگے: ''جو میرے بس میں تھا، میں نے کر دیا۔ باہر جانا میرے بس میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس کا اجر و ثواب دے گا''۔ پھر جب ان کی داڑھی مونڈی گئی تو وہ داڑھی کے کٹے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر کہتے تھے کہ ''غم نہ کر تو اللہ کی راہ میں مونڈی جارہی ہے''۔۔۔

بالکل اسی طرح ہم لوگوں نے عید کے دن باہر نماز پڑھنے کی کوشش کی۔ عید ضرور آئی مگر عید کی نماز نہیں ہوئی۔ جمعہ کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ البتہ سیل کے قید تنہائی کے علاوہ باقی اوقات میں ہم پانچ لوگ مل کر باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ محبوب علی بھائی اور ابوالبشر ہمارے ساتھ ایک ڈیڑھ ماہ رہے۔ اسی دوران میں اعظم صاحب اور عبدالرحیم

صاحب بھی آ گئے۔قید میں قرآن سے تعلق اور سوچنے کے لیے سکون کو تو میں اللہ کی طرف سے ایک نعمت سمجھتا تھا۔

جیل سے باہر آیا تو جماعت کا کام دیکھا کہ پابندی کی وجہ سے بے نام ہی سہی، مگر اپنے معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ میری غیر حاضری نے معمول کے کاموں پر کوئی منفی اثر نہ ڈالا تھا۔ مثال کے طور پر اعانتوں کا جمع ہونا، ہفتہ وار اجتماعات کا انعقاد، لٹریچر پھیلانا، لوگوں سے روابط رکھنا وغیرہ، اللہ کے فضل سے اسی طرح چل رہے تھے۔ البتہ مرکزی طور پر کارکنوں کا اجتماع، بیت المال کی رپورٹیں اور شوریٰ وغیرہ نہیں ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں یہ ضروری بھی نہیں تھا، گویا کہ گاڑی اپنے طور پر چل رہی تھی۔

اور پھر کمپنی

رہائی کے بعد میرے سامنے بڑا مسئلہ کمپنی کا تھا۔ میں اس کمپنی کا ملازم اور اچھے، ممتاز عہدے پر فائز تھا۔ ایسی صورت کہ کمپنی کا ایک ذمہ دار ملازم اُٹھا کر جیل میں ڈال دیا جائے، جب کہ کمپنی کے سارے منصوبے، ٹھیکے اور سمجھوتے بھی اسی حکومت اور واپڈا کے ساتھ تھے۔ مجھے یہ خیال گزرا کہ اب ملازمت رہے گی یا نہ رہے گی یا کمپنی اس معاملے کو کس طرح دیکھے گی۔ پھر واپڈا کے چیئرمین اور مختلف سرکاری لوگوں کا میرے ساتھ برتاؤ کیسا رہے گا؟ کیا وہ جیل سے ہو کر آئے ہوئے آدمی کی طرف حقارت سے دیکھیں گے یا عزت سے پیش آئیں گے؟ ایوب خان حکومت کی طرف سے جماعت کی مخالفت برابر بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی وجہ سے حکومت کا میرے اور کمپنی کے ساتھ کیا رویہ رہے گا؟

قید کے آخری دنوں میں، میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر نظر بندی میں دوبارہ توسیع ہوئی تو میں کمپنی کو یہ لکھوں گا، کہ وہ مجھے بلا تنخواہ رخصت دے دیں، البتہ گھر میرے پاس رہنے دیں، تاکہ میرے اہلِ خانہ زیادہ پریشان حال نہ ہوں۔ جب چھوٹ کے آؤں تو ڈیوٹی شروع کر لوں گا۔ لیکن جب تین ماہ بعد قید ختم ہوگئی تو میں نے خود ہی جا کر یہ پیش کش کر دی کہ میری تین ماہ کی چھٹی کا استحقاق تھا، آپ چاہیں تو تنخواہ کے ساتھ وہ چھٹی شمار کر لیں،

یا آپ چاہیں تو بلاتنخواہ چھٹی شمار کر لیں۔ مگر کمپنی نے خوش دلی سے پہلی شرط کو قبول کیا۔ ان کے تعلقات اور اندازِ کار میں کوئی فرق واقع نہ ہوا، بلکہ ان کو خوشی تھی کہ میں نے واپس آ کر کام دوبارہ سنبھال لیا ہے۔

واپڈا کے اعلیٰ بنگالی افسران کا معاملہ تو بڑا ہی خوش گوار اور تعجب خیز تھا۔ انھوں نے مجھے پہلے سے بھی زیادہ عزت اور توجہ دینا شروع کی۔ بنگال کا سیدھا سادا سیاسی کلچر تھا۔ اس میں کسی آدمی کا جیل جانا اس کے لیے عزت کا باعث ہوتا تھا۔ ویسے بھی پڑھے لکھے بنگالی لوگ، ایوب خان صاحب کے سخت مخالف تھے۔ اس لحاظ سے بھی ان کو کوئی اعتراض نہیں تھا کہ جماعت اسلامی اور صدر ایوب خان کے درمیان کوئی کش مکش چل رہی ہے۔ اب صورت یہ بنی کہ جہاں پہلے وہ لاپروائی برتتے تھے، وہاں مشرقی پاکستان واپڈا کے چیئرمین تک نے زیادہ تپاک سے ملنا شروع کر دیا۔ اس طرح الحمدللہ یہ معاملہ بھی بخوبی طے ہو گیا۔

متحدہ حزبِ اختلاف کا قیام

اسی دوران ملک کی سیاسی فضا گرم ہوتی جا رہی تھی۔

یہ کوشش ہو رہی تھی کہ حزب اختلاف کی تمام پارٹیاں متحد ہو جائیں۔ نورالامین صاحب اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے لیڈر تھے۔ اس وقت حزبِ اختلاف کے سربرآوردہ قائدین میں نظامِ اسلام پارٹی کے چودھری محمد علی، عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن اور نواب زادہ نصراللہ خان، نیشنل عوامی پارٹی کے عبدالحمید خان بھاشانی، مسلم لیگ کے خواجہ ناظم الدین وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب مارشل لا کے سخت مخالف تھے۔ جب کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی تو جیل میں تھے اور جماعت اسلامی پر پابندی تھی۔ جماعت اسلامی بھی مارشل لا اور ایوب آمریت کی سخت مخالف تھی۔ اسی مخالفت کی سزا کے طور پر اس کی قیادت جیل میں تھی۔ بہرحال یہ بات چیت چل رہی تھی کہ تمام اپوزیشن کو متحد کیا جائے، تاکہ صدر فیلڈ مارشل ایوب خان کی آمریت کا مقابلہ کیا جا سکے۔

حزبِ اختلاف کی ساری کوششوں کا مرکز ڈھاکہ تھا۔ پھر مشرقی پاکستان ہی ایوب خان

اور مارشل لا کی مخالفت کا بھی مرکز تھا۔ ناظم الدین صاحب، بھاشانی صاحب اور شیخ مجیب الرحمٰن صاحب بھی یہیں رہتے تھے اور پاکستان کے زیادہ قدآور لیڈر تھے۔ پھر یہ کہ انتخاب بھی جیتے ہوئے تھے، جب کہ مغربی پاکستان کے چودھری محمد علی صاحب کی وہ حیثیت نہیں تھی۔ان کے پاس مینڈیٹ نہیں تھا۔ بہرحال خواجہ ناظم الدین صاحب نے اس سلسلے میں پہل قدمی کرتے ہوئے اپنے گھر پر حزبِ اختلاف کی جماعتوں کا اجلاس بلایا۔

جماعت کی نمایندگی

چودھری رحمت الٰہی صاحب چونکہ اس زمانے میں جماعت کی مرکزی شوریٰ کے رکن نہیں تھے، اس لیے وہ گرفتار نہیں ہوئے تھے اور آزاد تھے۔ یہاں پر میں رہا ہو چکا تھا۔آپ کہہ سکتے ہیں اس وقت جماعت کی ٹاپ لیڈرشپ صرف ہم دو آدمیوں پر مشتمل تھی۔ ہر چند کہ اپنے جیل میں قید ساتھیوں سے بھی ہمارا ربط تھا۔ظاہر ہے راہ نمائی تو انھوں نے کرنی تھی۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے چودھری رحمت الٰہی صاحب لاہور سے ڈھاکہ آئے تھے۔

جماعت کی ذمہ داری اور منصب پر آنے کے بعد، چودھری رحمت الٰہی صاحب سے یہ میرا پہلا ربط تھا۔ البتہ چودھری صاحب سے شناسائی ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۰ء سے تھی۔ جب وہ سعید منزل کے قریب پولیس لائن میں اپنے کسی عزیز کے یہاں رہتے تھے۔ظفر اسحاق تو اکثر اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، جہاں چودھری صاحب نماز کے لیے جاتے۔ جب میں ادھر جاتا تو رحمت الٰہی صاحب سے ملاقات ہوتی، مگر یہ سرسری ملاقاتیں کوئی دیرپا نقوش کی حامل نہ تھیں۔ البتہ ڈھاکہ میں ہونے والی ملاقات کے بعد میں نے ان کو بڑا سمجھ دار، معاملہ فہم، نہایت بُردبار، متحمل مزاج، صائب الرائے، متین اور ایک حلیم الطبع انسان پایا ہے۔ کچھ عرصہ تک لوگوں نے، بے وجہ اور بے بنیاد طور پر ان کے خلاف باتیں کیں جن کا کوئی جواز نہ تھا۔لیکن میرا تجربہ یہی ہے کہ وہ بڑے معقول اور نہایت سمجھ دار آدمی ہیں۔ان سے دلیل کے ساتھ بات ہوسکتی ہے، بلکہ اختلاف بھی ہو تو بلاتردّد بات ہوسکتی ہے اور وہ

معقول بات قبول کرتے ہیں۔

جب رحمت الٰہی صاحب ڈھاکہ آئے تو ان کے ساتھ میری بڑی اچھی ورکنگ ریلیشن شپ (تعلقاتِ کار) بن گئی تھی۔ وہ میرے ہاں آکر ٹھیرے تھے۔ جب آل پارٹیز میٹنگ کا دعوت نامہ جماعت کو موصول ہوا تو وہ مولانا مودودی کی ہدایت پر شرکت کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ مولانا مودودی نے ہدایت کی تھی کہ میں اور چودھری صاحب جماعت کی نمایندگی کریں گے۔ اس سے قبل بتا چکا ہوں کہ اس وقت سیاسی سطح پر دوسرے سیاست دانوں سے میرے روابط نہیں تھے۔ ویسے بھی مجھے اس کا شوق نہیں تھا۔ یہ سراسر مزاج اور طبیعت کا معاملہ تھا، ورنہ بہرحال ہم جماعت کے ساتھ پوری طرح سیاست میں تھے۔ سیاست میں حصہ لینے کو صحیح سمجھتا تھا، اور دین کا کام سمجھ کر اس میں اپنا حصہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔ اب نمایندگی کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

چنانچہ ہم دونوں، خواجہ ناظم الدین صاحب کے ہاں گئے، اور وہاں پر بات چیت میں شریک ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب سے بھی ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ چودھری محمد علی صاحب، شیخ مجیب الرحمٰن صاحب، عبدالحمید خاں بھاشانی صاحب اور نواب زادہ نصراللہ خان صاحب وغیرہ سے بھی یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بہرحال ان لوگوں میں، میں ایک جونیئر آدمی تھا۔ ویسے بھی میرا مزاج ایسا ہے کہ سنا اور دیکھا زیادہ جائے، جب کہ بولا اور دکھائی کم دیا جائے۔ اجلاس کا آغاز ہوا جس میں 'کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز' (COP- متحدہ حزب اختلاف) بن گئی۔ یہ حزبِ اختلاف کی پانچ پارٹیوں پر مشتمل تھی۔ جن میں کونسل مسلم لیگ، جماعت اسلامی، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی لیگ اور نظامِ اسلام پارٹی شامل تھیں۔ سابق وزیراعظم خواجہ ناظم الدین اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ پھر یہ طے ہوا تھا کہ ہر مہینے مختلف پارٹیوں کے لوگ باری باری صدر ہوں گے۔ اس کے بعد باقی عہدوں کا سوال آیا۔

اس وقت دل چسپ صورت سامنے آئی، جب متحدہ حزبِ اختلاف کے خزانچی کے

انتخاب کا مرحلہ آیا۔ شیخ مجیب صاحب نے فوراً کہا: ''مراد صاحب treasurer (خزانچی) بن جائیں''۔ میں اس بات پر بہت حیران ہوا، اس لیے کہ نہ وہ مجھے جانتے تھے، نہ کوئی ملاقات تھی اور نہ بات ہوئی تھی کہ میں پیسہ جمع کرسکتا ہوں۔ مگر بعد میں، میں نے تجزیہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ انھوں نے یہ سمجھا ہوگا: یہی ایک اُردو بولنے والا مشرقی پاکستان میں لیڈر ہے، اور سارا پیسہ انھی مغربی پاکستانی لوگوں کے پاس ہے، اور ویسے جماعت بھی ان کو لے کر آئی ہے، اس لیے ضرور روابط ہوں گے۔ مگر جماعت کے لوگ اس سے واقف تھے، کہ میرا ایسا کوئی ربط نہیں ہے۔ خود میں نے اور چودھری رحمت الٰہی صاحب نے بھی جماعت کی طرف سے یہ ذمہ داری سنبھالنے سے معذرت کی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے اپنے کسی شیخ صاحب کا نام لیا، جو خزانچی مقرر ہوئے۔ یوں اس اتحاد میں ہمارے پاس کوئی عہدہ نہیں آیا۔

پروگرام کمیٹی

جب عہدے تقسیم ہوگئے تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اس کا پروگرام بنایا جائے۔ وہ ایسا پروگرام ہو جس پر ایوب خان کے خلاف الیکشن بھی لڑا جاسکے۔ اگلے دن ایک پروگرام کمیٹی بن گئی، اس کمیٹی میں بھی جماعت کی جانب سے ہم دونوں شامل تھے۔ دوسری پارٹیوں کے بھی دو دو آدمی تھے۔ طے ہوا کہ یہ کمیٹی ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے ارکان کے ہاسٹل میں صبح نو بجے ملے گی۔ یہ خوب صورت ہاسٹل صدر ایوب خان نے ہی بنوایا تھا۔ نظامِ اسلام پارٹی کے چودھری محمد علی صاحب اور نیشنل عوامی پارٹی کے میاں محمود علی قصوری صاحب [م: اپریل ۱۹۸۷ء] وغیرہ یہیں پر ٹھیرے ہوئے تھے۔

میٹنگ میں پروگرام کو آخری شکل دینے کا عمل شروع ہوا۔ ہم دونوں نے غور کیا کہ اس میں اپنی طرف سے کیا رکھوا سکتے ہیں؟ یہ بات ظاہر تھی کہ کچھ مطالبات تو جمہوریت کے بارے میں ہوں گے۔ اس سے ہم ویسے ہی اتفاق کرتے تھے کہ بالغ حق رائے دہی ہو، انتخابات ہوں اور صدارتی کے بجائے پارلیمانی نظام ہو۔ کچھ مطالبات خاص طور پر مشرقی

پاکستان کے تھے، جن میں صوبائی خودمختاری سب سے نمایاں مطالبہ تھا۔ اس پر بھی ہمیں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

میں سمجھتا ہوں اہلِ مشرقی پاکستان کے اس جائز مطالبے پر، ہمیں passive اور دبا دبا نہیں بلکہ مؤثر اور مضبوط موقف اختیار کرنا چاہیے تھا۔ صوبائی خودمختاری کے مسئلے پر ہمیں اتنی ہی دل چسپی لینی چاہیے تھی، جتنی کہ پارلیمانی نظام اور بالغ حق رائے دہی کے لیے دل چسپی لی تھی اور کھلا موقف اختیار کیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ جماعت نے صوبائی خودمختاری کے مسئلے پر مشرقی پاکستان کی حمایت نہیں کی تھی، بلکہ اس مسئلے پر مضبوط اور زوردار طریقے سے کلام کرنا چاہیے تھا جو نہیں ہوا۔ صوبائی خودمختاری کا عدم وجود مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا بڑا سبب بنا۔ اب بھی مغربی پاکستان میں خرابی کی سب سے بڑی وجہ صوبوں کو صوبائی خودمختاری کا نہ ملنا ہے۔ سارے اختیارات مرکز کے پاس ہیں، ہر چند کہ دستور میں صوبائی خودمختاری کے باب میں بہت کچھ ہے، لیکن عملاً انھیں کچھ اختیار نہیں۔ ہم نے متحدہ حزبِ اختلاف کے اس اجلاس میں صوبائی خودمختاری پر حمایت کا فیصلہ کیا۔

ہمارے نکات

اس کے علاوہ ہمارے اپنے اصولی اور بنیادی موقف کا مسئلہ تھا، کہ یہاں پر اسلامی ریاست بنانا اور اسلامی قانون نافذ کرنا ہے۔ مگر اجلاس کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ بات منوانا مشکل ہوگا، کیونکہ متحدہ حزبِ اختلاف میں سیکولر پارٹیوں کو اکثریت حاصل تھی۔ ان میں قوم پرست اور کمیونسٹ موجود تھے۔ اگرچہ اسلامی فکر کے حامل افراد بھی تھے، مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے ضرورت یہ تھی کم از کم نکات اور مشترک پروگرام پر اتفاق راے اختیار کیا جائے، جو کسی کو ٹوٹنے کا موقع نہ دے۔

ہم نے خاصا سوچ سمجھ کر کچھ اس طرح کے الفاظ پروگرام میں شامل کرنے کے لیے پیش کیے کہ: ''قرآن وسنت کی تعلیم کے مطابق اسلامی معاشرے کی تعمیر''۔ ہمارا خیال تھا کہ

یہ ایسی بات ہے جو قبول ہوسکتی ہے۔ 'معاشرے کی تعمیر' ذرا زیادہ وسیع اور پہلی نظر میں کچھ ہلکا لفظ ہے، اس کے برعکس 'ریاست' کا لفظ زیادہ زوردار ہے۔ جس میں اقتدار اور قوت کا مفہوم آپ سے آپ آجاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہم اپنی بات کہنے کے لیے یہ راستہ اختیار کریں۔ چودھری رحمت الٰہی صاحب نے بھی اس بات سے اتفاق کیا۔ اس سے قبل جمعیت کے نصب العین میں بھی 'انسانی زندگی کی تعمیر' کے ٹیکنیکل اور زیادہ جامع الفاظ رکھوائے تھے۔ خیر، ایک تو یہ بات تھی۔

اس وقت دوسرا اہم مسئلہ ''فیملی لاز آرڈی ننس'' (عائلی قوانین) کا تھا۔ ایوب خان نے ایسے عائلی قوانین کو نافذ کیا تھا، جن میں بہت ساری چیزیں خلافِ شریعت تھیں اور بہت سی ایسی تھیں، جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مثال کے طور پر شادی کی رجسٹریشن کے بغیر نکاح کا فاسد ہونا غلط تھا، پھر یتیم پوتے کی میراث کا معاملہ تھا، وغیرہ وغیرہ۔ ہمارا خیال تھا کہ اس پروگرام میں ان قوانین کو واپس لینے کا اظہار کیا جائے۔ یاد رہے مارشل لا سے پہلے ایک کمیشن بیٹھا تھا، جس نے ایسی ہی ترامیم کی سفارش کی تھی۔ کمیشن کے رکن کے طور پر مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب نے اختلافی نوٹ لکھا تھا، جب کہ مولانا مودودی اور خصوصاً مولانا امین احسن اصلاحی نے اس پر بہت زبردست تنقید کی تھی۔ اسلامی علوم کے دیگر ماہرین نے بھی اس کی مخالفت تھی، مگر یہ قانون نافذ مارشل لا کے زمانے میں ہوا۔ خورشید بھائی نے اس تنقید کو Marriage Commission Report X-Rayed کے نام سے ترتیب دیا اور ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔

اس حوالے سے یاد آیا، جمال میاں فرنگی محل ڈھاکہ میں رہتے ہیں۔ ان کے تعلقات بالائی طبقے سے تھے۔

وہ ایوب خان اور مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خان آف کالاباغ [م: نومبر ۱۹۶۷ء] سے بھی ملاقات رکھتے تھے۔ مسلم لیگ میں کافی نمایاں تھے اور ہمارے ہاں کمپنی میں بھی اکثر آیا کرتے تھے۔ عبدالرزاق صاحب سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ اسی دوران میں

ان سے ہماری بھی دوستی ہوگئی۔ انھوں نے بتایا، کہ جب فیملی لاز آرڈی ننس آیا تو نواب آف کالاباغ نے مجھ سے کہا کہ ''آپ ایوب خان کو کچھ سمجھائیے کہ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں کیوں ہاتھ مار رہے ہیں۔ یہ ان کا کام نہیں ہے کہ لوگوں کی خانگی زندگیوں میں اصلاح کا بیڑا اُٹھائیں، بلکہ ان کو چاہیے کہ وہ ملک کے لوگوں کی معاشی ترقی، سیاسی بہتری اور قومی استحکام کے لیے کام کریں''۔

جمال میاں کہنے لگے: ''میں نے ایوب خان سے یہ بات کی اور کہا کہ اس سے آپ کو کچھ حاصل تو ہوگا نہیں، لوگ ویسے کے ویسے ہی رہیں گے۔ آپ خواہ مخواہ بدنامی مول لے رہے ہیں۔ اس پر میرا تاثر یہ ہے کہ ایوب خان نے میری بات مان لی تھی۔ مگر جب وہ مغربی پاکستان گئے تو پھر دو چار مہینے بعد 'فیملی لاز آرڈی ننس' جاری ہوگیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ بیوروکریٹس میں اور ان کے قریب ایسے طاقت ور لوگ موجود ہیں جنھوں نے ان سے یہ کام کرا لیا'' —— اس سے بڑی بے چینی پھیلی، جماعت نے مہم چلائی اور گرفتاریاں ہوئیں۔

یہ مسئلہ بھی ہمارے نزدیک ایک اہم ایشو تھا، اور بجا طور پر ہمارا خیال تھا، کہ اس بات کو متحدہ حزب اختلاف کے پروگرام میں شامل ہونا چاہیے کہ ''جب ہمارے پاس اقتدار آئے گا تو ہم ترمیم کر کے اسے اسلام کے مطابق بنائیں گے'' لیکن یہ کڑوی گولی نگلنا نیشنل عوامی پارٹی، عوامی لیگ اور دیگر سیکولر عناصر کے لیے بہت مشکل تھا۔ ہم نے طے کیا کہ پروگرام کے لیے یہ دو نکات وہاں پر پیش کریں گے۔

جوں ہی پروگرام کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا، تو وہاں پر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ مشرقی پاکستان والے 'مکمل صوبائی خودمختاری' پر اصرار کر رہے تھے، جب کہ چودھری محمد علی صاحب مغربی پاکستان کی نمایندگی کرتے ہوئے بول رہے تھے۔ وہ صوبائی خودمختاری کے مطالبے کو من وعن قبول کرنے کے بجائے، مشرقی پاکستانی سیاست دانوں کے پیش کردہ فارمولے میں ذرا کمی کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ کے تاج الدین، نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور مشرقی پاکستان کے دوسرے نمایندے بڑی شدت کے ساتھ 'مکمل صوبائی خودمختاری' کا مطالبہ کررہے تھے۔ صبح سے شام تک، ماسوا کھانے، نماز اور وقفہ چائے کے، صرف اسی مسئلے پر بات چیت چلتی رہی۔

اجلاس کے دوران چودھری محمد علی صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی۔ انھوں نے تکلیف کے باوجود بستر پر لیٹ کر پوری کارروائی میں حصہ لیا اور یہ بات بار بار سمجھانے کی کوشش کی کہ ''اس طرح ملکی وحدت کو نقصان پہنچے گا''۔ خود ہمارا ابھی یہ نقطۂ نظر رہا ہے کہ مضبوط مرکز، ملک کے استحکام کا ضامن ہوسکتا ہے۔ بلاشبہہ اس وقت میرا بھی یہی خیال تھا، تاہم بعد میں معاملات کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد میری اس رائے میں تبدیلی آئی کہ مضبوط ملک کے لیے مضبوط مرکز کا ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ قانون اور جبر کے ذریعے لوگوں کو ایک نہیں رکھا جاسکتا۔ خیر، اجلاس کے دوران 'مکمل خودمختاری' اور 'سادہ صوبائی خودمختاری' پر بحث ہوتی رہی، جس میں ہم لوگ خاموش بیٹھے رہے۔ ہم یہ بات طے کر کے گئے تھے، کہ ایسی صورت حال میں ہم خاموشی اختیار کریں گے۔

جوں ہی یہ بحث کچھ دھیمی پڑی تو رحمت الٰہی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''ہم اپنے دونوں نکات کو پیش کر دیں''۔ میں نے کہا: ''نہیں، اپنے ان نکات کو آخر کے لیے روکے رکھتے ہیں''۔ میرا تجربہ تھا کہ آخر میں جب لوگ بالکل تھک جاتے ہیں تو پھر جو چیز بھی آتی ہے، وہ اکثر بغیر کسی لمبی بحث کے منظور ہوجاتی ہے۔ یہی خیال تھا کہ شاید ہماری قسمت ساتھ دے اور یہ دونوں نکات منظور ہوجائیں۔ یہ چیز اس صورت حال میں بہت بڑی بات ہوگی، جس سے بجا طور پر جواز مل جائے گا کہ ہم متحدہ حزب اختلاف میں کیوں شامل ہوئے۔ اجلاس کے دوران بحث ہوتے ہوتے تقریباً آدھی رات گزر گئی۔ لوگ بالکل تھک چکے تھے۔ اس دوران میں دو کھانے اور چائے بھی ہوگئی تھی۔ اس وقت اجلاس کی صدارت بھی میاں محمود علی قصوری صاحب کے پاس آ گئی تھی۔ چودھری محمد علی صاحب اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث اجلاس کی رواں نشست کی صدارت نہ کرسکے۔

سب سے آخر میں چودھری رحمت الٰہی صاحب نے کہا کہ ''ہمارے دو نکات ہیں''۔ پہلا نکتہ تھا: ''اسلامی معاشرے کی تعمیر'' والا یہ بغیر کسی حیل و حجت اور بلا کسی بحث کے منظور ہوگیا۔ شاید انھوں نے اپنی جگہ پر اسے 'بے ضرر سی چیز' سمجھا ہوگا۔ اچھا، اگر ہم وہاں پر یہ کہتے کہ ''قرآن و سنت کو بالاترین قانون تسلیم کرو'' تو ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو اکثریت میں تھے اسے نہیں مان سکتے تھے۔

پھر ہم نے 'مسلم فیملی لاز آرڈی ننس' کا دوسرا نکتہ پیش کیا۔ اب یہ ہوا کہ عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی والے یک دم بپھر گئے۔ ''یہ نہیں ہوگا، اس سے عورتوں کی آزادی ختم ہوجائے گی، یہ عورتوں کے حقوق کا مسئلہ ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اتفاق سے اس وقت اجلاس کی صدارت محمود علی قصوری صاحب کر رہے تھے اور وہ خود نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کے لیڈر تھے۔ دوسری جانب ان کا تعلق قصور کے ایک نہایت مشہور اور دین دار گھرانے سے تھا۔ وہ خود بلند پایہ قانون دان اور بیرسٹر تھے۔ اجلاس میں انھوں نے سیکولرازم کی راہ اپنانے کے بجاے، خالص قانونی اور عملی حوالے سے دلیل دیتے ہوئے کہا: ''نہیں نہیں، اس آرڈی ننس نے تو خود بہت سی قانونی پیچیدگیاں اور سماجی انتشار پیدا کیا ہے۔ موجودہ شکل میں یہ نہ اسلامی ہے اور نہ جمہوری، اس پر نظرثانی ہی ہونی چاہیے؟'' جیسا میں نے کہا، کہ آخری وقت میں لوگ ویسے ہی تھکے ہوتے ہیں اور پھر صدر مجلس نے بھی کہہ دیا کہ ''ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس کو شامل ہونا چاہیے''۔

یہ بات کہنے والا فرد نہ جماعت اسلامی کا لیڈر تھا اور نہ مسلم لیگ سے متعلق، بلکہ نیشنل عوامی پارٹی کا صدر تھا، بہت بڑا قانون دان، جدید تعلیم یافتہ اور انسانی بنیادی حقوق کے لیے جدوجہد کا شان دار ریکارڈ رکھنے والا تھا۔ اس لیے اجلاس میں ان کی اچانک تائید نے یہ نکتہ بھی متحدہ حزب اختلاف کے پروگرام میں شامل کرا دیا۔ لوگوں نے کہا کہ ''ٹھیک ہے منظور ہے''۔

ہر چند کہ ہم نے اس مقصد کے لیے کوئی پیشگی لابی بھی نہیں بنائی تھی۔ ہم دونوں نوآموز

اور جونیئر افراد نے اللہ کے بھروسے پر قدم اٹھایا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت ڈال دی۔

جب اگلے روز متحدہ حزبِ اختلاف کا پروگرام اخبارات میں آیا تو 'اپوا' ٹائپ عورتوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ دیگر سیکولر حلقے بھی میدان میں کود پڑے، احتجاج ہوا کہ ان نکات کو خارج کیا جائے، مگر اس پروگرام میں ترمیم نہ کی گئی، حتیٰ کہ جنوری ۱۹۶۵ء میں اسی پروگرام کے تحت محترمہ فاطمہ جناح نے متحدہ حزب اختلاف کی نامزدگی صدارتی امیدوار کے طور پر الیکشن لڑا۔

ہائی کورٹوں کے متضاد فیصلے

اسی عرصے میں جماعت اسلامی پر پابندی کے مسئلہ پر ہمارا کیس بھی اعلیٰ عدالتوں میں چلتا رہا۔ چونکہ جماعت پر پابندی کے لیے مغربی پاکستان کی صوبائی حکومت کا آرڈر الگ تھا، اور مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت کا آرڈر الگ تھا، اس لیے دونوں کیس الگ الگ، لاہور ہائی کورٹ اور ڈھاکہ ہائی کورٹ میں چل رہے تھے۔

دونوں ہائی کورٹس کے فیصلے تقریباً ایک ہی زمانے میں سامنے آ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کی ہائی کورٹ نے ہماری درخواست منظور کر لی۔ حکومت نے جماعت اسلامی پر جو پابندی عائد کی تھی، اس کے دفتروں پر تالے ڈالے تھے اور تمام ریکارڈ اور پیسہ ضبط کیا تھا، اس سارے عمل کو غیر قانونی اقدام قرار دیا۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان کی ہائی کورٹ نے جماعت پر پابندی کے حکومتی اقدام کو جائز قرار دے دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں لاہور ہائی کورٹ کے جج، حکومت کے کچھ زیادہ تابع اور زیراثر نکلے۔ جب دو مختلف فیصلے آئے، تو مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا، کہ وہ سپریم کورٹ میں جائے گی۔ مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا کہ وہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل کے لیے سپریم کورٹ میں جائے گی۔ اس طرح جماعت پر پابندی کا یہ کیس سپریم کورٹ میں پہنچ گیا۔

جماعت بحال ہوگئی

سپریم کورٹ نے بھی وہی فیصلہ کیا، جو مشرقی پاکستان کی ہائی کورٹ نے کیا تھا۔ اس طرح جماعت اسلامی بحال ہوگئی، اس کے دفاتر کھل گئے اور باقاعدہ کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع تھا، کہ اب دوبارہ کھلے عام دعوتِ دین اور نظم کا کام کرسکیں گے۔

جب سپریم کورٹ کا فیصلہ سامنے آیا، تو ہم نے بہت بڑا جلوس نکالا۔ یہ جلوس طول میں بہت بڑا اور عرض میں چھوٹا تھا۔ ہم نے اس کو ایسے ترتیب دیا کہ وہ بہت بڑا دکھائی دیتا تھا۔ یہ جلوس مسجد بیت المکرّم سے شروع ہوا۔ ہر طرف لوگ تھے۔ سائیکلوں، رکشوں اور گاڑیوں پر اور پیدل بھی۔ اللہ کے فضل سے یہ جلوس بڑا کامیاب تھا۔ اس موقع پر ہم نے ایک خیر مقدمی پوسٹر بھی نکالا۔ چونکہ سپریم کورٹ کی کارروائی کی اخباری رپورٹنگ پڑھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ جماعت بحال ہوجائے گی، اس لیے جس روز فیصلہ آنا تھا، میں نے پہلے ہی سے جماعت کی بحالی کے پوسٹر کی کتابت اور ڈیزائن وغیرہ تیار کرا رکھے تھے۔ پرنٹنگ پریس والوں سے پیشگی بات بھی کر لی تھی۔ اس لیے جونہی سپریم کورٹ نے ہمارے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے جماعت اسلامی پر پابندی کے حکم کو غیر آئینی قرار دیا، تو اس کے محض تین چار گھنٹوں کے دوران یہ پوسٹر چھپ گیا، جسے کارکنوں نے ڈھاکہ کی دیواروں پر چسپاں کردیا۔ اس پوسٹر کی شہ سرخی تھی: ''مجرم کون؟''

مزدوروں میں کام

۶۴ء میں جیل سے رہائی کے بعد میں نے بیرسٹر قربان علی سے مشورہ کیا اور مزدوروں میں کام کے لیے انھیں ذمہ داری سونپی۔ اگرچہ صوبائی جماعت انھیں رکن بنانے کے لیے تیار نہیں تھی، تاہم میں کسی بھی فرد کے مزاج میں اُتار چڑھاؤ کے باوجود اپنے ذاتی ربط و تعلق کی بنیاد پر، اس سے کام لینے کا قائل تھا اور اس بنیاد پر کسی کو الگ کردینے کا قائل نہیں تھا۔

ان دنوں مزدوروں میں زیادہ تر کام عدالتی مقدموں ہی کا ہوتا تھا۔ ہم نے، قربان صاحب کی سربراہی میں 'سرامک کلیان کمیٹی' (مزدور ویلفیئر کمیٹی) کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ ڈھاکہ کے قریب صنعتی علاقے میں تین چار ملّیں (mills) تھیں، سب سے پہلے وہاں پر کام کو منظّم کیا۔ اس کے نتیجے میں کام کی داغ بیل پڑ گئی۔ خواہش کے باوجود اس میں کوئی بہت بڑی پیش رفت نہ ہوسکی۔ سوائے اس کے کہ کام شروع ہوگیا اور کئی چھوٹی بڑی ملّوں میں ہماری یونین بن گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس وقت کوئی اتنا بڑا صنعتی علاقہ بھی نہیں تھا، جتنا کہ مغربی پاکستان کے شہروں کراچی، لاہور، فیصل آباد میں تھے۔ صنعتی کارخانے بھی بڑی تعداد میں نہیں تھے۔ بہرحال ہماری اچھی خاصی تنظیم قائم ہوگئی تھی۔ اس نے بعد میں بھی کافی کام کیے۔

'سرامک کلیان کمیٹی' کے ذریعے بھی، 'جمعیت طلبہ عربیہ' کی مانند وسیع البنیاد طریقے سے، میں لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ دستور کی حدود میں رہتے ہوئے، جماعت کو جتنا وسیع البنیاد بنانا ممکن تھا، اس کو اتنا وسیع البنیاد بنایا، سوائے اس بات کے کہ عام کارکنان کو ووٹ کا حق دیا جائے۔ کیونکہ یہ اختیار دینا دستور جماعت کے مطابق میرے بس میں نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جتنے بھی حقوق انھیں جماعت کے نظم کے تحت دیے جاسکتے تھے، وہ دیے۔

اس کا نتیجہ تھا، کہ ایک اچھا نظم، خوش گوار ماحول اور فعال کام اور اتنی ہی مضبوط تنظیم بن گئی تھی، کہ آج کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس نوعیت کا تجربہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس پیش رفت کی ایک سب سے بڑی وجہ کارکنوں کی مشوروں اور احتساب میں برابر شرکت تھی۔

۱۰

انتخابات، جنگ اور کچھ اہم واقعات

۱۹۶۲ء میں جب مارشل لا ختم ہوا، تو ایک دن کا وقفہ ڈالے بغیر ہر مقام پر جماعت کے حلقوں نے کام شروع کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح ۱۹۶۴ء میں دس ماہ بعد حکومت کی جانب سے جماعت پر پابندی کے حکم نامے کو غیر آئینی قرار دیے جانے پر جماعت نے ہر جگہ کام شروع کر دیا۔

محترمہ فاطمہ جناح، صدارتی امیدوار

جماعت پر پابندی کے خلاف سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے سے پہلے، متحدہ حزب اختلاف نے ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو اپنی جانب سے صدارتی انتخاب میں کھڑا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب مغربی پاکستان میں جماعت کی لیڈر شپ اور مولانا مودودی جیل میں تھے۔ میں اس فیصلے میں کچھ اس لیے زیادہ شریک نہیں تھا، کہ فیصلہ کے وقت متحدہ حزبِ اختلاف کا مرکز مغربی پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔

قبل ازیں مشرقی پاکستان میں اس موضوع پر جو کچھ بات چیت ہوئی یا ہو رہی تھی، اس میں زیادہ خیال یہ تھا کہ متحدہ حزبِ اختلاف، جنرل (ریٹائرڈ) اعظم خان کو اپنا صدارتی امیدوار بنائے گی۔ جنرل اعظم خاں سیاست میں مارشل لا کی پیداوار تھے۔ اس سے قبل انھوں نے ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کے خلاف تحریک کے زمانے میں، لاہور میں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داری نبھائی تھی۔ یہ وہ مارشل لا تھا جب پاکستانی فوجیوں نے لاہور کی سڑکوں پر اپنے ہم وطنوں کو گولیوں سے بے دریغ بھون کر رکھ دیا تھا۔ جس سے لفظ

'مارشل لا' کا خوف لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا۔

اس کے بعد یہی جنرل اعظم خان، صدر ایوب خان کے زمانے میں مشرقی پاکستان کے گورنر بن کر آئے۔ مشرقی پاکستان کے گورنر کی حیثیت سے انھوں نے جس ہمدردانہ رویے کا مظاہرہ کیا وہ ان کے لیے غنیمت تھا، اس نے بنگالیوں کو بہت متاثر کیا۔ بلکہ صحیح معنوں میں ان کے دل جیت لیے۔ وہ کام کرانے میں بہت فعال اور مؤثر تھے۔ دوسرا یہ کہ بنگالیوں کے جائز مطالبات اور ان کی شکایات کی انھوں نے پذیرائی، ہم نوائی، اور تائید کی تھی۔ صرف اتنی سی بات بھی بنگالیوں کے دل کو اچھی لگی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنما اس بات کے لیے تیار تھے، کہ ریٹائرڈ جنرل اعظم خان کو صدارتی امیدوار کے طور پر کھڑا کیا جائے۔ اس میں ایک سیاسی پہلو یہ بھی تھا، کہ وہ خود فوج سے تھے اور ایوب خان بھی فوجی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح فوج neuteralize (غیر جانب دار) سی ہو جائے گی۔ یہ ساری گفتگو ڈھاکے میں چل رہی تھی۔

مغربی پاکستان میں متحدہ حزبِ اختلاف کے لیڈروں کا اجتماع ہوا۔ جہاں مختلف پارٹیوں کے سربراہان شامل تھے۔ جماعت پر پابندی کے باعث جماعت کا سربراہ تو موجود نہیں تھا، البتہ چودھری رحمت الٰہی صاحب جماعت کی نمایندگی کر رہے تھے۔ اپنی کمپنی کی مصروفیات کی وجہ سے میرے لیے ممکن نہیں تھا، کہ ان اجتماعات میں شرکت کر سکوں۔ وہاں پر بھی عبدالحمید بھاشانی اور شیخ مجیب وغیرہ کی یہی خواہش تھی، کہ اعظم خاں امیدوار ہوں۔ ویسے بھی ان دنوں پاکستان میں چین نواز کمیونسٹ تحریک کے سربراہ بھاشانی صاحب کا ایوب خان سے خفیہ رابطہ تھا۔

تاہم متعدد مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد حزبِ اختلاف نے محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا صدارتی امیدوار بنانے کا فیصلہ کر لیا، جو میرے خیال میں سیاسی طور پر بڑا درست فیصلہ تھا۔ ان حالات میں ایوب خان کا مقابلہ اگر کوئی شخصیت کر سکتی تھی، تو وہ محترمہ فاطمہ جناح ہی کی شخصیت تھی۔ لیکن اس فیصلے نے جماعت کو خاص طور پر ایک

آزمایش میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس حزبِ اختلاف کے اندر 'نظام اسلام پارٹی' بھی تھی، جس کے صدر مولانا اطہر علی صاحب تھے اور ان کی نمایندگی مشرقی پاکستان سے مولوی فرید احمد صاحب کرتے تھے، جو پاکستان کے مشہور لیڈر تھے، جنھیں بعد میں سقوطِ ڈھاکہ کے وقت شہید کر دیا گیا تھا۔

ایک مخمصہ

مجھے شروع سے یہ محسوس ہوتا ہے، کہ ایسے مسائل میں زیادہ مشکل کا سامنا صرف جماعت اسلامی ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ باقی وہ لوگ جو سکہ بند گدی نشین علما اور مذہبی لوگ ہیں، وہ بڑی آسانی کے ساتھ ان مراحل سے گزر جاتے ہیں، اور کوئی ان سے سوال نہیں کرتا۔ اگر رے بھی تو چند روز بعد اسے بھلا دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اس سے پہلے بھی دیوبند کے کانگریسی علما کا گروہ، جن میں محترم مولانا حسین احمد مدنی مرحوم [م: ۱۹۵۷ء] کی مشیخت کا مقام مسلم ہے، وہ کھل کر انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیتے رہے۔ وہ کانگریس کہ جس میں عورتیں بھی تھیں اور جس کے کرتا دھرتا ہندو تھے۔ لیکن ایسے اتحادِ عمل سے ان کی مشیخت میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ کسی نے ان سے پوچھا بھی نہیں کہ حضرت یہ کیا؟

بعد میں ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران اسی گروہ کے تسلسل میں مفتی محمود صاحب [م: اکتوبر ۱۹۸۰ء] نے بھٹو صاحب [م: اپریل ۱۹۷۹ء] کا ساتھ دیا۔ بس ۱۹۷۰ء کے آخر میں ان کی اپنی نشست پر الیکشن میں مقابلہ ہوگیا، مگر اس سے قبل ان کے تعاون سے بھٹو صاحب کو مجموعی فائدہ پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح مفتی صاحب کے صاحبزادے فضل الرحمٰن صاحب نے پہلے ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک پیپلز پارٹی کے اتحادی محاذ ایم آر ڈی میں، اور پھر ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کھل کر پیپلز پارٹی اور بے نظیر بھٹو کا ساتھ دیا۔ ان کی وزارتِ عظمیٰ میں براہِ راست حصہ دار بنے، مگر ان کے متبعین میں اس پر کوئی چراغ پا نہیں ہوا۔ عوام میں ان کے حلقۂ اثر پر یا ان کے وقار میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

مگر اس کے برعکس جب جولائی ۱۹۸۸ء میں پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب نے جماعت کے فیصلے کی روشنی میں بے نظیر سے صرف ایک ملاقات کی تھی، تو جماعت کی پوری قیادت کو کیا کچھ نہ سننا پڑا۔ جماعت اسلامی جب بھی کوئی ایسی عملی سیاسی تدبیر اختیار کرتی ہے، جو دین کے کسی مرکزی حکم سے تعلق نہیں رکھتی اور جس کی نوعیت ضمنی احکام سے متعلق ہوتی ہے، یا جو دین کی جڑ نہیں بلکہ شاخوں کی حیثیت رکھتی ہے، ان میں سے بھی کسی ایک کی فی نفسہٖ نہیں بلکہ بظاہر ذرا سی خلاف ورزی ہو جائے تو جماعت کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ اور جماعت سے باہر تو شدید طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ باقی سب مذہبی یا سیاسی لوگوں کے حوالے کچھ عرصہ بعد بھلا دیے جاتے ہیں، یا ان کے اقدامات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ لیکن اس کے برعکس جماعت کے لیے ایسے ذرا سے خفیف اشارے کو بھی رائی کا پہاڑ بنا کر یاد رکھا جاتا ہے، دہرایا جاتا ہے، بلکہ وقت گزرنے کے بعد مبالغے کی بلاتکلف آمیزش بھی کر دی جاتی ہے۔

ذرا پیچھے چلے جائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی طبقہ اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا، کہ مولانا مودودی نے قادیانی مسئلہ جیسا مؤثر اور مدلل کتابچہ لکھ کر، دین کی بڑی ٹھوس خدمت انجام دی اور پھانسی کی سزا تک سنی۔ مولانا مودودی نے ان علما کی پُرتشدد تحریک کا ساتھ دینے سے معذرت کی، مگر اس معاملہ میں آئینی طریق کار اختیار کرنے پر زور دیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ وہ طبقہ اسے تحریک ختم نبوت سے 'غداری' پر محمول کرتا ہے، مسلسل لکھتا ہے اور غالباً آخرت میں جواب دہی کے ہر احساس کو پسِ پشت ڈال کر مسلسل دہراتا بھی ہے۔

اسی طرح انھی علما کی جانب سے، 'اخوان المسلمون' پر مسلط کردہ دار و گیر اور مصری آمر ناصر کے وحشیانہ مظالم کی تائید جیسی زیادتی کسی فرد کو یاد نہیں رہتی۔ اس متضاد رویے کے اور بہت سارے شواہد موجود ہیں۔ پھر جہادِ افغانستان کے خلاف پروپیگنڈے کرنے والے مذہبی عناصر کی دین داری بھی کسی کی نظر میں مشکوک نہیں ٹھیری۔

میرے خیال میں یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، کہ ان عناصر کے زبردست تضادات اور بعض اوقات دین کے بنیادی احکام تک کی شدید خلاف ورزی کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسری جانب جماعت اسلامی کسی فروعی اور ضمنی نوعیت کے معاملہ میں غور وفکر کا قدم بھی اُٹھا لے، تو فتویٰ ساز فیکٹریاں پورا زور لگا دیتی ہیں۔

انتخابی مہم کے موڑ

یہ تو ایک ضمنی بات تھی جو زیر بحث آ گئی، شاید آگے چل کر بھی اس پر بات کروں گا، لیکن یہ کہ اس وقت صدارتی انتخاب میں اس فیصلے پر ایک بڑا زبردست اور شدید رَدِّعمل ظاہر ہوا۔

محترمہ فاطمہ جناح کی امیدواری کے اس متحدہ فیصلے کو جماعت نے بھی قبول کر لیا۔ جماعت نے اس فیصلے کی یہ تائید جیل میں مولانا مودودی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کی تھی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اسے قبول کر لیا جائے۔ مولانا کی دلیل کے ایک حصے کو فاطمہ جناح صاحبہ نے ناپسند کیا تھا۔ جس میں مولانا نے کہا کہ: اضطرار کی حالت میں یہ اقدام کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر پوزیشن یہ ہے کہ ایک طرف جبر واستبداد کا نظام ہے اور دوسری جانب اس سے نجات کا راستہ ہے۔ ہم نے ایک عورت کی امیدواری کو نہیں، بلکہ نجات کے راستے کو اپنا کر کم تر برائی کی دلیل کو مدنظر رکھا ہے۔ اگر ہم اس سے الگ رہیں تو اس جدوجہد کو نقصان پہنچانے کا سبب بنیں گے جو کہ نجات حاصل کرنے کے لیے ہو رہی ہے ___ مجھے مولانا محترم کی اس دلیل سے سوفی صد اتفاق تھا۔

میری نظر میں تو اس بات کی کوئی اہمیت نہیں، کہ ہم جزوی اور فروعی مسائل اور تدابیر کی بنیاد پر پیچھے پڑ جائیں۔ میں سیاست میں تدبیر کو دینی مقام نہیں دیتا، بلکہ جنگ میں جس طرح آدمی ہتھیار استعمال کرتا ہے، دشمن کے مقابلے کے لیے منصوبہ بناتا ہے، کبھی اپنی فوجوں کو آگے بڑھاتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹاتا ہے، کسی دشمن کو غیر مؤثر بنانے کے لیے اسی کے طبقے کے کسی عنصر کو ساتھ ملاتا ہے، یا کبھی کسی کو حلیف بناتا ہے، مگر ہر بار یہ نہیں دیکھتا

کہ اس کا کردار کیا ہے، بلکہ اس کا مقصد تو جنگ جیتنا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں البتہ اس کے اپنے مقصد، نصب العین اور ہدف میں کوئی ضعف نہیں آنا چاہیے۔

بہرحال، اس مسئلہ پر جماعت کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ اسی دوران مولانا مودودی کی رہائی کے لیے اے۔کے بروہی صاحب نے اپیل دائر کردی۔ جس پر مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے جماعت کے تمام گرفتار قائدین کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ یہ تقریباً ستمبر ۶۴ء کی بات ہے۔ جب مولانا اور ارکان شوریٰ رہا ہوگئے، تو پھر جماعت کی مرکزی شوریٰ نے قرارداد پاس کر کے فاطمہ جناح کو بطور صدارتی امیدوار نامزد کرنے کے فیصلے کی توثیق کردی۔ اس توثیق کے بعد تو علما نے بڑے پُرزور طریقے سے جماعت اسلامی کی مخالفت پر اپنی قوت صرف کردی۔ اس زمانے میں دیوبندی، اہلِ حدیث اور بریلوی علما اور مشائخ عظام کی ایک غالب تعداد نے جماعت کو زبردست ہدفِ تنقید بنایا۔ حالانکہ الیکشن تو فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان ہو رہا تھا۔ مگر پروپیگنڈے کا ہدف جماعت اسلامی تھی۔

بڑی زبردست صدارتی انتخابی مہم چلتی رہی۔ یاد رہے بالغ رائے دہندگان کو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان سے چالیس چالیس ہزار بنیادی جمہوریتوں کے ممبران کا انتخاب کرنا تھا۔ بعد میں انھی اسّی (۸۰) ہزار ارکان کو ووٹ دے کر صدر پاکستان کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے بعد انھی ارکان کو ارکانِ اسمبلی کو بھی منتخب کرنا تھا۔ یہ بالواسطہ طریق انتخاب تھا، جس میں حکومتی مشینری اسّی ہزار رائے دہندگان کو ممکن حد تک زیراثر لاسکتی تھی اور یہ ہوا۔ حکومتی مشینری زیادہ تر مغربی پاکستان کے بی ڈی ممبران پر اثر انداز ہوئی۔

اس وقت بنیادی جمہوریت کے نظام پر ہمارا اعتراض یہ تھا کہ ''اگر اتنا محدود ووٹرز کا حلقہ ہوگا، تو ان کو کوئی حکومت بھی خرید سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر عام شہری ووٹ دے گا تو خرید وفروخت کم ہوگی''۔ بنیادی جمہوریت کے ممبروں کی میونسپل کمیٹیاں حکومت کے زیراثر ہوتی تھیں۔ ہر جگہ ان کے مفادات حکومت سے وابستہ ہوتے تھے۔

مغربی پاکستان میں نواب آف کالا باغ ملک امیر محمد خاں مرحوم اور مشرقی پاکستان میں عبدالمنعم خان مرحوم جیسے جابر افراد گورنر تھے۔ یہ دونوں، کہیں دھمکی سے اور کہیں لالچ سے لوگوں کو قابو میں رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مغربی پاکستان میں تو منتخب بھی ایسے ہی لوگ ہوئے تھے، جو ریاستی انتظامیہ سے قریبی تعلق رکھنے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے تھے۔ مغربی پاکستان میں بلاشبہ ایوب خان کے حق میں لہر پائی جاتی تھی۔

اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں چلنے والی عوامی اور سیاسی لہر بڑے زوردار طریقے سے صدر ایوب خان کے خلاف تھی۔ بلکہ اس سے پہلے جب ۶۱ء میں ایوب خان نے مارشل لا کے زمانے میں واحد نمایندے کے طور پر اپنی صدارت کی توثیق کرائی تھی، تب مغربی پاکستان سے بمشکل چند ایک ووٹ ان کے خلاف پڑے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اس وقت، جب کہ کوئی بھی ان کے مقابلے پر نہیں تھا، اور کسی کو ان کے خلاف بولنے کا حق نہیں تھا، ایوب صاحب کے خلاف چھے ہزار ووٹ پڑے تھے۔ اس مخصوص فضا میں وہاں کے بی ڈی ممبران کا ایوب خان کے خلاف یہ بہت بڑا عدم اعتماد تھا۔

مشرقی پاکستان میں بڑی زبردست انتخابی مہم چل رہی تھی۔ ہم کو توقع تھی، کہ یہاں سے تو جیت جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کے لیڈر مشرقی پاکستان میں مہم چلا رہے تھے اور مغربی پاکستان کے لیڈر مغربی پاکستان میں۔ محترمہ فاطمہ جناح نے ایک بھرپور دورہ کیا، جس میں وہ بڑے بڑے شہروں میں گئیں۔ ہر جگہ ایک بڑا جلسۂ عام ہوتا تھا۔ ان کی وجہ سے واقعی اس انتخابی مہم میں جان پڑ گئی۔

یہ بات مشہور ہے، کہ ایوب خان کو صدارتی الیکشن کرانے کا یہ مشورہ ان کے ایک مرکزی وزیر نے دیا تھا۔ جب ایوب خان کو معلوم ہوا کہ ان کی ہوا اُکھڑ رہی ہے، لوگ ان کے خلاف ہو رہے ہیں، اور ان کا جیتنا مشکل ہو رہا ہے، تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ سنا ہے انھوں نے غصے میں اپنے اس کرم فرما سے کہا کہ ''یہ تیری ماں کہاں سے میرے مقابلے میں آ گئی ہے''۔ کیونکہ ان کو یہ بتایا ہی نہیں گیا تھا، کہ یہ بھی ایک 'خطرہ' موجود ہے۔

جلسۂ عام کی تقاریر

مشرقی پاکستان میں متحدہ حزبِ اختلاف کی انتخابی کمیٹی میں، جماعت اسلامی کی نمایندگی میں اور غلام اعظم صاحب کرتے تھے۔ اس کمیٹی کے اندر یہ طے ہوا کہ جو جلسہ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہوگا، ان میں متحدہ حزبِ اختلاف کی نو پارٹیوں میں سے ہر ایک کا سربراہ پانچ منٹ بولے گا، یعنی مجیب صاحب، بھاشانی صاحب، فریداحمد صاحب اور غلام اعظم صاحب، پانچ پانچ منٹ بولیں گے، لیکن بطور صدارتی امیدوار محترمہ فاطمہ جناح آدھا گھنٹہ بولیں گی۔

مشرقی پاکستان کے سیاسی جلسے بڑے مختصر ہوا کرتے تھے۔ وہاں پر مغربی پاکستان کی طرح گھنٹوں نہیں صرف ہوا کرتے تھے۔ لوگ خود ہی وقت پر آتے تھے۔ حاضرین کو جگہ جگہ سے لانے کے لیے بسیں، ویگنیں یا کشتیاں بھی نہیں چلتی تھیں۔ جس طرح کہ اسی زمانے میں کنونشن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے لیڈر صدر ایوب خان صاحب نے رواج دیا۔ ٹرانسپورٹ کے ذریعے لوگوں کو دیہات اور بستیوں سے بھر بھر لانے کا کلچر انھوں نے متعارف کرایا۔ جماعت کے جلسوں میں بھی لوگوں کو لایا نہیں جاتا تھا، وہ خود سے آیا کرتے تھے۔ یہ مغربی پاکستان میں نیا رواج پڑ گیا تھا کہ لوگوں کو لانے کے لیے بسیں فراہم کی جائیں۔

پلٹن میدان کے مذکورہ جلسے کا ایک دلچسپ واقعہ مجھے اب تک یاد ہے، جس سے ہماری جماعت کے طرزِ خطابت یا عام جلسوں میں اظہار و بیان پر روشنی پڑتی ہے۔ جب یہ جلسہ ہوا تو پورا پلٹن میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، واقعی بڑا شان دار جلسہ تھا۔ باقی لوگوں کے ہمراہ میں بھی اسٹیج پر موجود تھا۔ طے شدہ قاعدے کے مطابق سب کو پانچ پانچ منٹ بولنا تھا۔ جب غلام اعظم صاحب بولنے کے لیے آئے، تو انھوں نے جماعت کے روایتی انداز میں تقریر کی۔ جس میں سب سے پہلے ایک تمہید ہوتی ہے، پھر مقدمہ قائم کیا جاتا ہے، اس کے بعد دلائل اُٹھائے جاتے ہیں اور پھر جا کر کہیں اپنی بات کہنے کا موقع آتا ہے۔ جلسۂ عام میں

آدھا گھنٹہ، پون گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ، دو گھنٹے کی تقریریں مولانا مودودی کیا کرتے تھے۔ ان کے لیے جواز فراہم کیا جاسکتا تھا، لیکن یہی اسٹائل جماعت کے باقی مقررین نے بھی اپنایا، جس کا کوئی جواز نہ تھا۔ یہاں پر متعین طور پر صرف پانچ منٹ ملے تھے۔ غلام اعظم صاحب پانچ منٹ میں ابھی تمہید بھی نہیں ختم کر سکے تھے، کہ ان کا وقت ختم ہوگیا۔ کیونکہ وقت کی سخت پابندی تھی، اور چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیاں برابر کی سطح پر تھیں، اس لیے غلام اعظم صاحب کو اپنی پوری بات کہے بغیر ڈائس چھوڑنا پڑا۔

لیکن ان کے برعکس شیخ مجیب الرحمٰن نے پانچ منٹ کے اندر پورے مجمع میں گویا برقی رو دوڑادی۔ ان کی آواز بھی تقریر کے لیے بڑی موزوں تھی۔ انھوں نے آتے ہی پہلی بات یہی کہی کہ: ''ایوب خان سن لو کہ اب تمھاری پتنگ کٹ چکی ہے''۔ مجیب نے جس جوش و جذبے سے یہ بات کہی، اس سے مجمع کھڑا ہوگیا۔ پھر پانچ منٹ میں مزید چار پانچ باتیں کہیں اور پورے مجمع پر گہرا نقش چھوڑتے ہوئے شیخ صاحب ڈائس چھوڑ کر چلے گئے۔ مولوی فرید احمد صاحب نے بھی پانچ منٹ میں اچھی مؤثر تقریر کرلی۔ اسی طرح باقی مقررین نے اپنا وقت خوب نبھایا۔ اس جلسے سے قبل میں نے کبھی اس پہلو پر سوچا نہیں تھا، لیکن اس واقعے کے بعد سے یہ بات میرے دل میں رہی ہے کہ ہم لوگ مختصر اور مؤثر تقریر کرنے میں دوسروں کی نسبت اب بھی بہت پیچھے ہیں۔

بعد میں جب ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم چلی، تو شیخ مجیب الرحمٰن ایک دن میں کوئی دس بارہ جلسے کرلیتے تھے۔ بھٹو صاحب بھی ایک دن میں پندرہ بیس جگہ پر جاتے تھے۔ مگر غلام اعظم صاحب ایک دن میں صرف ایک یا دو جلسے کرتے تھے۔ جب کہ شیخ مجیب وغیرہ نے تو دس منٹ یہاں پر جلسہ کیا، پھر اگلے گاؤں اور اس کے بعد دوسرے شہر میں جاکر دس منٹ خطاب کیا۔ انتخابی مہم عوام کو متحرک کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ مگر غالباً یہ کرنے کی ہمارے اندر صلاحیت یا مشق نہیں تھی۔ البتہ جماعت کی تاریخ میں یہ خوبی قاضی حسین احمد صاحب میں پائی جاتی ہے، اور وہ اس صلاحیت کو استعمال بھی کررہے ہیں۔

انتخابی مہم: بد اخلاقی کا مسئلہ

مشرقی پاکستان متحدہ حزبِ اختلاف کی کمیٹی کی صدارت ہر ماہ باری باری ہر پارٹی کے سپرد ہوا کرتی تھی۔ جس مہینے میں صدارتی انتخاب ہونا تھا، صدارت 'نظامِ اسلام پارٹی' کے حصے میں آئی۔ مولوی فرید احمد صاحب نے متحدہ حزب اختلاف کی صدارت سنبھالی اور اس کے بعد الیکشن مہم کے لیے اپنے حلقے کاکسس بازار، چٹاگانگ چلے گئے، جہاں سے وہ منتخب ہوا کرتے تھے۔ جاتے ہوئے وہ مجھے متحدہ حزب اختلاف کا قائم مقام صدر بنا گئے۔ اس وقت تک میری کوئی سیاسی پوزیشن نہ تھی، کہ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر میرے پیچھے ہوں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان لوگوں نے بڑی اچھی طرح میرے ساتھ تعاون کیا۔ میں نے بھی اپنی صلاحیت کے مطابق اس کو اچھی طرح چلایا۔

اس دور کی ایک بڑی اہم بات مجھے یاد ہے کہ جب میں قائم مقام صدر تھا، مہم کے آخری دن تھے، الیکشن سر پر تھا۔ کہیں سے ہمارے اتحادی دوستوں نے برطانیہ سے صدر ایوب خان کا ایک برہنہ فوٹو حاصل کیا۔ اس زمانے میں وہاں پر کرسٹینا کیلر کا ایک بڑا مشہور اسکینڈل چل رہا تھا، جس میں ایک برطانوی وزیر مسٹر پروفیومو کو استعفا بھی دینا پڑا تھا۔ اس فوٹوگراف میں صدر ایوب خان صاحب، برطانیہ کے کسی سوئمنگ پول کے پاس، غسل کے نیم عریاں لباس میں کرسٹینا کیلر کے پاس کھڑے تھے۔ یہ فوٹو لوگوں نے لاکر دیا اور کہا کہ ''اسے وسیع پیمانے پر تقسیم کریں، اس سے لوگوں کی رائے متاثر ہوگی، اور رائے عامہ ایوب خان کے خلاف ہوجائے گی''۔ اس وقت تک مجھے اتنا خیال نہیں تھا، کہ یہ تصویر لوگوں کی رائے بدلنے میں اتنی مؤثر نہیں ثابت ہوگی۔ اگرچہ بعد کے تجربات سے میری یہی رائے بنی ہے کہ ایسا ہتھکنڈہ اتنا مؤثر نہیں ہوا کرتا۔ بہرحال یہ ایک بے کار سی تدبیر تھی۔ لیکن اس وقت مجھے اس پر اخلاقی طور پر بڑا شدید اعتراض تھا، کہ ایک تو اس طرح فحش تصویر کی ہم وسیع اشاعت کا ذریعہ بنیں گے، جو قرآن مجید کی نظر میں فواحش کی تشہیر کی تعریف میں آتا ہے، اور اس تصویر میں ہیجان خیزی کا بھی پہلو تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سیاسی لیڈروں کا مقابلہ سیاسی دلائل ہی سے کیا جانا چاہیے اور ان کے پبلک کردار کا

تجزیہ کیا جانا چاہیے۔

جس طرح اس زمانے میں مولانا مودودی نے ایوب خان کے خلاف پوری چارج شیٹ تیار کی تھی، اور اس چارج شیٹ کو وہ جگہ جگہ بڑے جلسوں میں پیش کرتے تھے۔ یہ ان کی بہت مدلل، خوبصورت اور عمدہ تقریر تھی۔ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں بھی انھوں نے یہ تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ میں ایوب صاحب کے ذاتی کردار، ان کی لوٹ کھسوٹ اور ان کی اولاد وغیرہ کے 'کارناموں' پر بات نہیں کرتا، بلکہ ان کا پہلا جرم یہ ہے کہ انھوں نے فوج کو استعمال کر کے ملک پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے پوری چارج شیٹ پیش کی۔

میں نے تصویر لانے والوں سے پوری گفتگو کی اور اس کو شائع کرنے کی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ میں نے ان سے کہا کہ "ہم کو اس سطح پر گر کر انتخابی مہم نہیں چلانی چاہیے۔ اس سے ہماری اخلاقی سطح بھی گرے گی اور یہ ان صاف ستھرے سیاسی اصولوں کے بھی منافی ہے جو ہم متعارف کرانا چاہتے ہیں"۔ اللہ کا شکر ہے ان لوگوں نے میری بات مان لی۔ بعد میں سنا کہ وہ فوٹو مغربی پاکستان کے کچھ شہروں میں تقسیم ہوا، مگر پورے مشرقی پاکستان میں یہ تقسیم نہیں ہوا۔ میں اب تک سیاسی مقابلے میں ان اخلاقی اصولوں کی پابندی کا سختی سے حامی ہوں۔

ابھی چند سال قبل ۱۹۸۸ء میں بھی ایک ایسا مرحلہ آیا۔ قصہ یوں ہے کہ اوکسفرڈ یونی ورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں بے نظیر بھٹو کا مغربی لباس میں کوئی فوٹو تھا جس کو ہفت روزہ تکبیر کراچی والوں نے وسیع پیمانے پر تقسیم کیا، ٹائٹل شائع کیے اور پوسٹر بنائے۔ اپنی جگہ یہ ہتھکنڈہ غیر مؤثر ثابت ہوا اور اس سال پیپلز پارٹی واحد اکثریتی پارٹی بن کر منتخب ہوگئی۔ ہمارے سیاسی اتحادیوں میں سے چند نے زور دیا کہ ان لچر پوسٹروں کو لگایا جائے۔ مگر میں نے سختی سے کہا کہ ایسے پوسٹروں کو جماعت کے کارکن نہیں بانٹیں گے۔ بہرحال ایسا کرنے والے اسلامی جمہوری اتحاد کی دیگر پارٹیوں کے لوگ ہی تھے۔ بات یہ ہے

کہ پروپیگنڈا لٹریچر بانٹنے والے لوگ خود ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر آدمی متاثر ہو رہا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ لوگ اپنے ووٹ بالکل دوسری بنیادوں پر دیتے ہیں۔

انتخابی نتائج کے لمحے

ہم کو یقین تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح، مشرقی پاکستان سے ضرور جیتیں گی۔ دوسری طرف صدر ایوب خان میں جہاں بہت سی خرابیاں تھیں، وہاں ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ پاکستان کے عام لوگ سیاست دانوں کی لڑائیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک آدمی نے آکر ان کو امن، چین اور سکون دیا ہے، بلکہ جب وہ شروع شروع میں مشرقی پاکستان آئے تو ان کا بڑا زبردست استقبال بھی ہوا تھا۔ جس سے لگتا تھا کہ وہ بڑے مقبول ہیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ یہ فضا ان کے خلاف ہوگئی۔ اسی طرح گورنر عبدالمنعم خان نے بھی دھونس، لالچ سے کافی بی ڈی ممبران کو ساتھ ملا لیا تھا۔

صدارتی انتخاب کے دن، میں مشرقی پاکستان میں حزبِ اختلاف کے کنٹرول روم میں بطور صدر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت تک میں اتنی بنگالی نہیں جانتا تھا، کہ تمام اضلاع سے آنے والی رپورٹوں کو مرتب کرتا یا انھیں مانیٹر کرتا۔ عزیز الرحمٰن، مشرقی پاکستان کے ایک ممتاز سیاسی رہنما تھے۔ وہ دین پسند طبیعت کے مالک اور پاکستان سے محبت کرتے تھے، لیکن عوامی لیگ میں بھی تھے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد وہ بنگلہ دیش کی کابینہ میں بھی لیے گئے۔ ان سے میرا تعارف پروفیسر غلام اعظم صاحب نے کرایا تھا اور ہم دونوں اکثر اکٹھے ملتے تھے۔ ہمارے اچھے ذاتی مراسم تھے۔

الیکشن کنٹرول روم میں وہ میرے پاس بیٹھ کر ٹیلی فون پر معلومات اکٹھی کرنے لگے۔ یہاں مجھے اندازہ ہوا، کہ جو لوگ سیاست کے میدان میں رہتے ہیں، سیاسی کام کرتے ہیں، ان کا ہاتھ حالات کی نبض پر ہوتا ہے۔ وہ کتنے صحیح اندازے رکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کس چیز سے کیا نتائج نکلنے والے ہیں۔ جب کہ ہم نظریاتی لوگ، اپنے نظریات کی دنیا میں

مگن رہتے ہیں، اور شاید لوگوں کی دنیا میں نہیں رہتے۔ حالانکہ ہمارے نظریات صحیح ہیں، اور اس لیے یقیناً لوگوں کو ہمارا ساتھ دینا چاہیے، مگر سچائی رکھنے کے باوجود ہم لوگوں کے دلوں پر دستک دینے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ ناکامی پیغام کی نہیں بلکہ ہماری ناکامی ہے۔

اب تک یہ بات ذہن پر نقش ہے، کہ پہلا فون ضلع کومیلا کی ایک تحصیل سے آیا۔ عزیز الرحمٰن میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ووٹوں کی تعداد بتائی جس میں محترمہ فاطمہ جناح جیت رہی تھیں، لیکن تقریباً ۵۵ یا ۴۵ کا تناسب تھا۔ مثلاً ۱۰۰ میں سے ۵۵ ووٹ محترمہ فاطمہ جناح کے اور ۴۵ ووٹ ایوب خان کے تھے، یعنی ۱۰ ووٹ کا فرق تھا۔ مگر اسی ایک نتیجے کو سنتے ہی عزیز الرحمٰن صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''پھر تو ہم ہار گئے''۔ میں نے بڑی حیرت سے کہا: ''کیوں؟'' کہنے لگے: ''اس جگہ سے تو یہ نتیجہ نہیں آنا چاہیے تھا، اس جگہ سے بہت اچھا نتیجہ آنا چاہیے تھا''۔ یہ ان کا فوری تجزیہ تھا۔

بعد میں ڈھاکہ کے انتخابی نتائج آئے، یہاں پر تو محترمہ فاطمہ جناح کو زبردست اکثریت ملی۔ فتح کے جلوس نکلنا اور لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے، کہ جیسے سب جگہ جیت ہی رہے ہوں۔ ہم لوگ بھی پُرامید ہوگئے۔ حالانکہ ابھی تک پورے پاکستان کے نتائج نہیں آئے تھے۔ جب رات بہت دیر گئے نتائج آئے تو پتا چلا کہ ایوب خان جیت گئے ہیں۔ مغربی پاکستان سے انھوں نے بہت زیادہ ووٹ لیے، یعنی تقریباً ۹۰ فی صد۔ ادھر مشرقی پاکستان سے بھی ایوب خان جیت گئے۔ اگرچہ ان کے ووٹ ۲۱ ہزار تھے اور محترمہ فاطمہ جناح کے ۱۹ ہزار۔ بہرحال وہ دوبارہ صدر منتخب ہوگئے۔

ایک خطرناک تبصرہ

اگلے دن ہم نے جماعت اسلامی کی طرف سے ڈھاکہ میں متحدہ حزبِ اختلاف (COP) کے کارکنوں اور لیڈروں کے لیے دعوت چائے رکھی۔ ڈھاکے کے کارکن بہت دل گرفتہ تھے۔ انھوں نے ڈھاکے میں محترمہ فاطمہ جناح کو کامیاب کرا دیا تھا اور بڑا جوش و خروش تھا۔ سب کو حکومت پر سخت غصہ تھا۔ اس دعوت چائے میں سارے ہی لیڈر آئے۔

جن میں مجیب الرحمٰن سمیت، نظامِ اسلام پارٹی اور عوامی لیگ کے کارکن شامل تھے۔ تقریباً چار سو آدمی تھے۔

وہاں پر شرکا میں گفتگو ہوتی رہی، کہ اس انتخابی عمل میں کیا ہوا ہے؟ لوگ تبصرے کرتے رہے۔ ان میں ایک بنگالی لیڈر تھے، جن کا مجھے نام یاد نہیں ہے۔ انھوں نے ایک ایسا جملہ کہا، جو میرے لیے خاصا چشم کشا ثابت ہوا۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ ''اگر فاطمہ جناح یہاں مشرقی پاکستان سے جیت جاتیں، تو ہم ایوب خان سے کہہ دیتے کہ تم صرف وہاں مغربی پاکستان کے صدر ہو، یہاں کے صدر نہیں ہو''۔ یہ بات سن کر ایک دم میں نے سوچنا شروع کیا، کہ ان کی طرف سے واقعی یہ تو کہا جا سکتا تھا۔ اسی لیے ہماری یہ رائے تھی کہ صدارتی نظام کے نتیجے میں ملک تقسیم ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا خیال تھا کہ پارلیمانی جمہوریت یہاں زیادہ بہتر انداز سے وفاق پاکستان کو چلا سکتی ہے، کیونکہ اس میں ہر صوبے کی نمایندگی ہو گی۔

اگرچہ اس بات پر مجھے بھی صدمہ تھا کہ فاطمہ جناح ہار گئی ہیں اور ایوب خان کو ہٹانے کا ایک موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ اگر ایوب صاحب جیتے ہیں، تو یہاں مشرقی پاکستان سے بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ کم ازکم اس وقت ملک کی وحدت اور سالمیت کو نقصان نہیں پہنچا، وگرنہ اگر صرف مشرقی پاکستان میں فاطمہ جناح جیت جاتیں اور بنگال میں علیحدگی کی کوئی بڑی تحریک شروع ہو جاتی کہ ''تم وہاں کے صدر ہو، ہمارے صدر نہیں ہو'' تو اس سے بڑا بھیانک منظر اُبھرتا۔

اسمبلی انتخابات سے سبق

اس کے بعد اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ ان کے لیے یہ طے ہوا تھا کہ متحدہ حزبِ اختلاف اپنے مشترک نمایندے کھڑے کرے گی، یعنی نو پارٹیاں ایک دوسرے کا مقابلہ نہیں کریں گی۔ مطلب یہ کہ ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے مقابلے پر اپوزیشن کا ایک ہی نمایندہ ہو گا۔ دوسری پارٹیوں سے سیاسی گفتگو اور سیاسی افہام و تفہیم کے لیے یہ میرا

پہلا تجربہ تھا۔ باقی پارٹیوں کی کامیابی سے کہیں زیادہ ہم کو دلچسپی اس بات سے ہوتی تھی کہ 'نظامِ اسلام پارٹی' کے امیدوار کامیاب ہو جائیں۔

وہاں پر جا کر مجھے پہلی بار اندازہ ہوا، کہ ہمارے پاس تو امیدواروں کی قابلِ ذکر تعداد بھی موجود نہیں ہے۔ قومی اسمبلی میں ڈیڑھ سو نمایندے منتخب ہونے والے تھے۔ اس میں صرف ۲۰، ۲۵ جگہیں ایسی تھیں، جہاں ہم نام دے سکتے تھے کہ کوئی آدمی ہماری طرف سے کھڑا ہو۔ درحقیقت ان ۲۰، ۲۵ لوگوں کے بھی نام ایسے تھے، جو ہم نے بہت زبردستی کھینچ تان کر جمع کیے تھے، تاکہ ہمیں bargaining یا سیاسی معاملہ بندی میں آسانی ہو۔ اس طرح آخرکار دس بارہ تو ہمیں مل جائیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ عوامی لیگ کے پاس ڈیڑھ سو نشستوں کے لیے پورے ڈیڑھ سو نمایندے موجود تھے۔ یہ نمایندے بھی زبردستی کے نہیں تھے، بلکہ ایسے نمایندے تھے، جو اپنا ذاتی وزن رکھتے تھے اور جن کے جیتنے کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت پہلی بار مجھے عوامی لیگ کی بے پناہ سیاسی قوت کا اندازہ ہوا، کہ یہ واقعی مشرقی پاکستان کی ایک عوامی پارٹی ہے۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ جو بھی الیکشن لڑ کر جیتنا چاہتا ہو، اس کو بڑے پیمانے پر اپنا حلقۂ اثر بنانا ہی پڑے گا، کہ لوگ اس کے ساتھ آئیں اور پھر کھڑے بھی ہوں۔ بہرحال اجلاسوں میں سب پارٹیوں کے درمیان سیاسی معاملہ بندی ہوتی رہی۔ جبکہ ہم مضبوط سیاسی بنیاد کے بغیر تھے۔

ہم نے قومی اسمبلی کے الیکشن میں غلام اعظم صاحب کا نام تجویز کیا تھا۔ یہ ڈھاکہ کے قریب تھانہ ساور کی ایک سیٹ تھی۔ یہ ان کا اپنا گاؤں نہیں تھا۔ پاکستان ہی نہیں، بلکہ برطانیہ اور بھارت میں بھی اس بات کو وزن حاصل ہوتا ہے، کہ ہر امیدوار کا ایک اپنا ذاتی حلقہ ہو، جہاں وہ ذاتی طور پر معروف ہو، یا اپنا گھر رکھتا ہو، یا اس کی برادری وغیرہ کے لوگ رہتے بستے ہوں۔ برطانیہ میں بھی خاندانی سیٹیں بہت کافی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے سیاسی اثرات عرصے سے چلے آرہے تھے۔ ہماری مجوزہ سیٹ پر غلام اعظم صاحب کا ذاتی سطح پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ہم کو خود سوچنا چاہیے تھا کہ ہم اگر جیت سکتے ہیں تو صرف جماعت کی بنیاد پر جیت سکتے ہیں۔ مگر اس حلقے میں تو جماعت کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔

بہرحال ہم نے انتخابی کمیٹی میں غلام اعظم صاحب کا نام تجویز کردیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن اس زمانے میں مجھ سے بہت تپاک، عزت اور احترام سے ملتے تھے۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے کہ ''اگر آپ اپنی تجویز میں سنجیدہ ہیں تو ظاہر ہے کہ غلام اعظم صاحب کے مقابلے پر ہم کسی کو کھڑا نہیں کریں گے۔ اگر آپ ان کے لیے یہ سیٹ چاہتے ہیں تو ہم دے دیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ ذرا تحقیق کرلیں، کہ وہاں سے ان کے جیتنے کا امکان کس قدر ہے۔ اس سلسلے میں آپ عطاالرحمٰن صاحب سے بات کریں، جو ہماری طرف سے مشرقی پاکستان میں وزیراعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ وہ اب الیکشن نہیں لڑ رہے۔ یہ انھی کا حلقہ تھا۔ آپ ان سے جاکر پوچھ لیں اور بات کرلیں۔ اگر سب چیزیں دیکھ کر واقعی آپ کا اطمینان ہوجائے تو ہماری طرف سے بھی غلام اعظم صاحب کی نامزدگی سمجھ لیجیے، لیکن بس ذرا عطاالرحمٰن صاحب سے مل لیں''۔

عطاالرحمٰن صاحب سے وقت لے کر میں ان کے پاس گیا اور بات کی۔ انھوں نے ہر پہلو سے پورے حلقے کا بھرپور تجزیہ کرکے مجھے بتایا کہ ''غلام اعظم صاحب کو وہاں پر پانچ فی صد ووٹ بھی نہیں ملیں گے''۔ میں نے واپس آکر جماعت میں اپنے ساتھیوں سے بات کی، کہ اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ غلام اعظم صاحب کی حیثیت متاثر ہوگی اور خرچ بھی اتنا ہوگا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم کو حقیقت پسند بننا چاہیے۔ یہ خوشی کی بات تھی کہ جماعت کے ساتھیوں نے میری بات خوش دلی سے مان لی۔ کسی کے چہرے پر ناگواری نہ تھی۔ اس لیے میں نے انتخابی کمیٹی میں جاکر بخوشی ان کا نام واپس لے لیا۔

یہاں پھر یہ بات کہوں گا کہ جتنے غیرحقیقت پسندانہ تجزیوں اور بے جا توقعات پر ہم لوگوں کو کھڑا کرتے رہے ہیں، وہ کوئی ایک دو بار کا تجربہ نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی، اور بعد میں بھی یہ ہوتا رہا ہے۔ بہرحال اس سے پہلی اسمبلی میں ہمارے چار ممبران قومی اسمبلی تھے، ان چاروں کو وہاں سے ٹکٹ مل گیا اور یہ چاروں منتخب بھی ہوگئے۔ اس طرح ۱۹۶۵ء کے شروع میں صدارتی انتخاب کے بعد اسمبلیوں کے انتخابات کا

ہنگامہ بھی ختم ہوا۔

صدر ایوب خان نے مشرقی پاکستان میں معاشی ترقی کے لیے کچھ اقدامات تو کیے تھے، لیکن بھارت کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے کچھ سنجیدہ کام نہیں کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ منعم خان کی گورنری کا میونسپل کمیٹی کی سطح کے لوگوں پر شدید دباؤ تھا۔ ان ممبران کے اپنے مفادات بھی وابستہ تھے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غیر جانب دار حکومت ہوتی تو ایوب خان کو وہ ووٹ بھی نہ ملتے، جو ان کو ملے تھے۔ وہاں پر ایک اچھے آدمی کے طور پر ان کو عوامی مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ ان سے لوگوں کو یہ شکایات تھیں کہ انھوں نے جمہوریت ختم کر دی، جس سے مشرقی پاکستان کی سیاسی حیثیت بھی ختم ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ پوری طاقت فوج کے ہاتھ میں آ گئی اور فوج ۹۵ فی صد مغربی پاکستان کے پٹھان اور پنجابی نژاد لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس طرح حقیقی اقتدار مغربی پاکستان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی یہ دلیل جائز تھی، صحیح تھی، اور عام طور پر شکایت بھی درست تھی۔

اس انتخابی ہنگامے کے بعد جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں دعوتی کام کا ایک پانچ سالہ منصوبہ بنایا۔ پھر مشرقی پاکستان کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ شوریٰ کے اس اجلاس میں مغربی پاکستان سے ایک بڑی ٹیم شامل ہوئی۔ جس میں خود محترم مولانا مودودی شریک تھے۔ ان کے ہمراہ میاں طفیل محمد صاحب، چودھری غلام محمد صاحب اور خورشید بھائی آئے تھے، ایک دو آدمی اور بھی تھے۔ ہم نے مشرقی پاکستان کا منصوبہ بنا کر دیا، جسے شوریٰ نے منظور کیا۔

جنگ ستمبر ۶۵ء- چند نازک پہلو

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ بڑا اہم واقعہ ہے۔ اس جنگ میں جو کچھ پیش آیا اور اس سے جو کچھ نتائج میں نے اخذ کیے وہ قابلِ غور اور دل چسپی کا باعث ہوں گے۔

خبروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جنگ شروع ہوسکتی ہے۔ رن آف کچھ کے علاقے میں پاکستان نے آگے بڑھ کر قبضہ کرلیا تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین نے آگے بڑھ کر بعض اہم

مقامات پر قبضہ کرلیا تھا۔ وہ جموں اور سری نگر کے قریب بھارتی فوجوں کے خلاف زبردست کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ بھارت بار بار جنگ کی دھمکی دے رہا تھا، کہ اگر یہ عمل زیادہ ہوا تو پھر وہ بین الاقوامی سرحد پر حملہ کردے گا۔ چنانچہ ۶ ستمبر کو بھارت نے لاہور پر حملہ کردیا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو ہم لوگ محاذِ جنگ سے دُور تھے۔

اگرچہ مشرقی پاکستان میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی، لیکن اس میں دو چیزیں کھل کر سامنے آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد سے ہی دراصل بنگلہ دیش بننے کا بیج، جو اگرچہ پہلے سے موجود تو تھا، اب وہ ایک قدآور درخت بننا شروع ہوا۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان کے اہلِ قلم اور دانش ور طبقے کو کشمیر کے معاملے میں اتنی دل چسپی نہیں تھی جتنی کہ مغربی پاکستان کے لوگوں کو تھی، اور انھیں براہِ راست یہ مسئلہ درپیش بھی نہیں تھا۔ لیکن مغربی پاکستان کا مفاد اور اس کی معیشت کشمیر سے وابستہ تھی۔ البتہ مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا، کہ اگر کشمیر مل گیا، تو پھر مغربی پاکستان کو عددی اکثریت حاصل ہوجائے گی، اگرچہ ابھی تک مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت تھی۔

لیکن اس سیاسی پہلو کی باریکی سے قطع نظر، میں سمجھتا ہوں کہ عام آدمی میں بڑا جوش و خروش تھا۔ لوگوں میں پاکستان کے لیے بڑی محبت تھی، پاکستان کی کامیابی کے لیے دعائیں ان کے لبوں پر تھیں۔ خبریں سننے کے لیے ریڈیو کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے۔ غازیوں کے حملوں اور کامیابیوں اور ہمارے پائلٹوں کی قربانیوں کی خبریں لوگوں کو بہت متاثر کرتی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فی الحقیقت ایک ایسا بندھن موجود ہے، جو لوگوں کو جوڑے اور باندھے ہوئے ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی کہ واقعی یہ ایک قوم ہے، جس کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں اور ناہمواریوں کو مٹا کر اسے ایک رکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس میں بعض پڑھے لکھے بنگالی بھی پیش پیش تھے۔ جن کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا تھا، کہ وہ

پاکستان کے مفاد کے خلاف جائیں گے یا وہ پر جوش نہیں ہوں گے۔ مگر وہ بھی پاکستان کے حق میں بڑے پُر جوش تھے۔ مثلاً کمپنی کے کام کے سلسلے میں واپڈا کے چیف انجینیر مشرف علی صاحب سے میرا خاصا ملنا جلنا تھا۔ اچھے بھلے مانس آدمی تھے۔ ایک دن کہنے لگے: ''مراد صاحب، اگر اس وقت ہمارے پاس یہاں پر ایک لاکھ پیدل فوج ہوتی، جس کے پاس چاہے کوئی بڑے ہتھیار نہ بھی ہوتے، مگر صرف رائفلیں ہوتیں، اور کچھ تربیت ہوتی تو ہم شمال میں نومیل کی اس پٹی کو کاٹ دیتے جو آسام کو بھارت سے جوڑ رہی ہے۔ اگر اس کو یہاں سے کاٹ دیتے تو مغربی پاکستان پر سے بھارت کا سارا دباؤ ختم ہو جاتا اور ان کو پوری فوج یہاں لگانی پڑتی۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ یہ بھارت ادھر سے بالکل مطمئن ہو کر صرف مغربی پاکستان پر حملے کر رہا ہے''۔

مجھے حیرت ہوئی کہ واقعی یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اگر اس وقت یہاں پر اتنی فوج ہوتی اور پاکستان جوابی طور پر یہاں سے حملہ کر دیتا، تو بھارت کو لازماً سخت مشکل پڑ جاتی۔ پاکستان آسام کی پٹی کو بڑی آسانی کے ساتھ فتح کر سکتا تھا۔ محض کشمیر کی خاطر بھارت پورے آسام کو تو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ لوگوں کے یہ جذبات تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ مشرقی پاکستان، جنگ کے اس پورے عرصے میں مغربی پاکستان سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ ہوائی جہاز آ جا نہیں سکتے تھے، کیونکہ جہاز بھارت پر سے گزرتے تھے۔ کوئی اور سامان بھی نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ایک ٹیلی فون اور تار کا رشتہ تھا۔ اب وہ بھی موجود نہیں تھا۔ اب دونوں حصوں کے درمیان صرف وائرلیس ہی ربط کا ایک ذریعہ رہ گیا تھا۔ حکومت پاکستان کے مرکز کا اس حصے پر کنٹرول نہیں تھا۔ پرانے زمانے کی تاریخ دیکھیں تو ایسے حالات عہدِ مغلیہ یا خاندان سلجوق کے زمانے میں ہوتے تو ان کا گورنر خودمختاری کا اعلان کر دیتا۔

یہاں پر یہ پہلو بھی دیکھیں کہ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان پر اتنا انحصار تھا کہ کرنسی نوٹ بھی وہیں کراچی یا لاہور میں چھپتے تھے اور پھر یہاں ڈھاکہ میں آتے تھے۔ اسٹیٹ بنک

کی ڈھاکہ شاخ میں کرنسی نوٹ ختم ہونے لگے تھے۔ سوال اُٹھا کہ اب کیا ہوگا؟ ڈاک کے ٹکٹ ختم ہونے لگے تو مسئلہ کھڑا ہوا، اب کیا ہوگا؟ ناکہ بندی تھی، اس لیے تیل نہیں آ رہا، تو یہ سوال پیدا ہوا کہ کہاں سے آئے گا؟ تیل شرق اوسط سے آتا تھا اور بحری راستے بند تھے۔

ان سترہ دنوں کی جنگ کے دوران واضح طور پر محسوس ہوا کہ مشرقی پاکستان ایک بالکل الگ اور آزاد ملک ہے جس کی معیشت الگ ہے، جس کا مغربی پاکستان پر کوئی انحصار نہیں ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ اگر بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ آور ہو تو مغربی پاکستان اس کا دفاع نہیں کر سکتا، اور وہاں سے اس کے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ اس طرح مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا خوف مجسم صورت بن کر نظروں کے سامنے آ گیا۔ اس دوران لوگوں کو یہ خیال ہوگیا کہ، ہاں یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو بالکل سامنے ہے اور ہو سکتی ہے۔ اس جنگ سے پہلے تک یہاں کے لوگوں کے دل میں صوبائی خودمختاری کا خیال تھا، لیکن جنگ کے دوران اس سے آگے بڑھ کر یہ خیال اپنی جگہ بنا گیا، کہ ''اب ہم کو الگ ہی ہونا چاہیے اور ہم الگ ہو سکتے ہیں''۔

ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا یہ سبق تھا، جس نے نفسیاتی، سیاسی اور فوجی طور پر مشرقی پاکستان کے قوم پرست لیڈروں کو علاحدگی کا احساس دلایا۔ ان کے اندر اس احساس کو جگایا، کہ مغربی پاکستان سے ہمارا بڑا کمزور بلکہ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ پاکستان کی حکومتوں نے سراسر حماقت سے پاکستان کو چلایا۔ ان کو یہ پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا، کہ اگر ایسی کوئی بات ہوگئی تو وہ کیسے نبٹیں گے۔ یہاں بھی کرنسی چھاپنے کا ایک کارخانہ لگا دیتے۔ اسی طرح ڈاک کے ٹکٹ چھاپنے یا اسی طرح دیگر بنیادی چیزوں کا بندوبست کرتے یا مشرقی پاکستان کو دفاعی طور پر مضبوط بناتے۔ مگر کسے ہوش تھا؟ کون اتنا دُور اندیش تھا؟

جنرل ایوب خاں جب کمانڈر انچیف بنے تو اس وقت فوج ۹۸ فی صد مغربی پاکستان کے لوگوں پر مشتمل تھی، گنتی کے چند افراد کو چھوڑ کر اس میں مشرقی پاکستان کے آفیسر نہیں تھے۔

اس وقت یہاں ڈھاکہ چھاؤنی میں ایک ڈویژن فوج تھی۔ باقی ساری فوج مغربی پاکستان میں تھی۔ صرف چھ ہوائی جہاز یہاں پر تھے۔ باقی ساری فضائیہ مغربی پاکستان میں تھی۔ ٹینک، ہوائی جہاز اور توپیں بھی مغربی پاکستان میں تھیں۔ مشرقی پاکستان کی شکایت اسی بنیاد پر تھی کہ ''آدھا بجٹ تو دفاع پر خرچ ہوتا ہے، مگر اس میں سے سارا دفاعی بجٹ وہیں خرچ ہوتا ہے، یہاں پر کیوں نہیں خرچ ہوتا۔ تنخواہیں وہاں دی جاتی ہیں، ترقیاتی منصوبوں پر وہاں عمل ہوتا ہے، سڑکیں اور پُل وہاں بنتے ہیں، چھاؤنیاں وہاں بنتی ہیں، یہ ساری دولت وہیں خرچ ہو رہی ہے، حالانکہ اس میں ہمارا حصہ (contribution) زیادہ ہے''۔

ایوب خان صاحب نے کمانڈر انچیف کی ذمہ داری سنبھالی تو انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''مشرقی پاکستان کا دفاع ہم مغربی پاکستان سے کریں گے۔ مغربی پاکستان چاروں طرف دشمن سے گھرا ہوا ہے۔ ہم مغربی پاکستان کو دفاعی اعتبار سے اتنا مضبوط بنا دیں گے، کہ اگر کبھی بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو ہم مغربی پاکستان سے اس پر حملہ کر کے اس کو مجبور کر دیں گے، کہ وہ ایسا نہ کر سکے'' —— چنانچہ اسی مفروضے کی بنیاد پر انھوں نے مشرقی پاکستان میں کوئی قابلِ ذکر دفاعی کام نہیں کیا، یہاں تک کہ انھوں نے بنگالیوں کو فوج میں بھی نہیں لیا۔ ان پر اعتماد نہیں کیا گیا۔ جسم اور قد کی جو شرائط انگریز نے مقرر کی تھیں، وہ جوں کی توں باقی رکھیں۔ حالانکہ انڈونیشیا، ملائشیا، جاپان وغیرہ کی بھی فوجیں ہوتی ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی فرد پنجابی اور پٹھان جوانوں کے جیسے جسمانی معیار پر پورا اُترتا ہو۔ خود گورکھا اس شرط پر پورے نہیں اُترتے تھے، مگر انگریزوں نے ان کو بھی اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا۔ بنگالیوں کی فوج میں آمد کو دانستہ طور پر انگریز نے روکا۔ ان کے اس فیصلے کی بنیاد جسمانی نہیں تھی، بلکہ تاریخی اور سیاسی محرکات تھے۔ ہمارے نو آزاد حکمرانوں نے بھی انھی سامراجی فیصلوں کو سینے سے لگائے رکھا۔ فوج کے علاوہ سول سیکرٹریٹ میں بھی حال خراب تھا۔

مشرقی پاکستان دفاع کے لحاظ سے بہت مثالی (آئیڈیل) علاقہ تھا۔ لاہور پر اتنا بڑا بھارتی حملہ صرف ایک بی آر بی نہر کی وجہ سے رُک گیا۔ مشرقی پاکستان میں تو ہر ۱۵، ۲۰ کلومیٹر

پر ندی نالوں اور دریاؤں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہاں کوئی ٹینک نہیں دوڑ سکتے تھے۔ وہاں اگر صرف گن بوٹس (جنگی آبی کشتیاں) ہوں، آبادی ساتھ ہو، گوریلا ہوں تو کوئی دشمن آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر وہاں ایسی فوج ہوتی اور یہ خیال رکھا جاتا، کہ حملے کی صورت میں ہم دشمن پر آسانی سے فتح حاصل کر سکتے ہیں، تو پھر پوری دفاعی حکمت عملی ہی بدل جاتی۔ اس عمل سے شاید مشرقی پاکستان کی نفسیاتی کیفیت بھی بدل جاتی۔

یہ وہ جنگ تھی جس نے مشرقی پاکستان کے لیڈروں کے دلوں میں اس بات کو راسخ کر دیا، کہ اب اس کے علاوہ کوئی اور حل نہیں ہے کہ ہم الگ ہو جائیں۔ میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ایوب خان ۶۲ء میں مشرقی پاکستان میں تقریر کر گئے تھے کہ: یہاں کچھ لوگ علاحدگی کی بات کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کو یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی، تاہم اس وقت تک یہ خیالی بات تھی، مگر ۶۵ء کی جنگ نے اس خیال کو ایک ممکن حقیقت میں تبدیل کر دیا کہ اس کے لیے اگر کوشش کی جائے تو یہ چیز ممکن ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ جو کچھ مغربی پاکستان میں ہوا یا جنگ کے جو کچھ بھی اثرات پاکستان پر پڑے، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن اس جنگ کے جو اثرات مشرقی پاکستان پر پڑے، ان کو میں بہت توجہ، گہرائی اور غور سے دیکھ رہا تھا۔

ایوب خان ویسے تو جنگ کے مخالف تھے، یہ جنگ ان کی مرضی کے خلاف مسلط کی گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پاکستان ایسی جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس جنگ کے پس پردہ ایک بڑا کردار بھٹو صاحب تھے۔ میرا خیال ہے اس جنگ نے پاکستان کو خاصا نقصان پہنچایا۔ لاہور اور سیالکوٹ کا زبردست دفاع ایک مختلف چیز ہے، جس کی اہمیت، غازیوں کی شجاعت اور شہیدوں کی قربانی سے کسی کو انکار نہیں۔

اعلانِ تاشقند کے بعد

اس کے بعد جنوری ۱۹۶۶ء میں تاشقند کانفرنس ہوئی۔ جہاں اشتراکی روس کے وزیراعظم الیکسی کوسیگن نے پاکستانی صدر ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر

شاستری کے درمیان معاہدہ کرایا۔ تاشقند میں بھارت کے ساتھ معاہدہ کے بعد ایوب خان نے بھٹو صاحب کو وزارتِ خارجہ سے فارغ کر دیا۔ بھٹو صاحب نے معاہدہ تاشقند کو مشکوک قرار دے کر ایوب خان صاحب کے خلاف کام شروع کیا۔ مگر اس سے پہلے غالباً فروری ۶۶ء میں چودھری محمد علی صاحب وغیرہ نے جو حزبِ اختلاف میں مغربی پاکستان سے ایک مرکزی قائد تھے۔ انھوں نے بھی معاہدہ تاشقند کو بنیاد بنا کر ایوب حکومت کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش کی تھی۔

معاہدۂ تاشقند کے خلاف کانفرنس میں شرکت کے لیے شیخ مجیب الرحمٰن لاہور آئے، اور یہاں آ کر انھوں نے جنگ یا معاہدۂ تاشقند پر کلام کرنے کے بجائے چھے نکات پیش کر دیے۔ اگرچہ اس میں انھوں نے کہا یہ تھا: ''چھے نکات مشرقی پاکستان کی مکمل صوبائی خودمختاری کے ضامن ہیں''۔ تاہم میں بھی جماعت کے اس تجزیے میں شریک تھا کہ یہ پاکستان سے علاحدگی کا نسخہ ہے۔

مگر پھر ۱۹۷۱ء تک آتے آتے اور اس کے بعد بھی مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر پاکستان کے یہ دونوں حصے ساتھ رہنا چاہتے، تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ یہ صورت لازماً علاحدگی پر منتج ہوتی۔ مثلاً ان نکات میں ایک یہ تھا کہ ''دونوں صوبے اپنی بیرونی تجارت کے لیے براہِ راست معاہدے کر سکتے ہیں''۔ مغربی پاکستان کے لوگ اور خاص طور پر اسلامی نظام کی علَم بردار جماعتیں، اپنے مزاج کے اعتبار سے مضبوط مرکز کی حامی رہی ہیں۔

حالانکہ دورِ حاضر میں ریاست و سیاست کے متوازن تعلقات میں مضبوط مرکز کا تصور ایک ثانوی چیز ہے، اصل چیز فیڈریشن کے یونٹوں کا باہم اعتماد، اتفاق اور پھر مضبوطی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر محض مضبوط مرکز ایک واہمے سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اب امریکا میں ساری ریاستیں بیرونِ ممالک سے خود اپنے تجارتی معاملات کی بات کرتی ہیں، مگر ان کی وحدت پہ کوئی منفی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ امریکا میں تو ہر ریاست کے جھنڈے اور

دستور بھی الگ ہیں۔

۱۹۶۶ء میں میرا بھی یہی خیال تھا کہ چھے نکات علاحدگی کی بات ہے، چنانچہ ہم نے اس کو مسترد کردیا۔ شیخ مجیب احتجاج کر کے متحدہ اپوزیشن سے الگ ہوگئے۔ مغربی پاکستان کے نواب زدہ نصراللہ خاں وغیرہ نے عوامی لیگ سے علاحدہ ہوکر الگ گروپ بنالیا۔ ادھر شیخ مجیب کے چھے نکات کو بے پناہ تشہیر ملی۔ باقی بچ جانے والی اپوزیشن ایوب کی مخالفت کے ساتھ چھے نکات کی مخالفت کے راستے پر چل نکلی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان چھے نکات کی ماہیت بھی تبدیل ہوتی گئی۔ ۱۹۶۶ء کے چھے نکات ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے رہے تو چھے نکات ہی، مگر ان کا حلیہ بدل گیا۔

کمپنی میں ترقی

اگست ۶۶ء میں میرے ذاتی حالات میں تھوڑی سی تبدیلی آئی۔ ۵۹ء سے ۶۶ء تک کمپنی میں کام شروع کیے ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔ اس دوران میں سینیر انجینیر بن کر تین چار درجے آگے بڑھ چکا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہمارے کمپنی انچارج عبدالرزاق صاحب تھے۔ کمپنی کو ایران میں کام مل گیا تھا۔ خواجہ عظیم الدین صاحب نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ اگر عبدالرزاق صاحب کو ایران بھیج دیا جائے تو مشرقی پاکستان میں کمپنی کا سربراہ کون ہوگا؟ اس ضمن میں ایک نام تو میرا تھا اور دوسرے بنگالی نژاد محسن علی خاں صاحب تھے۔ وہ میری طرح نوجوان تھے اور ان کی شہرت بہت اچھی تھی (مشرقی پاکستان میں ہیلی کاپٹر کے ایک حادثے میں ان کا انتقال ہوچکا ہے)۔ پھر دو بنگالی اور حیدرآبادی میری طرح سینیر انجینیر تھے۔ یہ سب عمر میں مجھ سے تقریباً دس بارہ سال بڑے اور تجربے میں بھی بہتر تھے۔ عبدالرزاق صاحب مجھے پسند کرتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ ان کی جگہ میں چیف انجینیر بن جاؤں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے بات کی۔

میرے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ چیف انجینیر بننے کے بعد دو تنظیموں کی سربراہی کروں۔ ایک طرف کمپنی کی قیادت اور دوسری طرف ڈھاکہ جماعت کی سربراہی۔ پھر

۱۹۶۴ء کے بعد میں مشرقی پاکستان کے معاملات اور ملکی سیاست میں بھی عملاً شریک ہو چکا تھا۔ یہ بھی خیال آتا تھا کہ اگر کوئی نااہل یا کسی اور مزاج کا آدمی انچارج بن گیا، تو مجھے کام کرنے کی اب جو کچھ آزادی حاصل ہے، وہ ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر کمپنی کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہوگی، تو کمپنی میں اپنی کارکردگی کو بہتر معیار پر رکھنے کے بعد جس قدر چاہوں گا، کام کرسکوں گا۔ اور اپنے اوقات کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرسکوں گا۔ ویسے بھی کیریئر کے لحاظ سے یہ ایک بڑا قیمتی موقع تھا کہ ۳۴ برس کی عمر میں اپنے صوبے میں کمپنی کا سربراہ اور چیف انجینیر بن جاؤں گا۔ اگر صرف چیف انجینیر کے لحاظ سے غور کرتا تو یہ بڑی کامیابی تھی، جسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی گزرتا کہ شاید میں جماعت کا کام اس طرح سے نہیں کرسکوں گا، کیونکہ اس کے اپنے تقاضے ہوں گے، یہ وقت اور توجہ بھی چاہے گا۔

ایسے فیصلے اپنی صواب دید پر ہی کرتا تھا، کیونکہ میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے، کہ ان معاملات میں آدمی کو فیصلے خود کرنے چاہییں اور اللہ کے بھروسے پر ان کی ذمہ داری بھی خود لینا چاہیے۔ بُرا ہو تو خود فرد اس کا ذمہ دار ٹھیرے، بھلا ہو تو اس کا کریڈٹ لے۔ چنانچہ میں نے ڈھاکہ شہر میں جماعت کی شوریٰ کو بتایا کہ ''یہ پیش کش ہو رہی ہے، جس کے حق میں میرے سامنے یہ اور یہ چیزیں ہیں۔ اب آپ میری راہ نمائی کریں کہ کیا کیا جائے؟'' پھر ان سے خاص طور پر یہ بھی کہا کہ ''اس میں ایک یہ بات بھی ہوگی کہ بحیثیت چیف انجینیر میرے اور عام لوگوں کے معیارِ زندگی میں بڑا فرق آ جائے گا۔ میرے پاس دو گاڑیاں ہوں گی، چیف انجینیر کا ڈھاکہ کے بہترین علاقے میں پندرہ سو گز کا ایک بہت بڑا آراستہ مکان ہوگا۔ ایک لحاظ سے بڑا معاشرتی تفاوت پیدا ہو جائے گا۔ امیر جماعت اور کارکنوں کے درمیان اتنا فرق مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے مجھے کمپنی کو اور زیادہ وقت بھی دینا پڑے، لیکن یہ وقت کی کمی بیشی میرے اپنے ہاتھ میں ہوگی''۔

تمام ارکان شوریٰ نے بڑی خوش دلی کے ساتھ کہا کہ ''اس پیش کش کو قبول کر لیا جائے۔ اس طرح ہر لحاظ سے جماعت کو فائدہ ہی ہوگا۔ آپ آزاد ہوں گے اور کام بھی

زیادہ کرسکیں گے۔ اگر کوئی دوسرا فرد آپ کے اوپر نگران بن گیا تو وہ تنگ کرسکتا ہے"۔ اس مشورے کے بعد میں نے اطمینان کے ساتھ اس پیش کش کو قبول کیا، اور کمپنی کے چیف انجینیر کی ذمہ داری سنبھال لی۔

اسی دوران دوسرے لوگوں نے کہا کہ "اگرچہ سینیر آپ خود رہیں، کم از کم ہم کو چیف انجینیر تو بنا دیں"۔ اس کے بعد عبدالرزاق صاحب سے میں نے کہا کہ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ چار یا تین چیف انجینیر بنا دیں۔ میں کسی کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ آپ نے مجھ سے کہا ہے کہ بن جاؤ تو میں تیار ہوں، اگر آپ کسی اور کو بنا دیتے تو میں اس کے ساتھ بھی کام کرتا، لیکن جب آپ ان کو چیف انجینیر بنائیں تو پھر اس صورت میں میرا کوئی امتیاز تو رہنا چاہیے، تاکہ معلوم ہو کہ انچارج میں ہوں۔ اس کے لیے آپ میرا منصب جنرل مینیجر کردیں"۔ اب تک کمپنی میں یہ منصب نہیں تھا۔ ان کو بات پسند آ گئی۔ انھوں نے کراچی میں مینیجنگ ڈائرکٹر صاحب سے یہ بات کی۔ ان کو بھی پسند آئی کہ میں چیف انجینیر کے علاوہ جنرل مینیجر بھی بن جاؤں، تاکہ معلوم ہو کہ کمپنی کی مشرقی پاکستان برانچ کا سربراہ کون ہے۔ باقی تین چیف انجینیر میرے تحت ہوگئے۔ اس سے میرے رتبے میں اضافہ ہوگیا اور وہاں پر کمپنی کی باگ ڈور سنبھال لی۔

اس دل چسپ بات کا بظاہر تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن میرے خیال میں تعلق ہے بھی۔ پھر ایک بڑی پارٹی ہوئی، جس میں عبدالرزاق صاحب کو اسٹاف کی طرف سے الوداع کہا گیا، اور میری تقرری کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ پارٹی، ڈھاکہ نیو مارکیٹ کے ایک چائنز ریستوران میں ہوئی۔ پارٹی کے لیے میرا اصرار تھا کہ چپڑاسی سے لے کر اُوپر تک سب برابر سطح پر بیٹھیں گے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بڑی بات تھی۔ آفیسرز، ملازمین اور چھوٹے درجے کے ملازمین کے درمیان ہمارے معاشرے میں ایک بے رحم قسم کی طبقاتی تقسیم ہے۔ بہرحال اس پارٹی میں دفتر کے معمولی لنگی باندھنے والے چپڑاسی بھی انجینیروں کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ جو امریکی انجینیر ہمارے ساتھ کام کررہے تھے، اس عمل سے بہت متاثر ہوئے۔ الحمدللہ! مجھے اپنی کمپنی میں تمام

افسروں اور کارکنوں کا احترام اور اعتماد حاصل تھا۔ چنانچہ بہت کامیابی کے ساتھ یہ کام چلا۔

۶۶ء ہی میں ہماری فیملی بڑے مکان میں منتقل ہوگئی، اور فی الواقع اس سے مجھے بہت فائدے ہوئے۔ اس کے بعد میں نے تحریک کے لیے تقریباً ہمہ وقتی کام بھی کیا، جس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔

گرفتاری کے وقت سے عبدالرزاق صاحب کو مجھ سے ہمدردی تھی۔ میرے تحریکی کاموں اور مقاصد سے بھی ہمدردی تھی، اگرچہ وہ خود عملی طور پر اس میں کچھ نہیں کرتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر حیدرآباد کے ایک شریف اور وضع دار انسان تھے۔ ان کے گھر کا ماحول بھی دینی تھا۔

ہمارے مینیجنگ ڈائرکٹر عظیم الدین صاحب بھی حیدرآباد کے شریفانہ سماجی پس منظر کے حامل فرد تھے۔ مجھے ان کی بھی پوری تائید حاصل تھی۔ ویسے بھی وہ بہت فیاض آدمی تھے۔ جب مشرقی پاکستان گیا تھا تو میرے پاس کوئی کار نہیں تھی، پیدل آتا جاتا تھا اور اسی لیے میں دفتر کے قریب رہتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں پر حکومت کی طرف سے کاریں آئیں جو پرمٹ پر ملنے لگیں۔ ۱۳۰۰ سی سی قسم کی ڈاٹسن کار مجھے بھی الاٹ ہوگئی، جس کی اس وقت قیمت گیارہ ہزار روپے تھی، جو آج کل پانچ لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ میرے پاس تو گیارہ ہزار کیا، گیارہ سو روپے بھی فاضل نہیں تھے۔ میں نے صدر دفتر کراچی میں عظیم الدین صاحب کو فون کیا کہ ''یہ کار مل رہی ہے، مگر میرے پاس پیسہ نہیں ہے''۔ انھوں نے کہا: ''لے لو'' اور میں نے کار خرید لی۔

دردِ دل کی رفاقت

اسی سال ۳ نومبر ۱۹۶۶ء کو مجھے پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ تب میں تقریباً ۳۴ سال کا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے یا اس عمر میں ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک طرف ۶۳ء سے جماعت کا اتنا زیادہ کام تھا اور پھر کمپنی کا سارا کام،

پراجیکٹ، ڈیزائن وغیرہ وغیرہ۔ اس پر یہ دباؤ کہ جماعت یہ نہ سمجھے کہ کمپنی کی وجہ سے اس کا کام متاثر ہورہا ہے اور کمپنی والے یہ نہ گمان کریں کہ جماعت نے ان کی کمپنی کو متاثر کیا ہے۔ یہ اپنی جگہ اہم، مگر اس سے بڑھ کر ضمیر پہ یہ دباؤ اور بوجھ تھا کہ کمپنی سے میں رزق حلال حاصل کروں اور جماعت میں حتی الوسع حلف کے تقاضے پورے ہوں۔ میرے اپنے خیال میں بھی یہ اچھی خاصی اوورلوڈنگ ہورہی تھی۔

ہمارے گھر سے ذرا کچھ فاصلے پر ایک مسجد تھی۔ حسب معمول میں فجر کی نماز پڑھنے گیا۔ ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا کہ گردن کی وہ جگہ جہاں ٹائی باندھتے ہیں، وہاں پر یک لخت درد کی سخت لہر اُٹھی، جیسے کسی نے کند چھری رکھ دی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک میرے ذہن میں، اپنے بارے میں نہ ہارٹ اٹیک کا لفظ تھا اور نہ کوئی تصور۔ بس یہ چیز مجھے اتنی عجیب لگی کہ ذرا ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا اور سوچا کہ واپس چلا جاؤں یا مسجد کی طرف بڑھوں۔ پھر چند لمحوں میں وہ لہر ختم ہوگئی اور میں مسجد چلا گیا۔ نماز پڑھی، البتہ سجدے کے دوران دوبارہ ہلکی سی تکلیف ہوئی۔ میں گھر واپس آیا اور اس واقعے کو بھول گیا۔ وقت پر کمپنی کے دفتر چلا گیا، دفتر سے شام کو واپس آیا۔ اس شام بھی کچھ نہیں ہوا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت تھوڑا سا درد ہوا۔ پھر مغرب کے لگ بھگ کچھ مہمان آئے، ان کو چائے پلائی۔ جب کوئی ہمارے ہاں آتا تو بازار سے سموسے منگوا لیا کرتے تھے۔ میں نے بھی ایک سموسہ اٹھایا اور آدھا کھایا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد پیٹ میں درد کی سخت تکلیف شروع ہوگئی۔ میں سمجھا کہ سموسہ کھانے سے یہ خرابی ہوئی ہے یا شاید کچھ بدہضمی ہوگئی ہے، جس کا یہ درد ہے۔ خیر، ساڑھے سات سے آٹھ، نو اور پھر دس بج گئے، لیکن وہ درد جا نہیں رہا تھا۔ میں سمجھا کہ اس کے لیے کچھ ہاضمے وغیرہ کی دوا کھانا چاہیے۔

ڈاکٹر اکرام صاحب جن کا پہلے ذکر کر چکا ہوں، وہ اب رشتے میں میرے ہم زلف بھی تھے۔ میری بیوی کی پھوپھی زاد بہن سے ان کی شادی ہوئی تھی، انھیں فون کیا۔ وہ ذرا

فاصلے پر قیام پذیر تھے۔ کہنے لگے: ''میں آجاؤں اور دیکھ لوں''۔ میں نے کہا: ''نہیں، یہ تو پیٹ کی شکایت ہے۔ آپ کوئی دوا بتا دیں''۔ انھوں نے انٹاکس بتا دی وہ میں نے کھالی، مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پھر متلی ہونے لگی، جس سے قے ہوئی، ایک دو مرتبہ ٹائلٹ بھی جانا ہوا۔ اسی دوران سینے میں اتنا شدید درد اُٹھا کہ میں کھڑکی کی سلاخ پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی کش مکش میں رات کا ایک بج گیا۔

میں نے دوبارہ اکرام صاحب کو فون کیا۔ کہنے لگے: ''میں نے تو آپ سے اسی وقت پوچھا تھا، ابھی آرہا ہوں''۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے آپ کی مرضی ہے تو آجائیں''۔ وہ آگئے۔ میری حالت دیکھی تو بھاگے بھاگے گئے اور E.C.G مشین لے آئے اور مجھے لٹا دیا۔ (اٹیک کے بعد میں نے جب ریکارڈ دیکھے تو اتنا شدید اٹیک مجھے اس کے بعد بھی کبھی نہیں ہوا) بلڈ پریشر ۲۰۰ اور ۱۵۰ پر تھا، اور دل کی دھڑکن ۲۵۰ تھی، ہر چیز بگڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے پیتھاڈین کا انجکشن دیا، اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا ___ یہاں سے میرے دل کے مرض کا آغاز ہوا۔ دو مہینے تک بستر پر لیٹا رہا اور ڈاکٹر عبدالرب صاحب کے زیر علاج رہا۔ اس سے قبل ۱۹۶۳ء میں میرے والد صاحب کا انتقال بھی اسی مرض میں ہوا تھا۔ ان کو انجائنا تھا اور ۷۳ برس کی عمر میں ہارٹ اٹیک کے باعث فوت ہوئے تھے۔ اس مرض نے میری بعد کی زندگی کو متاثر کیا اور کچھ نہیں بھی کیا۔ تب سے درد دل کا مرض تو چل ہی رہا ہے۔

ہارٹ اٹیک تو بڑا سنگین مرض ہے، اسی لیے دل کا مریض عموماً بہت سی چیزوں سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ لیکن میں نے جماعت کے کام سے یا کمپنی کے کام سے کوئی ایسی چھٹی نہیں کی، بلکہ ہارٹ اٹیک کے زمانے میں، پہلے سے طے شدہ ایک بڑی شب بیداری کا ایک پروگرام تھا۔ میں نے غلام اعظم صاحب سے کہلوایا کہ اب آپ اسے چلائیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے آدھے گھنٹے کی ایک مختصر سی تقریر ٹیپ کرا کے بھیج دی تھی۔ اللہ کے فضل سے اس گفتگو کا اچھا تاثر رہا۔

اس میں دوسری باتوں کے علاوہ میں نے یہ کہا تھا کہ: آپ کے لیے بھی میری اس

بیماری میں خیر و برکت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، پچھلے چند برسوں کے دوران جماعت اسلامی ڈھاکہ نے کام کا جو اعلیٰ معیار پیش کیا ہے، اسے دیکھ کر کچھ کم فہم لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کردیا تھا کہ یہ کسی ایک فرد کا کارنامہ ہے۔ اس خیال کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوا، کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں بڑا غیرت مند ہے۔ اس لیے اس نے آپ کو ہر موقع فراہم کردیا ہے کہ آپ یہ ثابت کریں کہ کام کا یہ اعلیٰ معیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و توفیق اور سارے کارکنوں کی مشترکہ پُرخلوص محنتوں کا نتیجہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسی ہارٹ اٹیک کے زمانے میں، اتنی عمر گزرنے کے بعد مجھے پہلی دفعہ قرآن سننے کا بڑا قیمتی موقع ملا۔ ہمارے ایک دوست فصیح الدین فہمی، سعودی عرب میں ملازمت کے دوران آئے ہوئے تھے۔ میں بیکار بستر پر پڑا رہتا تھا اور حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے باتھ روم تک جانا بھی منع کر رکھا تھا، کیونکہ اس وقت حفاظتی قدم کے طور پر یہی طریقہ علاج تھا۔ اب تو ساتویں دن مریض کو اُٹھا کر چلاتے ہیں۔ تکلیف کی حالت میں تو پڑھنا بھی مشکل تھا۔ فصیح صاحب نے سورہ مریم، سورہ طٰہٰ اور سورہ ق کے ترتیل میں ٹیپ شدہ حصے بھیج دیے۔

میری اہلیہ وہ ٹیپ ریکارڈ پر لگا دیتی تھی اور میں ان کو سنتا رہتا تھا۔ اس سے پہلے قرآن پڑھنے میں مجھ سے غلطیاں سرزد ہوجاتی تھیں۔ میں نے کسی باقاعدہ استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ اگرچہ آج بھی دل چاہتا ہے کہ کسی قاری کے پاس بیٹھ کر اپنی اصلاح کروں۔ اب بھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید میں ابھی تک تجوید کے قاعدے کی رُو سے غلطیاں کر رہا ہوں گا۔ اس بات کا احساس رہتا ہے، اس لیے نماز پڑھانے اور قرأت کرنے سے گھبراتا ہوں۔ اس طرح سے ٹیپ ریکارڈر پر قرآن سن سن کر مجھے اچھی قرأت سننے کا شوق ہوگیا اور ساتھ ہی میں نے قرآن پڑھنے کے اس موقع سے فائدہ بھی اٹھایا۔

ہارٹ اٹیک کے بعد دو مہینے تک بستر پر لیٹا رہا۔ اس کے بعد جس دن پہلی دفعہ کھڑا ہوا تو چلنے کی طاقت نہیں تھی، اس لیے اٹھنے کے بعد گر پڑا۔ پھر بحال ہونے میں مزید دو تین

مہینے لگ گئے۔ ۶۷ء کا آدھا حصہ تو اسی میں گزر گیا۔

اس کے بعد ۶۷ء میں پھر ایک چھوٹا سا ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ کوثر ہاؤس میں مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کی نشست ہو رہی تھی، جس میں سیاسی معاملات پر بحث ہو رہی تھی۔ اس نشست میں صوبائی جماعت کے قائدین بھی موجود تھے۔ اجلاس میں بیٹھے بیٹھے مجھے سینے میں اسی جگہ پر جلن سی محسوس ہوئی، جہاں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس وقت اتنا سخت درد نہیں اُٹھا، اس لیے میں نے نظرانداز کر دیا اور تقریباً ایک دو گھنٹے کے بعد وہ درد ختم ہوگیا۔ اگلے دن میں نے ڈاکٹر سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا: ''چیک اَپ کروایئے''۔ چیک اَپ کروایا تو معلوم ہوا کہ یہ ہلکا ہارٹ اٹیک تھا۔ اس کے بعد انھوں نے پھر دو ایک ہفتے کے لیے لٹا دیا۔

پہلے ہارٹ اٹیک کے بارے میں تو نہیں کہتا کہ وہ جماعت کے کسی واقعے سے ربط رکھتا تھا، لیکن اس کے بعد مجھے جتنے بھی ہارٹ اٹیک ہوئے، وہ جماعت کے اجتماعات میں ہوئے۔ جماعت کے اجتماعات میں بھی کچھ اس طرح، کہ زیر بحث موضوع پر یا کسی بات پر سخت tension [ذہنی تناؤ] ہوا تو یہ تکلیف اُمڈ آئی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر tension پر ایسا ہوتا رہا ہے۔

القدس کا زخم

۵ جون ۱۹۶۷ء مسلمانوں کی تاریخ میں نہایت عبرت ناک دن بن کر سامنے آیا۔ اس دن دنیا بھر کے مسلمان جس ذلت اور رسوائی سے گزرے اس کی مثال نہیں ملتی۔

عرب دنیا پر عرب قومیت اور سوشلزم کا بھوت سوار تھا۔ عالمِ عرب میں آمریت اور ملوکیت نے اپنی جڑیں پیوست کر رکھی تھیں، وہ اسرائیل کے سامنے ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوا اور مسجد اقصیٰ بھی یہودیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ ان عرب ملکوں میں حکمرانوں نے 'الاخوان المسلمون' کے رہنماؤں کو جس بے دریغ طریقے سے پھانسی پر چڑھایا، اور کارکنوں پر جو روح فرسا مظالم ڈھائے، مدتوں اس کرب کو نہیں بھلایا جاسکے گا۔ 'اخوان' کے

ان کارکنوں نے ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین کے دوران یہودیوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے، کہ وہ لوگ اسلامی جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ لیکن ان قدسی نفوس پر عرصۂ حیات تنگ کرنے والے نام نہاد ترقی پسند اور عرب قومیت کے علَم بردار جب میدانِ جنگ میں اُترے، تو صرف دو دن میں اپنی فوجیں تباہ کروا اور اپنے ۲۷ ہزار مربع میل علاقے گنوا بیٹھے۔ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کو یہودیوں کے قبضے میں دے ڈالا۔

القدس کے سانحے نے میرے قلب و روح کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سانحے کی سب سے زیادہ افسوس ناک صورت یہ تھی، کہ اس کرب اور عبرت کا احساس ہمارے عوام اور خواص میں نمایاں نہیں تھا۔

تحریک جمہوریت میں

۳۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو ڈھاکہ میں کونسل مسلم لیگ؛ نظامِ اسلام پارٹی، عوامی لیگ (نصراللہ گروپ) اور جماعت اسلامی نے مل کر پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے اپوزیشن جماعتوں کا اتحاد قائم کیا۔ اس میں ہر پارٹی نے اپنے چار چار نمایندے نام زد کیے۔ جماعت کی مرکزی قیادت مغربی پاکستان میں تھی، مگر اس کے باوجود جماعت نے مساوات کے اصول کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے، مغربی پاکستان سے محترم مولانا مودودی اور میاں طفیل محمد صاحب کو نام زد کیا۔ جب کہ مشرقی پاکستان سے غلام اعظم صاحب اور مجھے پاکستان تحریک جمہوریت کے لیے نام زد کیا۔

متحدہ حزبِ اختلاف کے زمانے سے میں سیاست میں بہت زیادہ فعال رہا تھا۔ اس دوران میں دوسرے سیاسی لیڈروں سے ملنا جلنا، پارٹی کے لیے بات چیت کرنا، محاذ آرائی سے بچنا اور اتحاد و اتفاق کی مختلف تجاویز پر غور کرنا میرے پیشِ نظر رہا۔ پھر صدارتی اور اسمبلی انتخابات کی مہم میں حصہ لیا۔ اب پاکستان تحریک جمہوریت میں جانے سے قومی سطح پر سیاسی لیڈروں سے ملنے، ان کو سمجھنے اور ان سے معاملہ کرنے کا موقع ملا۔

۱۱

تعمیر وتخریب کا مشاہدہ

اس بات کا پہلے ذکر کر چکا ہوں، کہ میرے امیر منتخب ہونے کے بعد فضل الدین شمسی صاحب کے ایثار سے، ہمیں بیت المکرّم کے زیر سایہ دفتر مل گیا تھا۔ اس سے قبل ڈھاکہ جماعت کا دفتر ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ مگر اب نیا دفتر ایک وسیع اور کشادہ کمرے میں تھا۔ مرکزی اور معروف جگہ پر واقع تھا۔ اس مرکز نے ڈھاکہ جماعت کے کام کو آگے بڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

نیا دفتر، کوثر ہاؤس

لیکن اب جماعت کا کام الحمدللہ اتنا پھیل چکا تھا، کہ یہ دفتر بھی ناکافی پڑ چکا تھا۔ میں نے شروع سے یہ طے کیا ہوا تھا، کہ جب تک بھی ممکن ہوا، پورے ڈھاکہ سے جماعت کے کارکنوں کا اجتماع مہینے میں ایک بار ضرور منعقد کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے یہ جگہ بالکل ناکافی ہوگئی تھی۔ جماعت کے کارکنوں کی تعداد اب چار سو تک پہنچ گئی تھی اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

چنانچہ ہم نے ایک نئے دفتر کی تلاش شروع کی۔ ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی ہمیں صدیق بازار میں کوثر ہاؤس کے نام سے ایک مکان مل گیا۔ اس میں سات کمرے اور ایک کھلا صحن تھا۔ صحن میں تقریباً پانچ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ ہم اس دفتر میں منتقل ہوگئے۔ یہ دفتر سقوطِ ڈھاکہ (۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء) تک ڈھاکے میں تحریکِ اسلامی اور جماعت کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔

اسلامی جمعیت طلبہ سے ربط

اسلامی جمعیت طلبہ کے حلقۂ احباب سے تعلق کی وجہ سے، جماعت کے ساتھ ربط رکھنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ جماعت کے ساتھیوں میں جمعیت کے بارے میں خاصی شکایات پائی جاتی ہیں۔ میں نے ان شکایات پر غور کیا تو اندازہ ہوا، کہ اس کی ایک بڑی وجہ دراصل یہ ہے کہ جمعیت کے لوگ خودمختار رویے کو خوب اچھی طرح اپناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں تو ۱۹۵۱ء سے ہی اسلامی جمعیت طلبہ کے لیے سوچ، عمل، اختیار اور پالیسی کی آزادی کا قائل تھا۔

برادر تنظیم کی حیثیت سے اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی کا باہمی ربط بذاتِ خود ایک اہم موضوع ہے۔ پاکستان ٹوٹنے سے پہلے اور پاکستان ٹوٹنے کے بعد بھی، اس موضوع پر گفتگو اور بحث رہی ہے۔ اس ربط میں ارتقا اور تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں بھارت اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھی تنازع بڑھے ہیں۔ مثال کے طور پر مقبوضہ کشمیر میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ کو الگ کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ (SIM) کے نام سے طلبہ کی جو تنظیم قائم ہوئی تھی، جماعت اسلامی ہند نے ۱۹۸۱ء میں اس کی حیثیت کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کردیا، اور پھر خود اسلامک اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے نام سے طلبہ تنظیم بنائی۔

بہرحال مشرقی پاکستان میں، میں نے اس ربط کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس بات میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے، کہ مشرقی پاکستان میں اسلامی تحریک کے مستقبل میں اسلامی جمعیت طلبہ کا کردار ایک کلیدی، اور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی قومی سیاست میں طلبہ کا بڑا گہرا اثر اور دخل تھا۔ جس پارٹی کے ساتھ طلبہ ہوتے تھے، عموماً سیاسی طور پر بھی وہی پارٹی طاقت ور ہوتی تھی۔ لیکن طلبہ میں ہمارا اثر ورسوخ بڑا محدود تھا۔ کچھ عرصے تک جمعیت کی قیادت اُردو بولنے والے رفقا کرتے رہے۔ لیکن ۶۴ء تک بڑے اچھے اچھے بنگالی نژاد طلبہ جمعیت میں شامل ہوگئے تھے۔

مشرقی پاکستان جمعیت کے ناظم سے میرا ربط رہتا تھا۔ ایک طرف کمپنی، دوسری طرف ڈھاکے کی جماعت اور تیسری جانب صوبائی جماعت میں ذمہ داریاں اور مصروفیات تھیں۔ اس لیے جمعیت کی قیادت سے کوئی بہت قریبی تعلقات نبھانا تو ممکن نہیں تھے، لیکن اتنا ربط رکھنے کی ضرور کوشش کرتا تھا، جتنا کہ ضروری تھا۔ تربیت کے لیے پروگراموں میں شرکت کرتا تھا۔ ذاتی طور پر جہاں سمجھتا تھا، کہ جمعیت کی بہتری کے لیے کچھ خدمت کر سکتا ہوں، وہاں کوشش کیا کرتا تھا۔ اس طرح جمعیت سے میرے بڑے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے، اور ان کے لیے میں بڑے بھائی کی طرح تھا۔

وہ لوگ مجھے بڑا بھائی کہتے تھے اور مراد بھائی بھی کہتے تھے۔ بڑی محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ الحمدللہ یہ ایک ایسا تعلق ہے، جو نسلیں گزر جانے اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے باوجود اب تک برقرار ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسا mechanism (نظامِ کار) ہے، کہ وہ اس تعلق کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرتے آ رہے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ۲۵ سال گزر جانے کے بعد بھی، وہاں سے جمعیت کا کوئی طالب علم برطانیہ آتا ہے، تو میرا نام سنتے اور ملاقات کرتے ہی اس کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے، اور پھر محبت و احترام سے پیش آتا ہے۔ اس پر اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ کر شرمندگی ہوتی ہے، اور دین کے لیے ان کی بےلوث محبت پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہوں، جس نے یہ تعلق عطا کیا ہے۔

میں نے کوشش کی، کہ جماعت اور جمعیت کے درمیان جو غلط فہمیاں ہیں، وہ دُور ہوں اور آپس میں ایک مفاہمت کی فضا قائم ہو۔ جماعت بھی اپنی جگہ اس بات کو تسلیم کرے کہ اسی فکر سے راہ نمائی لینے والی یہ ایک آزاد اور خودمختار تنظیم ہے۔ جب یہ بات ذہنوں میں تسلیم شدہ ہو تو پھر اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، ان کو پورا کیا جانا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح جمعیت بھی اس بات کو محسوس کرے کہ بلاشبہہ وہ ایک آزاد تنظیم ہے، مگر اس سے بڑھ کر وہ ایک تحریک کا جزو بھی ہے اور اسے تحریک کا جزو ہونے کے تقاضے ملحوظ رکھنے چاہییں۔ میں نے اسی بات کو پیش کیا تھا، جس کو سب لوگوں نے مان لیا تھا۔

اس کے بعد بھی اسی بات کو برابر سامنے رکھتا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ ۸۶ء میں لاہور جانے کے بعد جب پاکستان میں جمعیت سے ربط میرے ذمے ہوا تو پھر اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا، کہ جو کچھ بھی مرکزی نظم نے جمعیت سے کہنا ہو، وہ مرکزی سطح پر نظم ہی سے کہنا چاہیے۔ ایک ایک مقام پر اور ایک ایک فرد سے یہ بات چیت کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے دخل اندازی محسوس ہوگی اور غلط فہمیاں بھی پیدا ہوں گی۔ ہر مقام پر لوگوں میں وہ وسعتِ ظرف، وہ تحمل اور وہ فہم نہیں ہوگا، کہ جس سے یہ تعلق دوسرے کی آزادی کو تسلیم کرنے کے باوجود مناسب بنیادوں پر قائم رہے۔

طلبہ عربیہ کے حوالے سے

یہ ۶۳ء کی بات ہے، کہ عربی مدارس میں طلبہ تنظیم کے قیام کی ذمہ داری مَیں نے اپنے ذمے خود لے رکھی تھی۔ پہلے سے عربی مدارس کے طلبہ کی ایک تنظیم، جمعیت طلبہ عربیہ کے نام سے موجود تھی۔ لیکن اپنی جگہ یہ ایک غیر مؤثر تنظیم تھی۔ چونکہ 'عربک اسلامک یونی ورسٹی' کی رپورٹ لکھنے کے بعد ان مدرسوں میں، میں ایک چھوٹا سا مقام حاصل کر چکا تھا، اس لیے اکثر اساتذہ مجھے جانتے اور احترام و عزت سے پیش آتے تھے۔ دوسری طرف ۲ جنوری ۶۴ء کو جمعیت طلبہ عربیہ کے تحت ایک جلوس ڈھاکے میں نکلا تھا، جس کی قیادت اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ شیخ محبوب علی بھائی نے کی تھی، اور وہ اسی بنیاد پر گرفتار بھی ہو گئے تھے۔

جیل سے نکلنے کے بعد مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا، کہ طلبہ کی یہ کتنی بڑی قوت ہے، جسے تحریک کے مقاصد کے لیے ہمیں تیار کرنا اور مثبت کام پر لگانا چاہیے۔ چنانچہ اس معاملے میں باہمی مشورہ کرنے کے بعد پھر یہ طے ہوا کہ جمعیت اپنے ایک باصلاحیت، معتمد علیہ رکن کو فارغ کرے، جو اس کام کو چلائے اور اس کی ذمہ داری اٹھائے۔ اس وقت تقریباً ایک لاکھ سے کچھ زیادہ طلبہ مدارس عالیہ میں، دینی اور عربی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

ڈھاکہ مدرسہ عالیہ میں تو بڑے ممتاز لوگ پڑھاتے تھے۔ مولانا قائد غنی حدیث کے استاد تھے، ان کا بڑا نام ہے۔ مفتی عمیم الاحسان صاحب اس کے پرنسپل تھے۔ جمعیت نے اس کام کے لیے مطیع الرحمٰن نظامی بھائی کو نام زد کیا۔ جمعیت طلبہ عربیہ کے تنظیمی معاملات سنبھالنے اور چلانے کے لیے ان کی مالی معاونت کا کام میں نے اپنے ذمے لیا۔ یہ کام خود اسلامی جمعیت طلبہ سے لیا نہیں جاسکتا تھا، کہ اس کے اپنے وسائل بڑے محدود تھے۔ پھر میں اسے بھی درست نہیں سمجھتا تھا، کہ ڈھاکہ جماعت، صوبائی جماعت یا مرکز جماعت پر اس کام کو کوئی بار پڑے۔ اس لیے میں نے نئے ذرائع پیدا کیے۔

مطیع الرحمٰن نظامی [آج کل بنگلہ دیش جماعت اسلامی کے امیر، گذشتہ پارلیمنٹ میں جماعت کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر، اور صف اوّل کے ممتاز راہ نما]، اس وقت طالب علم تھے، وہ اکثر صبح کے وقت میرے گھر ملنے آیا کرتے تھے۔ فجر کے بعد، کبھی ناشتے کے وقت، کبھی ناشتے کے بعد، ہر دوسرے تیسرے روز اُن سے ملاقات ہوتی تھی جس میں یہ موضوع زیر بحث رہتا کہ کیا کام ہو رہا ہے، کیا منصوبہ بندی ہو رہی ہے اور کیا رکاوٹیں ہیں؟ـــــ جمعیت طلبہ عربیہ کے لیے میں نے جو نقشۂ کار بنایا تھا، وہ شاید دل چسپی کا موجب ہوگا۔ کم سے کم جماعت کے باہر جو تنظیمیں ہیں، ان کے لیے ممکن ہے اس سے کوئی اچھا اشارہ مل جائے۔ کیونکہ وہ نقشۂ کار ایک مناسب تجربہ تھا، جس کی کامیابی کے زیادہ امکانات تھے۔

چنانچہ میں نے پہلی بات یہ سامنے رکھی کہ ''آپ جمعیت طلبہ عربیہ کو اس حیثیت سے نہ پیش کریں، کہ یہ مدارس کے طلبہ کی بہت سی طلبہ تنظیموں میں سے ایک طلبہ تنظیم ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے ایک دوسری مدمقابل تنظیم بھی کھڑی ہوسکتی ہے۔ دوسرے گروہ مثلاً نظامِ اسلام پارٹی، جمعیت علما اور مسلم لیگ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ بلکہ آپ اس کو عربی مدارس کے طلبہ کی واحد نمایندہ تنظیم کی حیثیت دیں۔ چونکہ عربی مدارس میں طلبہ یونین نہیں ہے، اس لیے آپ اس کی حیثیت، ایک طرح سے اسٹوڈنٹس یونین کی کردیں۔

آپ کہیں کہ مدرسہ کے جتنے طلبہ ہیں، وہ سب اس کے ممبر ہیں۔ اس کے لیے یہ کوئی ضروری نہیں ہے، کہ لوگ فارم بھریں اور کوئی درخواست دیں۔ آپ جمعیت یا جماعت کے تنظیمی ڈھانچہ کی نقل نہ کریں۔ رفاقت، رکنیت کے مدارج نہ بنائیں۔ اس میں کام کرنے والے افراد اپنے کردار، صلاحیت اور اپنے بل بوتے پر خود بخود سامنے آئیں اور کام کو چلائیں''۔

اس وقت بھی میں یہی سمجھتا تھا اور تجربے سے بھی ثابت ہوا ہے۔ یہ اندیشہ رکھنا کہ دوسرے لوگ تنظیم پر قبضہ کرلیں گے اور ہمیں نکال باہر کریں گے، یہ ایک موہوم اندیشہ ہے۔ اگر کچھ جان دار لوگ کسی تنظیم کو چلا رہے ہوں، تو کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی، کہ وہ گھس آئے اور فعال قیادت کو نکال باہر کرے، یا یہ کہ اگر لیڈرشپ کے لیے عام انتخاب ہوجائے تو افراد غلط لوگ منتخب کرلیں گے۔ یہ بھی ایک موہوم سا خطرہ ہے۔ اگر آج پاکستان میں جماعت کے سارے ہی متاثرین کو ووٹ کا حق دے دیا جائے، تو محترم قاضی حسین احمد صاحب ہی امیر جماعت منتخب ہوں گے۔ اگر یہ اختیار ارکان کو دیا جائے تو پھر بھی قاضی صاحب منتخب ہوں گے۔ لوگوں کی نگاہوں میں قیادت کے لیے ایک دو آدمی ہی ہوتے ہیں، جن میں سے لوگ اپنا لیڈر منتخب کرتے ہیں۔

دوسری بات ان سے یہ کہی تھی کہ ''اس تنظیم کو اوپن اور کھلا رکھیں، اس کے انتخابات اور نتائج بھی اوپن رکھیں۔ اس کے پروگرام میں اقامت دین اور اس نوعیت کی وہ اصطلاحیں نہ اختیار کریں جو صرف جماعت سے منسوب ہوکر رہ گئی ہیں۔ بلکہ، اس کی سرگرمیوں میں اسلام بطور پروگرام، نصب العین اور ہدف رکھیں، کیونکہ یہ اسلامی عربی مدارس کی تنظیم ہے۔ لیکن اس کی سرگرمیوں اور مطالبات میں سرفہرست عربی مدارس کے مسائل ہی رکھیں ـــــ چنانچہ بالآخر یہ ایک نمایندہ تنظیم بن گئی۔ کچھ عرصہ بعد نظامی بھائی واپس اسلامی جمعیت طلبہ میں آگئے۔

اپنے کارکنوں کی تعداد اور اپنے اثرات کے لحاظ سے، یہ اسلامی جمعیت طلبہ سے کوئی

کم مضبوط تنظیم نہیں تھی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھی اس نے بڑا زبردست حصہ ادا کیا تھا۔ جماعت میں اکثر لوگ ایسے تھے جنھوں نے پہلے انھی مدرسوں میں پڑھا تھا، جیسے مولانا عبدالرحیم صاحب اور عبدالسبحان صاحب وغیرہ۔

بعض لوگ ایسے تھے، جنھوں نے پہلے ان مدرسوں میں پڑھا اور اس کے بعد یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ان لوگوں میں سید محمد علی صاحب، بیرسٹر قربان علی، ڈاکٹر مناظر احسن گیلانی اور مطیع الرحمٰن نظامی وغیرہ شامل ہیں۔ ایسے بے شمار لوگ جماعت اور خود جمعیت کی صفِ اوّل میں کام کر رہے تھے جو عربی مدارس سے نکل کر آئے تھے۔ جمعیت کو اس سے تقویت مل رہی تھی، کیونکہ جو لوگ وہاں طلبہ عربیہ سے نکل کر کالجوں میں آتے، وہ اکثر جمعیت ہی کے دست و بازو بنتے تھے۔ یہ منجھے اور تربیت یافتہ لوگ جمعیت کا بڑا سرمایہ ثابت ہوتے تھے، کیونکہ ان کو قرآن، حدیث اور دین کا علم بھی تھا۔

ایک دینی تحریک کے طور پر اگر دینی مدرسہ آپ کے ساتھ ہو، تو علمی، دینی اور سیاسی طور پر بھی اس سے ایک بڑی قوت بن سکتی ہے۔ چنانچہ ڈھاکہ شہر کے نزدیک ہی نارائن گنج روڈ پر کسی نے ہمیں تھوڑی سی مفت زمین دی۔ جماعت کے ایک رکن نے یہ تجویز دی کہ ''اس پر ہم ایک دینی مدرسہ بنا لیتے ہیں''۔ چونکہ یہ ایک اچھا خیال تھا، اس لیے میں نے اس منصوبے میں پوری دل چسپی لی، فنڈز فراہم کرنے میں مدد کی، اس کا ٹرسٹی بھی رہا اور سقوطِ مشرقی پاکستان تک شاید اس کا صدر بھی رہا۔ جب عمارت بنی تو وہ دینی مدرسہ بن گیا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے حادثے کے بعد ۱۹۸۷ء میں جب میں پہلی مرتبہ بنگلہ دیش گیا تو احباب مجھے خاص طور پر اس مدرسے میں لے گئے۔ جہاں ہر کلاس میں، میں نے دو دو چار چار منٹ بنگلہ زبان میں خطاب کیا۔ پھر مدرسے کے تمام طلبہ کا اجتماع ہوا۔ اس کے بعد تدریسی اسٹاف سے بھی خطاب کیا۔ معلوم ہوا کہ اس وقت یہاں تقریباً بارہ سو طالب علم ہیں۔ شہر میں جماعت کا کوئی بھی پروگرام ہو، یہ پورے بارہ سو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بارہ سو لوگ کہیں آ جائیں تو خود بخود ایک قابلِ ذکر جلسہ اور متاثر کن جلوس بن جاتا ہے۔

اس وقت بھی میرا اندازہ تھا کہ یہ بہت بڑی قوت ثابت ہوگی اور واقعی یہ سیاسی قوت بنی۔ بلکہ جب ۱۹۷۱ء کے دوران دفاعِ پاکستان کے لیے تحریک اسلامی نے حصہ لیا، تو عربی مدارس کے طلبہ نے اس میں بڑا زبردست کردار ادا کیا، بڑی قربانیاں دیں اور اس دور کے شہداء میں ان کے بڑے نام سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد اب کیا صورت ہے، میں نہیں جانتا کہ اس پر کیا گزری؟ لیکن مختلف لوگوں سے یہ سنا ہے کہ بعد میں جمعیت (اسلامی چھاترو شبر) اور جمعیت طلبہ عربیہ کے کچھ طلبہ کے درمیان کوئی تنظیمی جھگڑا ہوا۔ جس سے یہ خلیج بڑھ گئی۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ہاں کوئی تنظیمی جھگڑا پیدا ہو اور پھر وہ حل نہ ہو سکے۔ ممکن ہے کہ وہاں کسی اور بنیاد پر ہمارے ساتھیوں کی رائے بدل گئی ہو۔ (جیسے کہ جماعت میں اور پھر 'پاسبان' میں ۹۰-۱۹۹۴ء کے دوران، جگہ جگہ ایک رقیبانہ کش مکش رہی)۔ اس کے بعد سنا ہے، بالآخر جمعیت نے طلبہ عربیہ کو اپنے اندر ضم کرلیا اور جو ساتھ نہیں ملے وہ الگ سے منظّم ہوئے۔

میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا، کہ یہ صحیح ہوا یا وہ غلط ہوا، اس سے فائدہ ہوا یا نقصان پہنچا؟ اس وقت صرف یہ بات کر رہا ہوں کہ جب اور جس انداز سے میں نے جمعیت طلبہ عربیہ کو اٹھایا تھا، اس کا دستور بنایا تھا، اور پیچھے رہ کر چلایا تھا، وہ ایک مناسب صورت تھی۔ یہ ایسا کام تھا، جو اللہ کے فضل سے اس زمانے میں انجام پایا اور جس سے میری جذباتی وابستگی بھی تھی۔ اب اگر انھوں نے بالکل جمعیت ہی کا ایک اور ماڈل بنا دیا ہے، تو یہ کوئی موزوں اقدام نہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ یہ ایک تاثر ہے، کوئی سوچی سمجھی رائے نہیں ہے، اس لیے کہ تمام حقائق میرے سامنے نہیں ہیں۔

کچھ لباس کا ذکر

لباس پہننے کے معاملے میں کبھی شدت پسندی کا قائل نہیں رہا۔

چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ میں سوٹ پہنے ہوئے کمپنی کی کسی میٹنگ سے اُٹھ کر، یا اپنے دفتر سے سیدھا جماعت کے دفتر آجاتا تھا۔ ساتھی میرے اس مغربی لباس کو برداشت کرتے

تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے مجھے اس سے ایک مختلف رپورٹ ملی تھی۔ جمعیت کے زمانے میں خواجہ محبوب الٰہی صاحب اور فیاض الدین صاحب دورے پر گئے۔ انھوں نے لنگی باندھی، اور ٹوپی لگائی، وگرنہ لوگ بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ میں سوٹ بھی پہنتا تھا اور بنگالی کُرتا پاجامہ بھی زیب تن کرتا تھا۔ مغربی لباس میں نماز کی امامت بھی کی، لیکن پھر جب پاکستان گیا، تو یہ سوچ لیا تھا کہ اب سوٹ نہیں پہننا۔

مشرقی پاکستان میں میرا خیال تھا کہ اب اگر میں بھی کُرتا پہن لوں اور مخصوص وضع بنا لوں تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اس کے بعد جو بات کروں گا، لوگ کہیں گے کہ اسے بھی بس وہی بات کرنا ہے، جو مولوی صاحب کو کرنا چاہیے۔ لیکن جب میں سوٹ پہن کر تقریر کرتا ہوں۔ اسلام، خدا اور آخرت کی بات کرتا ہوں تو لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے تو پھر یہ اپنی وضع کیوں بدلوں۔ حکمتِ دعوت بھی یہی ہے کہ اس ماحول میں ایسا کروں۔ اسی طرح اگر بعد میں بھی، پاکستان میں سوٹ پہن رہا ہوتا تو شاید زیادہ موزوں ہوتا۔

میری بیوی کے پھوپھی زاد بھائی نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ ''جماعت کا امیج بدلنے کی ضرورت ہے''۔ میں نے کہا: ''امیج بدلنے کے لیے کیا کریں''۔ کہنے لگے: ''میرا خیال ہے کارکنوں کو پتلون پہنوا دیں، تو عام لوگوں کے ذہن میں یہ تاثر بن جائے گا کہ فکر کے اعتبار سے قدیم اور پختہ کار ہونے کے باوجود، یہ ماڈرن بھی ہیں''۔ میں نے کہا: ''ہاں میں آپ کی بات رد نہیں کرتا، یہ بالکل بے وزن نہیں ہے''۔ بہرحال ڈھاکہ جماعت کے مزاج کو چاہے 'اخوان المسلمون' کا مزاج کہا جائے یا 'تبلیغی جماعت' کا کہا جائے یا قرآن وحدیث سے ماخوذ کہا جائے، لیکن اب تک اس کے اثرات موجود ہیں۔

مشرقی پاکستان کا سیاسی منظر

۱۹۶۷ء میں شیخ مجیب الرحمٰن اپنا 'چھے نکاتی پروگرام' بہت تیزی سے آگے بڑھا رہے تھے۔ یہ پروگرام مشرقی پاکستان کا مقبول ترین نعرہ بنتا جا رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی پاکستان والوں کے ساتھ واقعی بے انصافیاں ہوئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مغربی پاکستان میں کیا صورت تھی، تاہم مشرقی پاکستان جماعت ان بے انصافیوں کے خلاف اور ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی برابر مہم چلا رہی تھی۔ اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، کہ بنگالی ہم وطنوں کے دانستہ طور پر حقوق سلب کیے گئے، اور ان کے سیاسی مقام و مرتبے کو تسلیم کرنے سے جان بوجھ کر انکار کیا گیا۔ بلاشبہہ وہ ایک پس ماندہ حصہ تھا لیکن ایک نئی مملکت کے حصول کے لیے انھوں نے متحد ہو کر ووٹ دیا تھا۔ اس میں جہاں ایمان و اعتقاد کے حوالے سے اسلام کی کشش اور اسلام کی منزل ان کے سامنے تھی، وہیں اپنی سماجی اور معاشی حالت زار کے سدھار کا ہدف بھی ان کے سامنے تھا۔ سلہٹ کا ریفرنڈم ہو یا پہلی دستور یہ میں اپنی نشستوں پر غیر بنگالی مسلمان بھائیوں کی نام زدگی، یہ چیزیں ان کے اسلامی جذبۂ اخوت، ایثار اور یک جہتی کی علامت تھیں۔

مغربی پاکستان کی سول اور فوجی بیورو کریسی نے ان لوگوں کی حق تلفی کی تھی، انھیں بے نقاب کرنے کے لیے اور ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں کے خلاف جماعت اسلامی نے بھرپور تنقید بھی کی۔ پروفیسر غلام اعظم صاحب نے اس کے مقابلے میں ایک کتابچہ بھی لکھا اور مدلل تقریریں بھی کیں، جس میں مشرقی پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی استحصال سے بچنے کے لیے متبادل آٹھ نکات پیش کیے۔ ظاہر ہے ہماری آواز تو نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ ہر طرف عوامی لیگ کا شُہرہ تھا۔

اسی زمانے میں، ایوب حکومت نے شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ان پر مشہور 'اگرتلہ سازش کیس' بھی قائم کیا تھا۔ اس کیس نے عجیب و غریب رخ اختیار کیا۔ کیس کے بارے میں مصدقہ اطلاعات تو میرے علم میں نہیں ہیں، البتہ مبینہ اطلاعات پر کوئی بات یقین سے کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ممکن ہے واقعی شیخ مجیب نے سازش کی ہو، اور وہ مجرم بھی ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے سازش کی تھی یا نہیں کی تھی۔ لیکن

یہ ضرور سمجھتا ہوں، کہ اس طرح الزام لگا کر یک طرفہ پروپیگنڈہ کرنا اسلام کے مسلمہ اصولِ انصاف کے خلاف ہے۔ بلکہ عام طے شدہ اصولوں کے بھی منافی ہے۔ افسوس کہ سب ہی اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں امریکا نے جو یہ کہا ہے، کہ ''وہ ایران پر حملہ کرے گا کہ ایران نے سعودی عرب میں دھما کا (جون ۹۶ء) کیا ہے۔ اکانومسٹ، لندن نے لکھا ہے کہ ''اتنے بڑے اقدام کے لیے مضبوط شہادت چاہیے۔ اگر آپ کے پاس ایسی شہادت موجود نہیں ہے، مگر اس کے باوجود آپ اقدام کرنے چلے ہیں، تو سمجھ لیں کہ یہ چیز ان تمام بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، جن کے نام پر ہم دہشت گردی کی مخالفت کرتے ہیں''۔ اکانومسٹ نے بھی یہ موقف اس لیے اختیار کیا، کہ اس وقت یورپ کا یہ نقطۂ نظر ہے، ورنہ آج کل ہی دوسرے موقعوں پر تو وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں، جیسے فرانس میں اسکارف باندھنے والی مسلمان بچیوں کو پابندیوں اور تعصب کا نشانہ بنانا، الجیریا میں اسلامک فرنٹ (FIS) کی جمہوری کامیابی کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کے لیڈروں اور کارکنوں کو قتل کرنا، مصر میں 'الاخوان المسلمون' اور پاکستان میں جماعت اسلامی کی مخالفت وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی مخالفین پر الزام

میں اس بات کا سختی سے قائل ہوں کہ سیاست میں کسی پر اس حد تک جا کر الزام نہیں لگانا چاہیے، کہ جو ثبوت کے بغیر اس کے کردار پر چسپاں ہوتا ہو۔ کیونکہ یہ دین کا ایک بڑا بنیادی اصول ہے۔ اسلام میں احتیاط تو اس قدر ہے، کہ آدمی اگر اپنی آنکھ سے کسی کو زنا کرتے دیکھتا ہے، تو اس بات کو کہیں اکیلا بیان بھی نہیں کرسکتا، جب تک تین گواہ اور نہ لے کر آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا مزاج کیا ہے۔ وہی آدمی کسی پر الزام لگا سکتا ہے، جو ثابت کرسکتا ہو۔ محض اندازوں سے کسی کے بارے میں حتمی فیصلہ دے دینا بالکل غلط بات ہے۔

بدقسمتی سے ہماری سیاست اس اصول سے بالکل عاری ہے۔ اگرچہ میں تو ایسا نہیں

کرتا، لیکن کچھ لوگ برملا بے نظیر بھٹو وغیرہ کے خلاف ملک کو توڑنے اور غداری کرنے کا الزام لگاتے ہیں، مجھے اس رویہ سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے، یا کرنے جارہے ہو جس سے ملک ٹوٹ سکتا ہے لیکن یہ کہ ''تم دانستہ طور پر توڑنے کے لیے یہ کام کر رہے ہو''۔ ایک مختلف بات ہے۔ ممکن ہے دوسرا آدمی دیانت داری سے یہ سمجھتے ہوئے کوئی کام کررہا ہو کہ اسی میں ملک کی بھلائی ہے۔ ممکن ہے وہ امریکا کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہو، یہ سمجھ کر کررہا ہو کہ کم ازکم آج کے دور میں امریکا سے بنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے بنا کر رکھنا چاہیے اور اس کی جو تھوڑی بہت بھی قیمت دینا پڑے، وہ ادا کرنا چاہیے۔ یقینی بات ہے کہ وہ دلائل رکھتا ہوگا یا پھر اس کی سوچ میں یہ بات ہوگی۔

میں ایسے لوگوں کے مداہنت پسندانہ رویے کا دفاع نہیں کر رہا، لیکن بہرحال اسلام کے اصولِ عدل کی بنا پر یہ میرا موقف رہا ہے، کہ ہمیں کسی کے بارے میں واضح، متعین اور حتمی الفاظ میں فتویٰ کا سا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے، تاآنکہ کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ میں نہ ہو۔

مولانا مودودی کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہا ہے، اکثر اس کا حوالہ دیتا ہوں، اور اپنے طور پر اس کی پابندی بھی کرتا ہوں۔ حسین شہید سہروردی صاحب جنھیں میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا وزیراعظم دیکھنا چاہتا تھا، مگر وہ کہیں دوسری طرف چلے گئے اور لیاقت علی خاں صاحب سے ان کی مخالفت ہوگئی۔ پھر جب وہ پاکستان آئے تو لیاقت علی خاں صاحب نے ان کے خلاف تقریر کرتے ہوئے ان کو غدّار کہا۔ جب انھیں غدّار کہا تو اس وقت مولانا مودودی نے اس پر برملا احتجاج کیا اور کہا کہ ''غداری کا الزام تو ایسا ہے کہ جیسے کسی شخص پر کوئی آدمی بدکاری کا الزام لگا دے، بلکہ میرے نزدیک ملک وقوم کے ساتھ بے وفائی اس سے بھی سخت ہے۔ جب تک ثبوت نہ ہو، یہ گالی دینا سیاست میں مناسب نہیں —— '' کاش، لوگ سیاست میں اس اصول کی پابندی کررہے ہوتے۔ یہی بات میرے ذہن پر نقش ہے، کہ ملک سے بے وفائی کتنا بڑا الزام ہے؟ مولانا محترم کے جملے سے یہ اصول دل پر

نقش ہوا۔

۱۹۶۴ء کے پہلے تین مہینوں کے دوران جب میں ڈھاکہ جیل میں تھا، جیلر نے میرے پاس آ کر کہا تھا کہ آپ انجینیر ہیں اور ایک اچھی کمپنی میں عہدے دار ہیں، معزز آدمی ہیں، اس لیے اگر آپ معافی مانگ لیں اور ملک کے خلاف کام نہ کرنے کا وعدہ کریں تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے''۔ میں نے کہا: ''آپ جو یہ کہہ رہے کہ میں ملک کے خلاف کام نہ کرنے کا وعدہ کرلوں۔ یہ بات تو ایسے ہی ہے جیسے کسی سے یہ کہا جائے، کیا تم اپنی بیوی کو نہیں مارو گے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں یعنی میں نہیں ماروں گا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے واقعی میں مارتا تھا۔ آپ کی اس بات کے اندر تو جرم کا اعتراف پوشیدہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی آدمی ملک وقوم کے خلاف کام کرے اور ملک سے بے وفائی کرے، تو یہ جرم بدکاری سے بھی بڑا اور گھناؤنا جرم ہے''۔ جواب سن کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔

شیخ مجیب پر 'اگرتلہ سازش کیس' کے حوالے سے میرا تاثر یہ ہے کہ جبر وتشدد کی جو بھی کارروائیاں ہوتی ہیں، وہ عموماً منفی اثرات کو بڑھاتی ہیں، انھیں گھٹاتی نہیں اور وہاں پر بھی ایسا ہی ہوا۔ 'اگرتلہ سازش کیس' میں حکومت یعنی استغاثہ کے گواہ پھر گئے اور حکومت کیس ثابت نہیں کرسکی۔

مسٹر بھٹو کی آمد

۱۹۶۷ء کے آخر میں ایوب حکومت کے سابق وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو بھی سیاسی میدان میں اُتر چکے تھے۔ اگرچہ وہ خود جاگیردارانہ اور امیرانہ ٹھاٹ باٹھ کے مالک تھے، تاہم مغربی پاکستان کے سوشلسٹ عناصر کے ایک حصے کو اپنے ساتھ ملانے میں وہ کامیاب ہوگئے تھے۔ ایوب حکومت کی غیر مقبولیت میں مہنگائی کا عنصر غالب اہمیت رکھتا تھا، اور دوسرا یہ کہ بھارت مخالف جذبات کو بھٹو صاحب نے ذاتی اقتدار کے حصول کے لیے بطور ایندھن استعمال کیا۔ اس ضمن میں معاہدہ تاشقند (جنوری ۶۶ء) کے بارے میں وہ یہ کہتے رہے کہ ''ایوب خان نے بھارت سے کوئی خفیہ معاہدہ کیا ہے، میں وہ بتاؤں گا'' اس قسم کی

باتوں سے تجسّس کا جو جذبہ اُبھرا انھوں نے بڑی چالاکی سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

سوشلسٹ تحریک سے مایوس اور قیادت سے بے زار نوجوانوں، دانش وروں اور مزدوروں کو بھٹو صاحب کی شکل میں گویا زبان مل گئی۔ ۶۸ء کے آخر میں، ایوب حکومت کے خلاف مغربی پاکستان میں اور خاص طور پر پنجاب کے بڑے شہروں میں زبردست ہلچل پیدا ہو چکی تھی۔

جماعت میں فیصلہ سازی: ایک تجویز

۱۹۶۸ء میں مشرقی پاکستان کے منظر کو دیکھتے ہوئے کچھ چیزیں نمایاں طور پر میرے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید اب پاکستان بچانے کی کوئی صورت نہ ہو۔ مشرقی پاکستان کے ساتھ روا رکھی جانے والی ہر قسم کی سیاسی و معاشی زیادتیوں کے باوجود، میں ابھی تک مایوس اور نا اُمید نہیں ہوا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر اب بھی سنبھل کر غلطیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش شروع کر دی جائے، تو پاکستان کو بچایا جاسکتا ہے۔ اس بات پر بھی پختہ یقین رکھتا تھا، کہ بچانے کی صورت جو کچھ بھی ہوگی وہ صرف سیاسی حل سے ممکن ہوگی۔ اسی لیے میں 'پاکستان تحریک جمہوریت' اور 'جمہوری مجلس عمل' میں شرکت کو اہمیت دیتا تھا اور عوامی لیگ والوں سے تعلقاتِ کار میں احترام سے بات کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ اسی طرح خود 'جماعت اسلامی' کے اندر بھی سمجھتا تھا، کہ مشرقی پاکستان کی 'جماعت اسلامی' کو پالیسی سازی میں زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ انھیں برابری کی سطح پر یا زیادہ حصہ دینے کا میں پُرجوش حامی اور اس کا وکیل بھی تھا۔

اسی زمانے میں ایک دفعہ مولانا مودودی نے مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں فرمایا تھا: ''مراد صاحب 'نوبنگالی' ہیں۔ جس طرح 'نومسلم' مسلمان ہو کر اسلام کی زبردست حمایت کرتا ہے اور اس پر نسلی مسلمانوں سے زیادہ عمل کرتا ہے، اسی طرح مراد صاحب تو 'نوبنگالی' ہیں'' ـــــ اسی وجہ سے سب بنگالی رفقا میری طرف دیکھتے تھے اور بڑی توقع رکھتے تھے۔

ان کے نزدیک میری حیثیت ممتاز تھی کہ اس معاملے میں حقائق پر مبنی موقف کا علم بردار تھا۔ یہ کوئی تعلّی کی بات نہیں، حق پسندی اور انصاف دوستی میرے مزاج میں رچی بسی ہے، یہ کوئی آج کی پیداوار نہیں ہے۔ نہ یہ وہاں سے نکلنے کے بعد یا مغرب میں آنے کے بعد آئی ہے، بلکہ یہ حس بچپن سے پائی جاتی تھی، جو بعد میں مختلف مشاہدات سے بڑھتی گئی ہے۔

اس زمانے میں ساری ملک گیر سیاسی پارٹیوں اور خود جماعت کے اندر، مرکزی اداروں اور عہدے داروں میں، مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان 'نیابتی مساوات' (parity) ایک اہم مسئلہ تھا۔ جماعت کی مرکزی شوریٰ کے پچاس ارکان میں، پانچ یا چھے ارکان مشرقی پاکستان سے اور باقی سب مغربی پاکستان سے ہوا کرتے تھے۔ جماعت کے مرکزی امیر اور سیکرٹری جنرل بھی بنگالی نہیں تھے۔ اس لحاظ سے جماعت کے اندر بھی پورا پلڑا مغربی پاکستان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ میں نے اس زمانے میں تحریری طور پر تجویز دی تھی، (پتہ نہیں وہ تحریر کہیں محفوظ ہے یا نہیں)۔ اس تجویز میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان مساوات اور امیج (تاثر) کا مسئلہ تھا۔

جماعت کی ۵۰ آدمیوں پر مشتمل مرکزی مجلس شوریٰ میں شرکت سے مجھے احساس ہوتا تھا، کہ اس مرکزی فورم میں مشرقی پاکستان کے بارے میں پالیسی معاملات پر جن معلومات اور حقائق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بحث اور گفتگو ہونی چاہیے، ویسے نہیں ہوتی۔ بلکہ میں نے یہ بھی محسوس کیا، کہ جماعت کے پالیسی ساز اداروں کو صحیح معنوں میں اس مقصد کے لیے وقت ہی نہیں ملتا، کہ پالیسی اصولوں پر، تحریک کے مسائل پر، تحریک کے vision پر، تحریک کے مستقبل پر، تحریک کے رخ اور رواں بہاؤ پر غور کر سکیں۔ بلکہ اس کے برعکس چھوٹے چھوٹے مسائل، روایتی کارکردگی رپورٹوں اور انتظامی معاملات وغیرہ پر بڑی سے بڑی اور اعلیٰ سے اعلیٰ میٹنگ ہو جاتی ہے۔ اس طرح شوریٰ کے وقت کا نوے پچانوے فی صد حصہ انھی چیزوں میں صَرف ہو جاتا ہے (بالکل یہی تاثر اب اور آج بھی ہے)۔

میرے خیال میں اب جماعت کے کام میں اس قدر پھیلاؤ آ گیا ہے، کہ جہاں مرکزی اور ذیلی سطح پر نئے سرے سے تقسیمِ کار ہونی چاہیے۔ مرکز جماعت صرف پالیسی کا تعین کرے، جماعت کے رُخ کو درست رکھے، جماعت کے مزاج کو راست بنائے اور کارکنوں کو خوفِ خدا، للّٰہیت، انقلابیت، احترامِ آدمیت، اخلاق اور انسانیت کے اعلیٰ اور لطیف جذبوں سے معمور کرے اور انھیں اسی سانچے میں ڈھالے، جب کہ ساری منصوبہ سازی، روزمرہ کے کام، دعوتی و تنظیمی معاملات جیسے تمام امور نیچے مقامی جماعتوں پر چھوڑ دیے جائیں۔

اس وقت میں نے یہ تجویز پیش کی تھی، کہ مرکزی طور پر ایک اعلیٰ ترین پالیسی ساز ادارہ قائم کیا جائے۔ وہ بارہ سے لے کر بیس آدمیوں پر مشتمل ہو۔ اس ادارے کے اندر مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابتی مساوات ہو۔ اگر سولہ یا بیس آدمی رکھنے ہوں تو ہم مشرقی پاکستان سے ایسے آٹھ، دس آدمی دے سکتے ہیں، جو اس اہلیت اور صلاحیت کے حامل ہیں، کہ مرکزی سطح پہ مل بیٹھ کر جماعت کی باگ ڈور سنبھال کر اس کا رخ متعین کر سکیں اور اس کو چلا سکیں۔ یہ ادارہ صرف پالیسی سازی کا کام کرے۔ اس کے علاوہ یہ دیگر چیزوں میں اپنا وقت صَرف نہ کرے۔ یہ ادارہ منتخب افراد پر مشتمل ہو، اس کو 'مجلس عاملہ' کہا جائے۔

اس ادارے کی معاونت کے لیے کچھ اسٹینڈنگ کمیٹیاں ہوں، مثلاً: خارجہ پالیسی، صوبائی خودمختاری، معاشی پالیسی، زرعی پالیسی اور تعلیمی پالیسی وغیرہ کے مسائل ہیں۔ وہ کمیٹیاں ان پر غوروفکر کریں۔ جماعت کے اپنے داخلی مسائل ہیں مثلاً: تربیت، تنظیم، دعوت، علمی کام، خدمتِ خلق، غیر مسلموں میں کام، مالیات، نشرواشاعت اور ابلاغِ عامہ، ان امور کے لیے اسٹینڈنگ کمیٹیاں ہوں، مگر ان کمیٹیوں میں مساوات برتنے کی ضرورت نہیں۔ ان کمیٹیوں کے لیے شوریٰ کا رکن ہونا ضروری نہ ہو، بلکہ جماعت کا رکن ہونا بھی ضروری نہ ہو۔ البتہ اس میں ایک رکن مرکزی مجلس شوریٰ کا ہو، اس کے ساتھ جماعت کے دو تین آدمی ایسے ہوں جو اس موضوع کے لحاظ سے میرٹ پر آتے ہوں۔ اس کے علاوہ

اگر جماعت کے حلقے سے باہر ایسے اہلِ علم، اہلِ دانش، اہلِ سیاست اور تجربہ کار افراد ہوں، تو ان کو بھی ان کمیٹیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

جب بھی اس ۲۰رکنی مجلس کا اجلاس ہونے والا ہو، جو مساوات کے اصول پر مرکزی سطح پر قائم ہے، تو اس سے دو یا تین دن پیش تر یہ اسٹینڈنگ کمیٹیاں ملیں اور اپنے موضوع کو زیر بحث لائیں اور حالات کا جائزہ لیں، آیندہ کے لیے خطوطِ کار اور تجاویز، قرارداد کی شکل میں مرتب کر کے مرکزی نظم کے حوالے کردیں۔ یہ مجلس بیٹھ کر بحث کرے اور ان کی منظوری دے۔ اس کے بعد امیر جماعت اور سیکرٹری جنرل کا کام ہے کہ وہ اس کو نافذ کریں اور اس کی رپورٹ مرکزی شوریٰ کو دیں۔ اس صورت میں ہم مجلس شوریٰ کے ارکان کی تعداد کو اور زیادہ وسیع کر دیتے۔ مطلب یہ کہ پچاس کے بجائے تین یا چار سو بھی کر دیتے۔ جس طرح ستمبر ۱۹۹۰ء میں مجلس نمایندگان بنی تھی۔ ہر دس یا بیس آدمیوں پر ایک نمایندہ ہوتا اور دو سال میں ایک یا سال بھر میں اس کا ایک بڑا اجلاس ہو جاتا۔

اس کا مقصد یہی ہوتا کہ یہ بڑا فورم کھلی بحث کے بعد ان پالیسیوں کی توثیق کر دیتا۔ یوں مزاج میں ہم آہنگی اور سوچ اور عمل میں یگانگت پیدا ہوتی۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ نسبتاً بڑی ٹیم قیادت اور راہ نمائی کے لیے تیار ہوتی۔ پھر ہم اس جنریشن گیپ سے بھی بڑی حد تک بچ جاتے، جو بہرحال ہر تحریک کے راستے میں آتا، اور اسے نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ تجویز میں نے 'شیخ چلّی' کے خواب کی مانند دی تھی۔ اب بھی سوچتا ہوں کہ اگر ہم اسے اختیار کر لیتے تو یہ کہیں بہتر نظام ہوتا۔ لیکن تجویز دیتے وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس چلتے دھارے میں تبدیلی کرنا آسان کام نہیں ہے۔ میں آج بھی اسے جماعت میں متعارف کرانے میں خیر اور بہتری کے امکانات دیکھتا ہوں۔

مشرقی پاکستان، سیاسی تناظر میں

بنگال سے تحریکِ پاکستان کے معتمد علیہ لیڈر حسین شہید سہروردی تھے۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ بنگال تقسیم نہ ہونے پائے۔ سہروردی صاحب کے بقول وہ قائداعظم کے

ایما سے یہ بات کیا کرتے تھے۔ یہ تحقیق کرنا میرا موضوع نہیں ہے، اور نہ میری عادت ہے کہ جن معاملات کی اہمیت ہماری فکر یا سوچ کے لیے مفید نہ ہو، خواہ مخواہ ان کی تحقیق میں کیوں پڑوں؟ لیکن بعد میں قائداعظم نے سہروردی صاحب کو disown (مسترد) کر دیا۔ اب یہ قائداعظم کی شخصیت کا وزن تھا کہ خواجہ ناظم الدین مشرقی پاکستان کے وزیراعلیٰ بن گئے۔

خواجہ ناظم الدین صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۴ء میں اس وقت ہوئی، جب کہ ان کی دعوت پر، انھی کے گھر سیاسی لیڈروں کا اجتماع ہوا تھا۔ جہاں 'متحدہ حزبِ اختلاف' کی تنظیم وجود میں آئی تھی۔ وہ ایک شریف، نیک نفس اور سمجھ دار انسان تھے۔ میرے خیال میں وہ کوئی ایسے گاؤدی اور بے وقوف انسان نہیں تھے، جیسا کہ عموماً مغربی پاکستان کے سیاست دان اور صحافی لوگ انھیں ظاہر کرتے رہے ہیں۔

پہلی گفتگو میں انھوں نے مجھے بڑی دل چسپ بات سنائی کہ ایوب خان نے کہا ہے: ''جب ناظم الدین رخصت ہوئے تو فائلوں کا ایک ڈھیر چھوڑ کر گئے تھے''۔ حالانکہ میں تو صرف تین فائلیں چھوڑ کر آیا تھا۔ ایک فائل اس وقت کے کمانڈر انچیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کی تھی۔ دوسری فائل اس وقت کے کمانڈر انچیف کی تنخواہ اور اس کی مراعات میں اضافے کی تھی۔ تیسری بھی کچھ ایسی ہی تھی''۔ اس طرح خواجہ صاحب نے ہوشیاری اور سمجھ داری سے ایوب خان کے اعتراض کا جواب دے دیا۔

ان کی شکل میں بنگال سے گیا ہوا آدمی، مغربی پاکستان اور کراچی میں بیٹھ کر وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری سنبھال رہا تھا۔ میرے خیال میں ایسے فرد کے اردگرد سازشوں کا جو جال خصوصاً پنجاب کے سیاسی لیڈروں اور بیوروکریٹس کی طرف سے پھیلایا گیا تھا، اس کے اندر تو کوئی ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی نہیں چل سکتا تھا، جب کہ فوج بھی سیاست میں مداخلت کرنے لگی تھی اور فوج کی یہ مداخلت دراصل پورے مغربی پاکستان کی مداخلت تھی۔ اس لیے کہ فوج میں ۹۵ فی صد لوگ مغربی پاکستان کے تھے۔ ان میں پنجابی، اُردو بولنے والے

اور پٹھان شامل تھے۔

بنگالی کو قومی زبان بنانے کے مسئلے کو حکمت اور تدبر کے ساتھ حل کیا جا سکتا تھا۔ بار بار اس بات کا اعلان کہ ''نہیں، اُردو ہی سرکاری زبان ہوگی'' یہ ایک بے جا اصرار تھا۔ خاص طور پر بغیر کوئی ایسا قدم اٹھائے یا کوئی بھلی سی تدبیر کیے بغیر کہ، جس سے اُردو واقعی سرکاری زبان بنتی، ایسا اعلان ایک بچگانہ مذاق تھا۔ یہ چال کوئی اس وقت ہی نہیں چلی گئی ہے، بلکہ آج تقریباً نصف صدی گزرنے تک یہی حال ہے۔ اُردو کی حمایت میں سارے دعوؤں اور اعلانات کے باوجود آج بھی اُردو کو اس کا مقام نہیں مل سکا۔ دراصل یہ کبھی اہلِ اقتدار کے پیشِ نظر رہا ہی نہیں ہے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد خواہ مخواہ ایک کش مکش مول لینے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ عارضی طور پر اگر بنگالی اور اُردو زبانوں کو تسلیم کر لیا جاتا اور دونوں کے فروغ کی کوشش کی جاتی، یا پھر بھارت کی طرح کچھ عرصے کے لیے انگریزی کو ہی قبول کر لیا جاتا (جو آج ۵۰ سال کے بعد بھی اسی طرح حکمران ہے) تو کم سے کم ملک میں افتراق یا انتشار کی جڑ گہری نہ ہوتی۔ لیکن اُردو نافذ کرنے کے بہ تکرار بیانات کے جواب میں بنگالی زبان کی تحریک اُٹھی، اسی بہانے انتشار کی جنگ بڑھی، وہاں گولی چلی، شہدائے بنگلہ زبان کا مزار بنا اور جذباتی کیفیت پیدا ہوئی، جس سے تفریق کی ایک مستقل بنا پڑ گئی۔

پاکستان ایک وفاق ہے اور وفاق میں صوبائی خودمختاری کا اصول مسلمہ ہے۔ لیکن فی الواقع پاکستان میں صوبوں کو کبھی بھی کم سے کم خودمختاری بھی نہیں ملی، جو بہرحال ان کو ملنا چاہیے تھی اور جس سے پاکستان کی سالمیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ وہاں بظاہر ایسا ہی محسوس ہوتا تھا، کہ مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کی حکومت ہے۔ بنگال وہ جگہ تھی، جہاں سے وہ سارے غیر بنگالی لوگ مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے، جو پنجاب، سندھ، سرحد وغیرہ میں سے منتخب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے نتیجے میں دستور ساز اسمبلی میں بنگالی، جو ملک کی آبادی میں اکثریت میں تھے، وہ اپنی وسعت قلبی کے باعث

روزِ اوّل سے ایک اقلیت بن گئے۔ اگر ہم ہندو نمایندوں کی نفی کر دیں تو پھر بنگالیوں کی یہ تعداد بالکل ہی محدود تھی۔ اسی کی بنیاد پر پاکستان کا ایک سیاسی نظام بننا تھا۔

میں اس بات کو ۱۹۵۰ء سے ۵۲ء کے زمانے میں بھی محسوس کرتا تھا، کہ مغربی پاکستان میں بنگالیوں پر کھلے دل کے ساتھ اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔ بنگالیوں کی حب الوطنی اور ان کی صلاحیت پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔ خاص طور پر یوپی اور بہار سے جو لوگ پاکستان آئے تھے، وہ اپنے اندر ایک احساسِ برتری اور احساسِ تفاخر لے کر آئے تھے۔ اسی طرح پنجابی بھی اپنے احساسِ برتری میں ہرگز ان سے پیچھے نہیں تھے۔ میں سب پنجابیوں یا سب اُردو بولنے والوں کی بات نہیں کر رہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بالعموم بھارت سے آنے والے ان مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر یہ چیز پائی جاتی تھی۔

نسلی تفاخر کی ایک مثال

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب ایک دل چسپ واقعہ سنایا کرتے تھے، جو مشرقی پاکستان کے ساتھ براہِ راست متعلق تو نہیں تھا، لیکن اس ذہن کی نشان دہی ضرور کرتا ہے، جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ واقعہ صوبہ سندھ سے تعلق رکھتا ہے۔ آج صوبہ سندھ میں جو مسائل ہیں بڑی حد تک ان کی جڑ اس کے اندر موجود ہے۔ مشرقی پاکستان میں جو کچھ پیش آیا اس کی بھی جڑ اسی احساسِ تفاخر کے اندر موجود تھی۔

مولانا انصاری صاحب نے بتایا کہ ''میں سندھ مسلم لیگ کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہندستان سے بہت بڑی تعداد میں مہاجر چلے آ رہے تھے۔ جن کو صرف سندھ نے کھلی بانہوں کے ساتھ جگہ دی تھی، اور سندھ ہی نے انھیں آباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے سندھ میں وہ جگہ پا رہے تھے۔ اہلِ سندھ ان کی آبادکاری کا بندوبست کر رہے تھے۔ مکان، الاٹمنٹ، جگہیں فراہم کرنے کے لیے بے چارے سندھی بھائی پوری محبت، پوری محنت اور بڑے انہماک سے اس کام میں لگے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ دفتر میں اور بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مہاجر ہمارے پاس دفتر میں آئے اور آتے ہی انھوں نے بے دھڑک کہا:

"کہاں لاکر ہم کو ڈال دیا ہے، نہ ان لوگوں میں کوئی تہذیب، نہ تمدن، نہ بولنے کی تمیز، نہ کھانے کا سلیقہ، نہ پہننے کا ڈھنگ اور نہ زبان"—— میرے پاس سندھ مسلم لیگ کے جو نہایت وضع دار، مشفق اور خدا ترس عہدے دار بیٹھے تھے، ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا، اور بالکل صحیح ہوا"۔

انصاری صاحب نے جو واقعہ سنایا، یہ کیفیت کم و بیش ہر جگہ تھی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس بداعتمادی کی جڑ بہت گہری تھی اور ہے۔ مشرقی پاکستان میں قیام کے پورے عرصے کے دوران میں یہ کیفیت محسوس کرتا رہا۔

پھر ۱۹۷۱ء میں جب فوج نے آپریشن شروع کیا تو یہ نفرت کھل کر سامنے آگئی۔ بنگالیوں کے بارے میں تاریخ سے پرانے پرانے استعماری نظریات نکالے یا گھڑے گئے اور لطیفوں کی صورت میں لوگوں میں چلائے گئے، کہ بنگالیوں میں کیا کیا خرابی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے بارے میں یہ جملے بڑی بے دردی سے استعمال ہوتے تھے: بنگالی بزدل ہوتا ہے، بنگالی بغل میں چھری رکھتا ہے، پیٹھ میں چھرا گھونپتا ہے، بنگالی دغاباز ہوتا ہے، بنگالی غدّار اور چور ہے—— یہ جملے مغربی پاکستان کے فوجی افسر، بیوروکریٹ، سرمایہ دار، پڑھے لکھے فرد وغیرہ کے لبوں پر تھے۔ جب ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع ہوئی تو میں مغربی پاکستان کا وہ فرد تھا، جو اس پر تڑپ رہا تھا، بلکہ خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس دوران کراچی آیا تو میں نے مسلم سجاد سے کہا تھا کہ "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں پر میں بالکل اکیلا فرد ہوں جو یہ موقف رکھتا ہے کہ بنگالیوں کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے اور انھیں دبانے کے لیے جو ہو رہا ہے، وہ غلط ہے"۔

وسائل کی تقسیم میں عدم توازن

مشرقی پاکستان نے وسائل کی تقسیم کے بارے میں جو اعتراضات کیے وہ غلط نہیں تھے۔ اس لیے کہ شروع میں تو پاکستان کے زرمبادلہ کا بڑا حصہ پٹ سن (jute) سے آتا تھا مگر جتنی صنعتیں اور جس قدر نئے کارخانے تھے، وہ مغربی پاکستان میں اور خاص طور پر

کراچی میں لگ رہے تھے۔ اسی طرح بجٹ کا تقریباً آدھا یا آدھے سے زیادہ حصہ دفاع پر لگ جاتا تھا۔ اس میں لوگ تنخواہیں لیتے تھے۔ اسلحہ خریدا جاتا تھا، یہ سب پیسہ مغربی پاکستان میں ہی لگتا تھا۔ پھر سرکاری ملازمین کی تنخواہیں، مرکزی پراجیکٹ اور منصوبے تھے۔ مشرقی پاکستان میں معاشی ترقی کا سوال ہر جگہ زیرِ بحث تھا۔

عبدالجبار صاحب مشرقی پاکستان کے محکمہ شاہرات و عمارات میں چیف انجینیر تھے۔ وہ بڑے سمجھ دار اور بڑے محبّ وطن انسان تھے۔ لیکن ساتھ ہی بنگالیوں کے ساتھ ناانصافی پر بڑے شاکی اور بنگالیوں کے حقوق کے بڑے علَم بردار تھے۔ مجھے ان کے دونوں رویوں میں کوئی تضاد نہیں ملتا تھا، کہ پاکستان سے محبت اور بنگال کے خلاف ناانصافی کی شکایت کو بے وجہ پاکستان دشمنی کے معانی پہنائے جائیں۔

ایک دفعہ عبدالجبار صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ کہنے لگے: ''کہنے کو دونوں صوبوں میں مساوات ہے۔ لیکن عملی صورتِ حال یہ ہے کہ مرکز کے کسی معاملے کو طے کرنے کے لیے جو کمیٹی بھی بنتی ہے، جو کوئی نہ کوئی پراجیکٹ منظور کرتی ہے، اس میں تین آدمی ہوتے ہیں۔ مساوات کے لحاظ سے اس میں ایک آدمی مشرقی پاکستان کا ہوتا ہے، ایک آدمی مغربی پاکستان کا ہوتا ہے اور ایک مرکز کا ہوتا ہے، لیکن ہمیشہ دو آدمی مغربی پاکستان ہی کے ہوتے ہیں اور ایک آدمی مشرقی پاکستان کا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مرکزی آدمی ہمیشہ مغربی پاکستان کا ہوتا ہے''۔ واقعی یہ ایک حقیقت تھی۔ میں نے اس پر غور کیا، تو بڑا وزن نظر آیا۔ اس لیے کہ اس وقت تک کم از کم مرکز میں سیکرٹری کی سطح پر کوئی بنگالی نہیں تھا۔ میں یہ ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۷ء کی بات کر رہا ہوں، اور ۶۸ء تک پاکستان کو بنے ۲۱ سال ہو چکے تھے۔

اس چیز کے دفاع میں عموماً یہ کہا جاتا کہ ''شروع میں ایسا ہی تھا۔ پہلے جو سی ایس پی آفیسرز آئے وہ پنجابی تھے یا پھر مہاجر۔ اور ظاہر ہے اس میں سنیارٹی ہے، اور ترقی کے مختلف طریقوں سے یہ اُوپر آئیں گے جس میں وقت لگے گا''۔ مگر یہ اس کا حقیقی جواب نہیں، جو اکیس برس گزرنے کے باوجود کسی بڑی تبدیلی کے آثار ظاہر کرنے میں ناکام تھا۔

اہلِ بنگال کی ذہانت پر شک

اس پر ایک دل چسپ بات یاد آئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ ۶۲ء، ۶۳ء کی بات ہے۔ وفاقی وزیر منظور قادر صاحب ایوب خان کے خاص آدمی تھے۔ انھیں ڈھاکہ یونی ورسٹی میں تقریر کے لیے بلایا گیا۔ انھوں نے یونی ورسٹی میں تقریر کی۔

وہاں لڑکوں نے سوال اٹھایا کہ ''مرکزی حکومت پورے ملک کی حکومت ہے، لیکن اس کے اندر پالیسی بنانے والا ایک بھی سینیر عہدے دار مشرقی پاکستان سے نہیں ہے''۔ منظور قادر صاحب نے یہی عذر پیش کیا کہ ''اس میں وقت لگے گا''۔

اس پر ایک لڑکے نے کھڑے ہوکر کہا کہ ''آخر قابلیت کی بنیاد پر لیٹرل انٹری (براہِ راست تقرری) بھی تو ہوسکتی ہے۔ آج آپ نہیں دیکھ رہے کہ امریکی صدر جان ایف کینیڈی کی انتظامیہ میں کئی کلیدی عہدے دار ایسے ہیں، جن کو کینیڈی نے کہیں یونی ورسٹیوں سے، کہیں تحقیقی اداروں سے، کہیں بزنس سے، کہیں بنکوں سے، کہیں موٹرساز کمپنی سے لاکر ان عہدوں پر بٹھا دیا ہے اور اپنی جگہ وہ کاروبارِ حکومت خوبی سے چلا رہے ہیں''۔ پھر اس لڑکے نے کہا: ''ڈاکٹر نورالہدیٰ صاحب اکنامکس کے پروفیسر ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا فنانس سیکرٹری ڈاکٹر نورالہدیٰ صاحب سے زیادہ قابل ہے؟ کیا یہ فنانس سیکرٹری نہیں بن سکتے؟'' منظور قادر صاحب کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

صحیح بات یہ ہے کہ حکومت اگر ان کی اپنی ہوتی، برابر کی ہوتی تو یقیناً یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ آدھی حکومت کے اندر اس کھنچاؤ کا سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ ایوب خان کا جو نظریۂ دفاع ہے، وہ تو میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ ایوب صاحب نے کہا تھا کہ ''مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا''۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کا کوئی مؤثر بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ جب اندرونی طور پر شورش ہوئی اور باہر سے بھارت نے حملہ کیا تو پاکستان اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔

صدر جنرل یحییٰ خان کے آنے کے بعد فصیح الدین شاید پہلے بنگالی سیکرٹری بنائے گئے تھے۔ یحییٰ خان ہی کے زمانے میں ذرا بے خوف ہوکر بنگالیوں کو فوج میں لینا شروع کیا گیا۔ تب قد کاٹھ اور جسم کی پابندیوں کو ہٹا کر ان کو ایک سطح پر لایا گیا۔

منظوری وہ کمیٹی کرتی تھی، جس میں دو آدمی مغربی پاکستان سے ہوتے تھے۔ ایوب خان نے خصوصاً ۶۵ء کے بعد بنگالیوں کو آگے بڑھانے کا عمل بہت تیز کیا، لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ پھر وہ اس بات کا بار بار احسان بھی جتاتے تھے۔

ایک دفعہ ایک بنگالی چیف انجینیر مجھ سے کہنے لگے کہ ''مراد صاحب، میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ ہندو نے ہمارے لوگوں کے دلوں میں اتنی جگہ کیوں بنائی ہے؟'' میں نے کہا: ''بتایئے''۔ کہنے لگے: ''مغربی پاکستان کے جو افسران یہاں پر آئے اور رہے، ان میں بہت سوں نے اچھے کام بھی کیے ہیں، لیکن وہ دلوں میں جگہ نہ بنا سکے۔ صدر ایوب خان نے یقیناً ترقیاتی کام کیے ہیں، جو اس سے پہلے کے جمہوری دور میں بھی نہیں ہوئے، لیکن اس کے باوجود لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں بن سکی ہے''۔

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: ''میں آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سناتا ہوں۔ ایک بوڑھی عورت تھی اور اس کے پاس لکڑی کا ایک گٹھا تھا۔ اس بڑھیا کے اندر گٹھا اٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ وہ جنگل کے راستے میں منتظر تھی کہ کوئی آدمی ملے، لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے اور اس کے گھر تک پہنچا دے۔ مغربی پاکستان کا ایک آدمی آیا جو پنجابی یا پٹھان تھا۔ اس نے کہا: ''کیا بات ہے بڑی بی؟'' ـــــ بڑی بی نے کہا: ''بیٹا یہ لکڑی کا گٹھا ہے، اسے گھر پر پہنچانا ہے''۔ اس پنجابی یا پٹھان نے گٹھا سر پر اٹھایا اور جا کر اس کے جھونپڑے کے صحن میں پھینک دیا۔ پھر کہا: ''بس بڑی بی ہوگیا کام'' اور چلا گیا۔ اسی طرح دوسرے روز پھر یہی مسئلہ درپیش ہوا۔ وہاں جنگل سے ایک ہندو گزرا۔ بڑی بی نے کہا کہ ''یہ گٹھا پہنچانا ہے''۔ کہنے لگا: ''اچھا اچھا اماں''۔ اس نے اماں کہہ کر خطاب کیا، لکڑی کا گٹھا کندھے پر رکھا، اسے لے جا کر اس کے گھر آرام سے رکھا۔ اس کے بعد ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا اور کہا کہ

"اماں کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ"۔ اماں نے اس کو دعائیں دیں اور دعاؤں کے بعد ایک چونی بھی اس کے حوالے کی"۔

کوئی کہہ سکتا ہے، کہ یہ تو صرف بیوقوف بنانے کی بات ہے لیکن میرے خیال میں یہ صرف بیوقوف بنانے والی بات نہیں ہے۔ بلکہ برتاؤ، رویہ اور اخلاق تو اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بڑی اہم اور فیصلہ کن چیز بن جاتی ہے۔

عدمِ اعتماد کا رویہ

یہ ٹھیک ہے کہ صدر ایوب خان نے ترقیاتی کام کیے، لیکن انھوں نے کُلی طور پر مشرقی پاکستان کو سیاسی اقتدار سے محروم کردیا۔ مشرقی پاکستان کے جتنے ممتاز اور عوام کے معتمد علیہ لیڈر تھے، ان سب کو انھوں نے سیاست کے عہدوں کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ ان کی جگہ ایسے افراد کو حاکم مقرر کیا جن کا لوگوں میں اثر نہیں تھا، اور پھر ان کے ذریعے انھوں نے زبردستی لوگوں میں اپنا اثر قائم کیا۔ ایوب خان کے اندر یقیناً بہت خوبیاں تھیں۔ انھوں نے بڑے کام بھی کیے۔ ان میں صلاحیت بھی تھی، شخصیت اور وجاہت بھی تھی۔ پاکستان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر وہ اس طرح حکومت کرتے جس طرح کہ کرنی چاہیے تھی۔

پھر مشرقی پاکستان اس مقام پہ پہنچ گیا جہاں وہ پاکستان سے علاحدگی پر سنجیدگی سے سوچ رہا تھا، یا اس کے لیے کوشش کر رہا تھا تو اس کی سب سے بڑی وجہ بھی صرف ایوب خان ہی نہیں تھے۔ ان سے بھی پہلے اس المیہ کے ذمہ دار نواب زادہ لیاقت علی خان تھے۔ اگر لیاقت علی خان اس ملک کو اسلام اور جمہوریت کی راہ پر ڈال دیتے، تو مجھے یقین ہے کہ ایوب خان کے اقتدار کا یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

ایوب خان اور فوج کو میں اس لیے بھی پاکستان کی شکست و ریخت کا ذمہ دار سمجھتا ہوں، کہ انھی کی آشیرباد سے ایک پنجابی گورنر جنرل غلام محمد نے ایک بنگالی وزیرِاعظم ناظم الدین کو برخاست کیا تھا۔ یہ پہلا بڑا سیاسی حادثہ تھا۔ میں اس وقت نام نہیں لے رہا، کیونکہ

نام اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایک پنجابی جو کہ سول سرونٹ تھا، اُٹھ کر گورنر جنرل بن گیا، اس کا کوئی سیاسی پس منظر نہیں تھا، وہ عوام کا منتخب کردہ نہیں تھا، تحریک پاکستان میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا، صرف پنجاب کے اور مغربی پاکستان کے سازشی عناصر کے بل پر اور فوجی سروسز کے زور پر اس عہدے پہ پہنچ گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف ایک سیاسی لیڈر تھا، جو شریف اور نیک نفس بنگالی تھا۔ کوئی گورنر جنرل انھیں برطرف کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا، اگر اس گورنر جنرل کی پشت پناہی فوج اور اس کا سپہ سالار نہ کر رہے ہوتے۔ اس لیے اس کی اصل ذمہ داری ایوب خان کے سر جاتی ہے۔ ۵۳ء میں پیش آنے والا یہ حادثہ ایسا تھا، جس کے نتیجے میں گاڑی پٹڑی سے ایسی اُتری کہ آج ۹۶ء تک واپس نہیں آسکی۔

پھر اگلے ہی سال انھوں نے اپنے نام زد وزیراعظم محمد علی بوگرا صاحب کو بھی برطرف کردیا اور دستور ساز اسمبلی بھی برخاست کردی، کیونکہ بنگالیوں کی قیادت میں اسمبلی نے ایک ایسی ترمیم پاس کردی تھی جس سے ان کے اختیارات محدود ہوگئے تھے اور یہ بات ان کے مزاج شاہی پر ناگوار گزری۔ لیکن اس کے پسِ پشت اصل بات یہ ہے کہ فوج کی بالادستی کے معنی مغربی پاکستان کی بالادستی کے تھے۔ اس لیے کہ فوج کے اندر مشرقی پاکستان کی کوئی نمایندگی نہیں تھی۔ اس وجہ سے سیاسی اقتدار کُلی طور پر فوج یعنی مغربی پاکستان کے پاس رہا۔

مشرقی پاکستان کو سیاسی اقتدار سے بالکل محرومی کا زخم برداشت کرنا پڑا اور صوبائی خودمختاری بھی نہیں ملی۔ افسرانِ اعلیٰ اور تمام عہدے دار اُوپر سے آتے تھے۔ صوبائی خودمختاری کے مسئلے پر میں اس وقت بات نہیں کر رہا۔ لیکن ایک مشترک سول سروس کا ہونا، ٹیکسوں کے سارے اختیارات کا مرکزی حکومت کے پاس ہونا اور صوبوں کو یہ اختیار تک بھی نہ ہونا، کہ ان کا چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کون بنے؟ بلکہ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی تک عوامی نمایندوں کی مرضی سے بالا بالا مقرر ہوتے اور تبدیل کیے جاتے تھے۔ یہ سب چیزیں صوبائی خودمختاری کے سراسر منافی تھیں۔

مضبوط مرکز کا غیر حقیقی نظریہ

اسی طرح بنگالی پر اعتماد اور بھروسا بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کو محبِّ وطن مانتے ہوئے طبیعت بوجھل ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ حب الوطنی کے لفظ پر صرف اُردو اور پنجابی بولنے والوں کی اجارہ داری ہے۔ یہ خیال راسخ تھا کہ ''مضبوط مرکز ہی مضبوط پاکستان کا ضامن ہے'' مگر اسی مضبوط مرکز کی تلاش میں یا اسی کی خاطر پاکستان دو ٹکڑے ہوگیا۔ ۶۸ء تک یہ کھچڑی خاصی پک چکی تھی۔ چھے نکات مشرقی پاکستان کے اندر بڑے مقبول ہو چکے تھے۔ مغربی پاکستان کی جانب سے ان نکات کے خلاف ساری مزاحمت بالکل ناکام ہو چکی تھی۔ قومی مفادات کی اس کش مکش میں مشرقی پاکستان کی اکثر شکایات جائز تھیں۔ وہ جو کچھ مانگ رہے تھے، منصفانہ تھا۔ میں اس وقت بھی یہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ چھے نکات میں ہے، اس کا بڑا حصہ انھیں دیا جاسکتا ہے۔ ۷۱ء تک پہنچتے پہنچتے تو میرا خیال یہ ہوگیا کہ تقریباً سب کچھ ہی دیا جاسکتا ہے۔ اگر لوگ ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو پھر زبردستی کوئی قوت ان کو ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ اور اگر ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو پھر کتنی ہی خودمختاری دے دی جائے، لوگ ساتھ رہیں گے، الگ نہیں ہوں گے۔

اکثر اوقات امریکا کی مثال میرے سامنے ہوتی تھی۔ وہاں پر کنفیڈریشن سے بات شروع ہوئی اور خود ہی ان ریاستوں نے فیڈریشن بنائی۔ فیڈریشن مضبوط ہوتے ہوتے اب اتنی مضبوط ہے کہ امریکا کا مرکز ایک بہت مضبوط مرکز ہے۔ لیکن امریکا کی ریاستوں کو بڑی خودمختاری بھی حاصل ہے۔ ٹیکس لگانے کا اپنا اختیار ہے، الیکشن وہ کراتے ہیں مرکزی حکومت نہیں کراتی ہے۔ قانون ان کا اپنا ہے، وہ قانون پاس کریں تو چلے گا، سوائے ان کے جو بین الریاستی معاملات سے متعلق ہوں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چیزیں ہیں جن میں ان کو خودمختاری حاصل ہے۔

پاکستان میں بھی یہ سب کچھ ہوسکتا تھا لیکن کچھ نہیں ہوا۔ البتہ اپنے طور پر یہاں کے لوگ اسی واہمے میں گرفتار رہے کہ ''مرکز مضبوط ہو رہا ہے'' حالانکہ وہ اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ

آخرکار ٹوٹ گیا۔ اسی طرح فضا ایوب خان کے خلاف بن چکی تھی۔ طالع آزما جنرل یحییٰ خان تاک میں تھے۔ ۶۸ء میں کسی وقت ایوب خان پر ہارٹ اٹیک ہوا جو خفیہ رکھا گیا۔ لیکن اس ہارٹ اٹیک نے ان کو تقریباً معطل کر دیا تھا۔ وہ ایک بیمار صدر تھے۔ اب جسمانی طور پر اور صحت کے لحاظ سے بھی ان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ پاکستان کو چلا سکیں۔ ہارٹ اٹیک ہی کے زمانے میں پاکستانی فوج کے سپہ سالار جنرل آغا محمد یحییٰ خان صبح شام چکر لگاتے تھے کہ یہ فیلڈ مارشل صاحب ختم ہوں تو وہ اقتدار سنبھالیں۔

اس لیے سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیہ کو پروان چڑھانے میں اگر میں دو آدمیوں کو single out کروں اور متعین کر کے بتاؤں تو اس المیے کی ابتدا کرنے والے نواب زادہ لیاقت علی خان تھے۔ اگرچہ میں ان کی بھی بڑی عزت کرتا ہوں۔ وہ قوم کے خیر خواہ اور سادہ مزاج انسان تھے۔ آج کے سیاست دانوں اور راہ نماؤں کے مقابلے میں وہ فرشتہ لگتے ہیں، ملک سے ان کو بہت محبت تھی، ان میں دیانت اور سادگی تھی۔ لیکن بہرحال انھوں نے جو سیاسی پالیسیاں اختیار کیں اور حکومت کو جس طرح چلایا، اس سے ملک بٹتا گیا۔ خود مغربی پاکستان میں بھی لیاقت علی خان صاحب نے پنجابی اور غیر پنجابی کا سوال خاصا آگے بڑھایا اور بنگال کو بھی کچھ نہیں دیا۔ دوسرے فرد جنرل محمد ایوب خان تھے، جنھوں نے ۵۳ء سے ایک ایک کر کے وہ سارے اقدامات کیے جن کے نتیجے میں فوج کو سیاست میں مکمل برتری حاصل ہوگئی۔ فوج کی یہی سیاسی برتری مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا ایک بڑا سبب بنی۔

پرنٹنگ پریس

مجھے شروع سے پریس میں دل چسپی رہی ہے۔ اسی لیے ڈھاکہ جماعت کے تحت ایک پریس بھی چلایا۔ جماعت سے تعلق کی وجہ سے نورالزمان صاحب کے لیے روزنامہ پاکستان آبزرور ڈھاکہ میں ملازمت برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ شوریٰ کے ممتاز رکن تھے۔ اخبار والوں کو ان پر بے جا اعتراض ہوتا تھا۔ آخرکار انھوں نے آبزرور کی ملازمت

چھوڑ دی اور ایک پریس لیا۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے پرنٹنگ پریس آپ لگائیں، لیکن پریس مشین لگانے میں سرمایہ ہمارا اور تنخواہ آپ کی ہوگی۔ پھر نفع میں آدھا حصہ آپ کا اور آدھا جماعت کا ہوگا''۔

مجھے یہ فارمولا پسند ہے کہ تنخواہ کے ساتھ نفع میں بھی حصہ ہو، تاکہ کارکن اس کو اپنی چیز سمجھے۔ انھوں نے پریس لگایا جہاں ہماری ڈھاکہ جماعت کی چیزیں اور عام لوگوں کی بھی مطبوعات چھپتی تھیں۔ اگرچہ اس میں کوئی قابلِ ذکر نفع تو نہیں ہوا، لیکن یہ ایک اچھا تجربہ تھا۔ ہمارے اس شوق کی بھی تکمیل ہوئی کہ اپنا پریس ہونا چاہیے، جہاں بلا روک ٹوک اور وقت بے وقت اپنی چیزیں چھاپ لیتے تھے۔ پیسوں کی بچت کے بجائے وقت کی یہ بچت واقعی بہت بڑا نفع تھا۔

اس میں بھی ایک دل چسپ بات ہوئی۔ اس زمانے میں اخبار اور رسالے کے لیے بھی ڈیکلریشن کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس ضمن میں پولیس وغیرہ کے چکر ہوتے تھے۔ پریس لگانے کے لیے بھی ڈیکلریشن کی ضرورت ہوتی تھی، اور یہ بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ میں نے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دی۔ اب پولیس کا چکر پڑا ہوا تھا۔ ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ، چار مہینہ، تنگ آ کر میں نے کہا کہ یہ تو بغیر کھلائے پلائے ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ بہت سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے؟ دفتر جمعیت کراچی کے لیے 'پگڑی' دینے میں 'غضِ بصر' کی مثال مجھے یاد تھی۔ اس وقت تک 'پگڑی' کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں تھا کہ یہ واقعی ناجائز اور حرام ہے یا مکروہ۔ مگر رشوت کے بارے میں تو کوئی ایسا ویسا ابہام بھی نہیں تھا۔ اس وقت تک اگرچہ سوچ میں ارتقاء بھی بہت گہرا نہیں تھا۔ البتہ عقلِ عام سے دلائل لے کر کام کر لیتا تھا۔

میں نے سوچا کہ اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے سخت نجس اور حرام چیزوں کی بقدرِ ضرورت اجازت دے رکھی ہے، اور یہ تو ظالمانہ، فاسقانہ اور خدا سے بغاوت پر مبنی نظام ہے کہ جس میں آدمی اپنا حق بھی حاصل نہیں کر سکتا، جب کہ یہاں پر میں کوئی اپنا حق نہیں

لے رہا تھا اور نہ اس پریس کا میں مالک تھا۔ بلکہ یہ ایک اجتماعی چیز تھی۔ جس کی راہ میں خواہ مخواہ قسم کی مہینوں پر پھیلی رکاوٹ تھی۔ اس رکاوٹ کو ہٹانے کے لیے میں نے اللہ سے دعا کر کے اقدام کرنے کا سوچا اور معاملے کو لے کر چلنے والے رفیق کو اجازت دے دی کہ ''راستہ نکال کر ڈیکلریشن لے لیجیے''۔ چنانچہ انھوں نے قدم اٹھایا، ڈیکلریشن لے لیے اور پریس لگ گیا۔ بعد میں، میں نے پڑھا کہ فقہا نے لکھا ہے: ''اپنا جائز حق لینے کے لیے اگر ضرورت پڑ جائے، اور کوئی فرد اس کی راہ میں بے جا رکاوٹ پیدا کرے تو اسے دُور کرنے کی اجازت ہے، لیکن کسی کا حق مارنے کے لیے اجازت نہیں ہے''۔

وہاں پر ایک اخبار Young Pakistan تھا، جسے عزیز احمد بلیمینی صاحب نکالتے تھے، اور وہ سخت پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''اس کی اشاعت کا انتظام جماعت کرے''۔ میں نے کہا: ''جماعت تو نہیں لے سکے گی، البتہ آپ ہی اس کو چلائیں، ہم آپ کی مدد کردیں گے''۔ یہ انگریزی میں غالباً ہفت روزہ تھا۔ میں نے نورالزماں صاحب سے کہا کہ آپ ایڈیٹر کے طور پر ان کی مدد کریں اور سب ایڈیٹنگ میں بھی ان کے ساتھ تعاون کرتے رہیں۔ چنانچہ ''ینگ پاکستان' نے خاصا اہم رول ادا کیا اور انگریزی میں ہماری بھرپور ترجمانی کی۔ ۱۹۷۱ء تک پریس کے لیے انگریزی میں بیانات زیادہ تر میں ہی لکھتا تھا۔ Young Pakistan سقوطِ مشرقی پاکستان تک نکلتا رہا۔ تحریک کے موقف اور کارکردگی کا یہ بڑا قیمتی ریکارڈ ہے ___ اس طرح صحافت اور پرنٹنگ کی داستان رقم ہوتی رہی۔

اخراج کا مسئلہ

۱۹۶۹ء میں زیادہ زور قومی سیاست پر تھا، لیکن اس کے باوجود دینی تربیت دینے اور دینی مزاج کو قائم رکھنے کے لیے کام پوری توجہ اور محنت سے برقرار رکھا گیا۔ ۱۹۶۹ء ہی کے دوران ہمیں ڈھاکہ میں ایک دوسرے صاحب کو قیم مقرر کرنا پڑا۔ ہمارے قیم شہر، نورالاسلام بھائی کو ذہنی عارضہ لاحق ہوگیا تھا اور ان کو علاج کے لیے ذمہ داری چھوڑنی پڑی۔

مجھے یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ ان کے ذہنی عارضے کا سبب ان کے معاشی مسائل تھے۔ یہ بات سخت تکلیف دہ ہے کہ اپنے محدود وسائل کے باعث فارغ کارکنان کو اتنا کم اعزازیہ دیتے ہیں، جس پر یہ خوددار لوگ بڑی تلخ معاشی اور سماجی زندگی بسر کرتے ہیں۔

بہر حال ڈھاکہ میں غلام سرور صاحب تھے۔ وہ اس زمانے میں مشرقی پاکستان جمعیت کے ناظم تھے، جب سید منور حسن بھائی، اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ ۱۹۶۶ء یا ۶۷ء کی بات ہوگی، کہ منور بھائی کو ان کے معاملات کی وجہ سے اختلاف ہوگیا۔ اس لیے منور بھائی نے جمعیت کی مرکزی شوریٰ کے مشورے سے ان کو جمعیت سے فارغ کر دیا تھا [متعلقہ احباب کے مطابق یہ امرِ واقعہ نہیں ہے، مرتب]۔ یہ بڑے فعال اور باصلاحیت آدمی تھے۔ جب ہمیں قیم شہر کی ضرورت پڑی تو لوگوں نے مجھے تجویز دی، کہ ان کو قیم بنا لیا جائے۔ مگر میرے لیے یہ ایک خاصا مشکل مسئلہ تھا۔

جماعت میں لوگوں کو یہ مسئلہ بار بار پیش آتا ہے، کہ جس فرد کے خلاف نظم تادیبی کارروائی کر چکا ہو، مستقبل میں اس فرد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اس کو کونے میں لگا دیا جائے، یا کوئی مقام دیا جائے، یا نہ دیا جائے؟ دستور اور روایت میں تادیبی کارروائی کی گنجایش کے باوجود، میں بنیادی طور پر کسی ساتھی کے خلاف انتہائی کارروائی کرنے کے خلاف ہوں، اِلّا یہ کہ بالکل ہی ناگزیر ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رکنیت کا جو تصور ہمارے ہاں ہے، وہ ہمیں ایسی کارروائی کی اجازت نہیں دیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ پُر سعادت میں جائیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی کا اخراج نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی جانب سے اخراج کا مطلب اسے کافر قرار دینا تھا۔

ہم یہ بات اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں، کہ جماعت کے اندر آنا ہی کسی فرد کے مسلمان ہونے کی بنیاد نہیں ہے اور نہ کسی فرد کا جماعت سے جانا کفر کے مترادف ہے، اسی لیے ہم لوگوں کا جماعت سے اخراج کر سکتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ ایک دینی اور جماعتی تنظیم ہے۔ جب ہم ایک فرد کو نکالتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ ہم اسے جماعتی زندگی سے

بری کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک آدمی فتنے پر تلا ہوا نہ ہو، اس وقت تک ہمیشہ اس کی اصلاح کا موقع موجود ہوتا ہے۔ احسن طریقہ یہ ہے کہ اس فرد کی کمزوریوں، خامیوں، خرابیوں بلکہ فتنوں کو بھی برداشت کرلیا جائے۔

آخر ایک اسلامی ریاست میں، ہمیں معاشرے کی خرابیوں کو برداشت کرنا ہی پڑے گا اور انھیں ٹھیک رکھنے کے لیے تعلیم، تربیت اور تادیب کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے بہرحال ناپسندیدہ افراد کو ملک سے باہر تو نہیں نکالا جاسکتا۔ ریاست کے لیے ضروری ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کی اصلاح کرے۔ ہم اپنے رفقاء کو ایک اسلامی ریاست کا نظام چلانے کی تربیت دے رہے ہیں۔ ایمانی شعور اور پوری نیک نیتی کے ساتھ یہ ہمارا ہدف بھی ہے۔ اس لیے ہمیں اس نکتے کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اپنی تحریکی زندگی میں جمعیت یا جماعت سے کسی فرد کا بھی اخراج نہیں کیا۔ البتہ صرف ایک فرد کو فارغ کرنے کا واقعہ ہوا، جو بیان کر چکا ہوں۔ پھر جب پاکستان میں ۱۹۹۳ء کے انتخابات کے بعد نظمِ جماعت کے خلاف اتنی گرم اور شدید مخالفتیں رہیں، تب بھی اس کا مخالف رہا ہوں، کیونکہ میں لوگوں کو کھو دینے کا قائل نہیں ہوں۔ مگر بڑی ناگزیر صورت پیدا ہو جائے کہ کوئی اور چارہ ہی نہ رہے تو پھر دوسری بات ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں، انسانی برداشت بہت دیر بعد جواب دیتی ہے ــــــ بہت غور کرنے کے بعد میں نے غلام سرور کو قیم جماعت مقرر کر دیا۔ مجھے کام میں ان سے بہت مدد ملی۔ اس زمانے میں کمپنی کے کام بھی بڑھ رہے تھے اور ادھر سیاست بہت وقت لے رہی تھی۔

''لبرل'' سوچ

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ)، اسلام آباد میں ایوب حکومت نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو ڈائرکٹر مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے بارے میں انگریزی میں ایک کتاب لکھی۔ اگرچہ فضل الرحمٰن صاحب سے میں ذاتی طور پر واقف

نہیں تھا، تاہم ان کے بارے میں ہمارا تاثر یہی تھا کہ وہ اسلام کے بارے میں بڑے لبرل خیالات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا نے ان کی چیزیں پڑھنے کے بعد مجھے یہ باتیں بتائی تھیں، جس سے میرا تاثر مزید گہرا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر چھاپرا بہت دیانت دار، منصف مزاج اور ایک کشادہ دل آدمی ہیں۔ جب وہ امریکا سے واپس آئے، تو انھیں ادارہ تحقیقات اسلامی (IRI) میں جگہ ملی اور وہاں پر کام کرنے لگے۔

فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب میں قابلِ اعتراض، بلکہ سخت دل آزار باتوں کی وجہ سے عوام میں سخت ردعمل ہوا۔ ان کی غلط باتوں کی نشان دہی کرنے میں جماعت نمایاں تھی، لیکن ان کے خلاف ایک ملک گیر تحریک چلا کر شر کی تشہیر سے اجتناب کرنا بہتر سمجھتی تھی۔ اس وقت ملکی فضا میں بارود تھا، کہ اگر کہیں بھی کوئی فیتہ لگا دیتا تو وہ دھماکا کر سکتا تھا۔ مولوی فرید احمد صاحب نے جب اس معاملے کو زوردار طریقے سے اُٹھا دیا تو مغربی پاکستان میں جلوس نکلنے لگے اور بات بڑھتی گئی۔ صدر ایوب نے ضد کرنے کے بجائے انھیں رخصت کر دیا اور وہ امریکا چلے گئے۔ پھر آخر تک جماعت کے سخت خلاف رہے۔ ان کی کتاب میں جہاں بھی جماعت کا ذکر آیا ہے بہت تلخی کے ساتھ آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ ان کا یہ سمجھنا کہ انھیں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی سے جماعت کی وجہ سے نکالا گیا، حالانکہ یہ ان کی بدگمانی ہی تھی۔ نکالا تو انھیں ان کے اپنے رطب و یابس کی وجہ سے گیا تھا۔

رسالہ مسلم ورلڈ بک ریویو میں ان کی مذکورہ کتاب اور کچھ مستشرقین کی کتابوں پر مشترکہ تبصرہ کرتے ہوئے میں نے یہ لکھا کہ اس میں فکر تو مغربی ہے، مگر ایک مسلمان کی لکھی ہوئی ہے ___ جو لوگ ان کے قریب تھے، مثلاً ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب وغیرہ، انھوں نے بتایا، کہ وہ اس بات پر سخت ناراض ہوئے تھے کہ ''مجھے ان لوگوں کی صف میں کیوں شامل کیا''۔ بہرحال دوسرے لوگوں نے ان کی جو باتیں بتائیں، ان میں شخصی طور پر کچھ قابلِ تعریف پہلو بھی تھے۔ لیکن میں ان کی فکر سے تو اتفاق نہیں کر سکتا تھا، جسے انھوں نے پیش کیا

تھا۔

جمعیت کی مالی مدد

۱۹۶۸ء کے بعد بنگالی قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کی جانب سے بڑھتی ہوئی شورش کے مقابلہ میں جمعیت کا کردار بڑھتا گیا۔ ہمارے پاس کارکنوں کی قابلِ لحاظ تعداد تھی۔ ان میں بڑے اچھے اور باصلاحیت کارکن شامل تھے۔ اللہ اور دین اسلام سے بڑی پختہ وابستگی تھی۔ ان میں فہم اور سمجھ بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ تحریک سے تعلق بڑا مستحکم تھا۔ مطالعہ کرتے تھے، آنے والے حالات کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتے تھے، کام بھی بڑی محنت اور لگن سے کرتے تھے۔

چونکہ جمعیت کے ساتھ ربط کی ذمہ داری میرے سپرد تھی، اس لیے ان کی بات سننا اور ان کو مشورہ دینا میرے فرائض میں داخل تھا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں نے ان کی شوریٰ میں شرکت کی ہو۔ لیکن اس کے باوجود مجھ سے ان کا بڑا گہرا ربط رہتا تھا۔ وہ کچھ بھی کر رہے ہوتے تھے، اس کی مجھے اطلاع ہوتی تھی۔ بعض اوقات مختلف امور پر ہمارا اتفاقِ رائے نہیں ہوتا تھا۔ ان کو میں یہ آزادی دیتا تھا، کہ جہاں تک اس سے تحریک اسلامی کا کوئی موقف یا کوئی پالیسی مجروح اور متاثر نہ ہو، وہ جو چاہیں کریں۔ اگرچہ اس بات کی کبھی نوبت نہ آئی۔

ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ مالیات کا تھا۔ مالیات کے سلسلے میں، جتنا کچھ کرسکتا تھا وہ یہاں پر ایک عرصے سے کر رہا تھا۔ جمعیت طلبہ عربیہ کے سلسلے میں بھی اہتمام کرتا تھا۔ ڈھاکہ جماعت کے معاونین کو توجہ دلاتا کہ وہ ان کی مدد کریں۔ لیکن جماعت کے بیت المال سے مدد کبھی نہیں کرتا تھا۔ جب ۶۸ء کے ہنگامے شروع ہوئے اور عوامی لیگ کی تحریک مضبوط ہو کر اُبھری، تو ہم نے اس کے موقف کی اصولی مزاحمت کا فیصلہ کیا اور مستقبل کے امکانات پر غور کیا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا، کہ ہم عوامی لیگ کی تحریک کی مزاحمت کامیاب اور

بھرپور انداز پر کرسکیں۔ اپنے موقف پر مصالحت کرنے اور اپنی دعوت سے روگردانی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی نے طلبہ میں براہِ راست اپنے کام کے ذریعے جارحانہ فضا پیدا کردی تھی۔ تعلیمی اداروں میں اس عملی اور فکری جارحیت کا فکری سطح پر مقدور بھر مقابلہ، صرف اسلامی جمعیت طلبہ کر رہی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ جمعیت کا کام مضبوط ہو، ان کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوں، جمعیت کے کارکن بھی خاصے ہوں۔ جمعیت کے کارکن موجود تو تھے، لیکن ان کا بڑا مسئلہ مالیات کا تھا اور یہ مسئلہ تحریک اسلامی میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ میرا تجربہ، مشاہدہ اور ایمان ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام کرانا منظور ہوتا ہے، وہ کبھی مال کی وجہ سے نہیں رُکتا۔ اس کے برعکس اگر بہت سارا مال موجود بھی ہو، مگر ہمارے اندر اس کام کی اہلیت نہ ہو تو وہ کام کبھی نہیں ہو پاتا۔ ہر چند کہ مال ایک ثانوی درجے کی چیز ہے، لیکن بڑی اہم چیز ہے۔ اسی لیے قرآن مجید، اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت سے بھرا ہوا ہے۔

اللہ کے فضل سے ڈھاکہ جماعت اپنے مالی وسائل اور ذرائع میں پہلے کی نسبت مضبوط تھی۔ وہ صوبائی جماعت کے بیت المال کی بھی خوب اعانت کرتی تھی۔ مزدوروں اور صحافیوں میں کام کے علاوہ بہت سے دیگر اجتماعی کاموں کی ذمہ داری، ڈھاکہ جماعت کے سپرد تھی۔ لیکن جمعیت کی مالی اعانت کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ جماعت کی استطاعت اور حدود سے باہر تھا۔

اس کے لیے میں نے ڈھاکہ کے اہلِ ثروت سے رابطے کا سوچا۔ میرے ذہن میں جمشید روڈ، کراچی میں مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیے امداد جمع کرنے کا تجربہ موجود تھا۔ لہٰذا جمعیت کے لیے یہی سوچا، کہ میں جا کر کوئی درخواست نہیں کروں گا، کسی سے نہیں مانگوں گا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا، بلکہ باوقار انداز میں بات کروں گا۔ چنانچہ کچھ تو اپنے ہی لوگ تھے۔ ان کے علاوہ تین چار لوگوں سے ملاقات کی۔

ان سے یہی کہا کہ ''دیکھیے، سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ یہ کسی بھی وقت سب کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ اس کے اندر آپ ٹک نہیں سکیں گے بلکہ بہہ جائیں گے، جو قوتیں اس سیلاب کو لا رہی ہیں اور اس کی پشت پناہ ہیں، ان کے مقابلے میں لازمی طور پر کامیابی کی میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا، لیکن کوشش کرنا فرض ہے۔ آج آپ اللہ کی راہ میں رقم خرچ کر کے شاید اس بات میں کامیاب ہو جائیں، کہ اسے روک لیں یا اس کی شدت کو توڑ دیں۔ لیکن کل آپ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ یہ ساری فیکٹریاں، کارخانے اور کاروبار آپ کو اسی طرح چھوڑ کر جانا پڑے گا، اور کوئی چیز آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ اس لیے جو کچھ آپ کر سکتے ہوں، اسے کرنے سے دریغ نہ کیجیے۔ خاص طور پر طلبہ کے فرنٹ پر اس تعاون کی بڑی سخت ضرورت ہے''۔

جمعیت کی امداد میرا سب سے بڑا ہدف تھا۔ اسی کے لیے جگہ جگہ گیا۔ آدم جی سے بھی ملا مگر مایوسی ہوئی، ان سے کچھ بھی نہیں ملا۔ لیکن اللہ کے فضل سے باوانی صاحب نے اچھی خاصی رقم دی اور کچھ لوگوں نے مستقل طور پر ماہانہ اعانت کا بندوبست کر دیا۔

جمعیت کے لیے رقم لینے دینے کا میں نے یہ راستہ نکالا، کہ نہ کہیں لینے میں نام آئے، اور نہ دینے میں میرا نام آئے۔ چنانچہ رقم لانے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو جماعت کا کارکن تو تھا، لیکن وہ نمایاں نہیں تھا۔ جناح ایونیو پر ان کی دکان تھی۔ یہ فضل الدین شمسی صاحب کے بھتیجے رشید تھے۔ ہمارے ساتھی تھے، لیکن نمایاں نہیں۔ میں نے ان کو یہ ذمہ داری سونپی کہ فلاں فلاں فرد نے یہ وعدے کیے ہیں، آپ جا کر ان سے پیسے لائیں اور اس کے بعد تقسیم کا کام بھی خود ہی کریں۔ کچھ مستقل اعانتیں ہیں، وہ اگلی دفعہ بتا دوں گا کہ ان کو یہ ہر مہینہ دینی ہیں اور کچھ غیر مستقل رقم ہوگی، اس کا آپ کو حساب رکھنا ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ حساب مجھے دیتے رہنا ہے۔ رشید نے بڑی فرض شناسی اور باقاعدگی کے ساتھ یہ ذمہ داری ادا کی۔ جب تک وہ ڈھاکے میں ہنگاموں کی وجہ سے ہجرت کر کے کراچی نہیں گئے، اس وقت تک یہ کام بہت باقاعدگی سے کرتے رہے۔

جمعیت کی اعانت کے دوران ایک اصول یہ بھی اپنایا تھا کہ جمعیت کی تنظیم چلانے کے لیے جو معمول کے مطابق خرچ ہے، یعنی دعوت و تربیت ہے، دفتر کا خرچ وغیرہ، اس کے لیے ہم غیر معمولی ہنگامی اعانت نہ لیں کہ یہ ریونیو بجٹ تھا۔ انھیں بتایا کہ اس کے لیے نہیں، لیکن جو ڈویلپمنٹ کا کام ہے یا کوئی ایسا کام ہے کہ اگر تھوڑے عرصے بعد ہم کو وسائل ملیں تو وہ کام کرلیں گے اور نہ ملے تو اس کو لپیٹ دیں گے جس کام کے نہ ہونے سے نقصان کا خطرہ ہوگا، اس کے لیے پیسے کا بندوبست کروں گا۔ چنانچہ وہ ہر سال یا تین مہینے بعد اپنا بجٹ بناتے تھے، اخراجات کی مدات طے کرتے تھے اور اس کو دو حصوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ایک وہ جو اس کی تنظیم، دفتر، دعوتی اور تربیتی کام کو چلانے کے لیے ناگزیر تھا، یہ وہ خود ہی جمع کرتے تھے۔ اس میں ذاتی سطح پر بھی ہم جمعیت کی مدد کرتے تھے۔ لیکن یہ انھیں اپنی بھاگ دوڑ سے خود جمع کرنا ہوتا تھا اور جو خصوصی ذرائع سے ہمیں حاصل کرنا تھا، اس کا وہ الگ بجٹ بناتے تھے۔

چنانچہ ۶۸ء، ۶۹ء میں انھوں نے ایک اسکیم بنائی۔ وہاں کی چار ڈویژنوں میں ۱۷ اضلاع تھے اور ہر ضلع کے اندر تین تین، چار چار سب ڈویژن تھیں۔ اسکیم یہ بنائی کہ ہر سب ڈویژن میں ایک ہمہ وقتی کارکن مقرر کیا جائے، جسے تعلیم کے لیے وظیفہ دیا جائے۔ اس زمانے میں کوئی گاڑی یا موٹر سائیکل نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے ان چند کارکنوں کے وظیفے مقرر کیے، سائیکلیں لی گئیں اور لٹریچر اکٹھا فراہم کر دیا۔ یہ بھی جماعت کے بیت المال سے نہیں تھا، بلکہ میں نے اس سے ہٹ کر جو نظام وضع کیا تھا، یہ اس کے تحت تھا جو سقوطِ مشرقی پاکستان تک جاری رہا۔ انھی وسائل سے ڈھاکہ جمعیت کو موٹر سائیکل لے کر دی گئی تھی۔

لٹریچر کا پھیلاؤ

دینی لٹریچر کے پھیلانے پر بھی میں نے بڑا زور دیا۔ ہمارے پاس اُردو کے مقابلے میں بنگلہ زبان میں لٹریچر بہت کم تھا۔ لیکن میرا مشاہدہ تھا کہ بنگال میں دینی لٹریچر بڑا مؤثر اور

مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ان لوگوں کے مزاج اور طبیعت کا ایک ذوق ہے، کہ وہ کتاب پڑھتے اور استدلال سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر بات اپیل کر جائے تو وہ پھر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے لیے ڈھاکہ میں ایک اسکیم چلائی تھی، جس کے تحت ایک دعوتی سیٹ بنایا۔ اس سیٹ کے اندر دعوتی لحاظ سے بنیادی اور ایسی ضروری کتابیں رکھیں جن کو پڑھنا ضروری اور کافی بھی ہو۔

شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ ہر آدمی جو جماعت کے ساتھ آئے، اس کے لیے تحریک کی ساری کتابیں پڑھنا لازمی نہ ہو۔ بلکہ ہم کو یہ چاہیے کہ تھوڑی کتابوں، تھوڑے الفاظ، تھوڑے وقت میں ایک فرد کو سمجھا دینا چاہیے جو نہایت ضروری ہو۔ ہمارے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایک آدمی کو وسیع اور جامع لٹریچر پڑھانا تھوڑے وقت میں ممکن نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اپنے دعوتی لٹریچر پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک دعوتی سیٹ بنایا۔ یہ لٹریچر اسلامک پبلی کیشنز سے ایک تہائی کمیشن پر حاصل کیا۔ ایک تہائی، جماعت کے بیت المال سے پورا کیا اور کارکنوں سے کہا کہ وہ بقیہ ایک تہائی قیمت پر حاصل کریں۔ اس طرح ہر کارکن کے پاس کتابیں ہوتی تھیں، وہ دوسروں کو پڑھنے کے لیے دیتا تھا، چونکہ اس میں خود اس کا اپنا پیسہ بھی لگا ہوتا تھا، اس لیے اس کی حفاظت اور اس کے استعمال میں احساس ذمہ داری کا محرک بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ وہ عمل تھا جس سے خاک پھانکتی اور دیمک کی خوراک بنتی لائبریریوں کے بجائے، چلتی پھرتی موبائل لائبریریاں وجود میں آگئیں۔

میں کارکنوں اور ارکان وغیرہ سے ملاقاتوں میں خاص طور پر ان کے ذخیرۂ کتب، کتب کے استعمال اور اس سے دعوت میں پھیلاؤ کے بارے میں سوال پوچھا کرتا تھا۔ الحمدللہ اطمینان بخش جواب ملتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج جب کہ اتنا شدید دورِ آزمایش نہیں ہے، پھر بھی ہمارا کارکن یہاں کتب پھیلانے اور پڑھانے میں شرماتا ہے، یہ بات آج تک میں

سمجھ نہیں سکا کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ مہم بڑی کامیاب رہی، جس میں بہت وسیع پیمانے پر لٹریچر پھیلا۔

لٹریچر کا ترجمہ

لٹریچر کا ذکر ہو رہا ہے، تو اس یاد کو تازہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کہ جب سے مشرقی پاکستان میں جماعت کے کام کی طرف مرکز جماعت اسلامی پاکستان نے توجہ دینا شروع کی تھی، وہاں پر بنگلہ زبان میں ترجموں کے کام کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بہت سا لٹریچر ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا تھا۔

یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ ادارہ معارف اسلامی، ڈھاکہ کے سیکرٹری کی ذمہ داری کے دوران میں نے ایک منصوبہ بنایا تھا جس کے مطابق ۱۹۷۰ء تک جماعت کا سارا لٹریچر بنگلہ میں منتقل کرنا تھا۔ ان میں اگر مولانا مودودی کی **الجہاد فی الاسلام** جیسی کوئی ضخیم کتاب رہ جائے تو الگ بات ہے، لیکن دعوتی، تربیتی اور علمی نوعیت کی کوئی کتاب ترجمہ ہونے سے باقی نہ رہے۔ اس مقصد کے لیے خود مترجمین کی ایک ٹیم منتخب کی اور انھیں معقول اعزازیہ دیا۔ ان کتابوں کو اسلامک پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ دوسری جانب اسی منصوبے کے تحت مولانا عبدالرحیم صاحب کو اس بات کی پیش کش کی تھی کہ وہ تفہیم القرآن کا ترجمہ کریں۔ وہ باقاعدگی سے ترجمہ کرتے رہے، جو برابر چھپتا رہا۔

'پرتھوی' کا اجرا

ماہ نامہ ترجمان القرآن اُردو میں شائع ہوتا تھا۔ ہمیں وہاں پر اس نوعیت کے ایک بنگلہ ماہ نامے کی بڑی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس غرض کے لیے ادارہ معارف اسلامی، ڈھاکہ کے ترجمان کے طور پر ماہ نامہ پرتھوی جاری کیا۔ پرتھوی کے معنی زمین کے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں اس کی اشاعت پانچ، چھے ہزار تھی جو کم نہیں تھی، اور اس وقت یعنی ۱۹۹۶ء میں ۳۵ ہزار شائع ہو رہا ہے۔ صحیح اسلامی فکر کی اشاعت، جدید مسائل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت اور اسلام کی دعوت عام کرنے کے لیے یہ ایک بڑی مفید تدبیر تھی۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اسلامی لٹریچر کے ذریعے بنگالی مسلمانوں کے دل اور دماغ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مغربی پاکستان کے رہنے والوں کی بہ نسبت اہلِ بنگال دلیل سے زیادہ متاثر ہوتے اور اسے قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ بڑی تعداد میں تحریک کا حصہ بننے والے نوجوانوں کو اسی لٹریچر نے متاثر کیا۔

نعروں کا ردھم

مشرقی پاکستان نعروں کی سرزمین تھی۔ صوتی اور جذباتی لحاظ سے بنگالی زبان نعروں کے لیے بڑی موزوں ہے۔ ان کے نعرے بڑے پُرکشش، بڑے زوردار اور بامعنی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی بنگالی ادب، خصوصاً گیت، نظم، آرٹ، وغیرہ میں مغربی پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں سے بہت آگے ہیں۔ مؤثر پوسٹر بنانے میں بھی وہ بہت آگے ہیں۔

جس طرح ''پنڈی کہ ڈھاکہ ـــــ ڈھاکہ، ڈھاکہ'' یعنی وہاں پر دہرانے اور تکرار کا ایک خاص رواج تھا۔ اس کے مقابلے میں ہمارے نعرے بہت پھس پھسے تھے، بلکہ میں کہوں گا کہ سوائے ''نعرۂ تکبیر ـــــ اللہ اکبر'' کے تمام نعرے بے جان تھے۔ نعروں کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر، میں نے ایک نشست اسلامک ریسرچ اکیڈمی میں بلائی۔ اس میں جمعیت کے بھی تین چار لوگ تھے۔ مجھے ان کے نام یاد نہیں، البتہ جماعت کے افراد میں سے غلام سرور، عبدالحنان طالب اور اختر فاروق تھے۔ ان میں اختر فاروق ادیب اور اچھے صحافی تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے اجتماعات، جلسوں اور جلوسوں میں نعرے بے شمار لگتے ہیں مگر عام طور پر وہ بے جان ہوتے ہیں، ان میں کوئی سلیقہ نہیں ہوتا اور نہ کوئی پیغام ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ نعرے وضع کریں، ان کو سائیکلوسٹائل کر کے صوبے میں پھیلا دیں تاکہ پھر ہر جگہ انھی نعروں کا زور ہو۔

چنانچہ دو چار نشستوں میں نعرے بنائے گئے۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی کوئی چیز بناتا ہے، تو اس تخلیق میں وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ ہم بھی فضا میں گونجتے ہوئے ان نعروں سے متاثر تھے۔ پہلا نعرہ یہ وضع کیا: ''بپلوپ بپلوپ ــــ اسلامی بپلوپ''۔ مغربی پاکستان پر پہنچا تو انقلاب انقلاب ــــ اسلامی انقلاب'' بن گیا۔ امرنیتا تمرنیتا بشو نبی مصطفیٰ یہاں آیا تو ''رہبرورہنما ــــ مصطفیٰ مصطفیٰ'' بن گیا۔ پھر اسی تسلسل میں یہاں پر جمعیت نے ''خاتم الانبیاء ــــ مصطفیٰ مصطفیٰ'' کا نعرہ ایجاد کیا۔ تحریکِ ختم نبوت میں یہ اچھا اضافہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی نعرہ تھا: ''شنگرام، شنگرام ــــ چولبے چولبے'' وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے کوئی سات آٹھ نعرے تجویز کیے اور ان کو صوبے کے کارکنوں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ۶۹ء اور ۷۰ء میں یہی نعرے چلتے رہے، اور پھر مقبول ہوکر زبان زدعام ہو گئے۔

حج بیت اللہ

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل واحسان تھا کہ اس نے ۱۹۶۸ء میں حج بیت اللہ کی سعادت عطا فرمائی۔ میں نے جب اس کمپنی کی ملازمت اختیار کی تھی، اسی وقت سے اہتمام کے ساتھ لازمی طور پر کچھ رقم ماہانہ نکالتا رہتا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس میں رفتہ رفتہ جمع ہونے والی رقم سے حج کے اخراجات نکل آئے۔

اس سفر اور ارکانِ حج کی ادائیگی کا جو لطف تھا، اس کے کیا کہنے، لیکن اس سفرِ شوق پر روانگی کے لیے روپوں کو اکٹھا کرنے اور محبوب حقیقی کے آستانے پر حاضری کے انتظار میں جو دن گزر رہے تھے، انھوں نے ہجر کی لذت کو بڑھا کر ایک نئی دنیا سے آشنا کیا۔ دراصل اس مشق کے کئی فائدے بھی تھے۔ ایک یہ کہ جب میں نے حج پر جانے کی نیت کرلی تو اسی وقت سے حج کا ثواب ملنا شروع ہوگیا۔ دوسرا یہ کہ رقم جمع کرنے کا دباؤ بھی نہ پڑا اور زادِ سفر

نکل آیا۔ تیسرا یہ کہ اس پس اندازی کے دوران اگر میرا سفر آخرت آجاتا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس نیت کا پھل دیتا۔ ایسے کاموں کے لیے کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی، پس عزم اور ڈسپلن چاہیے۔

دینی یا سیاسی؟

کچھ لوگ کہتے ہیں: ''سیاست کی وجہ سے جماعت کا کام خراب ہوتا ہے، اخلاقی معیار گرتا ہے اور نظم کمزور پڑ جاتا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۱ء تک شدید سیاسی سرگرمیوں کا دور تھا، لیکن اس دور میں بھی اللہ کے فضل سے کارکنوں کے اجتماع میں حاضری کا تناسب، رپورٹوں کا آنا اور تنظیمی کام کا ہونا بالکل اسی طرح سے چل رہے تھے، جیسے عام حالات میں۔ حالانکہ ۶۹ء ۷۰ء سے بڑھ کر کوئی ہنگامی سال نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مذکورہ 'نظریے' کے علَم بردار اپنے ایک سابقہ رفیق کی 'تنظیم' کی میں سالانہ رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ ان کی تنظیم کا تو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سارا زور تربیت، تعمیرِ کردار، خلافت وغیرہ پر ہے۔ حیرت ہوئی وہاں پر بھی تعلق کے اتنے مدارج ہیں۔ البتہ وہ وقت بے وقت اپنا زور جماعت اسلامی کے خلاف لگاتے اور اس 'کارِ خیر' میں اپنے ضمیر کو مطمئن کرتے ہیں۔ اپنے خطبوں میں جماعت اسلامی کے 'زوال' کی خبر بھی بار بار سامنے لاتے ہیں، مگر خود ان کے اجتماعات میں حاضری کی تعداد مایوس کن اور نظم کی پابندی کا معیار کم تر ہے۔ ہمارے اجتماعاتِ کارکنان میں ۹۵ فی صد کارکن آتے تھے اور وقت پر آتے تھے۔ مطلب یہ کہ 'سیاست' نے ان کے مزاج کو بگاڑا نہیں تھا۔ دراصل ان میں دینی احساس، آخرت کی فکر اور دنیا میں ذمہ داری کی لگن پیدا کرنے کے لیے مختلف موضوعات پر مختصر مگر مؤثر پروگرام رکھے جاتے تھے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جو ٹیم فراہم ہوگئی ہے، اس کا دینی مزاج برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے، ان کے اندر للّٰہیت برقرار رہے، خواہ ان کاموں میں کچھ بھی کریں، جلوس نکالیں،

نعرے لگائیں یا اپنا خون پیش کریں اور تشدد کا مقابلہ کریں، لیکن یہ سب کام اللہ کی ربوبیت اور الوہیت کو عملاً تسلیم کرتے ہوئے کریں۔ اسی لیے میں تربیتی پروگراموں میں رفقا سے ان امور پر گفتگو وغیرہ کا بہت اہتمام کرتا رہتا تھا۔

باقی یہ سوال کہ ''جماعت میں دین پر سیاست زیادہ غالب'' آ گئی ہے، تو اس کی وجہ سیاست میں حصہ لینا نہیں ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے، کہ جن چیزوں کی طرف دین میں توجہ دلائی گئی ہے، افراد ان چیزوں کی طرف عام طور پر کماحقہ توجہ نہیں دیتے۔ جنت کی طلب، دوزخ کا خوف، اللہ سے تعلق اور رسول اللہؐ سے محبت ہی یہ بنیادیں ہیں اور انھی بنیادوں پر ایک فرد کا نقطۂ نظر درست رہ سکتا ہے۔

۱۲

مارشل لا کا نفاذ، زوال کا راستہ

چھٹے عشرے کے آخری برسوں کے دوران ملک میں بے چینی کی فضا تھی، جب 'پاکستان تحریک جمہوریت' (PDM) کا اتحاد وسیع ہوا اور ۸ جنوری ۱۹۶۹ء کو اس نے 'ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی' (DAC) کی شکل اختیار کر لی۔

اتحادی جماعتوں کے اجلاس

ان دونوں سیاسی اتحادوں میں شرکت کے دوران ایک دل چسپ صورت حال پیش آئی، جس کا ذکر ضروری ہے، کیونکہ ہماری سیاسی جدوجہد سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک پاکستان میں سیاسی سطح پر جتنے بھی اتحاد بنے، ان میں، مَیں شریک رہا ہوں۔ اس دوران میری سوچی سمجھی رائے یہی تھی، کہ اگر ہمیں سیاست میں حصہ لینا ہے تو پھر مختلف النوع سیاسی، سماجی اور مذہبی عناصر کے ساتھ، جتنے بھی ہمارے حلیفانہ تعلقات بن جائیں، وہ ضروری ہیں۔

بہرحال، اجتماعی اور قومی جدوجہد میں ہمیں اپنے زیادہ سے زیادہ حلیف بنانے چاہییں۔ جس طرح حالتِ جنگ میں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے پاس زیادہ قوت ہو، اسی طرح سیاست میں بھی وسیع قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاست ہے ہی اس بات کا نام، کہ صرف اپنے لوگوں ہی سے کام کروا کر مطمئن نہ ہو بیٹھیں، بلکہ وہ لوگ جو اپنے نہیں ہیں، ان سے بھی، حصولِ مقصد کے لیے کام لیں، ان کی قوت بھی مقصدِ زندگی کے لیے استعمال کریں اور انھیں اپنے ساتھ ملائیں۔

وقت گزرنے کے بعد آج یعنی ۱۹۹۶ء میں جماعت میں تقریباً اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ "اب جماعت کو کسی سیاسی اتحاد میں نہیں جانا چاہیے"۔ پچھلے ۳۵، ۴۰ برسوں کے دوران اگرچہ بڑے تلخ و شیریں تجربات مجھے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس بات سے پوری طرح اتفاق نہیں کرسکتا۔ اتحاد میں نہ جانے کے باوجود ہم کبھی ایڈجسٹمنٹ کی بات کرتے ہیں، اور کبھی مفاہمت کا نام لیتے ہیں۔ اپنی اصل میں تو یہ بھی اتحاد ہی کی ذرا سی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ سب اتحاد ہی کے مختلف لبادے ہیں، جو دوسرے ناموں سے سامنے آرہے ہیں اور پھر حالات کی بھی مجبوری ہے، جس سے فرار ممکن نہیں۔ مفاہمت اور ایڈجسٹمنٹ کے تقاضے بھی کم و بیش اتحاد جتنے ہی ہوتے ہیں، جنھیں پورا کرنا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے نہ پوری طرح مفاہمت ہوسکے گی، اور نہ اکیلے رہنے کا فائدہ ہوگا۔

مختلف سیاسی لیڈروں سے ملاقات اور روابط کی بنیاد پر پہلے پہل میری بھی یہی رائے تھی، کہ یہ راستہ ہمارے لیے مفید نہ ہوگا۔ بلاشبہہ اس اتحادی عمل سے ہمیں کچھ نقصانات بھی ہوئے اور فائدہ زیادہ نہیں ہوا۔ سادہ سی بات ہے کہ جو بھی انسانی تدبیر ہوگی، اس میں ہمیشہ نقصان کے ساتھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔ جب جہاد ہوتا ہے تو بظاہر جان کا نقصان ہوتا ہے، مال کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ کچھ لوگوں کے خیال میں تو 'بدامنی' پھیلتی ہے۔ بہرحال اس کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ یہ تو ایک بالکل جائز اور افضل چیز کی مثال تھی۔

دوسری جانب دیکھیں۔ قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے، کہ جس کا نقصان زیادہ ہو، وہ نہ کیا جائے اور جس کا فائدہ زیادہ ہو، وہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ حرام نہ ہو۔ شریعت میں انسانی سطح پر کوئی تدبیر کرنا منع نہیں ہے۔ لیکن طویل مشاہدے کے بعد میرا خیال ہے، کہ ہمیں اتحاد کا ہمیشہ فائدہ ہوا۔ اگر مولانا مودودی ۶۴ء میں سہروردی صاحب کی عوامی لیگ اور بھاشانی صاحب کی نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر ایوب خان کے خلاف مہم نہ چلاتے، تو قومی اور ملکی سیاست میں جماعت کا اتنا وزن نہ بڑھتا۔ جہاں تک تشخص کا تعلق ہے تو اس کی حفاظت کرنا جماعت کا اپنا کام ہے اور جماعت کی قیادت کی ذمہ داری ہے، اس کے

اتحادیوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔

چنانچہ انھی دنوں کی بات ہے، ڈھاکہ میں حزبِ اختلاف کا اجلاس ہوا۔ جس میں جماعت کی نمایندگی مَیں اور غلام اعظم صاحب کر رہے تھے۔ یہ قومی سطح کا اجلاس تھا، لیکن جماعت کا کوئی فرد مرکز لاہور سے نہیں آ سکا تھا۔ ہم دونوں کو انھوں نے کہہ دیا تھا، کہ جماعت کی نمایندگی کریں۔ مرکزی شوریٰ نے اتحاد کے بارے میں کچھ اصول بھی طے کیے تھے، کہ یہ وہ اصول اور دائرے ہیں، جن میں ہمارا اتحاد ہوسکتا ہے۔ آج مجھے پوری طرح یاد نہیں ہے کہ نکتہ وار وہ اصول کیا تھے۔ بہرحال ہم دونوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ وہاں جب بات چیت شروع ہوئی تو ہمیں ان اصولوں کی روشنی میں جو شوریٰ نے ہمیں دیے تھے، کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن ساتھ ہی ہم نے وہاں پر یہ بھی کہا کہ ''جو چیزیں آپ کی جانب سے مانی گئی ہیں یا جن کو ہم قبول کر رہے ہیں، وہ جماعت کی مرکزی شوریٰ کی منظوری کے ساتھ مشروط ہیں''۔ یہ بات طے کر کے ہم آ گئے۔

اس کے بعد لاہور میں جماعت کی شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں ایک طوفان کھڑا ہوگیا کہ ''آپ کو جو مینڈیٹ (اختیار و اعتماد) دیا گیا تھا، آپ نے اس کی خلاف ورزی کی ہے اور آپ نے اس سے آگے بڑھ کر فلاں بات کیوں تسلیم کی ہے؟'' ہر طرح کی تقریریں ہوتی رہیں اور لوگ بولتے رہے۔ اسی دوران جماعت کے بزرگ رہنما ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم کھڑے ہوئے اور انھوں نے ایک دل چسپ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اتحاد کا اور ہمارا معاملہ وہ ہے، جو ایک شعر میں اس طرح سے ہے ؂

کہا کابل چلو، کہا کابل چلیں
کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا

ہم لوگ راستہ بنانے کے لیے اور رکاوٹ دُور کرنے کے لیے سیاست میں حصہ بھی لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے اس عمل کے دوران اگر اتحاد کرنا ہے تو اتحاد کریں گے اور اگر اتحاد میں ہم کو یہ اور وہ خطرہ ہے، پھر خطرہ تو ہوگا'' ___ وہ بڑے لطیف انداز میں بڑی بڑی باتیں

کہہ جاتے تھے اور انھوں نے ہلکے پھلکے انداز میں یہ بات کہی۔

بہرکیف، جب کافی لوگ بول چکے تو پھر میں نے بتایا کہ ہم نے کیا چیزیں مانی ہیں، کیوں مانی ہیں اور کس طرح مانی ہیں۔ ان کے کیا فوائد ہیں اور کیا نقصانات ہیں؟ میں نے دوسری بات یہ کہی کہ ''اگر آپ کو اسی بات پر جم جانا تھا جو آپ نے طے کر کے بھیجی تھی اور یہ کہ سب پارٹیاں بھی صرف وہی بات مانیں جو ہم گھر سے طے کر کے جائیں، تو پھر آخر ہمیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ وہ باتیں رجسٹرڈ ڈاک سے ہی انھیں بھیج دیتے۔ ظاہر ہے ہم وہاں اجلاس میں پوسٹ مین کا کام تو نہیں کر رہے تھے۔ ہم کو آپ نے اس لیے بھیجا تھا کہ ہم حالات کو دیکھیں، اور سمجھیں۔ نمایندوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ سیاست میں بات چیت، مفاہمت اور give and take (لو اور دو) تو ہوتا ہے۔ اسی کے بعد کوئی چیز طے ہوتی ہے، جس پر سب متفق ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ بس صرف ہماری ہر بات کو مانیں یا نہیں مانیں۔ یہ صرف وہاں پر ہو سکتا ہے، جہاں حکومت اور ریاستیں ہوں اور جن کے پاس اتنی بڑی قوت ہو کہ وہ خود اپنے بل بوتے پر لڑ سکیں۔'' ہم نے تو ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہمارا فیصلہ شوریٰ کی منظوری سے مشروط ہے۔ اس لیے اب آپ کو پورا اختیار ہے، آپ اس کو مان لیں یا اس کو رد کر دیں۔ ہم پر کوئی بات نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے آپ اس کو رد کر دیں''۔

وہ سب لوگ جنھوں نے اس پر سخت موقف اختیار کیا تھا، اب وہ بڑی مشکل میں تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ اس کو مانا جائے۔ ایک صاحب نے کہا: ''جب آپ نے مان ہی لیا ہے، تو ہم کو ماننا پڑے گا''۔ میں نے کہا کہ ''ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر آپ لوگ اسے نہیں ماننا چاہتے تو ہم جا کر انکار کر دیں گے''۔ بہرحال آخر میں مولانا مودودی نے بہت جچے تلے انداز میں تقریر کرتے ہوئے ہماری بات کی تائید کی اور فرمایا کہ ''انھوں نے ٹھیک کیا ہے''۔ شوریٰ میں کسی بحث کے آخر میں مولانا جب بولتے تھے تو پھر گویا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہاں یہ فیصلہ منظور ہو گیا۔

اسی طرح 'ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی' کی ایک اور نشست ڈھاکہ میں ہوئی تھی، جس میں

سیاسی پارٹیوں کے شاید مرکزی سطح کے سبھی لیڈر موجود تھے۔ اس میں شرکت کے لیے مغربی پاکستان سے ہمارے ایک نہایت محترم ساتھی آئے ہوئے تھے۔ اجلاس میں جماعت کا موقف یہ تھا کہ ''۵۶ء کا دستور بحال کیا جائے'' اور یہ ایک صحیح موقف تھا۔ لیکن تمام لوگ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مگر ہمارے وہ ساتھی اس صورت حال میں اپنی بات پر جمے ہوئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بس اپنی کہے جا رہے ہیں اور دوسروں کی کوئی سن نہیں رہے، کہ آخر وہ کیا اعتراض کر رہے ہیں اور پھر نہ وہ ان کا کوئی جواب دے رہے ہیں۔ وہ میرے محترم، بڑے اور بہت سینیر تھے۔ میں ان کے بالکل ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اجلاس کے دوران ان سے ایسی کوئی بات کرنا مناسب نہیں تھا، جس سے ان کو زک پہنچتی ہو۔ اس لیے میں سخت اضطراب میں رہا۔

لیکن جب اجلاس ختم ہوگیا، تو میں نے مرکز میں مولانا مودودی کو خط لکھا کہ: ماضی میں حزبِ اختلاف کی پارٹیوں کے اجلاسوں میں، میں نے چودھری رحمت الٰہی صاحب کے ساتھ کئی جگہ جماعت کی نمایندگی کی ہے۔ جہاں ہمارے بڑے خوش گوار تعلقات کار رہے، اور اگر اختلاف راے ہوا بھی تو ہم آپس میں مل کر بے تکلفی سے اس کا اظہار کر لیتے تھے۔ غلام اعظم صاحب کے ساتھ میری درخواست ہے کہ دوسری پارٹیوں کے جس اجلاس میں ہمارے وہ ساتھی نمایندگی کرنے جائیں، وہاں پر آپ مجھے نہ بھیجیں۔ کیونکہ پہلے ہی میں بڑی آزمایش سے گزرا ہوں۔ یہ بات اس لیے نہیں لکھ رہا کہ میرے دل میں ان کے احترام یا محبت میں کوئی کمی ہے، نہیں، بلکہ ہمیں اجتماعی زندگی میں انسانوں کے مختلف مزاجوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرا مزاج یہ ہے کہ آدمی جب برابری کی سطح پر، یا ویسے بھی کسی دوسرے سے مل بیٹھے تو اس کے نقطۂ نظر کو سمجھے، اس کے بعد اپنی بات کرے، اپنی رائے کے ساتھ دلائل تو ضرور دے، لیکن لہجے اور دلائل میں شدت اختیار نہ کرے، ایسی گفتگو میں الفاظ محتاط اور نرم ہوں'' وغیرہ وغیرہ ـــــ یہ بات میں نے امیر جماعت مولانا مودودی مرحوم تک پہنچا دی۔

میرا خیال ہے کہ حالیہ زمانے میں جماعت کی طرف سے پارٹیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے چودھری رحمت الٰہی صاحب، پروفیسر غفور احمد صاحب، خورشید بھائی، لیاقت بلوچ بھائی وغیرہ بہت موزوں افراد ہیں۔

صدر ایوب کے خلاف تحریک

۱۹۶۹ء کے شروع میں ایوب خان پر دباؤ تھا کہ وہ سیاسی بحران کا کوئی حل نکالیں۔ اسی سال فروری ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ صدر ایوب خان نے مولانا مودودی سمیت حزب اختلاف کے تمام لیڈروں کو بات چیت کے لیے بلایا۔ اس ملاقات سے پہلے مسلم لیگ کے لیڈر ممتاز محمد خان دولتانہ صاحب نے شرط عاید کردی کہ ''پہلے مجیب الرحمٰن کو رہا کیا جائے، پھر آپ سے ملیں گے''۔ حالانکہ خود عوامی لیگ کا بھی یہ مطالبہ نہیں تھا۔

شیخ مجیب سے ملاقات

شیخ مجیب الرحمٰن صاحب ۱۹۶۹ء میں دو سال بعد جیل سے باہر آئے تھے۔ اسی روز مغرب کے وقت مبارک باد دینے کے لیے میں ان کے گھر چلا گیا۔ یہ قدم میں نے اپنے طور پر اُٹھایا تھا۔

اخلاقی طور پر یہ پسندیدہ چیز ہے کہ کوئی دشمن ہے یا اختلاف رکھتا ہے، اس کے دکھ درد میں شرکت کی جائے۔ میں نے سوچا کہ بلاشبہہ ہم عوامی لیگ کے پروگرام کو پسند نہیں کرتے اور جس کے لیے ہمارے پاس مضبوط دلائل بھی ہیں۔ ان کے سیاسی طریقِ کار کو ہم نامناسب سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف سیاسی طور پر ہم برسرِ پیکار بھی ہیں۔ لیکن وہ انسان دو سال سے بیوی بچوں سے الگ رہا ہے، اور اب جب کہ وہ جیل سے چھوٹ کر آیا ہے، تو اخلاقیات اور انسانیات کا تقاضا ہے کہ اسے ملنے جانا چاہیے ـــــ اس لیے رہائی پر میں نے انھیں گھر پہنچ کر مبارک باد دی۔ اس بات پر وہ بہت خوش ہوئے۔ پانچ منٹ وہاں بیٹھا، کچھ گفتگو ہوئی اور پھر آ گیا۔ اسی رویے کی وجہ سے وہاں پر ان تمام سیاسی رہنماؤں سے

میرا ربط تھا اور ذاتی سطح پر تعلقات خوش گوار تھے۔

بے ثمر گول میز کانفرنس

ایوب صاحب کی طلب کردہ یہ گول میز کانفرنس بذاتِ خود سلجھاؤ سے زیادہ الجھاؤ کا سبب بنی۔ ۲۱ فروری کو انھوں نے آیندہ انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر کے سارا بھرم ہی ختم کردیا۔ مناسب یہی ہوتا کہ صدر اس میں وقت ضائع کرنے کے بجائے دستور میں ترمیم کر کے بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرانے کا اعلان کر دیتے، یا اس سے بھی مستحسن یہ قدم ہوتا، کہ اپنی ہی اسمبلی کا اجلاس بلا کر اپنے ہاتھوں ختم کیا ہوا ۱۹۵۶ء کا دستور بحال کر دیتے۔ جس کی بنیاد پر اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کے لیڈر کو وزارتِ عظمیٰ سنبھالنے کی ضمانت دیتے اور انتخابات کرانے کے بعد ہی یہ فیصلہ کرتے کہ وہ بطور امیدوار صدارتی الیکشن نہیں لڑیں گے۔ یہ حکمت عملی اختیار کرنے سے بات اتنی نہ بگڑتی۔ یہ نہیں تو پھر وہ اپنے ہی نافذ کردہ دستور کے مطابق اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کے سپرد کر دیتے، مگر قومی اسمبلی کے اسپیکر صاحب بنگالی تھے۔ اگر وہ یہ راستہ اختیار کرتے تو گول میز کانفرنس میں شیخ مجیب صاحب کی شرکت سے چھے نکات پر کھینچا تانی کی جو صورت بنی، اس سے بھی پہلو بچ جاتا۔

مشرقی پاکستان میں بھاشانی صاحب اور مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب نے شرکت نہ کر کے گول میز کانفرنس کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔ وہ گھیراؤ، جلاؤ، ہڑتال اور تشدد کی زبان استعمال کر رہے تھے۔ گول میز کانفرنس میں مجیب صاحب اپنے چھے نکات کا علَم بلند کیے ہوئے تھے۔ گول میز کانفرنس ہی میں مفتی محمود صاحب کا اصرار تھا، کہ ابھی اور اسی وقت قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ حالانکہ اس وقت اصل مسئلہ تو ملک کو بے آئینی ڈگر سے ہٹا کر آئین و دستور پر چلانے کا راستہ تلاش کرنے کا تھا، کہ جس پر کم سے کم وقت پر عمل ہو سکے اور قوم کسی بڑی تباہی سے بچ سکے۔

کچھ لوگ کانفرنس کے اندر اور کچھ باہر اپنی انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ انھیں اس بات

سے کوئی غرض نہ تھی، کہ بند گلی میں پھنسی ہوئی قوم کے لیے کوئی محفوظ راستہ نکل آئے۔ جب ایوب صاحب نے آخرکار بالغ حق راے دہی اور پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کی بات مان لی تو اس وقت سیلاب ہمارے سیاسی ڈھانچے کو تباہ کر کے جا چکا تھا۔ اس منظر میں ملی بھگت سے اقتدار پر شب خون مارنے والے 'عقاب' منڈلا رہے تھے اور جنھوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو پاکستان کے اقتدار پر ہی نہیں، بلکہ دوسرے لفظوں میں خود پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ تھے کمانڈر انچیف جنرل آغا یحییٰ خان، جن کی مکمل حمایت کا اعلان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے۔

ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی اور ایوب خان کے درمیان گول میز کانفرنس اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچی۔ ایوب خان نے استعفا دے دیا، اپنے ہی بنائے ہوئے دستور کو نظرانداز کرتے ہوئے بے اصولی کا مظاہرہ کیا اور اقتدار سپہ سالار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دیا جنھوں نے فاتحانہ شان سے مارشل لا لگا دیا۔ مارشل لا لگاتے وقت ان کا مینڈیٹ بس یہی تھا، کہ وہ جلد سے جلد الیکشن کرا دیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ لیا تھا اور ۱۹۷۰ء کا وعدہ کیا تھا۔

جنرل یحییٰ صاحب نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے بے جا طور پر سب سے پہلے تو ایوب خان کے زمانے کے تین سو تین سول ملازمین کو ہٹایا اور پھر مختلف شعبوں کی اصلاح کا بھی اعلان کیا۔ جس طرح پاکستان کے ہر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی یہ خواہش ہوتی ہے، کہ وہ صرف الیکشن کرا کے اقتدار منتخب نمایندوں تک منتقل نہ کرے، بلکہ اس کے ساتھ وہ ایک 'نجات دہندہ' اور 'مصلح' بن کر بھی قوم کے سامنے نمودار ہو، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان بھی یہی سب کچھ کر رہے تھے۔

جنرل یحییٰ سے ملاقات

اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد جنرل یحییٰ صاحب نے سب سے پہلے تو پاکستان کے تمام سیاسی لیڈروں سے رابطہ قائم کیا۔ مغربی پاکستان میں سیاست دانوں سے ملاقات

کے دوران وہ جماعت کے لیڈروں میں مولانا مودودی اور میاں طفیل محمد صاحب سے ملے۔

جب یحییٰ خان مشرقی پاکستان آئے، تو انھوں نے یہاں پر جماعت کے لوگوں کو بھی ملاقات کے لیے بلایا۔ جماعت کی طرف سے صدر سے ملنے کے لیے میں، پروفیسر غلام اعظم صاحب اور مولانا عبدالرحیم صاحب گئے۔ رمنا پارک کے پاس ایک کوٹھی تھی، جہاں وہ ٹھیرا کرتے تھے، وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک دل چسپ ملاقات تھی، جس میں تمام قومی امور پر بڑی تفصیل سے بات ہوئی۔

بہرحال ہم نے ان سے جو کہا، وہی جماعت کا صحیح اور برمحل موقف تھا کہ ''آپ ایسے کوئی اقدامات نہ کریں جو دستور سازی کے مترادف ہوں اور نہ مزید کوئی ایسی اصلاحات ہی کریں جو کہ آپ کے پیش نظر ہیں، اگر آپ body politic (جسدِ سیاست) سے کوئی زہر صاف کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ آپ کر دیں، مگر اس کا محفوظ طریقہ یہ ہے کہ آپ ۵۶ء کا دستور بحال کر کے اس کے تحت انتخابات کرا دیں۔ ۵۶ء کے دستور کی منسوخی کے بعد سے اب تک جو کارروائیاں ہوئی ہیں، ان کو انڈیمنسٹی (تحفظ) دے دیں، کیونکہ اس دوران کے فیصلوں اور اقدامات کی بساط لپیٹ دینے سے ایک آئینی اور قانونی خلا پیدا ہو جائے گا، جس سے اُلٹا انتشار پیدا ہوگا۔ ۵۶ء کا دستور مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی اتفاق سے بنا تھا۔ آج چاہے کتنے ہی مطالبات اُٹھ رہے ہوں، لیکن بہرحال اس دستاویز پر ایک اتفاق راے ہے۔ اس سے باہر جانے کی کسی کو جرأت نہیں ہوگی۔ ایسا قدم پاکستان کے حق میں بہت بڑی خیرخواہی ہوگی''۔

میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ''آپ دستور کی بحالی کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیں، کہ ہم چھے نکات کو بھی سمو دیں گے، آبادی کی بنیاد پر نمایندگی بھی دے دیں گے، اس طرح دونوں بازوؤں کے درمیان سیاسی مساوات بھی ختم کر دیں گے، لیکن یہ سارے کام عام انتخابات ہونے کے بعد ہوں گے۔ ہم فوری طور پر اقتدار منتقل کر دیں گے، جس کے بعد

اسمبلی ۵۶ء کے دستوری قاعدے کے مطابق اس میں جو چاہے ترمیم کرلے‘‘۔ اس طرح چھے نکات کے سیاسی ایشو بننے کا امکان بھی کم ہوجائے گا۔

میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ: ’’اس طرح جب انتخاب کا اعلان ہوگا، تو عوامی لیگ کے لیے ان کا بائیکاٹ کرنا مشکل ہوجائے گا اور انتخاب کے نتیجے میں جب اقتدار لینے کے بعد ترمیمات کرنی ہوں گی، تو اس سے پہلے وہ کوئی ہنگامہ نہیں کرسکے گی۔ انتخاب کے بعد جب وہ اقتدار سنبھال لے گی تو اقتدار کے مسائل خود ایسے ہوں گے، جس میں اس کے لیے وسیع پیمانے پر دستور میں ترمیمات کرنا مشکل ہوگا۔ کیونکہ اس کے لیے انھیں دوتہائی اکثریت چاہیے ہوگی، جو ۵۶ء کے دستور کے تحت ان کو آسانی کے ساتھ حاصل نہ ہوسکے گی۔ یہ چیز کم ازکم طوفان خیز سیاسی موڈ کی شدت کو کم کرے گی‘‘۔

اسی گفتگو کے دوران میں نے ان سے ایک جملہ یہ بھی کہا تھا کہ: ’’دیکھیے اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ سیاست کی جتنی فکر آپ کررہے ہیں، اس میں ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ قوموں کی اصلاح ڈنڈے کے زور پر نہیں ہوتی، اس لیے یہاں پر بھی یہ اصلاح مارشل لا سے نہیں ہوگی۔ اگر مارشل لا سے یا ڈنڈے کے زور سے قوموں کی اصلاح ہونا ایک فطری عمل ہوتا تو اللہ تعالیٰ پھر انبیاے علیہم السلام کو مبعوث نہ کرتا، بلکہ فیلڈ مارشل مبعوث کیا کرتا‘‘۔ یہ بات سن کر جنرل یحییٰ صاحب نے اچانک اپنی گھنی بوجھل پلکیں اٹھا کر گہری نظروں سے مجھے دیکھا، مگر کچھ جواب نہ دیا۔

اصلاحِ معاشرہ کے بارے میں میرا یہ بہت پرانا نقطۂ نظر ہے۔ آج بھی یہی کہتا ہوں کہ لوگوں کی اصلاح کے لیے راستہ ان کے دل ودماغ سے جاتا ہے۔ کوڑوں، صلیبوں اور مارشل لا کے ضابطوں سے عام انسانوں کی اصلاح کا راستہ نہیں بنتا۔ بڑے بڑے مطلق العنان حکمران گزر چکے ہیں، مگر وہ قوم کو اس راستے پر نہیں لگا سکے، جب کہ ان کے برعکس انبیا علیہم السلام نے دل ودماغ کو اپیل کرکے اصلاح کی تھی، اور ان کی اصلاح دیرپا ثابت ہوئی۔ جنرل یحییٰ صاحب نے تحمل کے ساتھ ہماری بات سنی اور نوٹ بھی کرلی، لیکن انھیں

اس بات پر عمل نہیں کرنا تھا۔

جنرل یحییٰ نے بعدازاں، لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) جاری کیا۔ پھر اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے یکم جولائی ۷۰ء کو مغربی پاکستان کا ون یونٹ توڑ دیا۔ حالانکہ اتنا بڑا دستوری کام قوم کے منتخب نمایندوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ دستور میں اصل مسائل تو صوبوں ہی سے متعلق تھے۔ دیگر مسائل پر دستور میں کوئی بڑا جھگڑا نہیں تھا۔ پارلیمانی جمہوری نظام اور دوسری چیزوں پر تو اتفاق تھا۔

دوسرا یہ کہ انھوں نے parity (نیابتی مساوات) کا اصول توڑ کر مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کو بحال کر دیا۔ پھر انھوں نے کچھ شرائط عاید کر دیں اور ساتھ یہ بھی کہا کہ دستور سازی کے لیے ایک سو بیس دن کی مدت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ان شرائط کو کون نافذ کرے گا۔ جو لوگ منتخب ہو کر آئیں گے، وہ عوام کے نمایندے ہوں گے۔ اگر وہ ان شرائط کو نہ ملحوظ رکھنا چاہیں تو ایک غیر منتخب اتھارٹی (مقتدرہ) انھیں کس اخلاقی اور قانونی ضابطے کے تحت مجبور کر سکے گی؟

تیسرا یہ کہ اگر دستور پہلے بنانا ہوگا اور انتقال اقتدار بعد میں ہوگا تو پھر یہ دستور کبھی نہ بنے گا۔ کیونکہ اقتدار کی چاشنی یا اقتدار میں ہونا بذات خود اس چیز پر مجبور کرتا ہے کہ سنبھل کر چلا جائے اور اقتدار گنوایا نہ جائے۔ اقتدار اگر آپ کے پاس ہوگا اور دوسرے لوگ منتخب ہو کر آئیں گے تو اس طرح فطری ٹھیراؤ نہیں پیدا ہو سکے گا۔ جن بنیادوں پر وہ لوگ عوام سے اختیار (مینڈیٹ) لے کر آئیں گے، انھی بنیادوں پر ہی وہ لڑتے رہیں گے اور دستور کبھی نہیں بن سکے گا۔

مارشل لا حکام سے ملاقاتیں

جنرل یحییٰ خان کے مارشل لا سے قبل بالعموم دوسری حکومتوں نے، اور بالخصوص ایوب حکومت (۶۹-۱۹۵۸ء) نے سیاسی پارٹیوں سے میل ملاقات کو بڑا محدود رکھا تھا۔ وزیراعظم چودھری محمد علی صاحب نے مولانا مودودی سے کچھ ربط رکھا، جس میں ان کے

ذاتی تعلقات کو زیادہ دخل تھا۔

۶۵ء میں جنگ شروع ہوئی اور پھر جب ایوب خان صاحب نے بھارت سے جنگ بندی کا فیصلہ کیا تو ان دو مواقع پر گورنر عبدالمنعم خان نے مشرقی پاکستان کے تمام سرکردہ سیاسی لیڈروں کو گورنر ہاؤس میں بلایا اور ان سے گفتگو ہوئی۔ جماعت کی طرف سے میں، غلام اعظم صاحب اور عبدالرحیم صاحب شریک ہوئے۔ ان مواقع پر گورنر صاحب سے کچھ زیادہ بات نہیں ہوسکی تھی۔ ستمبر ۶۵ء کی جنگ شروع ہوتے ہی جو پہلا اجلاس ہوا، اس میں لوگوں نے حکومت کی مکمل حمایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم آپ کے ساتھ ہیں''۔

لیکن دوسری ملاقات میں ان سیاسی رہنماؤں نے جنگ بندی کی ذمہ داری لینے سے انکار کردیا تھا۔ یہ سب لوگ بڑے ہوشیار تھے۔ انھوں نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا: ''آپ بلاشرکت غیرے حکمران ہیں۔ فوجی، سیاسی اور خارجہ امور آپ ہی کی دسترس میں ہیں، اس لیے جو مناسب سمجھتے ہیں، کرلیجیے۔ ہمارے کندھے پر رکھ کر بندوق کیوں چلانا چاہتے ہیں''۔ اس اجلاس کے بعد ایوب حکومت کے خاتمے تک حکومتی سطح کے کسی اجلاس میں ہم نے شرکت نہیں کی۔

جب جنرل یحییٰ صاحب نے مارشل لا لگایا، تو مارشل لا حکام نے تمام سیاسی پارٹیوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ فیاض الدین صاحب ڈھاکہ چھاؤنی کے علاقے میں رہتے تھے۔ کنٹونمنٹ بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ آرمی آفیسرز سے انھیں تعارف حاصل تھا۔ ان دنوں میجر جنرل مظفرالدین صاحب ۱۴ ڈویژن کے انچارج تھے۔ اسی لیے وہی مشرقی پاکستان کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے، جب کہ میجر جنرل راؤ فرمان علی صاحب ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے۔ میرا خیال ہے ضلع ڈھاکہ کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر غلام جیلانی خان تھے (جو بعد میں انٹرسروسز انٹیلی جنس کے چیف بنے اور جنرل محمد ضیاء الحق کے مارشل لا میں پنجاب کے طاقت ور گورنر رہے)۔

انتظامیہ سمجھتی تھی کہ عوامی لیگ کا اثر بہت گہرا ہے، اس کے چھے نکات علاحدگی کا پروگرام ہیں۔ اس لیے وہ ایک پاکستان کی حامی قوتوں سے صلاح مشورہ اور تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس ربط میں مسلم لیگ پیش پیش تھی، اس کے لوگ مارشل لا حکام سے تعلقات پر بڑے نازاں و فرحاں تھے۔ ان رہنماؤں میں خواجہ خیرالدین صاحب اور شفیق الاسلام مسلم لیگ کی نمایندگی کرتے تھے۔ یہ لوگ آگے بڑھ چڑھ کر مارشل لا حکام سے ربط رکھتے تھے۔ اس دوران میں انتظامیہ کی خواہش پر ہماری ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ کبھی میں اکیلا اور کبھی اعظم صاحب کے ساتھ ملنے گیا۔ زیادہ ملاقاتیں ۱۹۶۹ء میں ہوئیں۔

میجر جنرل مظفرالدین صاحب تھوڑے عرصہ تک گورنر [مارچ تا اگست ۱۹۶۹ء] رہے، ان سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن زیادہ تر ملنے کا اتفاق میجر جنرل راوٴ فرمان علی صاحب سے ہوا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے گورنر [ستمبر ۶۹ء تا مارچ ۱۹۷۱ء] ایڈمرل ایس ایم احسن صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ احسن صاحب کو میں نے ایک بڑا نفیس اور رکھ رکھاوٴ والا، شریف النفس اور راست باز انسان پایا۔ ان کے بارے میں میری رائے بڑی اچھی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہت تپاک اور بڑے اخلاق سے ملتے تھے یا گورنر ہونے کے باوجود باہر نکل کے ہم کو گاڑی تک رخصت کرنے آتے تھے۔ اگرچہ ان چیزوں کا بھی اچھا تاثر یقیناً موجود تھا۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ جو مسائل اُٹھتے، یا ان سے جس قدر بات چیت ہوتی تھی، اس میں ان کا رویہ مخلصانہ اور ہمدردانہ ہوتا تھا۔ مجھے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوا، کہ وہ ایک ہوشیار آدمی کی طرح ہمارے تعاون کو استعمال کر کے اپنے حکومتی مقاصد کا فروغ چاہتے ہیں۔

اسی طرح راوٴ فرمان علی صاحب کو اسلام اور جماعت اسلامی کے بارے میں خاصی واقفیت حاصل تھی۔ وہ بھی ایک بہت سمجھ دار، صاحبِ مطالعہ اور اچھے انسان تھے۔ ان سے بے شمار موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ ان سب ملاقاتوں میں مجموعی طور پر میرا تاثر یہ بنا تھا، کہ مارشل لا والوں کا حقیقی رجحان یہ ہے کہ مسلم لیگ کی کامیابی و مضبوطی کے لیے

مالی اور عملی سطح پر امداد کی جائے۔

اس وقت سے لے کر جنرل ضیاء الحق صاحب کے مارشل لا (۱۹۷۷ء) تک یہی پوزیشن رہی ہے۔ پیر پگاڑا صاحب اکثر جنرل ہیڈ کوارٹرز اور مسلم لیگ کے جن گہرے تعلقات کا ذکر کرتے رہے ہیں، وہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان میں ہر جگہ مسلم لیگ کا ان سے اچھا رابطہ تھا، اور درونِ پردہ بھی ربط تھا۔ بلکہ میں کہوں گا ساز باز بھی تھی اور وہ مسلم لیگ ہی کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ صاحب کی کونسل مسلم لیگ اور عبدالقیوم خان صاحب کی قیوم مسلم لیگ ان کی پسندیدہ پارٹیاں تھیں۔ اس سے پہلے بھی 'خفیہ' اشارے پر راتوں رات بننے والی ری پبلکن پارٹی اور پھر ایوب خان کے مارشل لا میں قائم ہونے والی کنونشن مسلم لیگ میں، مسلم لیگ ہی کے باقیات نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ پاکستان میں اس کردار کو ادا کرنے کے لیے کم وبیش ہر دور میں مسلم لیگ کی 'مستعدی' قابلِ ذکر چیز ہے۔

ایک جسارت

اسی دوران میں نے ایک اور جسارت کی جو ریکارڈ پر نہیں ہے، لیکن اپنی جگہ بڑی اہم تھی، کیونکہ اس نے جماعت کی تاریخ پر بڑا اثر ڈالا۔

ایک عرصے سے میں یہ بات محسوس کر رہا تھا، کہ مشرقی پاکستان جماعت میں جب بھی استصواب راے ہوتا ہے، عبدالرحیم صاحب کو اکثریت ملتی ہے۔ بلاشبہہ علم وفضل میں وہ بلند پایہ اور محترم بزرگ ہیں، مگر اس کے باوجود، بدلے ہوئے حالات میں جماعت کو ایک تحریک کے طور پر آگے بڑھانے میں زیادہ مؤثر کردار ادا کرنا، ان کے لیے دشوار ہے۔ اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں، کیونکہ ان میں جو صلاحیت ہے، تحریک کے لیے وہ اس کا بہترین استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس پروفیسر غلام اعظم صاحب اس بات کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور میدان میں زیادہ مؤثر ہوسکتے ہیں، مگر وہ صوبائی امیر نہیں ہیں۔ ان کے ہاتھ میں نظم کا سٹیرنگ نہیں ہے۔ جس کے ہاتھ میں پارٹی کا سٹیرنگ ہو تو وہ اپنی

بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہے۔ خاص طور پر جماعت کا جو مزاج اور نظام ہے، اس میں امیر کی پوزیشن سب سے محترم ہوتی ہے۔ سب لوگ امیر ہی کی طرف دیکھتے، سنتے اور اس کی بات مانتے ہیں۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، چیلنج بڑا ہمہ گیر تھا اور اس صورت حال میں غلام اعظم صاحب کے لیے مشکل تھا، کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنا رول ادا کرتے، یہ بات انھوں نے کبھی نہیں کہی تھی، بلکہ یہ میرا ذاتی طور پر اندازہ تھا۔

اس وقت تک سوچنے کے باوجود میں نے اس مسئلے پر کبھی کوئی بہت زیادہ غور کر کے تجزیہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں شیخ فقیر حسین صاحب ڈھاکہ آئے۔ وہ جماعت کے ابتدائی ارکان میں سے تھے، وہ مولانا مودودی کے بہت قریب تھے۔ شیخ صاحب مرکزی بیت المال کے ناظم تھے۔ اگرچہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے، تاہم اقتصادی اور حسابی اُمور کے اندر بہت اچھے، دیانت دار اور قابلِ اعتماد انسان تھے۔ ان کا کردار بڑا اچھا تھا، شخصیت میں پاکیزگی اور مزاج میں بذلہ سنجی تھی۔ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے اچھے، شگفتہ اور پُرمعنی جملے کہا کرتے تھے، جن میں بڑی گہرائی اور حقیقت ہوتی تھی۔ وہ ڈھاکہ جماعت کے بیت المال کا آڈٹ کر رہے تھے۔ ان سے میری ملاقات ہوتی رہتی تھی، کیونکہ ان کو بعض اخراجات میں امیر سے وضاحت کی ضرورت ہوتی تھی۔

ایک دن ملاقات میں شیخ فقیر حسین صاحب بڑے شگفتہ لہجے میں کہنے لگے کہ ''لوگ کہتے ہیں، جماعت میں کنویسنگ نہیں ہے، کوئی امیدوار نہیں ہوتا، بلاشبہہ یہ دونوں باتیں درست ہیں، لیکن اصل میں تو جماعت کے اندر سنگل کینڈیڈیچر سسٹم (یک امیدواری نظام) ہے''۔ ان کی بات سن کر میں ایک دم چونکا کہ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' کہنے لگے: ''دیکھیے، جو آدمی پہلے سے امیر ہے وہ فرد تو ایک امیدوار ہے ہی اور باقی کوئی امیدوار اخلاقی اور دستوری طور پر اس کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اِلّا ماشاء اللہ کوئی دوسرا منتخب بھی نہیں ہوتا''۔

ان کی بات سن کر مجھے ایک دم یہ خیال آیا، کہ اس بات میں صداقت ہے۔ ہر چند کہ امیدواری نظام کے جو بھی نقائص ہوں، مگر ایک آدمی جو پہلے سے منصب پر موجود ہے، لوگوں کی نگاہ تو اسی پر جائے گی۔ اس طرح واقعی لوگوں کے پاس یہ چوائس نہیں ہوتا کہ 'الف' کو منتخب کریں یا 'ب' کو منتخب کریں۔ 'الف' اور 'ب' ان کے پاس آتے بھی نہیں، البتہ امیر کے طور پر 'الف' روز ان کے سامنے آتا ہے۔ اب انھیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ 'الف' کو رکھنا ہے یا اس کو ہٹانا ہے۔ وضع داری کے اس ماحول میں کسی کو ہٹانے کا فیصلہ آدمی آسانی سے نہیں کر پاتا، کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن دو میں سے ایک کو منتخب کرنے کا فیصلہ ذرا آسانی سے کر سکتا ہے۔

البتہ مشاہدے کے دوران محسوس ہوا کہ امریکا جیسے جمہوری ملک میں کہ جہاں پر پڑھے لکھے رائے دہندگان موجود ہیں، وہاں بھی اگر پہلے سے منتخب صدر دوسری مرتبہ امیدوار بن جائے، تو ان میں سے شاید ہی کوئی ہارا ہو۔ دو سو سال میں دوسری ٹرم کے لیے ہارنے والے صدر شاید پانچ چھے ہیں۔ قریبی تاریخ میں جمی کارٹر اور جارج بش دوسری مدت کے انتخابات میں ہارے ہیں۔ روز ویلٹ تو کہیں چار مرتبہ جیتا۔ اس کے بعد امریکی کانگرس نے اس پر پابندی لگا دی کہ دو مدت سے زیادہ کوئی امیدوار نہیں ہو سکتا۔ جب وہاں پر یہ حال تھا تو ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جہاں پر لوگ مروت، احترام اور وضع داری کے باعث کچھ بہت زیادہ غور و فکر بھی نہیں کرتے۔

بعد ازاں اس بات کا مجھے لاہور میں عملی تجربہ بھی ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں امیر شہر کا انتخاب تھا۔ اس وقت لاہور جماعت کے امیر سید اسعد گیلانی صاحب تھے، جو مجھ سے زیادہ سینیر، زیادہ معروف، زیادہ عالم اور متقی انسان تھے اور ہر لحاظ سے مجھ سے بہت آگے تھے۔ اگرچہ اس سیشن میں لوگوں نے میرے لیے رائے دی اور میں لاہور جماعت کا امیر منتخب ہو گیا۔ انتخاب سے پہلے ایک روز میں دفتر گیا، وہاں پر لاہور کے مضافات سے ایک ناخواندہ رکن آئے اور پرچہ رائے دہندگی لیتے ہوئے بلا تکلف ناظم دفتر سے پوچھا کہ ''آج کل کون امیر ہے؟''

ناظم دفتر نے کہا کہ ''شاہ صاحب ہیں''۔ کہنے لگے: ''بس ان کے نام کے آگے نشان لگا دیں''۔ انھوں نے وہاں نشان لگا دیا۔

شیخ فقیر حسین صاحب نے جو خیال میرے ذہن میں ڈالا تھا، وہ پکتا رہا۔ اس عرصے میں، اس کی توثیق بھی ہوتی رہی کہ لوگ کس طرح ووٹ دیتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ تھا کہ جب تک کوئی مداخلت نہیں ہوگی، تب تک متبادل شکل نکالنا مشکل ہے۔ اس لیے جماعت کے دستور کی حدود میں رہتے ہوئے ہی کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے تبدیلی کی صورت کیا ہو؟

میری نگاہ میں مولانا عبدالرحیم صاحب کی بڑی عزت اور بڑا احترام تھا۔ خود اُن کو بھی مجھ سے بڑی محبت تھی اور وہ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے کچھ عرصہ بعد وہ جماعت سے الگ ہوگئے تھے۔ میں ڈھاکے گیا، مگر میرے ساتھ ان کا تعلق بڑے احترام کا تھا۔

۱۹۶۳ء میں خورشید بھائی کراچی میں ادارہ معارف اسلامی بنا چکے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی اس کی مرکزی مجلس انتظامیہ میں رکھا تھا۔ ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں ادارہ معارف اسلامی کی شاخ قائم کر دی تھی، جس کا صدر، مولانا عبدالرحیم صاحب کو اور سیکرٹری مجھے مقرر کیا تھا۔ ہم نے ڈھاکہ میں اس کے لیے ایک دفتر لے لیا تھا۔ خواجہ محبوب الٰہی صاحب کی گفتگو میرے اس ارادے کا باعث بنی تھی کہ میں مشرقی پاکستان جاؤں۔ وہ برطانیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی مشرقی پاکستان آچکے تھے۔ وہاں پر ان کی فیکٹری تھی۔ وہ ایک کامیاب تاجر اور بڑے اچھے صنعت کار بنتے جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا مودودی کی معرکہ آرا تفسیر تفہیم القرآن کا بنگلہ میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے انھوں نے مجھے پانچ سو روپے مہینے تک امداد کی پیش کش کی۔ اس زمانے میں پانچ سو روپے مہینہ ایک بڑی رقم تھی۔

جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کے طور پر عبدالرحیم صاحب کو شاید اس کے لگ بھگ

اعزاز یہ ملتا تھا۔ وہ ایک درویش منش انسان تھے۔ ویسے بھی بنگال کے لوگ سادگی پسند ہوتے تھے۔ وہ تفہیم القرآن کا پہلے سے ترجمہ کر رہے تھے، اور اس علمی کام کو وہی کر سکتے تھے۔ اگر میں ان سے یہ کہتا، کہ آپ ہی کچھ لے لیں تو وہ میرے ہاتھ سے لے لیتے اور کام بھی کرتے رہتے۔ اگرچہ ان دنوں بھی صوبے کے زیادہ سے زیادہ دورے پروفیسر غلام اعظم صاحب ہی کرتے تھے، اور عبدالرحیم صاحب گھر پر بیٹھ کر زیادہ تر علمی کام کرتے تھے، کیونکہ ان کا مزاج علمی تھا۔

مشرقی پاکستان میں چار اُمرائے حلقہ تھے: عباس علی خان صاحب تھے، کھلنا سے اے کے یوسف صاحب تھے، چٹاگانگ سے عبدالخالق صاحب تھے اور ڈھاکے سے حفیظ الرحمٰن صاحب تھے۔ میں نے ہمت کر کے پہلے ان چاروں سے بات کی کہ: ''صوبے میں جماعت کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ امارت میں تبدیلی ہو۔ کنویسنگ نہیں ہوسکتی اور ہونی بھی نہیں چاہیے۔ حسب معمول تبدیلی ویسے ہی نہیں ہوسکتی، پچھلے چار پانچ سال کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ اس میں میری تجویز یہ ہے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کو یہ پیش کش کی جائے کہ وہ ہمہ وقتی تفہیم القرآن کے بنگلہ ترجمے کا کام اپنے ذمے لے لیں، اس علمی کام میں ان کے لیے بھی کشش ہوگی۔ اگر وہ اس کے لیے دست بردار ہوجائیں گے، تو انتخاب میں خودبخود غلام اعظم صاحب امیر صوبہ منتخب ہوجائیں گے''۔ ان چاروں نے اس بات سے اتفاق کیا۔

مسئلہ بڑا نازک تھا، مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا اور ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ یہ تبدیلی تنظیمی، دعوتی اور سیاسی نقطۂ نظر سے جماعت کے مفاد میں ہے۔ سب نے کہا: مولانا مودودی سے مشورہ کیا جائے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ: ''آپ ہی لاہور جا کر مولانا سے بات کریں''۔ اکثر ایسے نازک موقعوں پر وہاں کے دوست بھی مجھے آگے کر دیتے تھے، یہاں بھی کر دیتے ہیں، خود بات نہیں کر پاتے۔ میں نے مولانا مودودی کے سامنے پوری صورت حال رکھی اور کہا کہ ''یہ اس کا حل ہے''۔ اپنی محتاط طبیعت کے تحت وہ زیادہ نہیں بولتے تھے، بلکہ ان کو کچھ بولنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ

''ہاں ٹھیک ہے، آپ لوگ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ کرلیں''۔ انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، یہ نہیں کہا کہ ہم کوئی غیردستوری کارروائی کر رہے ہیں۔ ایک لحاظ سے اگرچہ یہ غیردستوری تو نہیں تھی، مگر مجھ کو اعتراف ہے کہ اپنی روح میں یہ کارروائی دستور سے ٹکراتی تھی۔

واپس آ کر میں نے عبدالرحیم صاحب سے بات کی کہ تفہیم کا کام بھی بڑا اہم ہے۔ اگرچہ پوری جماعت کو چلانا اہم ہے، تاہم تفہیم کا ترجمہ بنگلہ میں ہوجائے تو اس کے بھی بڑے مثبت اثرات پڑیں گے۔ آپ اس کام کو پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آپ اس وقت 'ادارہ معارف اسلامی' کے اعزازی صدر ہیں، اس صورت میں ہمہ وقتی صدر بن جائیں اور صرف تفہیم القرآن کے ترجمے کا کام کریں۔ آپ مزید جتنے علمی کام کررہے ہیں، یا تصنیف و تالیف کے مختلف کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، وہ بھی کریں۔ لیکن آپ یہ طے کرلیں کہ تین چار سال میں تفہیم کا ترجمہ مکمل کرلیں گے۔ ظاہر ہے جماعت کی تنظیمی ذمہ داریوں کے ساتھ یہ کام نہیں ہوسکے گا''۔

انھوں نے بہت خوش دلی سے اس تجویز کو مان لیا۔ انھیں شبہ تک نہیں ہوا کہ میں یہ بات ایک علمی کام کی تکمیل کے ساتھ ان پر سے تنظیمی بوجھ ختم کرنے کے لیے بھی کررہا ہوں۔ انھوں نے اس بات پر عمل درآمد کے لیے پورا ساتھ دیتے ہوئے کہا کہ ''ہاں ٹھیک ہے''۔ پھر یہ تجویز میں نے صوبائی شوریٰ کے سامنے رکھ دی۔ انھوں نے وہاں پر اسی خوش دلی کے ساتھ امارت سے اپنا استعفا پیش کردیا۔ غلام اعظم صاحب قائم مقام امیر ہوگئے، اور جب انتخاب ہوا تو وہ باقاعدہ امیر منتخب ہوگئے۔

یہ واقعہ ان تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ پر نہیں ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے کچھ عرصے بعد، مولانا عبدالرحیم صاحب کا جماعت اسلامی بنگلہ دیش سے اختلاف ہوا، وہ الگ ہوگئے اور اسلامک ڈیموکریٹک لیگ (IDL) بنائی۔ چند سال پہلے سننے میں آیا کہ ان کے داماد، عزیزالرحمٰن صاحب ایڈیٹر جہانِ نو ڈھاکہ نے کہیں یہ بات کی، کہ خرم نے سازش کرکے

عبدالرحیم صاحب کو امارت سے ہٹایا تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ جن لوگوں کے مشورے سے یہ تجویز آگے بڑھی، ان میں یہ تمام لوگ سو فی صد بے تعصب تھے۔ کسی نے اس بات کو سازش سمجھ کر کام نہیں کیا۔

اس پورے مسئلے میں غلام اعظم صاحب سے تو مشورہ تک بھی نہ ہوا۔ امیر جماعت مولانا مودودی سے مشاورت ہوئی، پھر مشرقی پاکستان میں جماعت کے ڈویژنل امراء سے مشورہ ہوا، اور انھیں ایک بہتر متبادل کام سونپا۔ اس چیز کو سب نے خوش آمدید کہا۔ اگرچہ سوچنے اور سمجھنے والے سبھی لوگ تبدیلی چاہتے تھے۔ لیکن جماعت کے نظام میں اس تبدیلی کا کوئی راستہ نہیں تھا کہ جس پر عمل کرتے ہوئے یہ کام ہوسکتا۔ بہرحال اسی سال مولانا عبدالرحیم صاحب جماعت کے مرکزی نائب امیر مقرر ہوئے۔

۱۹۶۹ء کی پہلی ششماہی میں یہ تبدیلی آئی۔ جماعت کا کام ڈھاکے میں برابر بڑھتا رہا۔ مالیات، دعوتی کام اور کارکن بھی بڑھتے رہے۔ قومی انتخابات کے دوران ہماری سرگرمیوں کا ہمارے کام پر بڑا اچھا اثر پڑا۔

عبدالمالک کی شہادت

پاکستان کی وحدانیت، پاکستان کی سالمیت اور چھے نکات کے بارے میں جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کا موقف بالکل واضح، صاف اور دوٹوک تھا۔ اس کھرے موقف میں کوئی لگی لپٹی نہیں تھی۔ کسی قسم کی مداہنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان تینوں چیزوں سے بھی زیادہ پختہ موقف اسلام کے ساتھ وابستگی کا تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی مخالفت میں، عوامی لیگ کی حامی اسٹوڈنٹس لیگ (چھاترو لیگ EPSL) اور نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کی حامی اسٹوڈنٹس یونین (چھاترو یونین EPSU) یک جان تھیں۔ اگرچہ ان دونوں تنظیموں میں اکثر معرکہ رہتا، لیکن جمعیت کی مخالفت بہرحال ان کا واحد نکتہ اتحاد و اتفاق تھا۔ جمعیت کی دعوت اور تنظیم کے پھیلاؤ کو وہ اپنے مخصوص قوم پرستانہ اور سوشلسٹ نظریات کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کی جانب سے جمعیت پر چھوٹے موٹے حملوں اور

زیادتیوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔

جنرل یحییٰ خان کی مارشل لا حکومت نے ایئر مارشل نور خان صاحب کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی، جس نے پاکستانی نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لیے ایک رپورٹ پر کام شروع کیا۔ نور خان صاحب نے ماہرین تعلیم سے تجاویز مانگیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے ان سے ملاقات کی اور اپنی تعلیمی تجاویز دیں۔ آخرکار انھوں نے ایک 'نئی تعلیمی پالیسی' کا اعلان کیا۔ اس پالیسی میں بیش تر اطمینان بخش پہلو تھے، اور کچھ غیر اطمینان بخش نکات بھی تھے۔ مشرقی پاکستان کی بنگلہ قوم پرست اور کمیونسٹ طلبہ تحریک نے اس تعلیمی رپورٹ کو بنیاد بناتے ہوئے یہ تحریک اٹھائی، کہ ''پاکستان کا نظامِ تعلیم لادینی ہونا چاہیے''۔ ظاہر ہے کہ جمعیت کا نقطۂ نظر اور اس کے پروگرام کا نکتہ ہی یہ تھا، کہ ''اسلامی نظامِ تعلیم کے نفاذ کی عملی تدابیر کرنا''۔

پبلک انتظامیات کے قومی ادارے NIPA نے ڈھاکہ میں ایک سیمینار منعقد کیا۔ اس سیمینار میں ڈھاکہ جمعیت کے ناظم محمد عبدالمالک نے اسلامی نظامِ تعلیم کے حق میں بڑی مؤثر تقریر کی تھی۔ اس کے بعد چھاترو لیگ اور چھاترو یونین نے ڈھاکہ یونی ورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے پلیٹ فارم سے اسی موضوع پر ایک پروگرام کے انعقاد کا اعلان کیا۔

عبدالمالک نے کہا کہ ''اسٹوڈنٹس یونین تمام طلبہ کا پلیٹ فارم ہے، اس لیے آپ یونین کے پروگرام میں ہمیں بھی اپنا نقطۂ نظر ایک تقریر میں پیش کرنے دیں، باقی آپ کی مرضی جس قدر چاہیں اپنی تقریریں رکھیں۔ لیکن انھوں نے اجازت نہیں دی بلکہ عبدالمالک یہ بات کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے، کہ چھاترو یونین اور چھاترو لیگ کے کارکنوں نے ایک مشترکہ حملے میں انھیں تشدد کا نشانہ بنایا، لوہے کے سریوں اور لاٹھیوں سے بری طرح زخمی کر دیا۔ زیادہ ضربیں ان کے سر پر آئیں۔ دو دن بے ہوش رہنے کے بعد وہ ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کو شہید ہوگئے، اِنَّـا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

عبدالمالک کی شہادت کئی پہلوؤں سے بہت بڑا حادثہ تھا۔ ایک تو عبدالمالک کی شخصیت

بڑی ہونہار تھی۔ دوسرے ان کی شخصیت میں جتنی لگن تھی، جتنی دُور اندیشی اور استقامت تھی، فکر میں جتنی راستی اور محنت کی جس قدر عادت تھی، سوچ سمجھ میں جتنی بلندی تھی اور قیادت کی جتنی صلاحیت تھی، اس لحاظ سے ہمیں ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کہ آگے چل کر یہ ایک انمول ہیرا بنے گا اور تحریک اسلامی کو اس سے بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ معلوم نہیں ایسے کتنے لوگ تھے۔ مثال کے طور پر مصطفیٰ شوکت عمران، جہانگیر، شاہ جمال چودھری، محمد الیاس، اور کئی لوگ تھے کہ جن کے بارے میں سب کا یہی خیال تھا کہ یہ بڑے باصلاحیت لوگ ہیں، جو تحریک کا اثاثہ ثابت ہوں گے۔ لیکن ۱۹۷۰ء کا انتخابی طوفان اور ۱۹۷۱ء کا سیلاب ان میں بہت سارے لوگوں کو نگل گیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت کرے، ان پر رحم فرمائے اور ان کی قربانی کو قبول فرمائے۔

محمد عبدالمالک کی شہادت تحریک کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ ہمارے پاس اتنی قوت نہیں تھی کہ اس کا بدلہ لینے کی سوچتے یا قوت ہوتی بھی تو معلوم نہیں ہم سوچتے یا نہ سوچتے۔ اس لیے کہ بدلہ لینے کے ہم علَم بردار نہیں تھے اور نہ پُرتشدد طریقِ کار کے ہم قائل ہیں۔ میں جمعیت سے ربط کا ذمہ دار تھا۔ اس لیے صوبائی جماعت اور جمعیت میں سے کسی کا بھی یہ ذہن نہیں تھا کہ بدلہ لینا ہے، یا بدلہ لینا چاہیے۔

بہرحال اس حادثے کی رپورٹ پولیس کو درج کرا دی گئی۔ اس زیادتی اور ظلم پر مارشل لا حکام سے بھی رابطہ قائم کیا گیا۔ اس وقت ایسا لگتا تھا، جیسے مارشل لا والے جھٹ پٹ ان قاتلوں کو گرفتار کریں گے، مارشل لا عدالت میں مقدمہ چلے گا اور قاتلوں کو پھانسی کی سزا ملے گی۔ لیکن مجھے اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی مجھے اس انجام سے نہ کبھی پہلے خوشی ہوئی اور نہ آج کوئی خوشی ہوتی ہے، کہ ایک کو مارنے کے بعد دوسرا بھی تختہ دار پہ چڑھ جائے اور زندگی سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس لیے کہ جب تک آدمی جہالت اور ناواقفیت میں کوئی جرم کر رہا ہے اور وہ زندہ رہتا ہے، تو اس کے ہدایت پانے اور حق پر آنے کے کچھ نہ کچھ امکانات موجود رہتے ہیں۔ اسوۂ رسولؐ سے بھی یہی چیز ثابت ہے۔

اس لیے میں بڑی شدت کے ساتھ اس اسپرٹ کو اپنے اندر جذب کر چکا ہوں کہ ربنا اھد قومی انھم لا یعلمون (اے ہمارے رب، میری قوم کو ہدایت دے کہ یہ علم نہیں رکھتی) اس لیے ہر چھوٹے بڑے واقعے پر چراغ زیرپا ہو جانا، ہر ایک کا سر چاہنا، انتقام کے جوش اور غضب میں اُبلنا، سلگنا اور پھر بھڑک اُٹھنا محض جہالت اور ناسمجھی ہے، دین سے عدمِ واقفیت کی بات ہے، قرآن سے بے تعلقی اور سنت رسولؐ سے دُوری کی دلیل ہے۔ یہ رویہ ہم جیسی ایک دعوتی اور دینی تحریک کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔ اس تحریک کے لیے انتقامی سوچ کبھی بھی سازگار ثابت نہیں ہوسکتی۔ جب کبھی اور جہاں بھی ایسی کوئی سوچ پیدا ہوتی دکھائی دے، اہلِ نظم بلکہ ہر کارکن کو آگے بڑھ کر اس کے سامنے دیوار بن جانا چاہیے۔

عبدالمالک کے قتل کا مقدمہ درج کرا دیا گیا۔ ہماری طرف سے انتظامیہ اور مارشل لا حکام پر دباؤ بڑھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ جس ملک کے اہلِ سیاست اور اصحابِ عدل کو اس بات کی پروا نہیں کہ مارشل لا کیوں لگ گیا، وہاں کے لوگ بھلا ایک غریب خاندان کے عبدالمالک کے بے گناہ خون پر کیوں تڑپیں گے؟

عبدالمالک کی شہادت اس اعتبار سے بڑا اہم واقعہ تھا، کہ تحریک اسلامی پر اس کے بڑے گہرے اثرات پڑے۔ یہ خون کا پہلا قطرہ تھا، جو کہ اس دور میں اللہ اور اللہ کے دین کی خاطر اس زمین پر گرا اور جذب ہو گیا۔ وہ زمین کہ جہاں پر اب تک سارا خون قوم، وطن اور زبان کے نام پر بہہ رہا تھا اور بہایا جا رہا تھا، یہ شہادت ایک منفرد شان رکھتی تھی۔ عبدالمالک، ڈھاکہ جمعیت کے ناظم کی حیثیت سے میرے بہت قریبی ساتھی تھے۔ چنانچہ ان کی یاد تازہ کرنے اور سبق لینے کے لیے ہم نے ایک بڑا اجتماع بلایا۔ سبھی کے دل متاثر تھے اور تمام لوگ رو رہے تھے۔ یہ اجتماع اس لیے بلایا تھا، تاکہ ان کے سامنے یہ بات رکھی جاسکے، کہ ایسی صورت میں صحیح روش کیا ہے؟

میں نے اس موقع پر اپنے محبوب رفقا سے یہ بات کہی تھی:

''بے شک میرا دل رنجیدہ اور غمگین ہے، عبدِ مَالِک کے چلے جانے سے ہم مغموم ہیں۔ ایسا ہیرا جس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، ہم میں سے وہ لڑکا چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس پر جتنا بھی غم محسوس کیا جائے، کم ہے۔ لیکن میں تو اس پر خوش بھی ہوں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ دور جب نوجوان، مقام ومرتبے، معاش اور ترقی کے پیچھے جانیں قربان کرتے ہیں اور اگر کچھ آئیڈیل سوجھتا ہے تو، وہ زبان کا مسئلہ، معاشی حقوق اور معاشی انصاف کے لیے جانیں قربان کرنے کی سوچ ہے۔ اس سنہرے بنگال کے بے شمار نوجوان اسی حالت سے گزر رہے ہیں۔ انھی نوجوانوں میں سے ایک عبدالمالک تھے کہ جنھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس مقصد کے لیے آواز بلند کی، کہ جس موقف کو لے کر وہ چل رہے تھے وہ موقف اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا کا حصول تھا۔ اس جدوجہد میں خون کا یہ جو ایک قطرہ اس سرزمین پر گرا ہے، اس سے مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ یہ سرسبز وشاداب ہوگا، اور اس سے ایک بہت بڑی فصل اُگے گی''____

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ مستقبل قریب میں یعنی سال ڈیڑھ سال میں ان شہدا و صالحین کا ابھی کتنا مزید خون بہنے والا ہے۔ میں نے کہا کہ:

''کوئی اس جذبے کا مقابلہ نہیں کرسکے گا، ان شاء اللہ۔ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی مر نہیں سکتا۔ اسلام کی حمایت کے 'جرم' میں انسان اگر دشمنوں کے ہاتھ نہ بھی مارا جائے، تو اس کے باوجود موت آنی ہے اور پھر موت اس طرح آتی ہے کہ آدمی بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے، ٹریفک کے حادثات میں بھی مر جاتا ہے۔ اس لیے کسی کے بارے میں یہ نہ کہو کہ، کاش! یہ اگر ہمارے پاس ہوتا یا کاش، یہ واقعہ نہ ہوتا تو وہ بچ جاتا۔ یہ بات سمجھ لیں کہ عبدالمالک کا آخری وقت آ گیا تھا۔ اس لیے اس کو تو جانا ہی تھا، اس جگہ جانا تھا اور اسی طرح سے جانا تھا۔ اپنے اس عزیز اور محترم ساتھی کے غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے پوری یک سُوئی سے کام کریں۔ تا کہ لوگ ایسی ناسمجھی اور جہالت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے ایک دوسرے کا احترام کریں،

ایک دوسرے کی بات سمجھیں، اور حق کے علَم بردار بنیں'' وغیرہ وغیرہ۔ اس بات کا لوگوں نے اچھا اثر لیا۔

یہ شہادت اور ایک مخالف

عبدالمالک کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور بڑے اہم واقعے کا تذکرہ ضروری ہے۔ جس سے میرے اس اسلوب پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح تحریک کو چلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ وہ پہلو ہے جس سے انسانی فطرت کے بڑے اہم پہلو سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے ایفا ہونے پر بھی ایمان پختہ ہوتا ہے۔

عبدالمالک کی شہادت کے چند روز بعد ابوالمنصور صاحب (عوامی لیگ کے تیسرے اہم رہنما، حسین شہید سہروردی صاحب کے دست راست اور ان کے ہمراہ نائب وزیراعظم رہ چکے تھے) کا بیٹا منظور انعام جو اے سی ای کمپنی میں میرے دفتر کے انسپکشن ونگ میں کام کرتا تھا، دوسرے یا تیسرے روز صبح سویرے میرے دفتر آیا۔ وہ تقریباً رو رہا تھا۔ میں نے پوچھا: ''منظور بھائی، کیا بات ہے، کیا ہوا؟'' کہنے لگا: ''میرا چھوٹا بھائی، جو بھاشانی صاحب کی چھاترو یونین (EPSU) کا رکن ہے۔ جمعیت نے اس کا نام بھی عبدالمالک کے قتل کی ایف آئی آر (رپورٹ) میں درج کرا دیا ہے۔ حالانکہ وہ اس حملے کے وقت موجود نہیں تھا''۔ یہ لڑکا غالباً اس تنظیم کا سیکرٹری تھا۔

ان کو یہ خوف تھا، کہ آج مارشل لا والے اسے پکڑیں گے، کل فوجی عدالت جمے گی اور پرسوں وہ قتل کے جرم میں پھانسی پر لٹک جائے گا۔ ایک عام آدمی کی سوچ اسی جمع تفریق کے گرد گھومتی ہے۔ اسی لیے وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ خود میں بھی اس کی یہ بات سن کر بہت پریشان ہوا، کیونکہ قتل کی رپورٹ پولیس کے سامنے درج کرائی جا چکی تھی، جس میں اس لڑکے کا نام شامل تھا۔ جمعیت والے بھی سخت زخم خوردہ تھے، ان کا نہایت عزیز ساتھی اور رہنما دن دہاڑے بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ان سے سفارش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس معاملے کو کیسے حل کیا جائے؟ ــــ میں نے سوچا کہ انصاف، دیانت اور شفقت کے جو اصول قرآن نے سکھائے ہیں، ہمیں اسی کی بنیاد پر آگے بڑھنا چاہیے۔ لمحہ بھر توقف کے بعد میں نے بڑے تحمل کے ساتھ اس سے کہا: ''دیکھو منظور، اگر تمھاری بات صحیح ہے کہ تمھارا بھائی وہاں موجود نہیں تھا، تو میں تمھیں لکھ کر دیتا ہوں کہ اس کے خلاف کارروائی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر مجھے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ لڑکا وہاں پر موجود تھا، کیونکہ جمعیت والے مجھ سے ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے، میں اس کی پوری تحقیق کروں گا، تو پھر یاد رکھو، اگر میرا سگا بھائی بھی وہاں ہوتا تو میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا''۔ اس بات سے وہ بہت متاثر ہوا۔ حالانکہ میں نے ایک طرح سے انکار بھی کیا تھا، اقرار بھی کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ''ہاں ٹھیک ہے آپ دیکھ لیں کہ وہ وہاں پر نہیں تھا، آپ کو جمعیت والے خود بتا دیں گے''۔

عبدالمالک کی شہادت کے بعد شاہ جمال ڈھاکہ جمعیت کے ناظم منتخب ہوئے تھے۔ یہ سلہٹ کے رہنے والے تھے، بڑے ذہین اور پختہ کار۔ یہ جمعیت کے بڑے مستقل مزاج، سدابہار شگفتہ اور بڑے نمایاں کارکنوں میں سے تھے۔ مجھ سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ چونکہ وہ عبدالمالک کے ساتھ جمعیت کے معتمد (سیکرٹری) تھے، اس لیے پولیس رپورٹ انھی کے نام سے درج ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے شاہ جمال کو بلایا اور ساری بات اس کو بتادی کہ ''اس کے گھر والے کہتے ہیں کہ وہ لڑکا وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن آپ کی پولیس رپورٹ میں اس کا نام ہے، آپ ذرا مجھے تحقیق کر کے بتائیں کہ حقیقی صورت حال کیا ہے''۔

انھوں نے ایک دو روز میں تحقیق کر کے مجھے بتایا کہ ''ہاں، یہ بات صحیح ہے کہ وہ لڑکا وہاں موجود نہیں تھا''۔ میں نے کہا: ''بھئی، پھر اس کا نام پولیس رپورٹ میں کیسے آ گیا، جب کہ وہ وہاں پر نہیں تھا؟ پولیس رپورٹ تو ایک قسم کی شہادت ہے۔ رپورٹ لکھواتے وقت کسی کو غلط طور پر نہیں پھانسا جاسکتا''۔ کہنے لگے: ''ہم تو بالکل حواس باختہ تھے۔ ہمارے وکیل بیرسٹر قربان علی صاحب کو کارکن جو جو نام بتاتے گئے، وہ لکھتے رہے۔

اسی طرح یہ پولیس رپورٹ درج فائل ہوئی ہے۔ ویسے یہ لڑکا جمعیت کے خلاف بڑا پُرجوش ہے۔ اسی پس منظر میں کسی کارکن نے اس کا نام دے دیا ہوگا''۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ قتل کے مقدمے میں پہلی پولیس رپورٹ (ایف آئی آر) کی بڑی اہمیت ہے، جس سے کسی کا نام نکلوانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر مارشل لا حکام سے میں بات کرتا تو یہ اور زیادہ مشکل ہوتا۔ اس لیے میں نے شاہ جمال چودھری سے کہا: ''دیکھو یہ تو پھر جھوٹی گواہی ہوئی نا۔ ایمان لانے کے بعد جھوٹی شہادت سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے کسی فرد کا نام غلط طور پر لکھوانا جھوٹی گواہی کے ہی دائرے میں آتا ہے۔ تم کو عدالت میں جا کر حلفیہ طور پر یہ بیان دینا ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں، کہ جنھوں نے عبدالمالک کو میری نگاہوں کے سامنے قتل کیا ہے، اور اب تم خود جانتے ہو کہ وہ لڑکا ان قاتلوں میں نہیں تھا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تم کو یہ بیان نہیں دینا چاہیے اور سچ بات کہنی چاہیے''—— ایسی سچ بات کہنے کا صاف مطلب یہ تھا کہ خود مدعی پر بھی مقدمہ چل سکتا تھا اور اس کو بھی سزا ہو سکتی تھی۔

اسی دوران میں نے فوج کے ایک دو افسروں سے بات کی۔ انھوں نے یہی کہا کہ ''جب مقدمے کی سماعت ہوگی تو ہم ان کو سزا دیں گے، کہ انھوں نے جھوٹی رپورٹ کیوں درج کرائی''۔ بہرحال، شاہ جمال بے چارہ اتنا پیارا اور نیک دل لڑکا تھا اور جمعیت کے باقی لڑکے بھی اسی طرح خداترس اور کہنا ماننے والے تھے، کہ ان میں خودسری اور ہٹ دھرمی نام کو نہ تھی۔ شاہ جمال نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے مراد بھائی، ہمیں سچ بولنے کا حکم ہے، اس لیے سچ تو بولنا ہی ہوگا، آپ جس طرح کہتے ہیں، میں ویسا ہی کہوں گا، کہ وہ لڑکا وہاں پر موجود نہیں تھا۔ اب اس سے چاہے مالک بھائی کا مقدمہ قتل کمزور پڑے یا اُلٹا مجھے سزا ملے، میں خوش دلی سے سب کچھ قبول کروں گا''۔ شاہ جمال کی یہ بات سن کر میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

میں نے یہ بات اسی شام منظور انعام کو بتا دی، اور کہا کہ ''اس وقت میں اسی حد تک

کرسکتا ہوں۔ جب اس مقدمہ کی سماعت عدالت میں ہوگی، اس وقت میں اپنی ہر کوشش کروں گا۔ آپ اپنے بھائی کو میرا چھوٹا بھائی سمجھیں یا بیٹا۔ لیکن جہاں تک حفاظت کا تعلق ہے، انسانی بس میں جس قدر بھی ممکن ہوا، میں آپ کے بھائی کی حفاظت کروں گا''۔ یہ بات سننے کے بعد منظور نے مجھے اپنے بڑے بھائی محبوب انعام سے اور پھر اپنے والد ابوالمنصور صاحب سے ملوایا۔ اس واقعے کے بعد میں ان کے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے متعارف ہوگیا۔ حالانکہ جماعت اسلامی اور عوامی لیگ کی تو بہت پرانی مخاصمت تھی، دونوں کے درمیان تنازعہ تھا۔ دھان منڈی میں جس سڑک پر میرا مکان تھا، دو سڑک چھوڑ کر، ان کا مکان تھا۔ اس کے بعد ان سے میل جول، گفتگو اور لٹریچر پر تبادلۂ خیال چلتا رہا۔ ان کے بڑے بیٹے محبوب انعام پاکستان نیشنل آئل میں بڑے عہدے پہ تھے۔ ان سے بھی ربط بڑھا۔

ایک روز انھوں نے کہا کہ ''معلوم نہیں کس دن مارشل لا والے آجائیں اور اسے گھر سے اُٹھا کر لے جائیں''۔ یہ خبر مشہور تھی کہ مارشل لا والے ملزموں کو گھر سے اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ ''اس لیے کیوں نہ ہم اس کو مغربی پاکستان بھیج دیں''۔ میں نے کہا: ''تم اسے مغربی پاکستان بھیجنے کا بندوبست کرو اور اگر بہت زیادہ بے چینی ہے، تو آپ کچھ روز کے لیے اسے میرے پاس بھیج دیں۔ وہ میرے گھر پر رہے گا۔ میں اس کو پناہ دوں گا، اس کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں''۔ ان کے لیے ایک بڑی غیر معمولی پیش کش تھی، کیونکہ جماعت اسلامی اور بھاشانی صاحب کی پارٹی میں تو اتنی زیادہ دشمنی تھی۔ لیکن میں اس کے لیے تیار تھا کہ فوج سے بچانے کے لیے ان کے نوجوان رہنما کو اپنے گھر میں پناہ دوں۔ چنانچہ وہ میرے گھر آکر تین دن تک رہا۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتا اور گھر کے ایک فرد کی طرح رہتا تھا۔ میں نے اس کی خاطر مدارات کی۔ عباس خلیلی صاحب نے کراچی میں اس کا بندوبست کردیا۔ اسے کراچی بھیج دیا کہ وہاں پر محفوظ رہے گا۔ مارشل لا انتظامیہ نے عبدالمالک قتل کیس میں کیا کارروائی کرنی تھی، اس لیے مقدمہ چلا ہی نہیں۔ مگر ان کا خوف اس قدر زیادہ تھا کہ اس خوف کا مداوا ضروری تھا۔ یہ درست ہے کہ ''برائی

اور بھلائی برابر نہیں ہوتے''۔ اور اس حقیقت کا تجربہ تو مجھے سوا دو سال کے بعد دسمبر ۱۹۷۱ء ہی میں ہوگیا۔ یہ تفصیل میں آگے بیان کروں گا۔

عبدالمالک کی شہادت کے واقعے نے ممکن ہے، ملک کی مجموعی سیاسی صورت حال پر کوئی بڑا گہرا اثر نہ ڈالا ہو۔ کیونکہ اس وقت سیاسی سیلاب جس رفتار سے بہے چلا جا رہا تھا، اس میں ہماری کوئی ایسی قوت نہیں تھی، جس کے بل بوتے پر ہم حالات کا رُخ موڑنے یا انھیں متاثر کرنے میں کامیاب ہوسکتے۔ لیکن عبدالمالک کی شہادت کے تحریک اسلامی کے کارکنوں پر بڑے گہرے اثرات پڑے۔

جمعیت کے نوجوانوں کے جوش، جذبے اور وابستگی میں اضافہ ہوا۔ اب تک ان کے لیے شہادت ایک تقریری چیز تھی، لیکن اس واقعے کے بعد شہادت ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔ شہادت ان کی تمناؤں کا مرکز بن گئی۔ ظاہر ہے کہ شہادت کا جذبہ اور جہاد کا شوق موجود ہو تو پھر ایمان، ایثار، کارکردگی اور محنت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے، باوجود اس کے کہ ملک کے حالات اپنے ہی رُخ پہ بہے جا رہے ہیں۔

حالات کو سنبھالا دینے کے لیے مارشل لا حکام سے ملاقات ہوتی رہی، لیکن یہ تاثر بالکل غلط تھا کہ ان کا جماعت کے بارے میں کوئی نرم گوشہ تھا۔ ہمدردی کا اگر کوئی ایسا تعلق ہوتا، تو کم از کم عبدالمالک کے مقدمے کی ایک بار سماعت ہوتی۔ ان کے قاتلوں کو گرفتار کیا جاتا۔ یہی نہیں، بلکہ ۱۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو جب پلٹن میدان ڈھاکہ میں عوامی لیگ نے مولانا مودودی کا جلسہ اُلٹ دیا اور جماعت کے تین کارکن شہید کردیے تھے، مگر اس واقعے پر بھی مارشل لا حکام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

ایک عوامی لیگی لیڈر

عبدالمالک کی شہادت کے بعد یعنی اگست ۱۹۶۹ء سے ابوالمنصور احمد صاحب کے ساتھ میرے قریبی سماجی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ وہ عوامی لیگ کے بہت نمایاں اور ممتاز رہنما تھے۔ بنگلہ زبان کے مشہور ادیب اور صحافی بھی تھے۔ بنیادی طور پر ایک اچھے مسلمان تھے۔

وہ زبان، لباس، طور و اطوار میں مسلم کلچر کے بڑے زبردست حامی تھے، لیکن اب تقریباً گوشہ نشین تھے۔ عباس خلیلی صاحب نے ہماری کمپنی میں ان کے بیٹے کو ملازم رکھا تھا۔ انھی کی معرفت منصور صاحب سے میرا پہلا تعارف ہوا، جب پہلی بار میں ان کے گھر گیا اور ملا۔

انھوں نے پہلی ملاقات میں ایک دل چسپ بات یہ کہی کہ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کہ جماعت اسلامی میں کوئی پڑھا لکھا فرد اور امریکا کا پڑھا ہوا انجینیر بھی شامل ہوگا۔ آپ سے مل کر جماعت اسلامی کے بارے میں میری راے بدل گئی ہے''۔ اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ اتنے قریب ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے ہیں اور اتنے غلط تاثرات رکھتے ہیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ جس طرح ہم بھی اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی اپنی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ شاید ہم بھی دوسروں کے بارے میں ایسے ہی تاثرات رکھتے ہیں، جس طرح دوسرے لوگ ہمارے بارے میں۔ یہ سب معلومات میں کمی کا نتیجہ ہے۔ میں نے انھیں مولانا مودودی کی کتاب **تحریك آزادی هند اور مسلمان** (اول) اور دوسری تصانیف پڑھنے کے لیے دیں۔

جنوری ۷۰ء کی بات ہے، ایک دن ابوالمنصور صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''مراد صاحب، ۵۶ء میں جب دستور بنا تھا، اس وقت جو لوگ دستور بنا رہے تھے، انھوں نے آپس میں گفت وشنید کے بعد ایک ایسا فارمولا بنایا تھا، جس پر مشرقی اور مغربی پاکستان کا اتفاق ہوگیا تھا۔ ان میں فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور چودھری محمد علی جیسے دیو قامت لوگ تھے۔ لیکن بہرحال اس وقت مسائل بہت کم تھے۔ مگر آج مسائل دیو قامت ہوگئے ہیں۔ جن لوگوں سے یحییٰ خان چاہتے ہیں کہ دستور بنائیں، وہ لوگ سیاسی اور قومی طور پر بونے اور pygmies ہیں۔ ان سے پاکستان کا نیا دستور ہرگز نہیں بنے گا۔ بلکہ مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ اس مہم جوئی میں یہ ملک ٹوٹ سکتا ہے''۔ یہ ان کا اندازہ تھا جو صحیح ثابت ہوا۔

دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ ''دیکھیے، ۵۶ء میں جب مشرقی اور مغربی پاکستان کے

درمیان دستور سازی کا معاہدہ ہوا تھا، تب اس معاہدے کے پانچ بنیادی اجزا تھے۔ اس کا ایک جز صوبائی خودمختاری تھا۔ مشرقی پاکستان کا یہ خاص طور پر مطالبہ تھا، کیونکہ مغربی پاکستان کو تو یہ خود بخود حاصل تھی۔ دوسرا جز تھا، پیریٹی یعنی نیابتی مساوات۔ یہ مغربی پاکستان کا مطالبہ تھا___ مشرقی پاکستان نے بھی خودمختاری کی امید پر کچھ زیادہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اس مطالبے کو منظور کیا تھا۔ تیسرا جز تھا کہ بنگلہ قومی زبان ہوگی۔ یہ بنگال کا مطالبہ تھا، چھے سات سال کی جدوجہد کو تسلیم کرتے ہوئے اسے قبول کیا گیا۔ اس کے بعد چوتھا جز تھا کہ مخلوط انتخاب ہوگا''۔ میں نے کہا: ''اس کی کیا وجہ تھی ہم تو اس کے بہت مخالف تھے''۔ کہنے لگے کہ ''اگر مخلوط انتخاب نہ ہوتے تو مشرقی پاکستان کے مسلمان اسمبلی کے اندر اقلیت میں ہوتے۔ اور ہر چیز کے بارے میں بات بدمزگی کی صورت میں ہوتی۔ اگر بنگالی مسلمان نمایندے کسی چیز کو پاس کرتے تو مغربی پاکستان میں یہ پروپیگنڈہ ہوتا کہ یہ ہندوؤں کی مدد سے پاس ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہاں پر بنگالی: مسلمان اور ہندو کی تقسیم کے ساتھ نہ بیٹھیں، بلکہ ممکن ہے کہ ہم سب مسلمان ہی منتخب ہوجائیں''۔ (بعد میں ۷۰ء کے انتخاب میں ۱۶۳ میں سے عوامی لیگ نے جو ۱۶۱ نشستیں جیتیں، وہ سب مسلمان تھے)۔ انھوں نے کہا: ''مخلوط انتخابات کا مطالبہ ہم نے نظریاتی بنیاد پر نہیں، بلکہ سیاسی بنیاد پر کیا تھا۔ اس کو بھی دستوری معاہدے میں تسلیم کیا گیا۔ بعد میں سہروردی صاحب نے پانچویں یہ بات بھی پاس کروا دی کہ دارالحکومت کراچی رہے گا۔ ان پانچ چیزوں پر ۱۹۵۶ء کا یہ دستور بنا تھا''۔

پھر ابوالمنصور صاحب نے افسوس بھرے لہجے میں کہا کہ ''سب سے پہلی خلاف ورزی تو ایوب خان نے کی اور پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اُٹھا کر اسلام آباد لے گئے۔ اسلام آباد مغربی پاکستان کے دل یعنی GHQ (پاکستانی مسلح افواج کے مرکز) اور پاکستان کے پاور بیس [قوت و اقتدار کے سرچشمے] کے قریب ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ قوت اور اقتدار آرمی کے پاس ہے۔ اس صورت میں کوئی بھی بنگالی وزیراعظم، اسلام آباد میں بیٹھ کر اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھے گا، کہ وہاں سے کاروبار حکومت و ریاست چلا سکے۔ اس کے بعد

جنرل یحییٰ خان نے ازخود پیریٹی (نیابتی مساوات) کو بھی ختم کر دیا ہے۔ کسی مارشل لا کے تحت صوبائی خودمختاری کا مسئلہ حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ بنگلہ کا سرکاری زبان ہونا تو ایک برائے نام سی بات ہے۔ اب چونکہ دارالحکومت اسلام آباد چلا گیا ہے، اس لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب ہماری یہ نئی دستور ساز اسمبلی منتخب ہو جائے گی، تو خود اس کو بیٹھنے کے لیے کہیں جگہ نہیں ملے گی۔ ہم نے کراچی دارالحکومت بنانے کا مطالبہ اس لیے منظور کروایا تھا کہ پاکستان میں کوئی ایک جگہ ایسی ہو، جس کو دونوں اپنی سمجھیں۔ جہاں پر بنگالی بھی ہوں اور وہ جگہ کسی بھی صوبے کے تحت نہ ہو۔ اس اعتبار سے کراچی، مشرقی اور مغربی پاکستان کا مشترک ورثہ اور مشترک مقام بنتا ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچ سمجھ کر یہ پاس کرایا تھا، لیکن جنرل ایوب خان نے دارالحکومت اسلام آباد لے جا کر بڑی زیادتی کی ہے اور اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ دستور ساز اسمبلی منتخب ہوگی، تو وہ ڈھاکہ میں بیٹھے یا اسلام آباد میں، خود اس پر بھی اتفاق نہ ہو سکے گا۔ اور جب اسمبلی بیٹھ ہی نہ سکے گی، تو پھر پاکستان کا دستور بنانا تو دُور کی بات ہوگی"۔

ابوالمنصور صاحب کے یہ بڑے prophetic words (سچ ثابت ہونے والی پیش گوئی) تھے۔ ان کا بڑا سیاسی تجربہ تھا۔ بڑے مخلص انسان تھے۔ ان کی یہ دونوں باتیں صحیح ثابت ہوئیں نہ اسمبلی بیٹھ سکی، نہ دستور بنا اور پاکستان ٹوٹ گیا۔

ہمارا منشور، ایک تاثر

دسمبر ۱۹۶۹ء میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے لاہور میں اپنا انتخابی منشور منظور کیا۔ ہمارا منشور، بڑا تفصیلی اور ان حالات میں واقعی ایک انقلابی منشور تھا۔ اس کی طوالت اور تفصیل کے باعث مجھے خدشہ تھا، کہ منشور میں موجود اصل پیغام عوام تک نہیں پہنچ سکے گا، بلکہ اس کے پُرکشش حصے تک سامنے نہیں آسکیں گے۔

ملکیت زمین پر پابندی کے خلاف مولانا مودودی کی رائے خود ان کی کتاب میں موجود تھی۔ مگر جب جماعت کی شوریٰ نے اجتہادی بصیرت کے ساتھ یہ منظور کیا کہ "مخصوص

حالات میں ملکیت زمین پر پابندی لگائی جاسکتی ہے، یا اس کی تحدید کی جاسکتی ہے'' تو مولانا محترم نے اس رائے کو قبول کیا، اور یہ فیصلہ انقلابی قدم تھا۔

اسی طرح مشرقی پاکستان کے لیے صوبائی خودمختاری کا مسئلہ تھا۔ ان دونوں امور میں ہماری سوچ، فکر اور مزاج، ہمیں متوقع نتائج اور درست تخمینے تک پہنچنے میں مدد نہیں دے رہے تھے۔ شاید یہی سبب ہمیں کسی بہت زیادہ انقلابی موقف پر نہیں پہنچا رہا تھا۔ صوبائی خودمختاری کے مسئلے میں اس بات پر میں بالکل مطمئن تھا اور اس کے لیے کئی بار کوشش بھی کی تھی، کہ ہمارے منشور میں اس کو کھلم کھلا طریقے سے بیان کیا جائے۔ اب تک مشرقی پاکستان کو جو خودمختاری حاصل نہیں، اس کا اعتراف کیا جائے۔ پھر یہ بتایا جائے، کہ ہم کیا اقدامات کریں گے کہ جس سے صوبائی خودمختاری ایک حقیقت بن سکے۔

بلاشبہ ہماری سوچ، چند بنیادی، اصولی اور آئینی و دستوری معاملات میں پوری طرح واضح اور صاف تھی۔ لیکن معاشی عدل کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار یا اس کے اظہار، ترجیحات اور ابلاغ میں ہم واقعی بہت پیچھے تھے۔ منشور پر گفتگو کے دوران میں نے یہ تجویز پیش کی، کہ ''ہم یہ بات کہیں کہ کارخانوں کو چلانے کے لیے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں مزدوروں کے منتخب نمایندے بھی لیے جائیں گے'' مگر یہ تجویز منظور نہیں کی گئی۔ اس پر خود مولانا محترم نے یہ موقف اختیار کیا کہ ''جلاؤ، گھیراؤ کرنے والوں اور ٹریڈ یونین پر پیشہ ور قابض لوگوں کو حصہ دار بنانے کے لیے کون تیار ہوگا؟'' حالانکہ اس وقت یورپ میں یہ لہر چل رہی تھی، کہ مزدوروں اور کارخانے میں سرمایہ لگانے اور چلانے والوں کے درمیان ہم آہنگی، شراکت اور ربط ہو۔

جب منشور پاس ہوا، اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ اصل لڑائی منشور کی تفصیلات پر نہیں ہوگی۔ مشرقی پاکستان میں اصل ایشو چھے نکات ہوں گے۔ جہاں تک معاشی مسئلے کا تعلق ہے، قرآن مجید میں اس کے بارے میں بڑے واضح شواہد موجود ہیں۔ جس طرح قرآن مجید میں مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب دی گئی ہے اور مل جل کر یہ کام

کرنے کی ہدایت کی گئی ہے: اِنَّہٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (الحاقۃ ۶۹: ۳۳-۳۴)(وہ ایمان نہ لاتا تھا، اللہ بزرگ و برتر پر، اور ترغیب نہ دلاتا تھا مسکین کو کھانا کھلانے پر)۔ ایک آدمی کو زنجیروں میں جکڑ کر اس لیے جہنم میں ڈال دیا جائے گا کہ ایک طرف وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اور دوسری طرف مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔ اس طرح کا بیان کئی جگہ موجود ہے۔ مراد یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ان دونوں چیزوں کو ہم پلّہ رکھا گیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس حوالے سے منشور میں کوئی بہت ہی نمایاں چیزیں موجود نہیں تھیں۔

ایسی چیزوں کا تھوڑا یا زیادہ ہونا بھی شاید کوئی بڑی بات نہیں، اصل المیہ یہ ہے کہ جو کچھ منشور میں درج تھا، ہم لوگ اس کا بھی کم از کم ابلاغ نہیں کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ، اس ابلاغ اور پروجیکشن کی کمی کا اصل سبب یہ تھا، کہ انسان کے معاشی مسئلے اور طبقوں کی اُونچ نیچ کے مجموعی تاثر کو ہمارا کارکن اپنے دل میں ایک زندہ تجربے کی صورت پوری طرح سمو نہیں سکا تھا۔ حالانکہ ہمارا کارکن اور لیڈر نہ جاگیردار تھا، نہ صنعت کار تھا اور نہ کوئی بڑا تاجر ہی تھا۔ یہ بات بھی نہیں کہ مذکورہ طبقوں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے ہمارے کارکن کے دل میں کوئی ہمدردی کا جذبہ ہو۔ مگر اصل رکاوٹ یہ تھی کہ معاشی مسائل پر سوچ بچار ہمارے مزاج میں رچی بسی نہیں تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم عام طور پر معاشی مسئلے اور اس کی شدت کا ادراک کرنے سے قاصر تھے۔

ادھر پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں روٹی، کپڑا اور مکان کو بنیادی ایشو بنا دیا، مگر ہمارے پاس ۵۶ء کے دستور کی بحالی سے زیادہ بڑا کوئی سیاسی اور معاشی سلوگن نہیں تھا کہ جس میں جان اور کشش ہوتی۔ مشرقی پاکستان میں چھے نکات اور مغربی پاکستان میں سوشلزم کی مخالفت، یہ دو مزید سلوگن تھے۔

۱۳

۱۹۷۰ء: انتخابی امتحان اور پاکستان

مارشل لاحکومت نے اپنی حدود سے تجاوز کیا۔ انھوں نے بعض بنیادی آئینی مسائل پر اپنی رائے ہی نہیں دی، بلکہ ان کا نفاذ بھی کر دیا۔

عام انتخابات کے لیے یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے سیاسی سرگرمیاں بحال کرنے کا اعلان کیا۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو یکم جنوری سے پہلے ہی سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں، صرف جلسہ ہائے عام نہیں ہو رہے تھے۔ لیکن اب تو سیاسی سرگرمیاں بالکل کھلے عام شروع ہوگئیں۔ پاکستان میں ایسی آزادی سے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت شاید ہی اس سے قبل ملی ہو۔ ایسی آزادی کہ جس میں سیاسی قاتل بھی دندناتے پھرتے تھے۔ پاکستان کی سالمیت کے خلاف لکھنے، چھاپنے اور کہنے والوں پر بھی کوئی قدغن نہ تھی۔ البتہ کوئی فرد غلطی سے مارشل لا حکام کے بارے میں کچھ کہہ دیتا تو صرف اسی سے بازپرس ہوتی۔ عام طور پر سیاسی جماعتیں مارشل لا حکام کو تنقید کا ہدف نہیں بنا رہی تھیں، کہ انھوں نے نو ماہ کے اندر عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔

جب 'سنگرام' نکالا

۱۹۶۸ء میں جماعت نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان سے بنگلہ زبان میں ایک روزنامہ نکالا جائے۔ اخبار نکالنے کے لیے ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا۔ اخبار جاری کرنے کے لیے بڑے پیسے کی ضرورت تھی۔ ہم نے بجٹ بنایا، کم سے کم ۱۰ لاکھ روپے درکار تھے۔ اس زمانے کے ۱۰ لاکھ ایسے ہی سمجھ لیجیے جیسے آج کل کے چار کروڑ۔ ہمارے پاس اسٹاف بھی زیادہ

نہیں تھا۔ لیکن نوجوانوں اور لکھنے والوں کا اصرار تھا، مشرقی پاکستان کی صوبائی شوریٰ کی رائے تھی، اور مرکز جماعت کا بھی یہی خیال تھا کہ ''اب جو ہنگامہ خیز سیاسی فضا بن رہی ہے، ایسے میں اپنی بات کہنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں اپنا اخبار ہونا چاہیے''۔

مجھے اس نکتے پر اختلاف تھا کہ جماعت کا اپنا روزنامہ ہو، اور یہ رائے اب بھی ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے، کہ جس روزنامے پر یہ چھاپ ہو کہ وہ کسی پارٹی کا ترجمان ہے تو لوگ اس کو پارٹی کا گزٹ، پارٹی کا ہینڈ آؤٹ یا پارٹی کی قرارداد ہی سمجھیں گے، اخبار نہیں۔ بلکہ وہی بات جب کسی ایسے اخبار میں چھپے گی، جس کے غیر جانب دار ہونے کا شہرہ ہو یا جو اگرچہ مخالف ہے تو تھوڑی جگہ ملنے کے باوجود اس کا وزن زیادہ ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسے اخبار کی اشاعت کبھی بھی بہت زیادہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر کسی پارٹی کے حق میں عوامی لہر پیدا ہو جائے تو اس وقت صورت مختلف ہوتی ہے۔

اس وقت اگرچہ میرے سامنے کوئی حقائق نہیں تھے، بلکہ جس طرح منطق میں آدمی دو اور دو چار کی طرح نتائج نکالتا ہے، اسی طرح میری یہ رائے بنی تھی۔ خیال تھا کہ ایسے اخبار کی اشاعت بہت زیادہ نہیں ہوسکے گی۔ ہمیشہ یہی ہوگا کہ ہم ہی لکھیں گے، ہم ہی چھاپیں گے، ہمارے درمیان ہی وہ فروخت ہوگا اور زیادہ تر ہم ہی اس کو پڑھیں گے۔ اس سے زیادہ حلقوں میں یہ نہیں جاسکے گا۔ دراصل ہم کو یہ بے چینی اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی یا اپنے حق میں لکھی ہوئی چیزیں کہیں روزناموں میں پڑھنے کو نہیں ملتیں۔ بلاشبہہ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ہمیں نفسیاتی سطح پر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ ہماری بھی چیزیں چھپ رہی ہیں۔

اس کے برعکس اگر ہم اتنے افرادی اور مادی وسائل سے دیگر اخبارات میں رسوخ حاصل کریں۔ تعمیری سوچ کے حامل افراد کو پیشہ ورانہ تربیت دے کر اخبارات میں بھیجیں۔ یوں، اگر مخالفین کے دل جیت سکیں، تو میرے خیال میں یہ مولفة القلوب کی تعریف میں

یہ خرچ آ سکتا ہے۔ یہ کہ وہ ہمارے حق میں کوئی کالم، کوئی اداریہ یا کوئی اور چیز لکھیں۔ نیوز ایڈیٹر ہماری خبروں سے مثبت سرخی نکالے۔ ہم ان کے ساتھ تعلقات رکھیں۔ مغربی پاکستان میں تو ایسے صحافیوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد موجود تھی، جو جماعت سے تعلق رکھتے تھے یا جن کی تربیت جماعت کے زیرِاثر صحافتی اداروں میں ہوئی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کے پریس میں تو ایسا کوئی نہیں تھا۔ مجھے اس میں دل چسپی تھی کہ وہاں کے پریس میں ہمارا کوئی ساتھی ہو۔

معظم علی صاحب جو آج کل لندن میں بڑے معروف آدمی ہیں، ساٹھ کے عشرے میں وہ پاکستان پریس انٹرنیشنل (PPI) ڈھاکہ میں مینیجر یا ڈائرکٹر تھے۔ ایک ذریعے سے میں نے ان تک بات پہنچائی۔ وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ ہم جو افراد اپرنٹس شپ کے لیے بھیجیں گے، وہ ان کو جگہ دیں گے، البتہ ان کی تنخواہ ہم ہی کو دینا ہوگی۔ پی پی آئی نہیں دے گی۔ میں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ کسی ایک فرد کو اپرنٹس رکھا اور اس کی تربیت ہوئی۔ اس وقت مجھے نام یاد نہیں کہ کس کو رکھا۔ ڈھاکہ جماعت کی شوریٰ کے رکن نورالزماں صاحب پاکستان آبزرور میں سب ایڈیٹر تھے، ان کی معرفت یہ کام ہوا تھا۔ وہی ہمارا نشرواشاعت کا کام دیکھا کرتے تھے۔

فنڈز کا مسئلہ

جب اخبار نکالنے کے لیے منصوبہ بندی کی، تو جماعت کے رفقا نے ایسی فہرست بنالی، جس میں نمایندے، نیوز ایڈیٹر، سب ایڈیٹر وغیرہ موجود تھے، مگر پیسے کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اسی دوران چودھری غلام محمد صاحب سے بات ہوئی۔ وہ نئے نئے منصوبے سوچنے اور پراجیکٹ آگے بڑھانے والے بڑے قیمتی ساتھی تھے۔

انھوں نے کہا: ''اللہ کا نام لے کر تم کام شروع کرو جہاں تک ہو سکا میں تمھاری مدد کروں گا''۔ میں نے کہا: ''چودھری صاحب، ۱۰ لاکھ کا اندازہ ہے۔ پانچ لاکھ آپ کر دیں، پانچ لاکھ میں کر کے دوں گا''۔ اس کے برعکس آج کل عام طور پر میں جماعت میں جو رجحان دیکھتا

ہوں، اس کے مطابق ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ کہتا کہ ''نہیں، آپ ہی پورا کر کے دیں''۔ یہ ایک غلط رجحان ہے۔ مگر ہم نے پہلے ڈھاکہ جماعت کو مالی طور پر طاقت ور بنایا تھا۔ ہرصورت میں مقامات کو اپنے پاؤں پہ خود کھڑا ہونا چاہیے۔ مرکز اور صوبہ وغیرہ کے نظم سے کم از کم امداد لینا چاہیے۔ مشرقی پاکستان جیسے غریب صوبے کی طرف سے پانچ لاکھ کی ذمہ داری کا ہدف لے کر میں نے بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان جماعت کے صوبائی نظم کو مرکز جماعت کی طرف سے اعانت ملتی تھی، اور آدھا خرچ ڈھاکہ جماعت دیتی تھی، جب کہ پورے مشرقی پاکستان سے صوبائی نظم کو ایک پیسہ بھی نہ ملتا تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے، جماعت نے ایک بڑا صوبائی اجتماع رکھا۔ جس کے لیے اندازہ تھا کہ پچاس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ شوریٰ میں کسی فرد کی تجویز سے پہلے ہی میں نے کہا: ''۲۵ ہزار ڈھاکہ جماعت دے گی، باقی آپ کرلیں''۔ ان میں سے بھی زیادہ تر اعانت مرکز نے کی ـــــ اسی طرح اخبار کے لیے پانچ لاکھ روپے میں نے اپنے ذمے لے لیے اور پانچ لاکھ روپے چودھری غلام محمد صاحب امیر کراچی کے ذمے کردیے۔ چودھری صاحب نے بھی کہا کہ ''ہاں ٹھیک ہے، ان شاءاللہ ہم کریں گے''۔ وہ وعدہ کرگئے اور میں نے اپنی کوشش شروع کردی۔

اس مقصد کے لیے ہم نے اسلامک ویلفیئر ٹرسٹ بنایا۔ دس، دس روپے کے کوپن چھاپے اور پورے مشرقی پاکستان میں جماعت کے یونٹوں تک پہنچا دیے۔ کارکنوں سے کہا کہ ''پانچ لاکھ جمع کرنا ہیں، اس کے لیے پورے صوبے کے اندر سے آپ پچاس ہزار افراد تلاش کریں۔ دس روپے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہوتی۔ اگر لوگ دس، دس روپے دے دیں تو ان شاءاللہ، پچاس لاکھ روپیہ جمع ہوجائے گا''۔ اس سے کارکنوں میں واقعی بڑا شوق اور جذبہ پیدا ہوا۔ انھوں نے کوپن لے کر دس دس روپے جمع کرنا شروع کردیے۔ پھر کچھ مال دار لوگوں سے بڑی رقموں کے لیے، پانچ ہزار اور دس ہزار کی اپیل کی۔ اس کوشش سے ۶۹ء میں، ہمارے پاس تین لاکھ روپے جمع ہوگئے۔

اب ہم نے فلاح عام ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ خیال تھا کہ اسی ادارہ

کے تحت یہ پرچہ نکالا جائے اور یہ ٹرسٹ جماعت سے الگ تھا۔ البتہ جماعت کے وہ سارے کارکن حصہ دار بن گئے تھے، جن سے جماعت نے کچھ لیا۔ اس وقت سے میرا یہ خیال تھا کہ اگر ہم وسیع پیمانے پر چھوٹے چھوٹے عطیات جمع کرلیں، تو قطرہ قطرہ دریا بن سکتا ہے۔ ہم نے تین لاکھ روپے ان چھوٹے عطیات سے جمع کرلیے۔

۱۹۶۸ء میں مولانا مودودی اور چودھری غلام محمد صاحب لندن گئے تھے جہاں دونوں کا آپریشن ہونا تھا____ اس کے بعد چودھری غلام محمد صاحب ڈھاکہ آئے اور میرے ہاں ٹھیرے۔ وہ جائزہ لینے آئے تھے کہ اخبار کے سلسلے میں کیا کام ہوا اور کیا نہیں ہوسکا۔ ڈھاکہ میں پہنچنے کے بعد انھیں ایک دم پیٹ میں شدید درد شروع ہوگیا، ساتھ ہی بظاہر ہیضے کی علامات ظاہر ہوئیں۔ ڈاکٹر اکرام صاحب جو رشتے میں میرے ہم زلف تھے ان کو فون کیا، وہ آئے اور ابتدائی علاج معالجہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ ان کو کینسر ہے......'' میں نے صدمے کی حالت میں ان سے پوچھا: ''آپ نے کیا کہا، چودھری صاحب کو کینسر ہے؟'' انھوں نے کہا کہ ''یہ علامات دیکھ کر مجھے تو یہی شبہ ہوتا ہے''۔ بہرحال میں نے چودھری صاحب سے نہیں پوچھا کہ کیا ان کو کینسر ہے۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا، کہ لندن میں جب چودھری صاحب کا پراسٹیٹ کا آپریشن ہوا تھا تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ''کینسر کافی پھیل چکا ہے اور ابھی مزید بڑھے گا''۔ ان کے معالجوں نے یہ بات صرف خورشید بھائی کو بتائی، انھوں نے چودھری صاحب کو بھی نہیں بتایا تھا۔ بعد میں خورشید بھائی نے مجھے یہ واقعہ بتایا۔ بعد میں ان کا کینسر بڑھ گیا اور وہ ۲۹ جنوری ۱۹۷۰ء کو انتقال کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ رٰجعون۔ ان کے انتقال سے، میں جماعت کے قائدین میں اپنے محبوب بزرگ اور بڑے بھائی سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

چودھری صاحب سے میں نے بات کی، تو انھوں نے بتایا: ''میرے پاس تین ساڑھے

تین لاکھ روپے ہیں۔ کراچی واپس جاکر میں آپ کو بھیج دیتا ہوں، مگر تخمینہ تو دس لاکھ روپے کا ہے''۔ میں نے کہا: ''چودھری صاحب، اللہ کا نام لے کر شروع کرتے ہیں''۔ اگرچہ میں اخبار نکالنے کے حق میں نہیں تھا، لیکن اجتماعی فیصلہ ہو جانے کے بعد پورے جوش وخروش سے کام میں لگا ہوا تھا۔ چودھری صاحب کہنے لگے کہ ''ٹھیک ہے، پیسہ آتا رہے گا، آپ پرچہ شائع کرنے کا آغاز کریں۔ ابتداء میں ساڑھے چھے لاکھ روپے ہی سے شروع کرتے ہیں''۔

اس کے بعد عملی اقدامات شروع کیے۔ سب سے پہلے روٹری پریس مشین تلاش کی۔ ایک اخبار اپنی 'آف سٹ مشین' فروخت کر رہا تھا، جو ہم نے ڈھائی لاکھ میں خرید لی۔ پھر کیمرہ بھی خریدا۔ اب اخبار کی انتظامیہ (مینجمنٹ) کا سوال اُٹھا۔ سید فیاض الدین بھائی کو میں اپنی کمپنی میں بطور ایڈمنسٹریٹر آفس لایا تھا، انھوں نے بڑی محنت اور ذمہ داری سے میری مدد کی تھی۔ اس عرصے میں اخبار کے لیے جمع شدہ ساری رقوم اور ان کا حساب کتاب اور تعلقات عامہ کے اموران کے سپرد کر کے میں جماعت کے کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ قابلِ اعتماد آدمی تھے۔ ان کو پریس کا تجربہ بھی تھا۔ اس سے پہلے وہ کوآپریٹو پریس میں کام کرتے رہے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ وہ اس کام کے لیے بہترین فرد ثابت ہوں گے۔ انھیں اخبار کا جنرل مینیجر نام زد کر دیا اور کہا کہ ''آپ کمپنی سے رخصت لے لیں، بلکہ چھوڑ دیں اور وہاں چلے جائیں''۔

پھر یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اخبار کا نام کیا ہو؟

مشرقی پاکستان میں زیادہ تر اخبارات کے نام عربی کے الفاظ پر تھے۔ مثلاً روزنامہ اتفاق عوامی لیگ کا ترجمان تھا۔ روزنامہ آزاد نیشنل عوامی پارٹی کا پرچہ تھا۔ انقلاب کے نام سے بھی ایک اخبار تھا۔ لیکن نیا رجحان بنگالی میں سنسکرت الفاظ کا تھا۔ پہلے تو یہ تجویز آئی کہ جہاد نام رکھا جائے۔ میں نے کہا: ''یہ نام تو ایک دم اعلانِ جنگ کے طور پر لیا جائے گا''۔ نوجوانوں کا اصرار تھا کہ بنگالی میں نام رکھا جائے۔

دوسری طرف ایک طبقہ جو تھا تو بنگالی، لیکن وہ بنگالی مسلم کلچر کے حق میں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک ہی چیز کے الفاظ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مختلف ہیں۔ اسی طرح ان کے اور ہمارے درمیان لباس کا فرق ہے کہ وہ دھوتی باندھتے ہیں اور ہم پاجامہ پہنتے ہیں۔ پھر ہماری بنگلہ، ہندو کی بنگلہ زبان سے مختلف ہے۔ بہرحال ہم نے بڑی سوچ بچار کے بعد اس مجوزہ اخبار کا نام سنگرام منتخب کیا۔ سنگرام کے معنی جدوجہد، اور جہاد ہی کے ہیں۔ فیاض الدین بھائی نے جوش و خروش سے کام کرتے ہوئے باقی سٹاف کی تلاش شروع کی۔ ہمیں ایک اچھی جگہ کرائے پر مل گئی۔ اگرچہ انتظامی معاملات فیاض بھائی کے سپرد کر دیے تھے، تاہم جماعت کے کام کے ساتھ میں اخبار کے جملہ امور سے پوری طرح متعلق رہا۔

اختر فاروق صاحب کو ایڈیٹر مقرر کیا۔ ان سے جمعیت کے زمانے سے میرا ربط تھا۔ وہ بنگلہ میں بہت خوب صورت لکھتے تھے۔ نورالاسلام بطور نیوز ایڈیٹر آئے۔ باقی سب لوگ جمعیت ہی کے سابق یا موجودہ کارکن تھے، ان میں سے سب ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر رکھ لیے گئے۔ اس طرح ہم نے چار پانچ مہینے میں پوری ٹیم فراہم کر دی۔

پراجیکٹ انچارج کے طور پر، میں نے فیاض صاحب کو رہنمائی کے لیے خطوطِ کار لکھ کر دیے: ''اگر آپ شروع میں اخبار اس طرح نکالیں کہ پڑھنے والے کو یہ نہ معلوم ہو کہ جماعت اسلامی کا اخبار ہے، تو یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ حسنِ ظاہری اور حسنِ باطنی میں بھی آپ صحافت کا اعلیٰ سے اعلیٰ معیار قائم کریں (میں حسنِ باطن کے ساتھ حسنِ ظاہر کا بھی اتنا ہی قائل ہوں، جس طرح آج کل ترجمان القرآن میں ظاہر ہو رہا ہے)۔ پروف ریڈنگ معیاری ہو، رموز و اوقاف کا خیال رکھا جائے۔ آسان، صاف اور براہِ راست مفہوم واضح کرنے والی زبان ہو۔ خبروں کے لحاظ سے سرخیاں نکالیں جو بہت پُرکشش ہوں۔ تحقیقاتی صحافت میں نام پیدا کریں اور گہرائی میں جا کر چیزوں کا پتہ چلائیں۔ امریکا میں بے شمار اخبارات حالات و واقعات کی تحقیق کر کے انھیں شائع کرتے ہیں، آپ

لوگ بھی یہ کریں۔ پہلے تین چار مہینے میں اگر آپ اس کی ساکھ بنا کر اشاعت بڑھا لیں، تو اس سے آپ کو نسبتاً زیادہ کامیابی ہوگی"۔

اس کے بعد اخبار کے کارکنوں کے اجلاس میں کہا تھا: "آپ کو بہترین مینیجر دے دیا ہے، اور بہترین لکھنے والے آگئے ہیں، اب میرا کام تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ اس لیے آپ لوگ اسے سنبھال لیں اور کمال کی منزلوں تک پہنچنے کی کوشش کریں، کسی کم تر معیار پر ہرگز مطمئن ہوکر نہ بیٹھیں"۔ چنانچہ وہ کام کرتے رہے۔

غالباً دسمبر ۶۹ء میں انھوں نے سنگرام کی ڈمی نکالی۔ جب ڈمی دیکھی تو مجھے یاد آ گیا کہ پروفیسر جلیل الدین احمد خان صاحب نے ہمارے اسٹوڈنٹس وائس کے پہلے شمارے کے کس طرح پرخچے اُڑا دیے تھے۔ بالکل اسی طرح مجھے بھی سنگرام کی یہ ڈمی دیکھ کر بڑا غصہ آیا۔ میں ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر اور فیاض الدین صاحب وغیرہ کو لے کر بیٹھ گیا۔ انھیں بتایا کہ "یہ سرخی کیا ہے، اس میں آپ کیا کہہ رہے ہیں، اس میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہر جگہ جماعت کے اِس بیان اور اُس بیان کی تکرار ہے۔ اس کو ہفت روزہ ایشیا نہیں بنانا، اور نہ اسے جماعت کا نیوز گزٹ بنانا ہے۔ یہ ایک روزنامہ ہے، جسے پبلک میں جانا ہے۔ مجھے تو اس کارکردگی سے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس طرح کا اخبار نکالیں گے تو میں اس کے حق میں بالکل نہیں ہوں"۔ سب لوگ بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے کہا: "ہم اس کو بہتر بنائیں گے"۔

انتخابی مہم شروع ہوچکی تھی۔ مولانا مودودی ۱۸ جنوری کو پلٹن میدان میں جلسۂ عام سے خطاب کرنے کے لیے ڈھاکہ آرہے تھے۔ ڈھاکہ جماعت کے امیر کی حیثیت سے میں اور غلام اعظم صاحب انھیں ایئرپورٹ سے لے کر آئے تھے۔ اگلے روز یعنی ۱۷ جنوری ۱۹۷۰ء کو سنگرام کا پہلا شمارہ آیا تو پہلے صفحے پر مولانا مودودی کی آمد کی خبر کے ساتھ مولانا مودودی، میری اور غلام اعظم صاحب کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے تو سر پیٹ لیا۔ لیکن یہ سمجھ کر خاموش رہا کہ جذباتی سطح پر لوگوں کے لیے خود اپنے ساتھ مزاحمت کرنا مشکل ہوگئی

ہوگی۔ اس وقت بحث کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس اخبار کو دیکھ کر اپنے ہی لوگ خوش ہو گئے۔ لیکن جو اثر ہم پبلک پر ڈال سکیں اس طرح وہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ جب تک ہم اپنے مقاصد اور اہداف کو سامنے رکھ کر غور نہ کریں، کہ جو کام کر رہے ہیں اس سے وہ مقصد کہاں تک حاصل ہو رہا ہے؟ اس وقت تک بات نہیں بن سکتی ___ محض جماعتی جذبات کی تسکین تو ہمارا مقصد نہیں ہے۔

بہرحال پہلا باقاعدہ شمارہ ہاتھ میں پکڑ کر میں 'سنگرام' کے دفتر میں پہنچا۔ رفقا کو بلایا، بڑے ٹھنڈے لہجے میں اور چند جملوں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور مزید مداخلت سے بالکل ہی اپنا ہاتھ اُٹھالیا، کہ یہ تو اب اسی طرح چلے گا اور پھر وہ چلتا رہا۔ آج بھی ڈھاکہ سے شائع ہو رہا ہے، لیکن سخت مالی خسارے میں۔ جس طرح یہاں روزنامہ جسارت میں خسارہ رہا ہے۔ اس مالی خسارے سے قطع نظر، خاص طور پر بنگلہ دیش بننے کے بعد جماعت اور تحریکِ اسلامی کے لیے اس کا ایک اہم اور بڑا مثبت کردار ہے۔ بلاشبہہ اس کے فائدے ہوئے، مگر ان کے مقابلے میں جو زیادہ فائدے ہوسکتے تھے، میں ان کی بات کر رہا ہوں کہ وہ نہیں ہوئے۔ روزنامہ جسارت کراچی کا بھی اپنی جگہ فائدہ ہے۔ لیکن جو فائدہ دوسری صورت میں ہوسکتا تھا، شاید اس کے لیے یہ وقت نہیں تھا۔ اگر یہ کسی خاموش فضا میں نکلتا تو شاید بہتر ہوتا۔ پھر سوچتا ہوں کہ خاموش فضا میں تسنیم اور کوثر نکلے تھے، لیکن وہ بھی نہیں چل سکے۔

حال ہی میں یہ گفتگو ہوتی رہی کہ ہمیں لاہور سے بھی اپنا اخبار نکالنا چاہیے۔ اخبار کے لیے مطلوبہ رقم بھی تھی۔ میں نے یہی کہا کہ ''بتائیں، کیا آپ میں اتنا صبر اور تحمل ہے کہ اخبار نکلے، اور اس میں میرٹ کی بنیاد پر آپ کے اجتماعات کی تصویر نہ لگے، آپ کی من پسند سرخیاں نہ لگیں، مگر وہ آپ کے پیسے سے نکل رہا ہو؟'' احباب نے کہا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے''۔ میں نے کہا: ''اس طرح کام نہیں چلے گا، اس کا فائدہ محدود ہوگا''۔

۱۸ جنوری کا جلسہ

جیسا کہ بتا چکا ہوں مشرقی پاکستان میں، جماعت اسلامی کی انتخابی مہم کے آغاز میں مولانا مودودی ڈھاکہ تشریف لائے۔

۱۸ جنوری بروز اتوار انھیں پلٹن میدان میں جلسۂ عام سے خطاب کرنا تھا۔ اسی جگہ ۱۱ جنوری کو شیخ مجیب جلسۂ عام سے خطاب کر چکے تھے۔ مولانا کی آمد سے پہلے ہی ڈھاکہ کی فضا میں ایک خاص قسم کی کشیدگی پیدا کرنے کے لیے عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ نے اپنی جارحانہ کوششیں شروع کر رکھی تھیں۔

پروگرام کے مطابق ۱۸ جنوری کو ٹھیک تین بجے جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے مولانا عبدالجبار صاحب نے تقریر کی اور پھر عباس علی خان صاحب نے خطاب کیا۔ ان کے بعد پروفیسر عثمان رَمز صاحب کی تقریر ابھی جاری تھی، کہ پنڈال کی پچھلی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اسی دوران ہمارے دو زخمی کارکن اسٹیج کے قریب طبی امداد کے لیے پہنچائے گئے۔ اس اثنا میں جناب شمس الرحمٰن صاحب نے بھی اپنی بات مکمل کر لی، اور پھر مولانا ابوالکلام یوسف صاحب نے مائیک سنبھالا۔ میرے خیال میں یہ سبھی تقریریں بڑی مختصر اور بڑی مؤثر تھیں۔

یوسف صاحب نے جلسے میں جاری چھوٹی موٹی گڑبڑ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''کیا مارشل لا کا ضابطہ نمبر ۶۰ اسی لیے جاری کیا گیا ہے کہ شرپسند دوسروں کے جلسے درہم برہم کرتے رہے اور ریاستی اتھارٹی خاموش تماشائی بنی رہے''۔ اسی دوران عصر کی اذان بلند ہوئی۔ اجتماع گاہ میں جماعت کے کارکنوں نے نماز پڑھنا شروع کی۔ ابھی نماز ختم ہی ہوئی تھی کہ اسٹیج کے بائیں جانب اینٹوں اور پتھروں کی شدید بارش شروع ہو گئی۔ سڑک کے کنارے کھڑے عوامی لیگ کے کارکنوں کا ایک منظم گروہ بڑی دیدہ دلیری سے پتھراؤ کر رہا تھا۔ ہمارے زخمی کارکن لہولہان ہو کر اسٹیج کے قریب پہنچ رہے تھے۔ حملہ آور گروہ بلاخوف وخطر اور کھلم کھلا مغربی گیٹ کی جانب سے حملے کر رہے تھے۔ زخمیوں کو لے کر

ایمبولینس باہر نکلی، تو فسادیوں نے اسے بھی روک لیا۔ زخمیوں کو نیچے اُتار کر دوبارہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ پولیس کھڑی سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

اس صورت حال میں بھی جلسے کی کارروائی چلتی رہی اور قراردادیں بھی پیش ہوتی رہیں۔ اسی اثنا میں پولیس جلسہ گاہ میں داخل ہوگئی اور اُلٹا جماعت کے کارکنوں سے بدسلوکی پر اُتر آئی۔ جماعت کے کارکن جو اس گزرگاہ کے سامنے دیوار بنے کھڑے تھے، ان کا حصار ٹوٹ گیا اور لاٹھیاں لہراتے، اشتعال انگیز نعرے بلند کرتے شرپسند اسٹیج پر حملہ آور ہوگئے۔ جماعت کے کارکنوں نے جوابی تصادم کا راستہ اختیار کرنے کے بجاے مسجد میں پناہ لی، مگر وہاں بھی ان پر پتھراؤ جاری رہا۔

مولانا مودودی ابھی جلسہ گاہ کی طرف آرہے تھے کہ جماعت کے کارکنوں نے انھیں راستے ہی سے واپس بھیج دیا، کہ جلسہ بنگلہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھوں ختم ہوچکا تھا۔

انتخابات اور کمپنی

جماعت کا کام کرنے کے دوران میں نے سختی سے اصول اپنا رکھا تھا، کہ کمپنی کے کام میں حرج نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے، اس بات کی توفیق دی کہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں، امانت اور دیانت سے انجام دینے کی کوشش کروں۔ ایک آدمی رزقِ حلال حاصل کرنے کے لیے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے پہلوتہی برتے اور دوسری جانب دین کی سرگرمیوں میں دیوانہ وار لگا ہو، تو میرے نزدیک اس کی یہ سوچ خدا خوفی کے منافی ہے۔ اگر ہمارا کوئی ساتھی اپنے دفتر اور اپنے ادارے میں وقت کا پابند، مخلص، محنتی اور دیانت دار فرد کی سی شہرت نہیں رکھتا تو رزقِ حلال کا مسئلہ تو اپنی جگہ پر ہے ہی، اس طرح وہ اپنے ادارے میں بھی تحریک کی نیک نامی کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں متعدد رفقا سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ جب یہ بات میں اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں تو خدانخواستہ کسی غلط فہمی یا تعلّی کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا بلکہ

اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور بار بار آخرت میں جواب دہی کی باتوں کو دہرانا ہی میرے کام آتا رہا ہے۔ اگر میں جماعت کی سرگرمیوں کی بنا پر کمپنی کے کام کا نقصان کرتا، تو ایک پرائیویٹ کمپنی مجھے اس طرح ترقی نہ دیتی۔

بہرحال، جب ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کا زمانہ قریب آیا، تو دسمبر ۶۹ء میں، میں نے کراچی میں کمپنی کے سربراہ عظیم الدین صاحب سے کہا: ''میرے لیے ۱۹۷۰ء کا سال بڑا مصروفیت میں گزرے گا۔ اس لیے آپ مجھے بغیر تنخواہ کے، ایک سال کی چھٹی دے دیں، البتہ مکان اور گاڑی میرے پاس رہنے دیں، تاکہ چلنے پھرنے میں مجھے آزادی رہے۔ باقی، آپ اس عرصے میں کسی دوسرے فرد کو کمپنی کا انچارج بنا دیں''۔ انھوں نے جواب میں کہا: ''ہمیں بس یہ بتا دو، کہ دن میں زیادہ سے زیادہ کتنے گھنٹے دے سکو گے''۔ میں نے کہا: ''مشکل سے دو گھنٹے نکال سکتا ہوں''۔ وہ کہنے لگے: ''بس، بس یہ کافی ہے۔ مجھے تم پر بھروسا اور اعتماد ہے۔ تم دو گھنٹے کمپنی کو دے دیا کرو اور باقی وقت اپنے پارٹی کے کاموں میں لگا دیا کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا''۔ یہ الگ بات ہے کہ جب دفتر جاتا تو کئی بار پورا پورا دن بھی لگ جاتا۔ مگر امرِ واقعہ ہے کہ میں اپنے اللہ کی اس نعمت کا شکر کن لفظوں میں ادا کروں، کہ اس نے دین کے کام کے لیے مجھے یہ سہولت اور کمپنی کے مالکوں کا یہ اعتماد عطا کیا۔

ہماری کمپنی کے دفتر میں صبح ساڑھے سات بجے سے دوپہر دو بجے تک کام ہوتا تھا۔ میں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ ٹھیک ساڑھے سات بجے دفتر پہنچ جاتا، اس وجہ سے باقی لوگ بھی بروقت آجاتے۔ میں نے حاضری کا نظام بڑا سخت رکھا تھا۔ سبھی لوگ رجسٹر پر دستخط کرتے تھے۔ سات بج کر پینتالیس منٹ پر رجسٹر اُٹھا کر میرے کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا۔ پھر جو فرد بھی تاخیر سے آتا، وہ میری میز پر پڑے رجسٹر پر حاضری لگاتا تھا۔ میں کسی سے یہ نہیں کہتا تھا کہ، تاخیر سے کیوں آئے ہو۔ یہی بات کافی تھی کہ وہ میرے سامنے آکر دستخط کر دیں۔ یہ بات بھی لوگوں کے لیے کافی بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ کسی کو ڈانٹنے یا تادیبی خط جاری کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ تاخیر سے آنے والے لوگ دفتر میں حاضری لگانے آتے،

تو میں نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا کرتا تھا کہ کون آیا، اور کون گیا، بس اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس چیز کا لوگوں پر ایک تاثر تھا کہ یہ خود بھی دفتر ٹھیک وقت پر آتا ہے۔

انتخابات کے اس سال میں، میں دفتر جا کر ضروری کاغذات کو نمٹاتا، ٹائپ شدہ کاغذات کو چیک کرتا، ادائیگیوں کے کاغذات کی منظوری دیتا، تاکہ بنک اوقات سے پہلے یہ کام مکمل ہو جائے اور لینے دینے میں تاخیر نہ ہو۔ یہ سارے کام ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ مکمل کر لیتا۔ پھر ہدایات دیتا، کہ یہ ڈرائنگ بنانی ہے اور یہ ڈیزائن کرنا ہے۔ سب شعبوں کو کام دے کر ڈیڑھ دو گھنٹے میں دفتر سے اُٹھ کر سیدھا دفتر جماعت پہنچ جاتا اور تحریکی کاموں میں مشغول ہو جاتا۔

دفتر کا اسٹاف یہی سمجھتا کہ یہ کمپنی ہی کے کام کے لیے کسی میٹنگ میں، کسی انجینیر یا واپڈا کے دفتر میں گیا ہوگا۔ میرا کام بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ وہاں چیئرمین واپڈا سے ملنا ہوتا تھا۔ دوبارہ ڈیڑھ سے اڑھائی بجے تک میں کمپنی کے دفتر واپس آ جاتا اور ظہر کی نماز اپنے دفتر کے لوگوں کے ہمراہ پڑھتا تھا۔ نماز کے بعد بھی دفتر میں بیٹھ کر کام کرتا۔ کمپنی کے مقامی لوگ یہی سمجھتے کہ اس نے پورا وقت کمپنی کو دیا ہے۔ حالانکہ کمپنی کے ذمہ داران سے میں نے صرف دو گھنٹے دینے کا طے کیا تھا۔ پھر جب الیکشن کے عروج کا زمانہ آیا تو دو بجے کے بعد کمپنی کے ٹائپسٹ اور کچھ دوسری چیزیں بھی جماعت کی مہم میں استعمال کیں۔ ان کا باقاعدگی سے حساب رکھا جو ادا ہو سکتا تھا، وہ ادا کیا جو نہیں ہو سکتا تھا، اس کو بلاکم و کاست خواجہ عظیم الدین صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔

شعبہ انتخابات میں

نواکھالی کے ماسٹر شفیق اللہ صاحب، صوبائی ناظم انتخاب تھے جنھیں انتخابی مہم کی نگرانی اور منصوبہ بندی کرنا تھی ــــــ میں نے صوبائی نظم سے خود کہہ کر اپنی خدمات اس شعبے کے لیے پیش کر دیں۔ اگرچہ نظامتِ انتخابات کی ذمہ داری انھی کے سپرد تھی، تاہم عملی طور پر ناظمِ انتخاب میں ہی تھا۔ اللہ کے فضل اور اس کی تائید سے اس کام کو سنبھالا۔

شفیق اللہ صاحب کو بھی یہ احساس نہ ہونے دیا، کہ ان کے مرتبے میں کوئی فرق آیا ہے۔ انھوں نے خود ہی سارا کام اور اختیار میرے سپرد کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی الیکشن میں امیدوار تھے۔

الیکشن فنڈز

الیکشن میں سب سے بڑا مسئلہ فنڈز اکٹھا اور تقسیم کرنے کا تھا، اور ہمارے پاس فنڈز بڑے محدود تھے۔ اس زمانے میں آج جیسے انتخابی اخراجات نہیں تھے، مگر اخراجات تو ہوتے تھے۔ کچھ فنڈ مغربی پاکستان کی جماعت نے دینے کی ذمہ داری لی اور باقی فنڈ مشرقی پاکستان سے جمع کرنے کے لیے میں نے ذمہ لیا۔

فنڈز اکٹھا کرنا مشکل ضرور ہے، لیکن اس سے زیادہ نازک مسئلہ فنڈز کی تقسیم کا ہے۔ جس میں دل زخمی ہوتے ہیں، غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ فلاں کو زیادہ دے دیا اور فلاں کو کم۔ ویسے بھی مرکزی طور پر اس تقسیم میں مساوات برتنی ممکن نہیں ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کا جیتنا ممکن ہے، اس لیے لازمی طور پر ان کی زیادہ مدد کرنی چاہیے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کی حیثیت جماعت میں بطور لیڈر، نمایاں اور ممتاز ہے۔ ان پر بھی ہمیں زیادہ خرچ کرنا چاہیے، تاکہ ان کی جیت ممکن ہو سکے یا ان کی اچھی کارکردگی سامنے آسکے۔ پروفیسر غلام اعظم صاحب امیر صوبہ تھے، اس لیے ان کی پوزیشن بڑی نازک تھی۔

میں نے غلام اعظم صاحب سے کہا کہ کچھ گائیڈ لائن [رہنما خطوط کار] بنا دیں، کہ کس طرح تقسیم ہو، تاکہ جب فنڈ جمع ہوں تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو، کہ کس تناسب سے کس کو کتنا حصہ دیا جائے۔ لیکن الف، بے، ج کی تقسیم، فنڈز اکٹھا کرنا اور انھیں تقسیم کرنا بھی آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس میں آپ بالکل دل چسپی نہ لیں، کیونکہ اسی میں جماعت کی اور خود آپ کی بھی بھلائی ہوگی۔ انھوں نے یہ بات شوریٰ کے سامنے رکھی، جس نے ایسا کرنے کی اجازت دے دی اور صوبائی الیکشن کے مالیات میرے ذمے

کر دیے۔ اللہ کا فضل ہے کہ آخر وقت تک تقسیم کرتا رہا اور اس تقسیم میں کسی کو، کہیں بھی کوئی ذرہ برابر شکایت نہیں ہوئی۔ سب لوگ بڑے خوش اور مطمئن تھے۔

ہماری انتخابی مہم: کمزور پہلو

جب مغربی پاکستان میں انتخابی مہم شروع ہوئی تو محترم میاں طفیل محمد صاحب کی کراچی میں ہونے والی پوری تقریر روزنامہ جنگ کراچی میں شائع ہوئی۔ تقریر پڑھ کر میں نے اسی وقت ایک خط مولانا مودودی کو لکھا تھا: ''اگر ہماری الیکشن مہم کا theme یہی ہے کہ اسلام اور پاکستان کو خطرہ ہے اور ۵۶ء کا آئین، آئینی مسائل کا حل ہے، تو پھر ہم ووٹر کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے۔ کیونکہ فی الواقع اسلام کو خطرہ نہیں اور آئینی مسائل کے ساتھ معاشی مسائل کا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے جب تک دوسرے پہلو کو اجاگر نہیں کریں گے، اس وقت تک محض آئینی حل عوام کے دلوں پر دستک نہیں دے سکے گا'' ___ ہمارے ساتھ ایک مخمصہ (dilemma) یہ بھی تھا، کہ مشرقی پاکستان میں صوبائی خودمختاری جیسے مسئلے پر ہم اس انتہا تک نہیں جاسکتے تھے، کہ پورے مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کا دشمن قرار دے دیں۔

مشرقی پاکستان میں ہماری مہم کا مرکزی نکتہ اسلام تھا۔ مگر خود مشرقی پاکستان والوں کے سامنے عام طور پر صرف ایک ہی مرکزی نکتہ تھا، کہ ان کے ساتھ ناانصافیاں ہوئی ہیں، اور مارشل لا کے دور میں وہ سیاسی طور پر اقتدار سے بے دخل کر دیے گئے ہیں۔ مغربی پاکستان کو فوج کی بالادستی حاصل ہے۔ ان سب کے خلاف وہ غم و غصے میں بھرے پڑے تھے۔ صوبائی خودمختاری ان کا بہت پرانا مطالبہ تھا، لیکن کسی مارشل لا حکومت کے تحت وہ ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ: چھے نکات ہی ان کے آئینی اور معاشی مسائل، ان کی امنگوں اور شکایات کی ضمانت ہیں۔

اس کے مقابلے میں ہم چھے نکات کی بھرپور مخالفت کر رہے تھے اور ساتھ ہی مشرقی پاکستان کے مطالبات کی حمایت بھی کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے جائز مطالبات کی حمایت

میں ہم اس حد تک بہت آگے نہیں جا سکتے تھے، جس حد تک کہ عوامی لیگ جا رہی تھی۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ ہماری زبان میں، ہمارے لب و لہجہ میں، ہمارے آہنگ میں اور ہمارے دلائل میں وہ تیزی، مبالغہ، شدت اور تندی نہیں آ سکتی تھی، جو قوم پرستوں کے لب و لہجے میں رچی بسی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی دلیل، دوسرے کی حتمی نفی اور اپنے حق کے لیے انتہا پسندی تک حمایت پر مبنی ہوتی ہے۔ ہم نسلی قوم پرست نہیں تھے، انصاف سے بھی نہیں ہٹ سکتے تھے اور پاکستان کی سطح پر ایک قومی پارٹی تھے۔ یہ بھی دیکھنا ہمارے پیشِ نظر رہتا تھا، کہ جو کچھ کہیں گے اس کا ردِعمل دوسری جگہ پر کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ہمارے منشور میں صوبائی خودمختاری کے لیے جو کچھ بیان کیا گیا تھا، اسے نمایاں طور پر پیش کرنے کے لیے ہماری آواز اور ہمارے لہجے میں وہ زور اور کشش پیدا نہیں ہو سکی تھی۔

ہم مغربی پاکستان کو گالی نہیں دے سکتے تھے۔ پنجابی، پشتون اور اُردو بولنے والے کے خلاف نفرت پیدا نہیں کر سکتے تھے اور جھوٹ نہیں گھڑ سکتے تھے۔ اس لحاظ سے وہاں پر ہم کمزور تھے۔ ویسے بھی پورے مغربی پاکستان کے لوگوں کا اس ظلم و زیادتی اور سیاسی و معاشی استحصال میں ہاتھ نہیں تھا کہ برا کہا جاتا۔ یہ تو ایک برسرِ اقتدار ٹولہ تھا، جو غیر جمہوری طریقے سے نہ صرف مشرقی پاکستان کے، بلکہ خود مغربی پاکستان کے مفادات غصب کیے ہوئے تھا۔ اسی ٹولے کے خلاف مغربی پاکستان کے عوام میں بھی ردِعمل پایا جاتا تھا۔

جماعت کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو کئی حوالوں سے یہ معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم لوگ کسی معاملے کو بہت آگے بڑھ کر کرنا چاہتے ہیں، تو بعض اوقات اس میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے خلاف اس انتہا کی نفرت پیدا ہو گئی کہ کئی لوگوں نے بتایا: ''ہم نے اپنے بچوں کو، پیپلز پارٹی والوں کے بچوں سے بھی دُور رکھا ہے''۔ میرے نزدیک یہ حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی بات تھی۔ اسلام جیسا اعتدال چاہتا ہے، اور جس کا حکم دیتا ہے یہ عمل اس کے مطابق نہیں تھا۔ اس سے معاشرے میں حد سے بڑھی تفریق اور محاذ آرائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ تفریق جس کی وجہ سے آج پاکستان کی قومی اور سیاسی زندگی میں زہر گھلا ہے۔

زمینی حقائق کے طور پر بھی شیخ مجیب کی نسبت مسٹر بھٹو کی ہم سے زیادہ دشمنی تھی۔ اس وقت گردوپیش کے حالات اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کے پس منظر میں بجا طور پر سوشلزم ایک خوف ناک چیلنج تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنے آپ کو سوشلزم کے علَم بردار کے طور پر پیش کر رکھا تھا، اور سوشلزم کے حوالے سے جماعت اسامی نے بہت سخت موقف اختیار کیا تھا۔ جواب میں پیپلز پارٹی کے اخبارات مساوات اور شہاب نے مولانا مودودی کے خلاف بڑا شرم ناک، گھناؤنا اور غلیظ پروپیگنڈہ کیا۔ مولانا محترم پر ایسا کیچڑ اُچھالا کہ اس کا تذکرہ زبان اور قلم پر لاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میرے نزدیک جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی کے درمیان مخالفت یا اختلاف کو نفرت کی بلند دیوار بنانے میں اس پروپیگنڈہ کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ ادھر دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے طبقہ علما میں غلام غوث ہزاروی صاحب اور ان کے ہم نوا لوگوں نے بھی مولانا کے بارے میں جو زبان استعمال کی، وہ کسی درجے میں بھی اخلاق اور شائستگی کے دائرے میں نہیں آتی تھی، کجا یہ کہ اسے کسی عالم دین کی زبان کہا جائے۔

ہمارے مقابلے میں بھٹو صاحب کا سارا زور صرف تین الفاظ پر تھا۔ روٹی، کپڑا اور مکان، ان تین الفاظ میں سب کچھ تھا۔ یہ بالکل سادہ اور عام فہم بات تھی۔ اب یہ کہنا کہ ''یہ تو سب جھوٹ تھا''۔ مجھے اس بات سے بھی اتفاق نہیں۔ لوگوں کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنا بالکل درست بات ہے، جس کے ہم خود بھی علَم بردار ہیں۔ یہ سوچنا کہ بھٹو صاحب نے لازمی طور پر سب کو روٹی کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کیا تھا، یا سب لوگوں نے صرف اور صرف اسی بنا پر ووٹ دیا تھا کہ یہ چیزیں ان کی ملکیت ہو جائیں گی، ایک خلافِ واقعہ بات ہے۔ انھوں نے ان چیزوں کی فراہمی کا وعدہ کیا تھا، لازمی طور پر ہر ایک کو بہم پہنچا دینے کا لازمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر مارچ ۱۹۷۷ء میں انھیں کوئی ووٹ نہ ملتا۔ تب بھی وہ دھاندلی نہ کرنے کے باوجود اکثریت حاصل کرتے، حالانکہ لوگوں کو ان چھے برسوں کے دوران ملا تو کچھ نہیں تھا، مگر انھوں نے بہرحال عام لوگوں تک ہمدردی کا پیغام ضرور پہنچایا تھا۔ اسی لیے غریب، غریب رہنے کے باوجود ان کے ساتھ آیا۔

ہماری انتخابی تقاریر عام فہم نہیں تھیں۔ 'آئین' اور اس سے متعلقہ چھوٹے موٹے امور کب عوام الناس نے طے کرنے تھے یا ان کی سمجھ میں آنے والی بات تھی، کہ جس پر ہمارا سارا زور صَرف ہو رہا تھا۔ اس کے لیے 'منشور' میں اعلان اور کچھ نہ کچھ تذکرہ کافی تھا۔ 'آئین' کی باریکیاں زیرِ بحث لانے کے بجائے آئین کے بارے میں ایک تصور ہی عام لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔

پھر ہماری انتخابی مہم بڑی سُست رفتار تھی اور مقابلے میں مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب کی مہم بڑی تیز رَو تھی۔ آٹھ دس منٹ کی تقریر میں وہ بات مکمل کر کے اگلے مقام پر پہنچ جاتے تھے۔ ایک ایک دن میں پندرہ، بیس جلسوں سے خطاب کر لیتے تھے۔ ہمارے مقررین کی تمہید ہی دس منٹ لے جاتی تھی۔ اس کے بعد ۳۵ کا ایکٹ، قراردادِ مقاصد، پہلی دستور یہ کے ٹوٹنے، ۵۶ء کے آئین کی خوبیاں اور مارشل لا کی خرابیاں بیان کرتے پون گھنٹہ گزر جاتا۔ رہی سہی کسر سوشلزم کی تاریخ اور اس کی زیادتیاں بیان کرنے میں پوری ہو جاتی، اور اس دن اپنا بہتر منشور پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ہمارے سب مقررین کا یہ انداز نہیں تھا، مگر ہمارے اکثر مقررین ایسا ہی کرتے تھے۔ بڑی سوچی، سمجھی، سلجھی، متین، نستعلیق اور سنجیدہ تقریر ہوتی تھی۔ ہمارے مقرر عوامی خطابت کے رموز سے واقف نہیں تھے۔ اس لحاظ سے بھی ہماری مہم سُست رفتار تھی، اس کا آہنگ بہت کمزور تھا، پُرکشش نعرے ناپید تھے اور واضح پروگرام کی کمی تھی۔ شخصیت بھی کوئی ایسی متحرک نہیں تھی۔ اگرچہ تنظیم مضبوط تھی، مگر اس کی بنیاد وسیع نہیں تھی۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے پاس ہر نشست پر ایک مناسب نمائندہ موجود تھا۔ مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب نے ایسی لہر پیدا کر دی تھی، کہ بالکل غیر معروف لوگ بھی کامیاب امیدوار ثابت ہو رہے تھے۔ مطلب یہ کہ، الیکشن مہم کے آغاز ہی میں ہم بہت زیادہ پیچھے تھے اور انتخابی مہم کا ہر آنے والا دن ہمیں مزید پیچھے دھکیل رہا تھا۔

انتخابی منظر کا جائزہ

میری نظر میں ہمارے جیتنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے ساتھ مالیات کا معاملہ بھی بہت کمزور تھا اور معرکہ بڑا زبردست تھا۔

عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) کی جانب سے جگہ جگہ تشدد، دھمکی اور ہنگامے کا صرف خطرہ ہی نہیں تھا، بلکہ وہ یہ سب کچھ کر بھی رہے تھے۔ ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ۱۸ جنوری کو مولانا مودودی کے جلسے پر عوامی لیگ کا حملہ اس عدمِ برداشت، غنڈہ گردی اور غیر جمہوری رویے کی بدترین مثال تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم میدان میں تھے، معرکہ سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے میرا خیال تھا، کہ سب سے پہلے ہم کو سارے حقائق جمع کر کے جائزہ لے لینا چاہیے: کیا حالات ہیں؟ مالی اور افرادی قوت کی کیا صورت ہے؟ کس کس حلقے میں ہمارے امیدوار کی کیا پوزیشن ہے؟ مخالفین کی قوت کس قدر ہے؟ ان حقائق کو معلوم کر کے مجموعی طور پر بھی اور پھر ایک ایک نشست پر ہمیں طے کرنا چاہیے کہ کیا حکمت عملی اختیار کریں؟

اپنے دل کے مرض کی وجہ سے، جلدی جلدی اور مقدور بھر صلاحیتوں کو لگا کر کام کرنا میری عادت بن گئی ہے۔ انتخابی جائزے کے اس کام کے لیے میں نے ماسٹر شفیق اللہ صاحب سے کہا کہ ''مشرقی پاکستان کے کُل سترہ اضلاع ہیں۔ ہمیں ہر ضلع میں خود جانا چاہیے۔ خود جماعت کے نظم اور کارکنوں سے ملاقات کر کے امیدوار، صلاحیت اور امکانات کا تجزیہ کرنا چاہیے''۔ مجھے صرف اتوار کو چھٹی ہوتی تھی، اس لیے کہا کہ ''اس کے ساتھ ہفتہ کو بھی چھٹی لے لوں گا، مگر آپ بتائیں اس کام میں کتنے دن لگیں گے؟'' شفیق صاحب کہنے لگے: ''سترہ ہفتے تو لگیں گے''۔ میں نے کہا: ''آپ کا مطلب ہے، چار مہینے۔ ان چار مہینوں میں الیکشن کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ لیکن ہمیں تو فوری طور پر حقائق معلوم کرنے چاہییں، تاکہ کوئی حکمت عملی وضع کرسکیں۔ پھر مجھے فنڈز اکٹھے کرنے ہیں اور مختص بھی کرنے ہیں۔ وہ کہنے لگے: ''یہ تو ممکن نہیں ہوگا''۔ میں نے کہا کہ ''ہم

تین، چار ضلعے ایک ایک دو دو دن میں بھگتا لیں گے۔ بس، دعا کیجیے، اللہ نے چاہا تو ناممکن کو ممکن کر کے دکھائیں گے''۔

دیناج پور شمال میں بالکل آخری ضلع تھا۔ ڈھاکہ سے دیناج پور ہیلی کاپٹر سروس جاتی تھی۔ میں نے کہا: ''ہم دیناج پور ہیلی کاپٹر سے چلیں گے۔ جہاں بھی جانے کا ہمارا پروگرام بنے، آپ پہلے سے سب کو مطلع کر دیں اور وقت بتا دیں۔ سارے کارکن ضلعی صدر مقام پر آجائیں۔ تمام نشستوں کے کوائف اور اپنا جائزہ بھی تیار کر کے لے آئیں۔ ہم کارکنوں کے ساتھ نشست کریں گے، گفتگو کریں گے، جن سے الگ ملنا ضروری ہوگا، ان سے الگ بھی ملیں گے۔ جمعیت والے اگر الگ سے ملنا چاہیں، تو ان سے بھی مل لیں گے''۔

مشرقی پاکستان رقبے اور حجم کے لحاظ سے چھوٹا سا علاقہ ہے۔ فاصلے بہت کم ہیں۔ ہم صبح سویرے دیناج پور کے لیے نکلے اور چالیس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ میٹنگ صبح ہی سے تیار تھی۔ تمام لوگوں نے تفصیل سے ضلع کی ایک ایک نشست کا جائزہ پیش کیا۔ ان کی سوچ سے واقفیت حاصل ہوئی اور ہر نشست واضح ہو کر سامنے آگئی۔

اس طرح ضلعی اجتماعات کا سلسلہ شروع کیا۔ ان اجتماعات میں، میں نے پہلی بار کارکنوں کے سامنے بنگلہ زبان میں مسلسل، مفصل اور مربوط گفتگو کی۔ اس لیے کہ ان علاقوں کے لوگ اُردو بالکل نہیں جانتے تھے۔ نو دس سال رہ کر بنگلہ زبان سمجھنے کی مجھے مشق ہو گئی تھی اور ویسے بھی بنگلہ کو شعوری طور پر ذہن نشین کرتا رہتا تھا۔ مگر اب تک مجھے کوئی ایسا موقع نہیں ملا تھا، کہ میں بنگلہ میں کوئی لمبی گفتگو کروں۔ ڈھاکہ میں اُردو اور انگریزی سے کام چل جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے دیناج پور میں پہلی دفعہ بنگلہ میں کوئی لمبی گفتگو کی۔

دیناج پور سے فارغ ہوئے تو رنگ پور پہنچے۔ یہاں بھی اسی طرح شام کو اجتماع کیا۔ اگلی صبح ہم نے بوگرہ کی راہ لی اور وہاں پر اجتماع کیا۔ شام کو بوگرہ سے ٹرین پکڑی اور

آدھی رات کے لگ بھاگ ڈھاکہ واپس پہنچ گئے۔ اگلے دن پیر کی صبح میں آفس میں تھا۔ تین ضلعے دو دن میں نبٹا لیے گئے، یعنی ایک چھٹی کو ساتھ ملا کر یہ کام کیا۔ اس کے بعد شفیق صاحب نے کہا: ''ہاں یہ کام ہوسکتا ہے''۔

اگلی دفعہ ہم نے صبح سویرے پبنہ کے لیے ہیلی کاپٹر کا سفر کیا۔ یہاں پر مولانا عبدالسبحان صاحب کو پہلے سے اطلاع تھی، لوگ جمع تھے، اجتماع ہوا۔ وہاں سے راج شاہی گئے۔ جہاں پر شام تک اجتماع کیا، اور رات وہیں پر گزاری۔ صبح سویرے کشتیا آ گئے، ظہر تک کشتیا سے فارغ ہوکر جیسور چلے گئے۔ مغرب تک کھلنا پہنچ گئے۔ وہاں پر رات ایک بجے تک اجتماع رہا۔ صبح سویرے کھلنا سے ہیلی کاپٹر کی پرواز لی اور پیر کے دن ڈھاکہ میں اپنے دفتر حاضری دی۔ دودن میں مزید پانچ اضلاع تک پہنچ کر ضروری بریفنگ کی۔

تیسری بار نکلے تو کومیلا، نواکھالی اور چٹاگانگ سے ہو آئے۔ اس طرح گیارہ اضلاع، تین ہفتوں میں مکمل کر لیے۔ سلہٹ اور میمن سنگھ (مومن شاہی) الگ سے گیا۔ فرید پور اور باری سال جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کہ وہاں پر اتنا کام نہیں کیا تھا۔ ڈھاکہ تو ہمارے سامنے تھا۔

اس دورے کے بعد میرے سامنے صورت حال بالکل واضح تھی، کہ یہاں سے ہمارے کسی ایک امیدوار کا بھی جیتنا مشکل ہے۔ الیکشن لڑنے والے تو اس اعتماد و یقین سے لڑ رہے تھے، کہ ہم جیتیں گے، لیکن میں نے حقیقت پسندانہ جائزے کے باوجود ان کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ وہ جس جذبے سے کام کر رہے تھے، اس میں اگر ابتدا ہی سے ان کا حوصلہ توڑ دیا جاتا، تو یہ پہلا موقع جس میں ہم براہِ راست اہلِ بنگال تک پہنچ رہے تھے، وہ بھی ضائع ہوجاتا۔ میدانِ جنگ میں آدمی فتح کی امید سے سرشار ہوکر ہی کام کرسکتا ہے اور قربانی دے سکتا ہے۔

البتہ میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ الیکشن میں مکمل ناکامی کے امکان کے باوجود ایسی حکمت عملی بنا کر دوں، کہ جس سے ہم اتنے ووٹ لے لیں، کہ ان ووٹوں کی بنیاد پر دوسری

پارٹی کے طور پر سامنے آسکیں۔ اگر یہ ہدف حاصل کر لیتے ہیں، تو بذاتِ خود آیندہ کے لیے ایک اچھی بنیاد ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ ہم نے ایسی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے حکمت عملی وضع کی اور ایسا ہوا بھی۔

ہم خیال جماعتوں سے مفاہمت

انتخابات کے دوران بائیں بازو کی قوم پرست اور سیکولر پارٹیوں کو چھوڑ کر دیگر پارٹیوں کے درمیان انتخابی مفاہمت کے لیے جو اجلاس ہوئے، ان میں جماعت کی نمایندگی کرنا میرے ذمے تھا۔ کیونکہ غلام اعظم صاحب سمیت جماعت کے تمام رہنما انتخابی مہم میں مصروف تھے۔ اب میں بلاجھجک بنگلہ بول سکتا تھا۔ ویسے بھی ایک ایک ضلع کے بارے میں واقفیت رکھتا تھا، اس لیے زیادہ جم کر بات کرسکتا تھا۔ ہم نے مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی کی ۱۶۳ نشستوں میں سے اپنے ۶۰ اُمیدواروں کی فہرست بنائی تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہمیں ۲۰، ۲۵ نشستوں پر ہی الیکشن لڑنا چاہیے۔ ہم اتنے ہی وسائل فراہم کرسکتے تھے، اور اتنی ہی نشستوں پر مناسب افرادی قوت بھی موجود تھی، جو انتخابی مہم چلاسکتی۔ چنانچہ ۶۰ کی فہرست میں آدھی تو جھگڑوں وغیرہ میں چھوڑنے کے لیے تھیں، تاکہ مفاہمت اور معاملہ فہمی کے دوران کوئی ایسی اچھی نشست مل جائے، جسے ہم نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اسی طرح کچھ ایسی نشستیں تھیں، جہاں اگرچہ ہمارا موزوں امیدوار تھا، لیکن دوسری حلیف پارٹیوں کا کوئی لیڈر یا معروف فرد الیکشن میں حصہ لے رہا تھا، اس لیے خیر سگالی کے جذبے کے تحت ہمیں وہاں پر نشست چھوڑنا چاہیے تھی، اور ایسا ہی کیا۔

اس انتخاب میں مغربی پاکستان کی طرح ہمارے ہاں جھگڑا نہیں ہوا، بلکہ سارے اختلافات بڑی خوش اسلوبی اور یگانگت سے حل کر لیے گئے۔ نورالامین صاحب اور مولوی فرید احمد صاحب وغیرہ کا رویہ بڑا اچھا تھا۔ ہم نے ایک بات شروع میں طے کر لی تھی، کہ ''بعض جگہ پر ممکن ہے کہ جھگڑا پڑ جائے، اور کوئی بھی اپنے امیدوار کو بٹھانے کے لیے تیار نہ ہو، ایسی چند ایک نشستوں کے لیے ہم اپنے پورے معاہدے اور اتحاد کو خراب نہیں کریں گے،

بلکہ ایسی نشست کو سب کے لیے کھلا رہنے دیں گے''۔ اس حقیقت پسندانہ رویے کی بنیاد پر ہمارا یہ اتحاد سلامت رہا۔

اب یہ مغربی پاکستان کا مزاج تھا، یا بے تدبیری کی انتہا، کہ لاہور سے بھٹو صاحب کا مقابلہ کرنے کے لیے، مسلم لیگ کے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اور پاکستان جمہوری پارٹی کے جنرل سرفراز خان صاحب میں سے کسی ایک امیدوار پر اتفاق کے نہ ہونے پر پورے مغربی پاکستان میں ہم خیال جماعتوں کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جاوید اقبال صاحب کی حمایت کے لیے ہم نے بہت آگے بڑھ کر جو پوزیشن اختیار کی، وہ مناسب نہیں تھی۔

مشرقی پاکستان میں انتخابی مہم چلاتے وقت ہمارے نوجوان کارکن کامرانی کے جذبے سے سرشار تھے کہ ''ہم کافی نشستیں جیت لیں گے'' جیسا کہ ہر الیکشن میں ہوتا ہے۔ اس عرصے میں جب کہ میں اتحادی جماعتوں کے سامنے کمزور نشستیں چھوڑ کر نسبتاً زیادہ محفوظ نشستوں پر آ رہا تھا، ہمارے ہی روزنامہ سنگرام میں جمعیت کے ایک کارکن کا بڑا تندوتیز مضمون شائع ہوا، عنوان تھا: ''شہدا کے خون کا سودا نہ کیا جائے''۔ مضمون میں دراصل میری حکمت عملی کی جانب اشارہ تھا۔ اگرچہ مضمون نگار کا استدلال جذباتی اور حقائق کے منافی تھا، لیکن اس کا جذبہ قابلِ قدر تھا۔ وہ محمد عبدالمالک شہید اور پلٹن میدان ڈھاکہ کے شہدا کی یاد میں بجا طور پر تڑپ رہا تھا۔ یہ اس کا حق تھا، اور جماعت کے نظم نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی اسے دیانت داری سے ادا کرنا مجھ پر واجب تھا۔ اس لیے میں نے سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا۔

دفتر پر حملے کا خدشہ

انتخابی مہم کے دوران کی بات ہے، نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر عبدالحمید خاں بھاشانی صاحب مغربی پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ان کی کانفرنس تھی۔ کانفرنس کے بعد وہ ریل میں سفر کر رہے تھے، کہ مبینہ طور پر ان پہ کسی نے حملہ کیا۔ اس میں حقیقت کتنی تھی اور ڈرامہ کتنا، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بہرحال اس میں دل چسپ بات یہ ہے

کہ حملہ کی یہ خبر مشرقی پاکستان میں اس طرح شائع ہوئی کہ ''جماعت اسلامی کے کارکن نے بھاشانی صاحب پر قاتلانہ حملہ کردیا''۔ اس من گھڑت خبر سے یہاں پر بڑا ہیجان پیدا ہوگیا کہ ایک بنگالی پر حملہ ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ مسلح اور تربیت یافتہ تھے۔

انھوں نے پلٹن میدان ڈھاکہ میں احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ چاروں طرف یہ خبر فضا میں گرم تھی کہ ''جلسے کے بعد جماعت اسلامی کے دفتر کوثر ہاؤس کو جلا دیا جائے گا''۔ بھاشانی صاحب نے ''گھیراؤ اور جلاؤ'' کا نعرہ دے کر فضا کو اور زیادہ پُرتشدد بنا دیا تھا۔ جماعت کے دفتر کو ایک گلی سے راستہ آتا تھا۔ جب کہ دو اطراف میں تنگ سی گلی تھی۔ یہاں گھسنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جماعت کے دفتر پر حملہ کر کے جلائے جانے کی امکانی خبر بڑی سنگین تھی، جس سے ہمیں بڑی پریشانی تھی۔

چنانچہ پہلے ہم نے مقامی شوریٰ کا ہنگامی اجلاس کیا۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر ناظمین حلقہ اور کارکنوں کا اجتماع طلب کرلیا۔ میری رائے تھی کہ خواہ ہمیں کوئی بھی قربانی دینا پڑے دفتر کا ہر حال میں دفاع کرنا ہے، اسے چھوڑ کر ہم نہیں بھاگ سکتے، جس طرح جھنڈے کا دفاع کیا جاتا ہے، اسی طرح دفتر کا دفاع کرنا ضروری ہے۔ شوریٰ اور کارکنوں میں بھی اس پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ظہر کے بعد پلٹن میدان میں بھاشانی گروپ کا جلسہ شروع ہوگا، اس لیے اس روز کارکن یہاں دفتر میں جمع ہوجائیں گے۔ سارے کارکنوں کا اجتماع ہوا اور ذاتی حفاظت کے لیے لکڑی کی لاٹھیاں بھی جمع کرلی گئیں۔ اس زمانے میں لاٹھی ہی سب سے بڑا دفاعی ہتھیار تھا۔ اس جلسے سے ایک دن پہلے میں نے آکر دفتر کا سارا جائزہ لیا اور دیکھا کہ ایک طرف سے آنے کا بڑا راستہ ہے، اس لیے امکان تھا کہ حملہ آور وہیں سے آسکتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ ہم جماعت کے کارکن دفتر کے ایک چھوٹے سے صحن میں جمع ہورہے ہیں۔ اگرچہ دفاع کی تیاری تو کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ خیال تھا کہ بہت بڑا

رسک بھی لے رہے ہیں۔ ایک اہم سوال ذہن میں یہ اُبھرا کہ کیا کوئی باہر نکلنے، ری ٹریٹ کرنے کا راستہ بھی ہے؟ چنانچہ اندر سے ایک راستہ جو پیچھے دوسری گلی میں جا کر نکلتا تھا، وہ دکھائی دیا۔ جب ایک دو کارکن رہ گئے تو اس کو صاف کرایا، مگر کسی کو نہیں بتایا کہ ہمارے پاس یہ ایک راستہ پسپائی کا بھی ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کی جانب سے حملے کا خطرہ تھا، وہ باقاعدہ مسلح تھے، ان میں سے اکثر لوگ کمیونسٹوں کی نکسل باڑی تحریک کے تربیت یافتہ تھے۔ ہم محض ڈنڈے لاٹھی کی مدد سے ان کو دُور نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی دوسرے وسائل تھے اور نہ ہمارا نظم ہم کو اس کی اجازت دے سکتا تھا۔

جب متوقع حملہ آوروں کا جلسہ ہوا، ہم نے اسی وقت دفتر میں اپنا اجتماع کارکنان شروع کیا، اس اجتماع میں درسِ قرآن، حدیث اور انذار وتبشیر کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ لوگ بڑے جذبے سے سرشار تھے، ان میں استقامت تھی، جذبہ تھا اور شہادت کا شوق تھا۔ اسی اجتماع کے دوران ہارٹ اٹیک کے مابعد اثرات کی وجہ سے میں نے سینے میں درد محسوس کرتے ہوئے ساتھیوں سے پوچھا کہ ''آپ لوگ بتائیں، کیا میں موقع پر موجود رہوں؟'' لوگوں نے بلاتوقف کہا: ''آپ کا ہونا ضروری ہے'' اور میں نے بھی بلاہچکچاہٹ کہا کہ ''ہاں میں آپ کے درمیان موجود رہوں گا''۔ حالانکہ میں نے اس روز گھر والوں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں اور کس خطرے کا سامنا کرنے جارہا ہوں۔

متوقع حملہ آوروں کا جلسہ جاری تھا۔ ہمارے لوگ پل پل کی خبریں لاتے رہے، کہ جلسے میں یہ ہو رہا ہے، جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو گالیاں دی جارہی ہیں۔ ہم لوگ تیار بیٹھے تھے کہ جلوس آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی مدد کی اور جلوس کا رخ دفتر کی طرف نہیں ہوا، وہ نواب پور روڈ کی طرف نکل گیا۔ لیکن اس واقعے سے کارکنوں کا امتحان ہو گیا۔ جو کم وبیش تمام کے تمام، وقت سے پہلے دفتر میں موجود تھے۔ بوڑھے اور بیمار بھی حاضر تھے، سبھی کے چہرے جذبے سے تمتما رہے تھے، اور ان کی لو اپنے رب سے لگی ہوئی تھی۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے آپ کو کچھ ٹیسٹ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس روز فضا میں بڑا تناؤ اور ٹینشن تھا اور پوری تباہی متوقع تھی۔ لیکن اللہ کے فضل سے ہم سب لوگ

استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ یہ تھی وہ فضا جس میں یہ کام ہو رہا تھا۔

پارلیمانی بورڈ کا اجلاس

جون ۷۰ء میں ڈھاکہ میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا۔ جس میں شرکت کے لیے مولانا مودودی، محترم میاں طفیل محمد، چودھری رحمت الٰہی صاحب، اسعد گیلانی صاحب اور بورڈ کے دوسرے ارکان ڈھاکہ آئے۔

بورڈ کا اجلاس شروع ہوا۔ میں مولانا مودودی کے دائیں طرف بیٹھا ہوا تھا اور مشرقی پاکستان سے جماعت کے امیدواروں کے نام پیش کرتا جا رہا تھا، جو کسی خاص بحث کے بغیر منظور ہوتے گئے۔ ایسا ہی ہونا تھا، کیونکہ مغربی پاکستان سے آنے والے نہ ان علاقوں سے واقف تھے، نہ وہاں کی سیاسی صورت حال سے آگاہ تھے اور نہ امیدواروں کے بارے میں جانتے تھے۔ ویسے بھی ان ناموں کی منظوری صوبائی مجلس شوریٰ دے چکی تھی۔

اس سے ذرا پہلے مشرقی پاکستان سے جماعت کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آیا تھا۔ ایئرپورٹ پر چونکہ کوئی لینے نہیں آسکا تھا، اس لیے ایئرپورٹ سے ایک ٹیکسی لی۔ ٹیکسی پر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ ڈرائیور سے سیاست کی بات چھیڑی تو وہ پیپلز پارٹی کا بہت پُرجوش حامی نکلا۔ اس کے بعد میں اچھرہ موڑ پر جا اُترا، جہاں پر جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر اور مولانا مودودی کی رہائش بھی تھی۔ اچھرہ میں جدھر نظر دوڑائی، اکثر دکانوں اور مکانوں پر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لہراتا دیکھا۔ میں جب لاہور جاتا اور اگر مہمان خانے میں میرا ٹھیرنا ضروری نہ ہوتا، تو ماڈل ٹاؤن میں اپنی اہلیہ کی پھوپھی کے ہاں رات کو قیام کرتا۔ یہ جگہ ویسے بھی اچھرہ سے قریب تھی۔ اطلاع کرنے پر وہ لے جاتے اور بروقت چھوڑ جاتے۔ میں ان کے ہاں گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ''ہمارے ہاں برسوں سے کام کرنے والی آیا، جو ہماری احسان مند ہے، جب ہم نے اس سے یہ کہا کہ جماعت اسلامی کو ووٹ دو تو وہ کہتی ہے کہ ''نہیں، ہم تو پیپلز پارٹی کو ووٹ دیں گے''۔

یہ سمجھ لیں کہ دیگ کے ایک دو چاول ہی تھے، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں پر

بھی جماعت کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ لاہور سے کراچی گیا، تو وہاں پر زیادہ صحیح اندازہ نہیں کرسکا۔ بہرحال کراچی میں جماعت کا کام تو بہت تھا۔ اس چھوٹے سے دورے سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ مغربی پاکستان میں بھی بہت اچھے آثار نہیں ہیں۔ لیکن مغربی پاکستان میں جماعت کے رفقا بڑے پُرامید اور بڑی کامیابی کی اُمید سے سرشار تھے۔ حقیقت پسندی پر مبنی بات سننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ بے بنیاد تاویلیں تھیں کہ ''دوسروں کے جلسوں میں لوگ پیسے لے کر جاتے ہیں۔ پیسے دے کر پیپلز پارٹی کے جھنڈے لگوا دیے گئے ہیں'' مگر عوامی سطح پر پیپلز پارٹی کے اثرات دیکھ کر بات واضح تھی کہ یہ سب کام پیسے سے نہیں ہوسکتا۔

میں بتا رہا تھا ڈھاکہ میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا۔ اجلاس کے دوران ایک وقفے میں، مَیں میاں طفیل محمد صاحب، چودھری رحمت الٰہی صاحب اور چند دوسرے رہنماؤں کے ساتھ الگ سے بیٹھ گیا۔ ان کے سامنے مشرقی پاکستان کا پورا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ''مشرقی پاکستان سے ہم شاید ایک بھی نشست پر کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔ اگر کوئی نشست ٹپک آئے، تو وہ دوسری بات ہے۔ میں کوئی عالم الغیب نہیں ہوں لیکن مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مغربی پاکستان کی پوزیشن کو آپ لوگ بہتر جانتے ہیں۔ میرا ایک سرسری سا جائزہ ہے جس کی بنا پر مجھے وہاں بھی کوئی بہتر امکان نظر نہیں آرہا ہے''۔

انھی شرکا میں سے کسی نے کہا کہ ''آپ مولانا محترم کو بھی اپنا جائزہ بتا دیں''۔ لیکن میاں صاحب نے تشویش بھرے لہجے میں کہا: ''آپ مولانا کو کیوں پریشان کرتے ہیں''۔ اگر میں اپنا تاثر بلاکم و کاست مولانا مودودی کے سامنے پیش کرتا تو وہ پوری توجہ سے سنتے۔ یہ بات نہیں کہ وہ تصویر کا محض روشن پہلو دیکھنا، سننا پسند کرتے تھے بلکہ ان کے سامنے کسی پہلو کا بڑا بھیانک منظر بھی پیش کیا جاتا تو وہ پورے حوصلے سے سنتے اور اس میں راہ نمائی دیتے۔ بہرحال اس وقت میرا کوئی ایسا مقام نہیں تھا کہ میں کہتا کہ ''نہیں، میں مولانا کو ضرور بتاؤں گا''۔ میرے مزاج میں کبھی یہ نہیں رہا کہ بڑوں کی بات رد کر کے بے جا اڑ جاؤں۔

قبل از انتخاب تجزیہ

سات دسمبر ۷۰ء کے انتخاب سے دو دن پہلے مغربی پاکستان سے روزنامہ پاکستان آبزرور کے نمایندے نجیب اللہ کا ایک جائزہ شائع ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے مغربی پاکستان میں متوقع پارٹی پوزیشن پر لکھا تھا۔ انھوں نے یہی پیش گوئی کی تھی کہ ''پیپلزپارٹی جیت رہی ہے۔ خاص طور پر پنجاب میں تو بڑے بڑے قلعے گر جائیں گے۔ برادریاں، زمیندار اور جاگیردار اپنا بھرم کھو دیں گے۔ لوگوں میں پیپلزپارٹی کی بڑی زبردست لہر ہے'' ___ مگر اس لہر کو تسلیم کرنے سے ہم انکار کر رہے تھے۔

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ: ''دل چسپ بات یہ ہے کہ اس لہر کو پیدا کرنے میں جماعت اسلامی کا بڑا حصہ ہے۔ جماعت کی دعوت نے برادری ازم اور جاگیردارانہ انداز میں سیاست وغیرہ کو توڑ دیا ہے۔ لیکن لوئر مڈل کلاس (نچلے متوسط طبقے) سے تعلق رکھنے کے باوجود جماعت خود اپنے اس وسیع کام اور اثرات کو کیش نہیں کرسکی ہے''۔ ان کی یہ بات غلط نہیں تھی۔ اب تک طویل مشاہدے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ ہمارا ڈھانچا اور مزاج بلاشبہہ ایک فضا کو تیار کرسکتا ہے، لیکن اس کو کیش نہیں کراسکتا۔ واقعی یہ بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے۔

پھر تجزیہ نگار نے لکھا: ''پیپلزپارٹی انتخابات جیت جائے گی۔ ممکن ہے اس سے اگلے انتخابات میں جماعت کامیاب ہوسکے۔ کراچی سے جماعت کو دو نشستیں ملیں گی (حالانکہ کراچی کے بارے میں پُرامید تھے کہ تقریباً سبھی نشستیں مل جائیں گی) پورے پنجاب میں مشکل سے دو نشستیں ملیں گی''۔ جب انتخابی نتیجہ آیا تو پورے پنجاب سے صرف ایک ہی نشست ملی۔ ڈیرہ غازی خان سے ڈاکٹر نذیر احمد شہید (شہادت ۸ جون ۱۹۷۲ء) نے فاروق احمد خان لغاری صاحب کے والد محترم کو ہرا کر یہ نشست جیتی تھی۔

مخالفین کے تبصرے، اہمیت

خاص طور پر بی بی سی، وائس آف امریکا یا دوسرے ابلاغی اداروں اور اخباروں کے

تبصروں وغیرہ کو ہم یوں ہی رد کر دیتے ہیں، جیسے وہ خاص طور پر ہماری دشمنی ہی کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ سب لوگ محض تعصب کی بنیاد پر لکھتے ہیں۔ یقیناً کہیں نہ کہیں ان کا نقطۂ نظر یا ان کے جذبات کی رو بھی شامل ہوتی ہے۔ مگر مجموعی طور پر وہ جو سمجھتے ہیں، اسی کو لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ساکھ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آپ دیکھیے کہ اگرچہ وہ اسلامی تحریکوں کے حامی نہیں ہیں، لیکن الجزائر (۱۹۹۰ء) اور ترکی (۱۹۹۵ء) کے انتخابات سے قبل وہ برابر اس امر کا اعتراف کرتے رہے، کہ اسلامی تحریک کے لوگوں کو زیادہ ووٹ ملیں گے۔ چونکہ یہ بات زمینی حقائق پر مبنی تھی، اس لیے وہ جیتے۔ اور پیشگی طور پر وہ تجزیہ نگار بھی ان حقائق کو نہ جھٹلا سکے، جنھیں ہم اکثر سننا پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

باقی جہاں تک میرا ذاتی معاملہ ہے، میں پریس اور مخالفین کے جائزوں کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ انھیں بے حقیقت نہیں سمجھتا۔ اپنا تجزیہ تیار کرتے وقت ان کی آرا کو وزن دیتا ہوں۔ حقیقت پسندی اور سمجھ داری کا یہ تقاضا ہے کہ ہمیں اپنے کام کے اسلوب کا جائزہ لیتے وقت ان تبصروں کو 'دشمن کا پروپیگنڈہ' سمجھ کر یونہی رد نہیں کر دینا چاہیے۔ اگر ہم لوگ دوسروں پر اکثر کڑی تنقید کر کے انھیں سنبھلنے کا موقع دیتے ہیں، تو پھر خود ہمیں بھی دوسروں کی تنقید سے سنبھلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

انتخابی نتائج کا طوفان

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کا دن پولنگ میں گزرا اور پھر انتخابی نتائج کی رات آئی۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن پر نتائج آنا شروع ہوئے۔ جماعت کے سبھی ساتھیوں کے لیے یہ نتائج ایک صدمہ (shock) تھے۔ وہ حیرت زدہ تھے کہ ایسے نتائج کیوں آرہے ہیں؟ مغربی پاکستان کے بارے میں، مشرقی پاکستان کے ساتھیوں کی توقعات بہت بلند تھیں۔ ادھر مشرقی پاکستان کے بارے میں مغربی پاکستان کے لوگوں کو بہت ساری اُمیدیں وابستہ تھیں۔

مجھے تو مغربی پاکستان کے بارے میں بھی تین چار نشستوں سے زیادہ کی توقع نہیں تھی۔ کراچی میں جماعت کی پوزیشن سب سے زیادہ مضبوط تھی اور کراچی سے بڑی توقعات تھیں۔ انتخابات کی رات جب نتائج آنا شروع ہوئے تو کراچی سے صرف دو نشستیں واضح اکثریت سے آئیں، یعنی ایک نشست پر پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب اور دوسری پر مولانا ظفر احمد انصاری صاحب منتخب ہوئے، جنھیں جماعت کی پوری حمایت حاصل تھی اور جماعت ہی کے کارکن ان کی مہم چلا رہے تھے۔ باقی پورے صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پنجاب میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اور صوبہ سرحد کے علاقے دیر سے صاحبزادہ صفی اللہ صاحب کامیاب ہوئے۔ کراچی سے محمود اعظم فاروقی صاحب بڑے کم ووٹوں سے کامیاب ہوئے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ یہ نتائج سنتے وقت کراچی جماعت کے ایک ذمہ دار فرد تو اس قدر غصے میں آئے کہ وہ یہ کہتے ہوئے ٹیلی ویژن سیٹ توڑ کر چلے گئے کہ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے''۔ فی الواقع عام طور پر ہمارے ساتھیوں کی یہی کیفیت تھی اور لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

خوش فہمی کی دُھند

۳۱مئی ۱۹۷۰ء کو یومِ شوکت اسلام کے عظیم الشان جلوسوں سے جو فضا بنی تھی، دراصل اس نے ہمیں غلط اندازے قائم کرنے پر اُبھارا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نوعیت کے جلسے اور جلوس عوام کی تائید و حمایت کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی بڑا قابلِ اعتماد معیار نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کسی خاص صورت میں یہ واقعی عوام کی نبض بتا سکیں، مگر مجموعی طور پر کوئی ٹھوس فیصلہ کرنے کے لیے ان پر اعتماد و انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو صحیح طور پر دیکھنے کے لیے جذباتی رویے سے اجتناب اور بے جا خوش فہمیوں سے دامن چھڑانا بہت ضروری ہوگا۔

مثال کے طور پر جس طرح آج کل پاکستان میں 'ٹرین مارچ' طرح کی چیزوں کا رواج چل نکلا ہے۔ اس میں آپ دیکھیں، گاڑی اسٹیشن پر رکتی ہے، تو کوئی لیڈر یا پارٹی وہاں پر

نہ موجود ہو تب بھی مسافروں کی تعداد نے ایک ہنگامہ سا برپا کیا ہوتا ہے۔ اب کسی پارٹی کے صرف پانچ سو آدمی بھی ریلوے اسٹیشن پر آجائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیشن بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح اگر آپ کسی چھوٹی گلی میں جارہے ہوں اور وہاں پر پانچ سو آدمی جمع ہو جائیں تو لگتا ہے پورا شہر اُمڈ آیا ہے، لیکن وہی پانچ سو آدمی اگر کراچی کی بندر روڈ، لاہور کی مال روڈ یا اسلام آباد کے بلیو ایریا پر آجائیں تو وہ لوگ اپنی تعداد کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں لگیں گے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ہم نے کراچی جماعت کے تحت جو پہلا جلوس نکالا تھا، اس کو چار چار آدمیوں کی صف بنا کر بولٹن مارکیٹ سے برنس روڈ تک لمبا کر لیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۶۴ء میں جماعت کی بحالی پر ڈھاکہ میں جلوس نکالا تھا، جس کا ایک تاثر بنا تھا، مگر اپنی جگہ ہم خود ان جلوسوں کی عوامی حقیقت سے آگاہ تھے۔

ایک واقعہ یاد آیا، جن دنوں بھارت میں گجرات کو الگ صوبہ بنانے کی بڑی زبردست مہم چل رہی تھی، اس میں ایک بار بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو دہلی سے احمد آباد گئے۔ ان کا طیارہ ایئر پورٹ پر نہ اُتر سکا۔ کیونکہ بڑی تعداد میں لوگوں نے آکر ایئر پورٹ کو گھیر لیا اور مخالفانہ نعرے لگائے۔ وزیراعظم کا طیارہ نہیں اُتر سکا اور وہ واپس چلے گئے۔ بظاہر یہ بڑی خراب صورت تھی، جس پر لوگوں نے ان سے کہا ''آپ الیکشن کیسے جیتیں گے؟'' انھوں نے کہا: ''میرے سارے ووٹر تو گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں''۔ اور واقعی جب الیکشن ہوئے تو ان کی کانگریس پارٹی جیت گئی۔ بعد میں لسانی بنیادوں پر صوبوں کے مطالبے پر کمیشن بیٹھا، اس نے مسئلہ حل کر دیا ـــــ لیکن ہمارے لوگ اکثر اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ کوئی ایک جلسہ یا جلوس ہی پالیسیاں تبدیل کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

جب یہ انتخابی نتائج آرہے تھے تو ڈیڑھ دو گھنٹوں میں اندازہ ہو گیا تھا، کہ حتمی نتائج کیا ہوں گے۔ مشرقی پاکستان میں جو بھی کامیاب ہوتا تھا وہ عوامی لیگ کا تھا اور مغربی پاکستان سے جو لوگ جیت رہے تھے، ان کی اکثریت پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی کا دُور دُور پتا نہیں تھا۔ میرے خیال میں آج تک جماعت کی تاریخ کا

یہ سب سے زیادہ اعصاب شکن واقعہ تھا۔ اس واقعہ نے مولانا مودودی پر، جماعت پر، جماعت کے کارکنوں پر اور جماعت کی مستقبل کی قیادت پر بڑے گہرے اثرات ڈالے۔ لیکن میرا ذہن اس لحاظ سے پُرسکون تھا کہ میرے لیے یہ ایک بالکل متوقع حادثہ تھا۔ اگر آدمی ذہنی طور پر حادثے کے لیے تیار ہو تو وہ صدمے کو برداشت کرسکتا ہے۔ غیر متوقع ہو تو وہ حادثہ اعصاب شکن ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرے لیے یہ اسی طرح دکھ اور رنج کا باعث تھا، جس طرح کسی متوقع موت پر انسان کو رنج وغم ہوتا ہے۔ میں اطمینان سے گھر گیا اور جاکر لیٹ گیا، جب کہ دوسرے لوگ ریڈیو، ٹیلی ویژن سنتے اور دیکھتے رہے۔

اس کے بعد مغربی پاکستان سے فون آنا شروع ہوئے۔ مغربی پاکستان سے الطاف حسین قریشی صاحب، جو اس وقت ہفت روزہ زندگی اور اُردو ڈائجسٹ کے مدیراعلیٰ تھے، انھوں نے بھی مشرقی پاکستان کے دو دورے کیے۔ میں نے ان کو یا اس سطح کے کسی اور ملنے والے کو کوئی غلط اندازہ نہیں دیا۔ سب سے یہی کہا کہ ''یہ میرے اندازے ہیں''۔ لیکن جب ایسی فضا بن جاتی ہے، تو لوگ اپنی مرضی کے خلاف بات سننا نہیں چاہتے۔ بلکہ وہی بات سننا چاہتے ہیں جو ان کو مرغوب اور پسندیدہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے لاہور آکر اچھے خاصے خوش فہمی والے مضامین اور تجزیے شائع کیے۔ وہ مشرقی پاکستان سے جماعت کی ۲۵، ۳۰ نشستیں بتا رہے تھے۔ اس رات مجھے ان کا فون آیا کہ ''یہ کیا ہوگیا؟'' میں نے کہا: ''الطاف صاحب جو آپ کو بتادیا تھا وہی ہوا ہے''۔

صبح ہوئی تو میرے گھر پر کارکنوں نے آنا شروع کیا۔ سب کی حالت بُری تھی، آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے اُترے ہوئے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انھیں اس شدید دکھ کا جواب، اسی سطح کے تاثر میں نہ دے سکا، کیونکہ یہ متوقع تھا۔ بہرحال کارکنوں میں ردعمل شدید تھا۔

غلط اندازوں کی روایتی مثال

چنانچہ جب نتائج آگئے تو مشرقی پاکستان کی بہت سی نشستوں پر ووٹوں کے اعتبار سے

عوامی لیگ نمبر ایک اور جماعت اسلامی نمبر دو تھی۔ مغربی پاکستان میں تو دُور دُور تک جماعت کا پتا ہی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں امیدواروں نے پچاس پچاس ہزار تک بھی ووٹ لیے، مگر مجموعی طور پر ہم ہار گئے۔ اگرچہ سبھی جگہ میرے اندازے صحیح ثابت ہوئے، لیکن کشتیا کے معاملے میں، مَیں دھوکہ کھا گیا۔ وہاں پر ایڈووکیٹ سعد صاحب عوامی لیگ چھوڑ کر جماعت میں آئے تھے۔ بڑے اچھے اور سلجھے مزاج کے حامل انسان تھے۔

میں نے انھیں الف درجے کی نشستوں میں رکھا، مگر وہ صرف پانچ ہزار ووٹ لے سکے۔

اسی طرح ایک اور نشست کا بڑا عجیب قصہ ہوا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے اندازوں میں کتنی زبردست غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ یہ جمال پور کی نشست کا ذکر ہے۔ جمال پور، میمن سنگھ کے شمال میں واقع ہے۔ وہ نشست میں نے نورالامین صاحب کی پاکستان جمہوری پارٹی کے لیے چھوڑ دی تھی۔ نشست چھوڑنے کے بعد وہاں سے جماعت کے ذمہ دار لوگ میرے پاس آئے۔ صبح سے شام تک کبھی میرے گھر اور کبھی دفتر میں آ کر یہ کہتے کہ ''یہ نشست تو بڑی یقینی ہے، بڑی sure (پکی) ہے، ہم ضرور جیتیں گے، بھلا آپ نے یہ کیسے چھوڑ دی''۔ میں نے دل میں کہا: ''آپ کیا sure کی بات کرتے ہیں، یہاں تو کوئی نشست بھی یقینی نہیں ہے''۔ البتہ ان سے کہا: ''آپ کم از کم اس بات کا ہی خیال کریں، کہ جب میں نے جماعت کی طرف سے نمایندگی کرتے ہوئے ایک معاہدہ کرلیا ہے، تو پھر آپ مجھ پر کیوں دباؤ ڈالتے ہیں، کیونکہ یہ چیز سماجی آداب اور خود اپنی تحریک کی ساکھ کے بھی منافی ہے''۔ مگر وہ کسی طرح نہیں مانے۔

انھوں نے اتنا تنگ کیا کہ میں نے نورالامین صاحب کو فون کیا اور کہا کہ ''میں شرمندہ ہوں، معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو قول دینے کے بعد مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے ہاں اس ایک نشست کی وجہ سے سخت خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ اس وجہ سے اگر آپ اس نشست کو اوپن کر دیں تو میں شکر گزار ہوں گا''۔ وہ بے چارے بہت شریف النفس آدمی تھے۔ کہنے لگے:

''ہاں ٹھیک ہے، اگر اس وجہ سے آپ کو داخلی طور پر مشکلات کا سامنا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، نشست کو اوپن کر دیں''۔ جب اتنے زعم اور اتنے غرے سے نشست لی گئی تھی، بلکہ میرے نزدیک نرم سے نرم الفاظ میں کارکنوں نے مجھ سے بدعہدی کرائی تھی، پھر فی الواقع کوئی کارکردگی تو سامنے آنی چاہیے تھی۔ لیکن جب الیکشن کا نتیجہ آیا تو ہمارے امیدوار کو ڈھائی لاکھ میں سے صرف ڈھائی ہزار ووٹ ملے۔

چند سوالات

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے زمانے سے میرے ذہن میں ایک خلش اور کچھ سوالات پیدا ہوئے تھے۔

پہلا سوال تو یہ پیدا ہوا کہ مشرقی پاکستان میں ایک زبردست عوامی لہر ہے۔ انتخابات عوام کی رائے سے ہی جیتے یا ہارے جاسکتے ہیں۔ مگر ہم اس لہر کے خلاف کھڑے ہیں، اور ایسا پروگرام پیش کر رہے ہیں، جس کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے بنگالیوں کے حقوق کا حصول ممکن ہے۔ اہلِ مشرقی پاکستان کے ساتھ سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر ہونے والی ساری ناانصافیوں کا بھی اس میں ازالہ موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اس سے بہت کم مؤثر پروگرام ہے، جتنا کہ عوامی لیگ پیش کر رہی ہے۔ ایسا غیر مؤثر موقف اختیار کر کے ہم کیسے سیاست میں آگے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا صوبائی سطح پر ہونے والے سیاسی و معاشی استحصال کے خلاف بھرپور آواز اٹھانا صرف سیکولر جماعتوں کا حق ہے؟

دوسری جانب مغربی پاکستان میں ہمارا زور ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی پر ہے، مگر اس کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کا زور عام آدمی کے معاشی مسائل کو حل کرنے پر ہے۔ جب کہ ہمارا انتخابی منشور بڑی تفصیل کے ساتھ باریک مسائل پر بحث کر رہا ہے۔ ہمارے مقررین، امیدواروں، اہلِ قلم اور قائدین کی پوری ٹیم اپنے منشور میں پیش کردہ سچائی اور اس عادلانہ سوچ کو عوام تک پیش کرنے میں کیوں ناکام رہی ہے؟ ہم کو عوامی تائید کیوں نہیں حاصل ہورہی؟ اور اگر عوامی تائید حاصل نہ ہوئی تو ہمارے لیے انتخابات میں نتائج کس طرح

اچھے نکل سکتے ہیں؟ انتخابات میں نتائج اچھے نہ نکلیں گے تو پھر انتخابات میں حصہ لینے کا کیا فائدہ ہوگا؟ محض شہادتِ حق اور دعوتِ دین کے لیے انتخابات کے علاوہ بھی شاید کچھ بہتر ذرائع موجود ہیں جن کے ذریعے یہ کام ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم محض تبلیغ کے لیے نہیں بلکہ قیادت کی تبدیلی کے لیے کام کر رہے ہیں، اور اگر یہی رفتار رہی تو اس کا کیا ہوگا؟ یہ پہلی خلش یا پہلا سوال تھا، جو ذہن میں اُبھرتا تھا۔

جب انتخابی نتائج آ گئے تو پھر دوسرا سوال پیدا ہوا، کہ ہماری جانب سے اتنا عرصہ کام کرنے اور اتنی محنت کرنے کے باوجود یہ جو نتائج نکلے ہیں، ان نتائج کا باعث کون سی کمی اور کون سی خامی ہے؟ یا پھر یہ ہماری حکمت عملی اور نظامِ کار کا ایسا معاملہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم مطلوبہ نتائج نہیں حاصل کر سکے؟ میں نے اس وقت سوچنا شروع کیا کہ صدمہ ٹالنے کے بجائے ہم کو ابھی سے اس سوال پر غور کرنا پڑے گا، کہ جماعت جتنی کچھ بھی طاقت اور صلاحیت رکھتی ہے، اس کے ساتھ یہ کس طرح دنیا کے اندر اسلامی انقلاب کی منزل تک پہنچ سکتی ہے؟ نصب العین پر کوئی سمجھوتہ یا compromise کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر کیا ہمیں اپنے دائرۂ کار، عملی رجحانات اور اقدامات میں کہیں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے؟

اس کے بعد تیسرا سوال اس مزاج یا ذوق کے بارے میں تھا، جس میں معمولی واقعات اور حوادث یا اقدامات ہماری خوش فہمی کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ دیدہ بینا رکھتے ہوئے کسی فرد کے لیے ایسی خوش فہمی کا شکار ہو جانا میری سمجھ سے بالاتر رہا ہے۔ آخر کیوں لوگ خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں؟ مشرقی پاکستان میں سوائے میرے تقریباً ہر شخص انتخابی معرکے کے بارے میں خوش فہم تھا۔ جب کہ لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ عوام کا موڈ کیا ہے اور نتائج کیا نکلنے والے ہیں؟ مغربی پاکستان میری نگاہوں کے سامنے نہ تھا۔ وہاں پر بھی نتائج خدشات کے مطابق نکلے۔

اس وقت یہ بات اور بھی زیادہ محسوس ہوئی، جب معلوم ہوا کہ جناب مولانا شاہ احمد

نورانی جو بہت پیچھے سمجھے جاتے تھے، وہ کراچی میں جماعت کے ساتھ مل کر نشستیں تقسیم کرنے کو تیار تھے، مگر جماعت اس احساس میں تھی کہ ہم سب نشستوں پر کامیاب ہوجائیں گے۔ چنانچہ کوئی معاہدہ نہیں ہوسکا۔ نتیجہ یہ کہ نورانی صاحب کی کامیابی سے ان کی قوت کا سکّہ جم گیا، اور جماعت کی ساکھ کو دھچکا لگا۔ اگر سیاسی طور پر ان سے معاہدہ کرلیتے تو کم سے کم ساکھ تو بنی رہتی (ساکھ بگڑنے کا واقعہ تو ۸۵ءاور۹۳ء کے عام انتخابات میں بھی پیش آیا)۔ اس طرح حکمت عملی، تدبیر اور ترجیحات کے حوالے سے بھی سوالات میرے ذہن میں تھے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں، مَیں کراچی یا مغربی پاکستان کی انتخابی مہم سے متعلق نہیں تھا، لیکن اس مہم کے بارے میں میرے ایک ماہر تعمیرات دوست خالد اشفاق نے مجھے بتایا کہ جماعت کیوں ہار گئی۔ وہ کہنے لگے: ''میرا گھر محمود اعظم فاروقی صاحب کے حلقے ناظم آباد میں ہے۔ ہمارے گھر کام کرنے والی ملازمہ نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ میں تو جماعت کو ووٹ نہیں دوں گی۔ ہم نے اس سے پوچھا: ''کیوں ووٹ نہیں دوگی؟'' کہنے لگی: ''وہ محمدؐ رسول اللہ کو نہیں مانتے''۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ فاروقی صاحب کے مقابلے میں نورانی صاحب کے امیدوار مولانا محمد شفیع اوکاڑوی صاحب کی انتخابی مہم کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے بے بنیاد پروپیگنڈے نے ہمارے برسوں کے کام کی ساکھ بگاڑ دی۔

الزامات، جھوٹے مفادات اور جھوٹے جذباتی نعرے لوگوں کو بہا کر لے گئے۔ بعد میں بھی ہر الیکشن میں اسی چیز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم اپنے لیے یہ عذر نہیں پیش کرسکتے، کہ کوئی ہمارے بارے میں کیوں غلط کہتا ہے۔ مخالف نے اور دشمن نے غلط بات کہنا ہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنا سچ اور صحیح صورت حال کیوں پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں؟ اور انتخابی مہم چلانے کے لیے ہمارا انداز کیوں بے اثر ہے؟

انتخابی مہم، صبر آزما جدوجہد اور تلخ نتائج کے ساتھ ۱۹۷۰ء کا سورج غروب ہوا۔ یہ سال رنج وغم اور غوروفکر کے بے شمار موضوعات چھوڑ گیا۔

۱۴

المیوں کا سال

۱۹۷۰ء قومی، دستوری اور اخلاقی سوالات چھوڑ کر چلا گیا۔ وعدوں کی فصل دو بڑی پارٹیوں نے بوئی تھی، اب اس فصل کے کاٹنے کا مرحلہ تھا۔ فصل ہی نہیں بلکہ کھیت بچانے کا بھی سوال درپیش تھا۔ قوم جمہوریت کی جھلملاتی روشنی کو دیکھنے اور اپنے دکھوں کا حل تلاش کرنے کی متلاشی تھی، مگر افسوس یہ سال المیوں، ندامتوں اور حماقتوں کے کانٹے لے کر آیا۔ نہ کوئی دن برا ہوتا ہے نہ کوئی سال منحوس ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **لا تسبوا الدھر**، ''زمانے کو برا نہ کہو'' (**مسلم شریف**)۔ مطلب یہ کہ ماہ و سال سب کے لیے برابر ہوتے ہیں، لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو اچھے بھلے معصوم دنوں میں بارود اور نفرت بھر دیتے ہیں۔

کراچی کا سفر

جنوری ۱۹۷۱ء میں، میں اپنی اہلیہ کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی آیا۔ یہی خیال تھا کہ چند روز میں اپنے بہن بھائیوں سے مل کر، اپنی والدہ کے پاس بیٹھ کر اس اعصاب شکن صورت حال کے بوجھ سے نکلوں، جس کا گذشتہ سال کے دوران سے سامنا تھا۔

ویسے بھی ڈھاکہ کی فضا میں مستقبل کے خون ریز ہنگاموں کا پیشگی اندازہ ہو رہا تھا۔ اہلِ اقتدار کی روش اور مغربی پاکستان کے سیاسی اُفق پر طلوع ہونے والے تجزیوں، جذبات اور ایک نوعیت کے خوف سے یہ دکھائی دے رہا تھا، کہ سیاسی کھیل، سیاسی قاعدے کے

مطابق نہیں ہوگا، اور اگر ایسا منفی عمل ہوا تو پھر اس کے نتیجے میں لازماً الیے جنم لیں گے۔ اس ماحول میں مجھے اپنی بیوی بچوں کو وہاں رکھنا بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے بوجھتے، جماعت کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے مجھے حالات کا سامنا کرنا تھا۔ مگر میرے بیوی بچے تو اس کے مکلّف نہیں تھے، اس لیے انھیں کراچی چھوڑ کر ڈھاکہ چلا آیا۔

امارتِ شہر سے فراغت

انتخابات کے بعد، میں نے پاکستان کی سیاسی صورت حال پر غور کیا، تو یہی دکھائی دیا کہ ملک سیاسی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ ایک پارٹی ایک بازو کی نمایندہ ہے اور دوسری پارٹی دوسرے بازو کے دو صوبوں کی نمایندہ۔

اس صورت حال میں میرے نزدیک یہی مناسب تھا، کہ ڈھاکہ جماعت کی امارت چلانے کے لیے کسی مقامی ساتھی کو آگے آنا چاہیے۔ چنانچہ غالباً فروری ۱۹۷۱ء میں، میں نے ڈھاکہ جماعت کی امارت سے سبک دوش ہونے کے لیے جو دلائل پیش کیے، ارکان جماعت نے ان کو اسی اسپرٹ کے ساتھ قبول کرلیا۔ امارت کے انتخاب کے لیے دستور جماعت کی حدود میں رہتے ہوئے جتنا وزن ڈال سکتا تھا، ڈالا کہ کوئی زیادہ باصلاحیت بنگالی نوجوان منتخب ہو۔ چنانچہ اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک سابق ذمہ دار ساتھی غلام سرور، ڈھاکہ جماعت کے امیر منتخب ہوگئے۔

شیخ مجیب کو پیغام

شیخ مجیب الرحمٰن جیت گئے تھے۔ ہماری کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر پہلے ہی سے شیخ مجیب کے مزاج سے واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں پوری تندہی سے جماعت کا کام کر رہا ہوں۔ مشرقی پاکستان میں کرنافلی ڈیم پراجیکٹ سے متعلق بات کر کے وہ شیخ مجیب کے ہاں جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ان کا خیال تھا کہ مستقبل میں پاکستان کے وزیراعظم

شاید یہی ہوں گے۔

میں نے اپنی کمپنی کے سربراہ سے کہا: ''میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا، وہ پہلے ہی میرے خلاف بہت بھرے بیٹھے ہوں گے، اور آپ موصوف کے مزاج کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ البتہ آپ میری طرف سے پیغام دے دیجیے گا کہ ''اگر میری (یعنی خرم کی) وجہ سے آپ کا کوئی ارادہ ہے کہ کمپنی کو سزا دیں تو بتا دیں، میں مغربی پاکستان چلا جاتا ہوں۔ اس لیے کہ جو کچھ کیا وہ میں نے ہی کیا ہے۔ کمپنی اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہے''۔

وہ گئے، مل کر آئے اور کہنے لگے کہ شیخ مجیب الرحمٰن واقعی بہت برہم تھے کہ ''آپ کی کمپنی تو الیکشن میں جماعت اسلامی کا دفتر تھی''۔ لیکن جب میں نے آپ کا پیغام دیا تو کہنے لگے: ''نہیں نہیں ہم تو خرم کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی اقدام نہیں کریں گے''۔ یہ بڑا نمایاں فرق تھا مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں میں۔ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں میں عام طور پر بڑا انتقامی ذہن ہے، جب کہ مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں میں accomodating اور درگزر کرنے کا ذہن تھا۔ لیکن یہ بات وہاں کی پارٹیوں کے کارکنوں میں نہیں تھی۔

مسئلے کا حل ممکن تھا

میرے خیال میں مشرقی پاکستان کا مسئلہ حل ہوسکتا تھا۔

بلاشبہہ مشرقی پاکستان میں چند لوگوں کے اندر شدت سے یہ احساس تھا، اور ان میں بعض لوگ علاحدگی کی بات بھی کرتے تھے۔ میں اپنے مشاہدات اور لوگوں سے میل ملاقات کی بنیاد پر یہ سوچتا تھا، کہ مشرقی پاکستان کی آبادی کی غالب اکثریت پاکستان سے الگ ہونا نہیں چاہتی۔ اپنے اس دعوے کے لیے میں کوئی خوش کن جذبات نہیں بلکہ بڑے ٹھوس شواہد رکھتا تھا۔

۱۹۶۸ء میں بھی میرا یہ خیال تھا، ۷۰ء کے الیکشن کے بعد بھی یہی رائے تھی اور ۷۱ء

کے دوران یا اس کے بعد آج بھی انھی مشاہدات کی بنیاد پر یہ رائے رکھتا ہوں، کہ اگر صدر یحییٰ خان اور صدر ایوب خان جرأت سے کام لے کر اس مسئلے پر ریفرنڈم کرا دیتے کہ ''آپ پاکستان کا حصہ رہنا چاہتے یا الگ ہونا چاہتے ہیں'' تو مجھے یقین ہے کہ مشرقی پاکستان سے بھاری اکثریت کے ساتھ ایک پاکستان کے حق میں رائے آتی۔

بعض لوگ اپنے جذبات کی بنا پر کہتے ہیں کہ پاکستان کے عام انتخابات میں اسلام کو مسترد کر دیا گیا، حالانکہ جس طرح ان تمام انتخابات میں کبھی اسلام ایشو نہیں ہوتا، اسی طرح جب بنگالی ووٹ دیتے تو ان کے سامنے پاکستان اور پاکستان کی وحدت توڑنا ایشو نہیں ہوتا تھا، بلکہ اپنے حقوق کا حصول ہوتا تھا۔ اپنے ساتھ روا ناانصافی کی بنیاد پر وہ یہ دیکھتے تھے کہ کون انھیں یہ حقوق دلا سکتا ہے؟ کون اس ناانصافی کو دُور کر سکتا ہے؟ اس مقصد کے لیے کس کو ووٹ دیا جائے؟___ صرف اسی بنیاد پر وہ ووٹ دیتے تھے۔

جب بھی میں اس مفروضے پر غور کرتا ہوں تو اس کے حق میں تین شواہد میرے سامنے آتے ہیں:

۶۵ء کی جنگ کے دوران مشرقی پاکستان گورنر ہاؤس میں اجلاس ہوئے۔ جنگ شروع ہوئی تو گورنر عبدالمنعم خان نے مشرقی پاکستان کے سارے سیاسی لیڈروں کو بلایا۔ جب صدر ایوب خان جنگ بندی کرنے والے تھے، اس وقت بھی بلایا، تاکہ اس مسئلہ پر حمایت حاصل کی جاسکے۔ وہاں پر میں نے دیکھا کہ بعض لیڈروں کا رویہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں سرسری اور لاتعلقی کا سا تھا۔ گورنر ہاؤس کے انھی اجلاسوں کے دوران ایک صاحب کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''کشمیر سے ہمیں کیا؟ اگر کشمیر مغربی پاکستان کے ساتھ مل گیا تو پھر یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ ہماری آبادی کی اکثریت کم ہو جائے گی''۔ لیکن یہ صرف ایک دو افراد کی آواز تھی۔ باہر ڈھاکہ شہر میں ریڈیو کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے ہیں۔ جب خبر آتی تھی کہ پاکستان نے بھارت کا کوئی طیارہ مار گرایا، کہیں بم باری کی، کہیں فتح حاصل کی، کسی مورچے پر آگے بڑھے اور کہیں بھارت کے دانت کھٹے کر دیے تو لوگ خوشی سے

نعرے لگاتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے یہ جنگ مشرقی پاکستان میں ہو رہی ہو۔ پڑھے لکھے لوگوں کا تاثر تو میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجیب الرحمٰن کی ساری الیکشن مہم میں پاکستان کی وحدت ایک بنیادی اصول کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ پھر ان کا یہ جملہ کہ "پاکستان بھی ایک رہے گا اور چھ نکات بھی نافذ ہوں گے"۔ دراصل اس سیاسی شعور کا تقاضا تھا جو ایک پاکستان کے لیے عوام میں موج زن تھا۔ ممکن ہے شیخ صاحب خود اس پر یقین نہ رکھتے ہیں، لیکن میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ شیخ صاحب کو یہ بات کہنے کی ضرورت اسی لیے پڑتی تھی کہ سارے ووٹر یہی سننا اور اسی بات پر ووٹ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے مینڈیٹ میں یہ شامل تھا، کہ پاکستان کو وہ ایک رکھیں اور چھ نکات بھی نافذ ہوں۔

اسی طرح تیسرا مشاہدہ مجھے ۷ دسمبر ۷۰ء کے انتخاب کے بعد ہوا۔ انتخاب کے نتیجے میں سو فی صد مینڈیٹ عوامی لیگ کو مل چکا تھا۔ اس مینڈیٹ کے معنی یہ تھے کہ چھ نکات نافذ ہوں گے۔ اس لیے کہ نیابتی مساوات کے اصول ختم کر کے آبادی کی بنیاد پر جنرل یحییٰ خان، مشرقی پاکستان کو مرکزی اسمبلی میں یہ اکثریت دے چکے تھے۔ اب فضا میں یہ بحث گرم تھی، کہ پاکستان ایک رہے گا یا نہیں رہے گا۔ وہاں پر بنگلہ دیش اور جئے بنگلہ دونوں نعرے سننے میں آتے تھے۔

۲۵ دسمبر ۷۰ء کو میں کمپنی کے کام کے لیے، بذریعہ کار ڈھاکہ سے چٹا گانگ گیا۔ راستے بھر جگہ جگہ پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گاؤں، قصبہ اور شہر ہر جگہ یہی منظر تھا۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آیا، کہ یہ جھنڈا لہرانے کی کیا تقریب ہے؟ میں نے اپنی گاڑی کے ڈرائیور بشیر سے پوچھا کہ "جھنڈے اتنی بڑی تعداد میں کس تقریب کے سلسلے میں لگے ہوئے ہیں"۔ کہنے لگا کہ "آج قائداعظم کا یومِ پیدایش ہے"۔ اگرچہ میرا اپنا تجربہ بھی بنگالیوں کی پاکستان سے محبت پر شاہد تھا، لیکن ان انتخابات کے فوراً بعد اس نوعیت کا اتنا بڑا مظاہرہ میرے لیے مسرت افزا اور تعجب خیز تھا۔

عوامی لیگ کے رہنما عبدالصمد آزاد صاحب جو۶۴ء میں ہمارے ساتھ جیل میں تھے، ان سے میرے قریبی تعلقات تھے۔ اگرچہ ان دنوں وہ نماز وغیرہ کے پابند نہیں تھے لیکن سیکولر بھی نہیں تھے اور بڑے شریف آدمی تھے۔ وہ اکثر فکرمندی کے ساتھ غلام اعظم صاحب کو پیغام دیا کرتے تھے کہ ''مغربی پاکستان کے لوگ زبردستی مشرقی پاکستان کو الگ کر رہے ہیں، لیکن ہم لوگ ایسا نہیں چاہ رہے ہیں''۔ ان کا خیال تھا اور مجھے بھی ان سے اتفاق تھا، کہ ''مجیب الرحمٰن کی سب سے بڑی اور حقیقی مجبوری یہ ہے کہ وہ بیس منہ زور گھوڑوں پر کس طرح سواری کریں''۔ اس زمانے میں بیس جنرل کا ایک محاورہ بن گیا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ اس وقت ان کی صحیح تعداد کیا تھی اور اب کیا ہے۔ لیکن بنگال سے منتخب ہونے والا ایک آدمی جب اسلام آباد جاتا، اور وزارتِ عظمٰی سنبھالتا تو اسے یہ خوف لاحق ہوتا کہ وہاں بیٹھ کر کتنے دن حکومت کر سکے گا۔ بلاشبہہ مرکزی حکومت سنبھالنے پر اسے بنگالیوں کے لیے بعض حقوق ملتے، اور بعض حقوق پر مفاہمت کرنی پڑتی۔ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کرنی پڑتی۔ اپنے حلقہ انتخاب سے دُور بیٹھ کر اعتماد سے حکومت کرنا کسی بھی بنگالی کے لیے بڑا مشکل ہوتا۔ خاص طور پر جہاں مسلح افواج کا ہیڈکوارٹر ہو اور پھر گذشتہ بیس سال سے براہِ راست فوج اقتدار میں شریک بھی رہی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگالی وزیراعظم کا لازماً ویسا ہی حشر ہوتا (بعد میں ۷۷ء، ۸۸ء، ۹۰ء، ۹۳ء اور ۹۶ء کے واقعات نے اس خدشے کو مزید تقویت دی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ تو اسی جغرافیائی خطے سے تعلق رکھنے والے تھے)۔ عبدالصمد آزاد صاحب نے کہا: ''اس وجہ سے بھی مجیب الرحمٰن وزارتِ عظمٰی سنبھالنے کے موڈ میں نہیں''۔

میں سمجھتا ہوں کہ عام طور پر بنگالی علاحدگی نہیں چاہتے تھے جیسا کہ ابھی بتا چکا ہوں کہ اگر یحییٰ خان اور ایوب خان ریفرنڈم جیسا بڑا قدم اٹھاتے، تو علاحدگی نہ ہوتی اور اگر خدانخواستہ ریفرنڈم کے نتیجے میں علیحدگی ہوتی (جس کا امکان بہرحال نہیں تھا) تو پھر اثاثوں کی تقسیم بھی ہوتی۔ لیکن اگر کوئی دبنگ آدمی بنگالیوں کے ساتھ بات چیت کر سکتا، جا کر اپیل کر سکتا، ان کو قائل کر سکتا کہ ملک کو ایک رہنا چاہیے، چھے نکات کی بیش تر روح کو سمو کر

زیادہ سے زیادہ خودمختاری دے دیتا اور کہتا کہ اگر تم پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو رہو۔ میرا خیال ہے کہ بنگالیوں کی غالب اکثریت مغربی پاکستان کے ایسے سیاسی عزم و حوصلہ رکھنے والے لیڈر کی تائید کرتی۔

ہماری اطلاعات کے مطابق ۲۵ مارچ سے پہلے عوامی لیگ کی 'مرکزی ورکنگ کمیٹی' میں پاکستان سے علاحدگی یا پاکستان کے ساتھ رہنے کے مسئلے پر بحث ہوئی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کی بھاری اکثریت نے پاکستان کے ساتھ رہنے، اور پاکستان کو برقرار رکھنے کی رائے دی۔ لیکن اس کے برعکس عوامی لیگ کے حامی طلبہ کی تنظیم ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ (چھاترو لیگ) کی سنٹرل کمیٹی نے ایک پاکستان کے حق میں رائے نہیں دی۔

سیاسی بحران، اُمنڈتے بادل

دسمبر ۷۰ء کے انتخابی نتائج آنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگانا قطعی طور پر مشکل نہ تھا، کہ اب پاکستان کو بڑے شدید بحران کا سامنا ہے۔ مشرقی پاکستان نے اپنا پورا مینڈیٹ (حق حکمرانی) عوامی لیگ کو دے دیا تھا۔ مغربی پاکستان میں، پیپلز پارٹی صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب سے کامیاب ہوئی۔ مگر صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں وہ کامیاب نہیں ہوسکی۔ صوبہ سندھ میں اسے سادہ اکثریت حاصل تھی، تاہم آزاد امیدوار اور مسلم لیگ کے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر ان سے مل گئے۔ اس طرح صوبہ سندھ میں بھی ان کی اکثریت ہوگئی تھی۔ لیکن اصل مسئلہ تو دستور بنانا تھا، اور اس میں بھی بڑا مسئلہ عوامی لیگ کے چھے نکات کا تھا۔ جب کہ اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جنرل یحییٰ خان منتخب نمایندوں کو اقتدار منتقل کریں گے یا نہیں کریں گے؟

جنرل یحییٰ نے خود ہی ضابطہ جاری کر کے اس بات کو بھی طے کر دیا تھا کہ ''پہلے دستور بنے گا اور اس کے بعد اقتدار منتقل ہوگا''۔ حالانکہ انھوں نے یہ ایک بالکل اُلٹ بات کی تھی۔ اس کے بعد اس بات کا کوئی امکان نہ رہا تھا کہ دستور بن سکے یا ایسا دستور بن سکے، جو پاکستان کی سالمیت و وحدت کا محافظ ہو۔ دستور بنانے کے لیے ہر پارٹی اپنے منشور کی بنیاد پر

منتخب ہوکر آخری حد تک کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنی تجاویز کو دستور میں سمونے کی کوشش کرے۔ لیکن جب ایک سیاسی قوت کو اقتدار دیا جاتا ہے، تو خود اپنی جگہ پر اقتدار اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اگر اپنے آپ کو حکومت میں رکھنا ہے تو دوسروں کے مطالبات کو مقام دیا جائے، اپنے موقف میں لچک پیدا کی جائے اور بے جا کش مکش کو گھٹایا جائے۔

ہماری اطلاعات کے مطابق کہیں انٹیلی جنس والوں نے مجیب الرحمٰن کی ایک گفتگو ریکارڈ کی تھی، جس میں شیخ مجیب نے کہا کہ ''ایک بار میں منتخب ہو جاؤں تو پھر یحییٰ خان کو دیکھ لوں گا''۔ یہ خبریں صحیح تھیں کہ مارشل لا کا اور جنرل یحییٰ خان کا عوامی لیگ کے ساتھ رویہ نرم اور ہمدردانہ تھا۔ یہ ہمدردانہ رویہ اس لیے بھی تھا کہ ان کے درمیان کچھ معاملہ بندی ہوگئی تھی۔ جس کے مطابق مجیب الرحمٰن چھے نکات کو من وعن منوانے پر اصرار نہیں کریں گے اور جنرل یحییٰ خان کو صدر بنالیں گے۔ یحییٰ خان واقعی اقتدار کے بڑے بھوکے تھے۔ انھوں نے صدر ایوب خان سے بڑی مشکل اور اور سازش سے اقتدار حاصل کیا تھا۔ وہ صدارت چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے تمام بڑے دستوری فیصلے مثلاً ون یونٹ توڑنے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کو اکثریت دینے جیسے فیصلے خود کر لیے تھے۔ حالانکہ اس کام کے لیے ان کے پاس عوام کا مینڈیٹ موجود نہیں تھا۔ اپنے اثرات کے حوالے سے یہ بہت بڑے آئینی مسائل تھے۔

بھٹو صاحب کا غیر جمہوری رویہ

صدر جنرل یحییٰ خان کے اپنے منصوبے تھے جب کہ یہاں سے بھٹو صاحب نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ''تنہا مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل نہیں ہونا چاہیے، شراکتِ اقتدار کے فارمولے پر پہلے وہ ہم سے معاہدہ کرے۔ سیاسی ڈھانچے اور اقتدار کے مسئلے پر بات کر کے پہلے دستوری مسائل کو حل کیا جائے، اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے، ورنہ ہم تعاون نہیں کریں گے''۔ یہ کش مکش بڑھتی گئی۔ مجیب الرحمٰن کا اصرار تھا کہ ''دستور

ساز اسمبلی کا اجلاس ہو"۔ بھٹو صاحب کہہ رہے تھے کہ "نہ ہو" بلکہ انھوں نے لاہور کے مینارِ پاکستان تلے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ڈھاکہ میں "دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والے مغربی پاکستانی ارکان اسمبلی کی میں ٹانگیں توڑ دوں گا"۔ بھٹو صاحب کے اس غیر منصفانہ، غیر جمہوری اور قومی مفاد کے سراسر منافی موقف پر جماعت اسلامی کا نقطۂ نظر بڑا دوٹوک، واضح اور منصفانہ تھا کہ: "تمام سیاسی مسائل، اسمبلی کے اجلاس میں حل کیے جائیں، اور جس کو اکثریت حاصل ہے، حکومت اسی کو دی جائے"۔

صورت یہ بن رہی تھی، کہ شیخ مجیب اسمبلی کا اجلاس بلانے پر زور دے رہے تھے، کہ اپنی اکثریت کے بل پر چھے نکات پر مبنی دستور پاس کرالیں۔ بھٹو صاحب اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اجلاس سے پہلے شراکتِ اقتدار اور دستور سازی کا مسئلہ حل ہو۔

جنرل یحییٰ خان اس سیاسی 'معرکے' میں اپنا کھیل، کھیل رہے تھے کہ نتیجہ جو بھی ہو، مگر وہ صدر بن جائیں۔ اس عمل کے دوران جنرل یحییٰ خان، کھلم کھلا مسٹر بھٹو کے دامِ سیاست کا پرزہ بن گئے۔ وہ اپنے جرنیلوں عبدالحمید خان اور پیرزادہ وغیرہ کے ہمراہ لاڑکانہ میں مسٹر بھٹو کی جاگیروں پر مرغابیوں کا شکار کرنے گئے۔ معلوم نہیں وہ کوئی مرغابی شکار کرسکے یا نہیں، البتہ ان کی ملی بھگت سے پاکستان ضرور شکار ہوگیا۔

مشرقی پاکستان میں ردعمل

بھٹو صاحب کی پُرتشدد دھمکیوں کے باوجود قومی اسمبلی کے اعلان شدہ اجلاس میں شرکت کے لیے جماعت اسلامی کے ارکان اسمبلی، مولانا ظفر احمد انصاری صاحب اور مولانا شاہ احمد نورانی صاحب وغیرہ ڈھاکہ پہنچ گئے تھے۔ یحییٰ بھٹو گٹھ جوڑ کے نتیجے میں اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان ہوا، جس پر شیخ مجیب الرحمٰن نے تقریباً بغاوت کا علَم بلند کردیا۔ مشرقی پاکستان میں تمام کاروبارِ زندگی معطل ہوگیا۔ ریل کا پہیہ جام ہوگیا، یہاں تک کہ مغربی پاکستان سے ڈھاکہ جانے والے ارکان اسمبلی تک کے لیے واپس کراچی، لاہور جانا مشکل ہوگیا۔

مجھے یاد ہے کہ رات کا وقت تھا۔ نورانی میاں اپنا پان دان ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے، اور ان کے ہمراہ مولانا ظفر احمد انصاری بھی تھے۔ اس وقت ہمیں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ان کو ڈھاکہ ایئرپورٹ تک کیسے پہنچایا جائے۔ میں نے گاڑی کا انتظام کیا، جس سے وہ ایئرپورٹ گئے۔ اس ہڑتال میں پورا مشرقی پاکستان شریک تھا۔ فوج کا زیادہ تعلق مغربی پاکستان سے تھا، اس لیے وہ تنہائی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

جہاں تک فوج میں بنگالی عنصر کا تعلق ہے، اس کے بارے میں، میں 'بغاوت' کا لفظ تو نہیں استعمال کروں گا، البتہ وہ فوج کے احکامات کی حقیقی اطاعت کرنے کے لیے تیار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلکہ ان بنگالی افسروں کے ذریعے، فوج کی ہر حرکت اور ہر سوچ کی رپورٹ بڑے تسلسل کے ساتھ، خفیہ طور پر شیخ مجیب کو پہنچ رہی تھی۔ ایک جگہ فوج سے جھڑپ میں دو شہری مارے گئے۔ اس پر بڑا زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ جنرل یحییٰ اور بھٹو صاحب اقتدار کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ شیخ مجیب کو تامل تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں اسلام آباد میں جا کر حکومت سنبھالیں۔ وہ اسلام آباد کہ جو راولپنڈی کے جرنیلوں اور طاقت ور غیر بنگالی بیوروکریسی میں گھرا ہوا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ پاکستان میں فوج نے کسی صدر یا وزیراعظم کو آزادانہ کام نہیں کرنے دیا۔ ایسے میں شیخ مجیب کی یہ مرضی تھی کہ مجھے مشرقی پاکستان ہی میں اتنا اقتدار مل جائے کہ وہیں بیٹھ کر کام کروں۔

پُراسرار سرگرمیاں

بیوروکریسی کے اعلیٰ حلقوں اور ان کی غلام گردشوں میں ہونے والی پُراسرار سرگوشیوں کا کچھ نہ کچھ علم ہمیں بھی ہو رہا تھا۔ جس سے پتا چل رہا تھا کہ مغربی پاکستان بیوروکریسی کے طاقت ور حلقے کیا سوچ رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر پاکستان پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین مسٹر ایم ایم احمد قابلِ ذکر ہیں۔ وہ ایک قادیانی ''خلیفہ'' کے بھتیجے اور خود بھی غالی قادیانی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''مشرقی پاکستان کے لوگ بھک منگے ہیں۔ ایک بوجھ اور خواہ مخواہ کی ذمہ داری ہیں، اس لیے ان سے پیچھا چھوٹ جائے تو اچھا ہی ہے''۔

عوامی لیگ میں جو ہمارے ہمدرد اور پاکستان کو چاہنے والے تھے، ان سے ہمارا ربط تھا۔ ان لوگوں میں خوندکر مشتاق احمد صاحب اور عبدالصمد آزاد صاحب وغیرہ شامل تھے۔ یہ ہمیں بتاتے تھے کہ ''مغربی پاکستان کے طاقت ور سیاسی، فوجی اور انتظامی عناصر ہم کو اس انداز سے دھکیل رہے ہیں، کہ ہم پاکستان سے الگ ہوجائیں۔ حالانکہ ان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ پاکستان کو جوڑ کر رکھا جائے۔ مگر وہ ہمیں بے کار کا بوجھ سمجھ رہے ہیں''۔ خود امریکا بھی پاکستان توڑنے کے اس عمل میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

مذاکرات کا کھیل

ہماری اطلاعات کے مطابق ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں کم و بیش ۹۰ فی صد مغربی پاکستانی فوج (مغربی پاکستانی افسر اور جوان) بھٹو صاحب کے حامی تھے۔ صدر جنرل یحییٰ خان مارچ ۷۱ء میں ڈھاکہ آئے اور آتے ہی بھٹو صاحب کو بھی بلا لیا۔ بھٹو صاحب ڈھاکہ پہنچے تو فوج نے ان کا استقبال کیا، اور انھیں تحفظ دیا۔ وہ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل، ڈھاکہ میں ٹھیرے۔ شیخ مجیب سے ان کی بات چیت ہوتی رہی، اسی دوران ممتاز ماہر قانون اے کے بروہی صاحب بھی ڈھاکہ آئے تھے۔ ان سے میری بات چیت ہوئی تو یہی معلوم ہوا کہ ''ان حالات میں پاکستان کو بچانا بڑا مشکل ہو رہا ہے''۔

یہ سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ ''کیا مجیب الرحمٰن پاکستان کے لیے سنجیدہ تھے، اور کیا ان کو اقتدار دے دیا جاتا تو پاکستان ایک رہتا؟'' ہمارا اصولی موقف یہ تھا کہ ''چونکہ انتخابات ہوگئے ہیں، اسمبلی میں عوامی لیگ کی اکثریت ہے، اس لیے عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کر دیا جائے''۔ لیکن اس صاف اصولی موقف کے باوجود میں بھٹو صاحب کی اس بات کو بالکل بے وزن نہیں سمجھتا، جس کے مطابق اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ عوامی لیگ اسمبلی کے اجلاس میں آنے کے بعد پاکستان توڑنے کی قرارداد پاس کر دیتی۔ پھر اس کے بعد کسی کے بھی بس میں نہیں تھا کہ پبلک کے نمایندوں کے فیصلہ کو قانونی طور پر روک سکے، جب کہ یہ اسمبلی دستور ساز تھی۔

پھر یہ خوف بھی پایا جاتا تھا کہ پاکستان کو اپنے وسائل و ذرائع میں سے علاحدہ ہونے والے حصے کو اثاثہ دینا پڑتا۔ مثال کے طور پر خزانہ، اسلحہ، ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور دیگر اثاثہ جات میں آدھے سے زیادہ حصہ ادا کرنا پڑتا۔ کیونکہ اسمبلی کی قرارداد سے یہ ایک قانونی اور دستوری کارروائی ہوتی۔ اس کے برعکس بغاوت کے نتیجے میں علاحدگی میں یہ ذمہ داری نہ ہوتی۔ ممکن ہے کہ مغربی پاکستان کے فیصلہ ساز لوگوں کے سامنے یہ بات بھی ہو، اس لیے وہ 'بے دام علاحدگی' کو اپنے حصے کے لیے 'نفع بخش سودا' تصور کرتے ہوں گے۔ اگرچہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے ۲۵ مارچ کے آرمی ایکشن کے بعد کراچی میں جا کر بیان دیا کہ ''خدا کا شکر ہے، پاکستان بچا لیا گیا''۔ آرمی ایکشن کے غلط فیصلے کے باوجود، میں بھٹو صاحب جیسے ذہین آدمی سے یہ توقع نہیں رکھتا، کہ انھوں نے یہ بیان محض آرمی ایکشن کے حوالے سے دیا ہوگا۔ یقیناً ان کے سامنے کچھ اور باتیں بھی ہوں گی۔ اگرچہ ان باتوں میں تلخی پیدا کرنے اور ہٹ دھرمی کی آگ بھڑکانے کا ایک بڑا فعال سبب وہ خود بھی تھے۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء تک مجیب الرحمٰن نے یہ نہیں کہا کہ ''آزاد بنگلہ دیش بننا چاہیے''۔ حالانکہ اس دوران مغربی پاکستانی فوجی حکمرانوں اور مغربی پاکستان جو بہرحال ایک سیاسی اکائی نہیں تھا، بلکہ چار صوبے تھے، اس میں سے دو بڑے صوبوں کے سیاسی قائد مسٹر بھٹو نے مشرقی پاکستانی قیادت کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا تھا۔ اس دوران ڈھاکہ کے ریس کورس میدان میں ۱۰، ۱۰ لاکھ حاضرین کے جلسے ہوئے۔ بنگلہ دیش کا جھنڈا تک بن گیا تھا اور ہر جگہ لہرایا جا رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی عظمت کے گیت ایک سماں باندھ رہے تھے اور جارحانہ نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ ریڈیو بنگالی قوم پرستوں کے قبضہ میں تھا جہاں سے سونار بنگلہ کا ترانہ نشر کیا جا رہا تھا۔ بنگالی سول سروس ان کے ساتھ تھی۔ یہاں تک کہ جنرل ٹکا خان کو جب صدر یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کا گورنر بنا کر بھیجا تو ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے ان سے حلف لینے سے انکار کر دیا، اور وہ گورنر نہیں بن سکے۔ اتنی ہمہ گیر ہڑتال اور ایسا عدم تعاون تھا کہ ہائی کورٹ کا کوئی بھی جج اس فرض کی بجا آوری کے لیے

تیار نہیں تھا۔

ان حالات میں جنرل یحییٰ خان اور بھٹو صاحب ڈھاکہ آئے تو بات چیت شروع ہوئی۔ یہی نظر آ رہا تھا کہ بات چیت کا کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں آج بھی میں سو فی صد اطمینان سے یہ بات نہیں کہہ سکتا، کہ وہ پاکستان کو ایک رکھتے۔ میرے خیال میں ان کو اقتدار دینے سے پہلے مشرقی پاکستان میں عام لوگوں سے ریفرنڈم کرا لیا جاتا تو عام لوگ تو یہی کہتے کہ ''پاکستان ایک رہے گا''۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے ۲۵ مارچ سے پہلے بھی مثبت نتائج کے لیے قوی شواہد موجود تھے، حتیٰ کہ آرمی ایکشن کے کچھ عرصہ بعد بھی عام لوگ یہی فیصلہ دیتے۔

فوجی کارروائی کی خونیں رات

۲۳، ۲۴ مارچ کو شیخ مجیب کے ساتھ یحییٰ، بھٹو مذاکرات ٹوٹنے کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ میری چھوٹی بہن شیما جن کی شادی ایک معزز بنگالی گھرانے میں ہوئی ہے، ان کے شوہر ہمایوں صاحب [م: جنوری ۱۹۹۵ء] نے مجھ سے کہا: ''آپ ہمارے گھر آ جائیں''۔ ۲۵ مارچ کی رات میں ان کے گھر آ گیا۔ راستے میں دیکھا کہ لوگ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔

اسی رات کو گیارہ بجے کے بعد اچانک گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ پاکستانی فوج نے کارروائی شروع کر دی۔ اسی روز سات یا آٹھ بجے جنرل یحییٰ خان ڈھاکہ سے روانہ ہوئے۔ ہر جگہ عوامی لیگ کو اطلاع مل گئی کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں، اور اب کوئی فوجی کارروائی ہی ہو گی۔ ظاہر ہے فوجی کارروائی کرنے والوں میں بنگالی فوجی افسر بھی شامل تھے۔ یہ یقینی امر ہے کہ انھوں نے عوامی لیگ کو اس کی پیشگی اطلاع دی ہو گی۔

اسی کے بعد انھوں نے پاکستانی فوج کی مزاحمت کی تیاری کر لی تھی۔ مختلف چھاؤنیوں مثلاً کومیلا، چٹاگانگ اور رنگ پور وغیرہ اور دیگر مختلف جگہ پر بنگالی فوجیوں نے مغربی پاکستان کے فوجیوں سے ہتھیار چھین لیے، کچھ کو مار ڈالا، بعض جگہ ان کے بیوی بچوں تک

کی بے حرمتی کی اور ان کے ساتھ اخلاق سوز حرکتیں کیں۔ یہ سب واقعات اس رات سے اگلے دو تین دن کے دوران پیش آئے۔ ڈھاکہ میں ہم ان واقعات سے بے خبر تھے۔ اس رات مسلسل گولہ باری کے نتیجے میں بستیوں میں آگ لگ رہی تھی۔ ہم گھر کے اندر محصور تھے اور باہر نکلنا مشکل تھا۔

اب ہماری خبر کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا: ریڈیو پاکستان، آل انڈیا ریڈیو، بی بی سی لندن، ریڈیو ماسکو، پیکنگ ریڈیو اور وائس آف امریکا وغیرہ۔ اس ذریعے سے باہر کی خبریں مل رہی تھیں۔ جن سے یہ معلوم ہوا کہ شیخ مجیب کے گھر پر کارروائی ہوئی اور ان کو گرفتار کرلیا گیا، ان کی فیملی نامعلوم جگہ پر چلی گئی۔ عوامی لیگ کے دوسرے لوگوں کو گرفتار کرنے کے ساتھ مختلف جگہ فوجی کارروائی ہوتی رہی —— پورے صوبہ میں کیا ہوا؟ یا کیا ہو رہا تھا؟ اس کی کوئی تصویر سامنے نہیں آتی تھی۔

اگلے دن بھی ہم گھر سے باہر نہیں نکل سکے۔ البتہ شام کو عوام کا زبردست ریلا دیکھا۔ مرد، عورت، بچے، سڑک پر بھاگے چلے جا رہے تھے۔ یہ کدھر سے آئے تھے اور کہاں جا رہے تھے؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ سب خوف زدہ اور حواس باختہ تھے۔ گویا قیامت کا منظر تھا۔ معلوم ہوا یہ جہاں سے آ رہے تھے، وہاں پر آگ لگی ہوئی تھی یا آگ لگا دی گئی تھی۔

۲۷ مارچ کی صبح ہمارا ڈرائیور آیا، کیونکہ کرفیو نہیں تھا۔ چنانچہ پہلی بار گھر سے نکلا اور راستے میں مشاہدہ کیا کہ شہر میں کیا قیامت گزر گئی ہے۔ ایک جگہ بم باری کے آثار تھے۔ زمین کے اُوپر تازہ مٹی دیکھی جاسکتی تھی۔ پلٹن میدان کے ایک کونے پر ہمارا دفتر تھا۔ پلٹن میدان میں ایک مندر بھی تھا، جس کے سامنے تقریباً ۳۰ یا ۴۰ لوگوں کی بے گور و کفن لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی لاشیں بیک وقت ایک جگہ پر کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ بڑا دل دہلا دینے والا منظر تھا۔

وہاں سے ہم پرانے ڈھاکہ کی طرف گئے۔ جہاں پر جگہ جگہ فوجی کارروائی کے نتیجے

میں تباہی کے آثار نمایاں تھے اور بے گور و کفن لاشیں بھی پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے خیال میں زیادہ تباہی ان جگہوں پر ہوئی جہاں ہندو آبادی زیادہ تھی۔ اس الم ناک منظر کو دیکھنے کے بعد میں، غلام اعظم سے ملا۔ میرا اندازہ تھا کہ مارشل لا حکام، شیخ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے جائیں گے، یا لے گئے ہوں گے۔

شیخ مجیب کے بچوں کو دعوت

جنوری ۱۹۷۱ء ہی کے دوران میں اپنے بیوی بچوں کو کراچی چھوڑ آیا تھا کیونکہ عمومی حالات سے گڑبڑ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان حالات میں وہ وہاں پر رہیں۔ یہ سوچا کہ بچے اپنے ننھیال اور ددھیال کے پاس سکون سے رہیں گے۔ اس لیے ان کو چھوڑ کر خود واپس ڈھاکہ آ گیا تھا۔

دھان منڈی میں میرے گھر پر صرف دو افراد یعنی ایک باورچی اور دوسرا ڈرائیور تھا۔ مقصود الزماں خاں صاحب جو کہ مسلم لیگ کے بہت نمایاں لیڈروں میں سے تھے، وہ ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ میرے باورچی کا فون آیا کہ ''مقصود الزماں صاحب کہتے ہیں کہ کچھ مہمان ہیں، کیا وہ آپ کے ہاں ٹھیر سکتے ہیں؟ لیکن یہ مہمان سیاسی لوگ ہیں''۔ میں سوچتا رہا کہ یہ کون سے سیاسی لوگ ہیں، جو میرے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آرمی ایکشن سے کوئی بھاگے ہوئے لوگ ہیں۔ بہرحال میں نے اسلام کی جتنی بھی تعلیم حاصل کی تھی، اس کے تحت یہی خیال ہوا کہ جو بھی پناہ مانگے اسے پناہ دینا چاہیے۔ میں نے مقصود صاحب سے کہا کہ ''ان سے کہیے کہ وہ میرے ہاں ٹھیر سکتے ہیں''۔ بعد میں انھوں نے مجھے بتایا کہ ''یہ شیخ مجیب الرحمٰن کی بیوی اور ان کے بچے تھے۔ جو اپنے گھر سے نکل کر مقصود صاحب کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ مقصود الزماں نے کہا ہوگا کہ ''میرا گھر بھی خطرے میں ہے۔ البتہ جماعت اسلامی کے ہاں تو شاید آرمی والے آئیں گے ہی نہیں۔ اس لیے ان کے ہاں چلے جائیں''۔ لیکن میری طرف سے دعوت دینے کے بعد ان کو آنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس لیے وہ کہیں اور نکل گئے۔ اس وقت حسینہ واجد صاحبہ وغیرہ تو نوعمر بچی

ہوں گی۔

''ادھورا'' قدم

جنرل یحیٰی خاں نے پہلی بڑی غلطی یہ کی کہ فوجی کارروائی سے پہلے ڈھاکہ سے روانہ ہوگئے۔ اس روانگی سے لوگوں کو یہ تاثر مل گیا کہ بات چیت ختم ہوگئی ہے اور اب اگلا مرحلہ فوجی کارروائی کا ہوگا۔ کارروائی ظاہر ہے کہ ایک منٹ میں تو نہیں ہوسکتی تھی۔ بنگالی آفیسرز تقریباً ہر جگہ موجود تھے۔ اس کے لیے آرڈرز یا احکامات جاری ہوئے ہوں گے۔ جس کی خبر مجیب الرحمٰن کو مل گئی ہوگی۔ اگرچہ زیادہ ظالمانہ لیکن جابر حکمرانوں کے نزدیک 'حکیمانہ' قدم یہ ہوتا، کہ بظاہر بات چیت جاری رکھتے۔ سب لیڈروں کو آخری راؤنڈ کے لیے اپنے ہاں بلا لیتے اور وہیں ان کو گرفتار کر لیتے۔ موجودہ شکل میں کوئی اور قابلِ ذکر لیڈر ان کے ہاتھ نہیں آیا، سب لوگ نکل گئے کیونکہ سب کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ کارروائی ہونے والی ہے۔ صرف مجیب الرحمٰن ہی ان کے ہاتھ آئے اور جب تک مجیب الرحمٰن زندہ رہتے تو وہ اُمیدیں اس علامت سے وابستہ ہو کر زندہ رہتیں، کہ جن کے بل پر مستقبل میں بنگلہ دیش کی جدوجہد جاری رہتی۔

اسے یحیٰی خان کی بزدلی سمجھ لیں یا بے تدبیری۔ اگر ان کو واقعی کارروائی کرنا تھی تو پھر مکمل کارروائی کرتے، نامکمل کارروائی سے زیادہ خطرناک چیز کوئی نہیں ہوتی۔ مگر مکمل کارروائی کیا ہوتی؟ یہ فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے جس کی نظر صورت حال پر ہو اور جو کارروائی کرنے والا ہو۔ جس طرح پرانے زمانے کے بادشاہ برسرِ اقتدار آتے تھے تو چن چن کے اپنے بھائیوں، بھتیجوں اور ان کے قریب ترین رشتہ داروں کو یعنی جو تخت کے دعوے دار ہوں یا دعویٰ کر سکتے ہوں، ان کا صفایا کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے بچ جانے والا کوئی نہ کوئی فرد ضرور دردِ سر بن جاتا تھا۔

فوجی قیادت سے ملاقات

۲۸ مارچ کو میری اور غلام اعظم صاحب کی میجر جنرل راؤ فرمان علی صاحب سے گفتگو

ہوئی۔ جس میں فرمان صاحب نے یہ بتایا کہ ''ہم نے بہت کوشش کی، مگر معاملہ طے نہیں ہوسکا، بھٹو صاحب بھی تیار نہیں تھے۔ مجیب الرحمٰن چھے نکات کو من وعن نافذ کرنے پر تلے ہوئے تھے، جس کے معنی پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کا قیام تھا''۔

جب میں جنگی قید سے واپس آیا تو وائس ایڈمرل احسن صاحب نے مجھے بتایا کہ ''کس کس طرح ہم نے آخر وقت تک اس بات کی کوشش کی کہ یحییٰ خان اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہ کریں اور اگر کرنا ہی ہے تو پہلے ڈھاکہ آکر مجیب الرحمٰن سے بات کریں۔ پھر جو اعلان کرنا ہو، وہ انھیں اعتماد میں لے کر کریں، مگر یہ تاثر نہ دیں کہ مغربی پاکستان میں بیٹھے بیٹھے، مسٹر بھٹو کے دباؤ میں آکر انھوں نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا ہے۔ اور پھر اگر اجلاس ملتوی کرنا ناگزیر ہو تو ساتھ ہی اعلان کریں کہ فلاں تاریخ کو اجلاس ہوگا۔ مگر ہماری کوئی بات نہیں سنی گئی، حالانکہ ہمیں معلوم تھا اور ہم نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے سے حالات خراب ہو جائیں گے''۔

یہی بات راؤ فرمان علی صاحب نے فروری میں اسلام آباد آکر، جنرل یحییٰ خاں کے گوش گزار کی تھی، مگر راؤ صاحب کے بقول: ''جی ایچ کیو میں بیٹھا ہوا کوئی بھی فرد صورتِ حال کی نزاکت کا ادراک کرنے کو تیار نہیں تھا''۔

فوج سے تین سوال

اگرچہ راؤ فرمان صاحب سے اس ملاقات میں تفصیل سے بات ہوئی، تاہم میں نے ان کے سامنے اپنی بات تین سوالات کی شکل میں رکھی:

میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ ''آپ کے ہاتھوں اب تک مجیب الرحمٰن زندہ ہیں؟'' میں دیکھ رہا تھا کہ جواب دیتے وقت ان کے لہجے میں بڑی خوداعتمادی تھی۔ وہ ہر بات کا جواب بڑے سرسری طریقے سے دے رہے تھے۔ کہنے لگے: ''ہم جب چاہیں اس کو ختم کر سکتے ہیں۔ یہ کام مقدمہ چلا کر بھی کر سکتے ہیں''۔ میں نے کہا: ''یہ آپ کی غلط فہمی ہے، اس لیے کہ جس شخص کو پاکستان کی اکثریتی آبادی نے اور مشرقی پاکستان نے تقریباً سو فی صد اکثریت

سے اپنا مینڈیٹ دیا ہے، اپنے نمایندہ کے طور پر منتخب کیا ہے۔ جب وہ زندہ آپ کے ہاتھ میں آ گیا ہے تو بین الاقوامی راے عامہ اور خود ملک کی راے عامہ کی موجودگی میں آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔ ابھی تین سال پہلے جب آپ کے پاس پورا اقتدار تھا، اس وقت شیخ صاحب نمایندگی بھی نہیں رکھتے تھے، اور آپ کے شواہد کے مطابق 'اگرتلہ سازش کیس' بالکل درست تھا، تب بھی آپ شیخ مجیب پر مقدمہ نہیں چلا سکے۔ اب اگر آپ چلائیں گے تو وہ ایک براے نام مقدمہ ہوگا۔ آرمی ایکشن کے وقت اگر ان کی جانب سے مزاحمت یا فائرنگ کے تبادلے میں ایسا ایکشن ہوتا تو دوسری بات تھی''۔

پھر میں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ ''آپ ہندوؤں کو کیوں مار رہے ہیں؟ اس قضیہ میں ان کی بہت بڑی اکثریت بے گناہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں کوئی مزدور ہیں' کارکن ہیں' دکان دار ہیں وغیرہ وغیرہ''۔ راؤ صاحب نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا: ''یہ سب انھی کا لایا ہوا فساد ہے''۔ میں نے کہا ''جنرل صاحب نہیں، آپ کی یہ رائے غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ میرے نزدیک فساد تو ہمارے وہ مقتدر مسلمان بھائی لائے ہیں' جنھوں نے حکومت چلانے میں، فیصلے کرنے میں، اور معاملات طے کرنے میں زیادتی کی۔ اصل میں فساد کے ذمہ دار یہ لوگ ہیں۔ اس لیے عام ہندوؤں کے ساتھ آپ جو کر رہے ہیں، یہ اخلاقی طور پر نامناسب اور دینی لحاظ سے بھی غلط ہے''۔

اس کے بعد بھی میں اس بات سے کبھی اتفاق نہیں کر سکا، کہ سقوط ڈھاکہ کے بنیادی طور پر ذمہ دار ہندو ہیں۔ خود ہمارے ہاں بھی بنگالی ہندو کو مبالغہ آمیز حد تک ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عام ہندو کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ عام ہندوؤں نے میرے ساتھ کمپنی میں کام کیا ہے۔ ان میں انجینئر بھی تھے، درمیانے اور نچلے درجے کے کمپنی کارکن بھی تھے۔ انھیں دیکھ کر بھی میں سمجھتا ہوں کہ عام انسان تو بھلا ہی ہوتا ہے، اِلّا یہ کہ اس کے اندر زہر گھول دیا گیا ہو۔

تیسرا سوال میں نے یہ پوچھا کہ ''آپ کو اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ، اس واقعے کو

بنیاد بنا کر بھارت، مشرقی پاکستان پر فوج کشی کرے گا؟'' راؤ صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا ''اگر ایسا ہوا تو پھر بھارت کو بھی دیکھ لیں گے''۔ میں نے کہا '' آپ کس بل بوتے پر یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کوئی ہماری مدد کرے گا۔ کیا چین مدد کو آئے گا؟'' کہنے لگے ''ہاں' ہم کو اپنے دوستوں سے ٹھوس مدد کی توقع ہے'' میں نے کہا ''یہ محض ایک غلط فہمی ہے، کوئی کسی دوسرے کی لڑائی نہیں لڑتا۔ اگر بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ کرنا چاہے، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آبادی کے دل ٹوٹے ہوں، تو مشرقی پاکستان کا دفاع کرنا بہت مشکل ہو گا''۔ اس دوران چین یا کسی اور سے مدد کی درخواست کی جائے' کوئی بھی مدد کو نہیں آئے گا''۔

دوسروں کی مدد سے بلاؤں اور مصیبتوں کو ٹالنے کا تصور اس قدر ہماری گھٹی میں پڑا ہوا تھا، کہ کوئی بات سمجھتا ہی نہیں تھا۔ افسوس کہ آج تک یہی معاملہ چل رہا ہے۔

زیادتی کے آثار

ڈھاکہ میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی، دھواں اٹھ رہا تھا۔ مختلف جگہوں پر انسانی لاشوں کی بو میں دم گھٹتا اور جی متلاتا تھا۔ لوگ سخت پریشانی کو عالم میں مال و اسباب چھوڑ کر سڑکوں پر بھاگے چلے جا رہے تھے۔ میں جہاں رہتا تھا، وہاں سامنے والی سڑک لوگوں کے ہجوم سے پٹی پڑی تھی۔ شعلے دُور سے دکھائی دیتے تھے، جنھیں بجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پہلے پہل ہم سمجھے کہ فوج کی آمد کے ردعمل میں یہ ساری کاروائی 'مکتی باہنی' (یعنی بنگالی آزادی پسند گوریلے) والے کر رہے ہیں۔ لیکن ایک ساتھی نے بتایا: ''نہیں، یہ پاکستانی فوج والے کر رہے ہیں''۔ ان کی یہ بات سن کر مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔ آخر پاکستانی فوج والے کیوں آگ لگائیں گے؟

بہرحال غلام اعظم صاحب نے ملاقات میں جنرل فرمان علی صاحب کے سامنے اس مسئلے کو بڑی شدت سے اٹھایا اور کہا کہ ''جو لوگ بھی آگ لگا رہے ہیں، فوج سختی سے ان کے ہاتھ روکے۔ آخر یہ سزا عام شہری آبادی کو کیوں دی جا رہی ہے؟ آپ ان لوگوں پر گرفت کریں تاکہ لوگ اپنے گھروں میں بے خوفی سے رہ سکیں اور ان میں اعتماد، بھروسا اور

سکون پیدا ہو''۔

فرمان صاحب نے مسکرا کر کہا: ''جب امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور شر پسندی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر فوج کا کام آگ بجھانا نہیں ہوتا، بلکہ شر پسندی ختم کرنے کے لیے آگ لگانا، اور شر پسندی کو لڑ کر تباہ کرنا ہوتا ہے۔ آپریشن کے دوران میں یہ کمی بیشی ہو جاتی ہے''۔

غلام اعظم صاحب نے کہا: ''نہیں، آپ کے آپریشن میں تو تقریباً سارے ہی بے گناہ مارے گئے ہیں، یہ زیادتی ہے، اس کا پاکستان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا''۔ مگر جنرل صاحب اپنے بیان پر قائم رہے۔

یہ رپورٹیں بھی مل رہی تھیں کہ فوجی جوان، شر پسندوں (miscreants) کی تلاش میں اپنے بوٹوں کی ضربوں سے دروازے توڑ کر ان عام لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ بعض جگہ سے ریڈیو اٹھانے اور عورتوں، بوڑھوں، بچوں کی بے عزتی کرنے کے واقعات بھی سامنے آئے، جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بعض جگہ فوجی دستے اپنے آپ کو ایک فاتح فوج سمجھ کر سامنے آنے والوں کو پامال کر رہے ہیں۔ ایسا کرنے والوں کا یہ رویہ اپنے ملک کی فوج کا سا نہیں تھا، جو اپنے شہریوں سے محبت اور حکمت سے معاملہ کرتی ہے اور ضرورت پڑنے پر صرف فتنے ہی کی سرکوبی کرتی ہے۔ مگر اس ایکشن کے ابتدائی ایام میں تو یہ پاکستان کی وحدت کو بحال کرنے سے زیادہ انتقام کے جذبے سے بھری دکھائی دیتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ۳۱ مارچ تک مشرقی پاکستان کی مختلف چھاؤنیوں میں بنگالی فوجیوں نے بعض مغربی پاکستانی فوجی جوانوں اور افسروں اور ان کے اہلِ خانہ سے جو ہول ناک اور شرم ناک زیادتیاں کی تھیں، ان کے نتیجے میں بھی یہ انتقامی رویہ پیدا ہوا تھا۔ بلاشبہہ انتقام ایک فطری جذبہ ہے۔ کسی عام آدمی میں اس جذبے کے پیدا ہونے اور اپنے آپ پر کنٹرول نہ کر سکنے کا شاید کچھ جواز ہو، لیکن بہرحال فوج کوئی عام لوگوں کا ہجوم تو نہیں ہوتا۔ فوج ایک منظّم و تربیت یافتہ گروہ کا نام ہے، جس کو آرڈر کے تحت اپنے جذبات کو

قابو میں رکھ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ اور پورے زمانۂ ملازمت میں انھیں اسی نظم وضبط کی تربیت دی جاتی ہے، مگر کیا صرف یہاں پر ہی اس کی کمان، انتقام کے جذبے کے ہاتھ میں ہونا تھی؟

جماعت کا اجلاس

اپریل کے پہلے ہفتے میں مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کی صوبائی شوریٰ اور ضلعی اُمرا کا اجلاس ہوا۔ یہاں ہم نے فوجی انتظامیہ سے اپنے مکالمے کی روداد سنائی اور بتایا کہ ''یہ تو آغاز ہے، یوں لگتا ہے کہ آگے چل کر یہ لوگ مزید سختی کریں گے۔ مجیب الرحمٰن پر مقدمہ بھی چلے گا، بلکہ ان کا عزم تو یہ ہے کہ مجیب کو غداری کے الزام میں پھانسی بھی دی جاسکتی ہے''۔

اس کے بعد ہم راؤ فرمان صاحب سے دوبارہ ملے اور اپنے خدشات سے انھیں آگاہ کیا کہ ''اس اندھا دھند آرمی ایکشن کے اثرات پاکستان کے لیے سخت خطرناک ہوں گے''۔

پھر صوبائی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا، جس میں جماعت کی یہ پالیسی طے کی کہ ''ہم فوج کے شریک کار نہیں بنیں گے۔ سیاسی طور پر یا فوجی کارروائیوں میں اس کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ لیکن پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کے لیے جو تعاون درکار ہوگا وہ کریں گے۔ فوجی کارروائی کی بھی تائید نہیں کریں گے، کیونکہ جس طریقے سے جنرل یحییٰ خان اور ان کے لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان نے فوجی کارروائی کی ہے، فی الحقیقت سیاسی اور قانونی طور پر اس کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اور اس کے کوئی اچھے اثرات متوقع نہیں''۔

جب شوریٰ میں ہم یہ بحث کر رہے تھے، ہمارے سامنے تین راستے تھے۔ بھارتی تائید سے پیدا ہونے والی بغاوت کا ساتھ دیا جائے، یا غیر جانب دار رہ کر تماشا دیکھا جائے اور یا پھر آنکھیں بند کر کے فوج کی کارروائی کا ساتھ دیا جائے۔ پہلے راستے پر چلنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دوسرا اقدام بھی عملاً پہلے قدم کی تائید میں جاتا تھا، البتہ تیسرے اقدام

کے لیے محدود اور مشروط طور پر قدم بڑھایا جاسکتا تھا اور اسی کے لیے اُوپر بیان کردہ محتاط اور نازک پالیسی طے کی گئی۔

فوجی تربیت کی ضرورت

آرمی ایکشن سے پہلے مارچ ۷۱ء کے دوران، بنگالی قوم پرستوں نے دردناک طریقے سے اُردو بولنے والوں، اور ان کے ساتھ پنجابی اور پشتون شہریوں کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ وہ ایسی دہشت ناک روداد ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ سے لہو ٹپکتا ہے۔ مارشل لا حکومت نے اس پر جو 'وہائٹ پیپر' [۵ اگست ۱۹۷۱ء] شائع کیا، اس میں مذکورہ المیہ کی بڑی مختصر اور نامکمل تصویر تھی۔ اس دوران پاکستان کا سیاسی منظر ہوسِ اقتدار کی گرد سے اَٹا پڑا تھا۔

اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ بنگلہ قوم پرستی میں در آنے والا تشدد پسند عنصر پاکستان کی وحدت کے حامی بنگالی عناصر پر بھی اسی طرح حملہ آور ہوسکتا ہے جس طرح وہ پہلے اُردو بولنے والوں پر حملہ آور ہوا ہے۔ اس صورت میں خصوصی طور پر جماعت اسلامی، اسلامی جمعیت طلبہ، جمعیت طلبہ عربیہ وغیرہ کا ہدف بننا خارج از امکان نہیں تھا۔ حالانکہ سیاسی اعتبار سے ہمارا موقف بالکل درست، منصفانہ اور عوامی لیگ کو اقتدار کی منتقلی کی تائید لیے ہوئے تھا۔ لیکن جب سیاسی تحریکوں میں تشدّد کا عنصر آ جاتا ہے، تو پھر ان کو اکیڈمک اور سنجیدہ وفہمیدہ باتیں بُری لگتی ہیں۔ وہ تلوار کی دھار یا بندوق کی نالی سے قصہ زمین برسرِ زمین نمٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس فضا میں ہمارے لیے دفاعی نقطۂ نظر سے تربیت لینے کی بالکل جائز ضرورت پیدا ہوئی۔ ہمارا دستور اور ہمارا طریقِ کار ہمیں کسی بھی غیر آئینی یا مسلح سیاسی جدوجہد سے روکتا تھا۔ پھر تربیت بھی فوج کے بغیر نہیں مل سکتی تھی اور اسلحہ بھی ریاستی اداروں کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کرنا غیر آئینی اقدام تھا۔

اب دوسری صورت یہ تھی کہ مکتی باہنی کے قوم پرست اور نکسل باڑی تحریک کے کمیونسٹ گوریلے نہ صرف جدید خودکار اسلحہ سے لیس تھے، بلکہ انھیں بھارتی مسلح افواج نے

باقاعدہ تربیت دے رکھی تھی۔ یہ صورتِ حال بھی اس امر کا تقاضا کرتی تھی، کہ ہمارے لوگوں کو بھی عسکری تربیت ملے تاکہ دفاع کی ضرورت پوری ہو۔ کیونکہ اب مسئلہ صرف سیاسی نہیں رہا تھا، بلکہ ریاست کے خلاف دشمن ملک کی سرپرستی میں غیر اعلان شدہ اور ایک مسلسل جنگ مسلط ہو چکی تھی۔

راؤ فرمان علی صاحب سے میری ایک ملاقات میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ انھوں نے فوجی تربیت کی پیش کش کی۔ مجھے شروع سے مولانا مودودی کی اس بات پر ہمیشہ اطمینان رہا ہے کہ پُرامن ذرائع ہی سے انقلاب آنا چاہیے۔ تبلیغ، دعوت اور شہادتِ حق کے ذریعے ہی لوگوں کے دل جیت کر انقلاب آسکتا ہے اور وہی پایدار بھی ہوسکتا ہے۔ کسی اور ذریعے سے یہ تبدیلی آنا ممکن نہیں، اور بالفرض آ بھی جائے تو وہ پایدار اور پُراثر نہیں ہوسکتی۔

میں یہ سمجھتا تھا کہ ان حالات میں ہمارے لوگوں کو لڑنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے اور اگر ہوسکے تو دفاعی ضروریات کے لیے اسلحہ بھی لینا چاہیے۔ یہ بھی صرف اس خیال سے تھا کہ ہماری مدمقابل قوتوں کے پاس وافر تعداد میں خودکار اسلحہ موجود ہے، جس کی سپلائی میں تسلسل ہے، وہ تربیت یافتہ ہیں، اس لیے لڑ سکتے ہیں اور انھیں دشمن ملک کی زبردست پشت پناہی حاصل ہے۔ ان کے مقابلے میں ہمیں نہتے اور ناکارہ نہیں مارا جانا چاہیے۔ اگرچہ ہمارے مخالف حضرات کا 'فلسفۂ انسان دوستی' یہی کہتا ہے کہ ''جماعت کے رفقا کو چاہیے تھا کہ ان کے مقابلے میں وہ بلاچون و چرا نہتے مارے جاتے'' —— ان حالات میں جماعت نے تشدد کا راستہ روکنے کے لیے جو دفاعی راستہ اپنایا، اس کا اخلاقی جواز تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ اس وقت خود ریاست کی طرف سے تربیت دینے کا جو موقع مل رہا ہے، مجبوراً ہی سہی مگر اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ میرے ذہن میں یہ بالکل واضح تھا کہ جلد یا بدیر بنگلہ دیش بن کر رہے گا، کیونکہ مغربی پاکستان کی سیاسی اور فوجی قیادت میں اسے اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا کوئی دانش مندانہ عزم نہیں پایا جاتا۔ اس صورت میں بنگلہ دیش کی

تشدد پسند سیاست کے ہاتھوں، پاکستان کے حامیوں کے خون کی ہولی کا کھیلا جانا بالکل ظاہر تھا۔ اس طرح یہ عسکری تربیت جانی نقصان میں کمی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ میں آئینی ذرائع سے تربیت اور اسلحہ حاصل کرنے کا تو حامی تھا، مگر اس بات کے لیے ہرگز تیار نہ تھا کہ تربیت حاصل کر کے ہم فوج کے ساتھ مل جائیں۔

چنانچہ میں نے راؤ فرمان علی صاحب سے کہا: ''آپ ہمارے لوگوں کی تربیت کا انتظام کردیں، لیکن اس کا خرچ ہم خود برداشت کریں گے''۔ چنانچہ ڈھاکہ سے ہمارے تقریباً ۳۰ یا ۴۰ افراد کے پہلے گروپ کی تربیت کا انتظام ڈھاکہ چھاؤنی میں ہوا۔ اس سلسلے میں جو بھی اخراجات ہوئے، وہ بیت المال نے برداشت کیے۔ میرے ذہن میں فوجی تربیت اور دفاعی اسکیم موجود تھی، لیکن اس طرز پر نہ تھی جس طرز پر یہ بعد میں ہوئی۔

ایک المناک واقعہ

میرے بنگالی دوست، فوج کی زیادتیوں کا اکثر تذکرہ کرتے تھے۔ جن میں کشت و خون کے حادثات کی تفصیل ہوتی تھی۔ لیکن میں اکثر باتوں کو سن کر دل ہی دل میں رد کر دیتا تھا، کہ یہ بدنام کرنے کے لیے افسانہ طرازی ہے، بھلا فوج جیسا منظّم ادارہ اپنے ہی ہم وطن اور ہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ یہ کیسے کرسکتا ہے؟ پھر خیال آتا کہ آرمی ایکشن کے بعد پہلے دو چار دنوں میں شدید اعصابی کھنچاؤ اور نفسیاتی تناؤ کی حالت میں ایسے انسانیت سوز واقعات رونما ہوئے ہوں گے، بعد میں صورت حال بہتر ہوگئی ہوگی۔ اسی طرح بیرونی ممالک کے اخبارات میں ان حوالے سے جو تفصیلات چھپ رہی تھیں، ان پر بھی مجھے یقین نہیں آتا تھا۔

لیکن اس فضا میں خود ہمارے ساتھ ایک بڑا ہی اندوہ ناک سانحہ پیش آیا۔ اس سانحے کا شکار اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ کے ناظم شاہ جمال چودھری اور اسلامی جمعیت طلبہ ضلع فرید پور کے ناظم عبدالسلام تھے۔

۱۵، پرانا پلٹن میں جمعیت کا دفتر تھا۔ یہ دونوں جمعیت کے اجلاس میں شرکت کے بعد

رات کے وقت باہر سڑک پر آئے، مگر اس کے بعد کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ ہم نے ان کی اس پُراسرار گم شدگی کی ہر طرف رپورٹ کی، ہر طرح سے تحقیق کی، ہر ذریعے کو استعمال کرتے ہوئے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کی، ہر ذمہ دار فرد سے کہا کہ انھیں تلاش کرو، مگر کسی جگہ سے ان کا کچھ اتا پتا نہ چل سکا۔

غلام اعظم صاحب نے جنرل ہیڈکوارٹر راول پنڈی میں چیف آف اسٹاف جنرل عبدالحمید سے بات کی۔ میں نے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے جنرل اکبر صاحب سے ملاقات کر کے ان رفقا کے بارے میں دریافت کیا۔ مشرقی پاکستان میں جنرل ٹکا خان اور جنرل راؤ فرمان علی صاحب سے بھی مل کر پوچھا۔ سب یہی کہتے کہ ''تلاش کر رہے ہیں، مگر پتہ نہیں چل رہا''۔

اسی دوران انٹر سروسز انٹیلی جنس میں میرے دو تین واقف کار افسروں نے بتایا کہ ''جوں ہی وہ دفتر سے نکلے تھے، انھیں فوج نے گرفتار کر کے گولی ماردی تھی''۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جس طرح فوجی کارروائی کی خبریں مل رہی تھیں، ان کی بنیاد پر مجھے پہلے روز سے اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا حادثہ نہ رونما ہو گیا ہو۔ اس پر ہمارے لوگوں میں کسی حلقے نے یہ بات پھیلا دی کہ ''یہ کام ضرور کسی قادیانی افسر نے کروایا ہوگا''۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لوگ یہ تاویل اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے، یا پھر فوج کے بارے میں کسی خوش گمانی کا شکار ہونے کے لیے یا شاید اس کے دفاع میں کر رہے تھے۔ وہاں پر فوج کا جو عام رویہ تھا، اس رو میں ایسا اقدام کوئی بھی فرد کر سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ شاہ جمال چودھری شہید اور عبدالسلام شہید کی جیبوں میں وہ پاس ضرور ہوگا، جو مارشل لا حکام نے مختلف لوگوں کو جاری کیے تھے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ انھوں نے اپنے تعارف کے لیے غلام اعظم صاحب کا اور میرا نام لیا ہوگا، کہ آپ ہمارے بارے میں ان سے پوچھ لیں۔ لیکن ان لوگوں نے نہ اعظم صاحب سے پوچھا، نہ پاس کو کوئی وقعت دی اور نہ جمعیت میں ان کی حیثیت کو کچھ سمجھا، بلکہ سیدھا گولی مار کر ان کی

لاشیں کہیں پھینک دیں، جو کبھی دست یاب نہ ہوسکیں۔ اسی بنا پر میں سوچتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات اگر ہمارے ساتھ پیش آسکتے تھے، تو یقینی امر ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ تو بہ کثرت ایسا ہوا ہوگا، بلکہ ایسے حوادث کی اطلاعات ہم کو مل رہی تھیں۔

بنگالیوں سے نفرت کا ماخذ

دراصل بات یہ ہے کہ مغربی پاکستان سے جانے والے بہت سے فوجیوں، خصوصاً جوانوں میں، بنگالیوں کے خلاف تحقیر، تذلیل اور نفرت کے احساسات پائے جاتے تھے۔ اس نفرت کا ایک فوری سبب تو لازمی طور پر وہ سنگین نوعیت کے واقعات تھے، جو آرمی ایکشن سے چند روز قبل اور پھر چند روز بعد مغربی پاکستانی فوجیوں یا ان کے بیوی بچوں کے ساتھ رونما ہوئے، جب کہ مارچ کے پہلے ۲۲ روز کے دوران غیر بنگالی آبادی پر توڑے جانے والے ہول ناک مظالم نے بھی لازماً اس نفرت کو بھڑکایا ہوگا۔ اگرچہ ردعمل ایک فطری جذبہ ہے، لیکن منظّم قومی اداروں پر بھی جب عوامی ردعمل کی سی ہذیانی کیفیت طاری ہوجائے، تو وہاں ریاستی ڈھانچا تباہ ہوجاتا ہے۔

بہرحال ان واقعات کے نتیجے میں بہت سے مغربی پاکستانی فوجیوں نے عام طور پر بنگالیوں کو ذلیل، حقیر اور قابلِ نفرت سمجھنا شروع کردیا تھا۔ اس صورت حال کو سنبھالنا افسروں کی ذمہ داری تھی، مگر شاید ان کی بھی بڑی تعداد ایسا ہی سوچتی تھی۔ اس حوالے سے یہ بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے کمیشنڈ فوجی افسروں کو دورانِ تربیت اپنے ہم وطن سویلین لوگوں کے بارے میں کیا بتایا جاتا ہے؟ عام طور پر بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ حکم دینے والی یہ قوت ایک سویلین شہری کو تحقیر کی نظر سے دیکھتی ہے۔ شاید اسی لیے جب انھیں ان شہریوں سے معاملہ کرنے کا موقع ملتا ہے، تو پھر معاملہ برابری کا نہیں رہتا۔ یہی حال ہماری سول بیوروکریسی کا بھی ہے۔

میں ایک اور واقعہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جب ڈھاکہ جماعت کا ایک گروپ ڈھاکہ چھاؤنی میں تربیت کے لیے گیا، تو اس کے چند روز بعد امن کی بحالی کے سلسلے میں

ایک اجلاس میں شرکت کی غرض سے ہم لوگ چھاؤنی گئے۔ وہاں جا کر ایک فوجی گاڑی میں سوار ہوئے۔ اس گاڑی کو بنگالی ڈرائیور چلا رہا تھا، جب کہ ایک پنجابی حوالدار ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس وقت حیرانی اور صدمے کی انتہا نہ رہی، جب ہمارے تعارف کرانے کے باوجود اس نے اپنے طرزِ گفتگو میں اعظم صاحب کے ساتھ تمسخر آمیز سلوک کیا۔ اعظم صاحب تو ہمارے مرکزی رہنما تھے۔ مشرقی پاکستان کے تحفظ کے لیے ان کا ایک مقام تھا۔ ہمارا یہ ہم سفر حوالدار بھی اس چیز کو جانتا تھا کہ اس وقت ہم لوگ ان کے اعلیٰ افسروں سے بات کرنے جا رہے ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود ان عام مغربی پاکستانی فوجیوں کا رویہ بنگالیوں کے خلاف نفرت بھرا تھا، جس کا ثبوت اس فرد نے ہمارے منہ پر اپنی نفرت کا اظہار کر کے دیا تھا۔

بنگالیوں کے خلاف نفرت کا یہ اظہار کوئی ۱۹۷۱ء کے اعصاب شکن ایام کی بات نہیں تھی۔ اس نفرت کا آغاز انگریزوں کے دوسو سالہ سامراجی دور سے شروع ہوتا ہے۔ یہ حقیقت تاریخ کا حصہ ہے کہ ان کے خلاف سب سے زیادہ مزاحمت بنگالیوں نے ہی کی تھی اور انگریز سامراج کے خلاف جہاد، حریت، حقوق اور بغاوت کی تحریکوں کا گڑھ بھی بنگال رہا تھا۔

اس لیے انگریز فوج کی یہ روایت بہر حال ہمارے فوجیوں اور ان کے قائدین یعنی کمیشنڈ افسروں تک منتقل ہوئی ہوگی۔ پھر مغربی پاکستان بیوروکریسی نے بھی انگریز کی چھوڑی ہوئی سامراجی نفرت کے ساتھ اہلِ بنگال کو دیکھا۔ یہ سب چیزیں مغربی پاکستان کے ریاستی اہل کاروں، کمیشنڈ فوجیوں اور نوکر شاہی کے مزاج کا حصہ بنیں، جنھیں نفرت اور حقارت کو سات پردوں میں چھپانے کا گُر آتا ہے۔ لیکن ناخواندہ فوجی جوان کو اپنی نفرت نفاق کے پردے میں چھپانی نہیں آتی تھی۔

فوجی کارروائی کی نوعیت

میں یہاں پر ایک سوال اُٹھا رہا ہوں، جو مجھے ہمیشہ پریشان کرتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں فوج کی کارروائی نہ صرف ناانصافی پر مبنی تھی، بلکہ بہت ظالمانہ اور غیرانسانی بھی تھی۔ اس میں وہ سارے کام ہو رہے تھے جو پچھلی صدی کی کوئی فاتح فوج کر سکتی تھی۔ اس زمانے میں ہم جنرل فرمان علی صاحب سے اور دوسرے ذمہ دار لوگوں سے ایک بات کہا کرتے تھے۔ اسی عرصے میں امریکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے والے ویت نامی اشتراکی گوریلوں کے علاقے 'مائی لائی' سے منسوب ایک واقعہ ہوا تھا۔ جس میں چند امریکی فوجیوں نے بلاجواز، بے گناہ ویت نامی شہریوں کو مار دیا تھا۔ واقعے کی تشہیر کے بعد امریکا نے ان افسروں کو فوج سے فوراً برطرف کر دیا تھا، ان پر مقدمہ چلایا تھا اور ان کو سزا ہوئی تھی۔ میں نے جنرل فرمان صاحب سے کہا تھا کہ ''آپ کے ہاں 'مائی لائی' جیسے واقعات تو ہو رہے ہیں، مگر حیرت ہے کہ آپ کی نظر میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کا آپ اعتراف کریں اور اس کے ذمہ دار فرد کو سزا دیں''۔

فوج پہلے تو اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ بعد میں انھوں نے کہا: ''ہاں، ہم تحقیق کر رہے ہیں اور جوانوں کو متنبہ کر رہے ہیں''۔ میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں تمام نہیں، بلکہ کچھ ہی تفصیلات معلوم ہو جائیں تو لوگ حیرت کریں گے کہ ان محافظوں نے کیا کچھ کیا۔ ایسے ہی پے در پے واقعات سے عام بنگالی آبادی خلاف ہوگئی تھی۔ وہ نوجوان جو بالکل غیرسیاسی تھے، وہ بھی آہستہ آہستہ مکتی باہنی میں شامل ہونے لگے۔

بنگال کے جنگلات یا سرحد کے پار بھارتی فوجی کیمپوں میں ان کی تربیت کا ایک زبردست نظام قائم تھا۔ سرحدی علاقوں میں آبادی خوف زدہ تھی، اسی لیے وہ گھربار چھوڑ کر بھارت میں پناہ گزیں ہو رہے تھے۔ شاذونادر ہی کوئی بنگالی ملتا تھا، جو دل سے کہتا کہ میں پاکستان کا حامی ہوں۔ بنگالی آبادی میں خاص طور پر ہمارے حلقے کے لوگ رہ گئے تھے، جو پاکستان کی حمایت کا کھلے بندوں دم بھرتے تھے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ بھی پاکستانی فوج کی محبت میں گرفتار نہیں تھے، بلکہ پاکستان کو اسلامی عقیدے کا ایک مظہر سمجھتے ہوئے اس سے

محبت کرتے تھے۔ اگرچہ روزمرہ کے مشاہدات سے ان کے دل بھی زخمی تھے۔

ضمیر احمد میرے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ ایڈمرل محمد شریف صاحب جب مشرقی پاکستان نیوی کے انچارج بن کر آئے تو وہ ان کے چیف آف اسٹاف تھے۔ فوجی کارروائیوں کے دوران جب ضمیر مرحوم سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ "چٹاگانگ کو پاکستانی مسلح افواج نے عملاً دوبارہ فتح کیا"۔ اس زمانے میں ان سے دوسرے، تیسرے روز ملاقات ہوا کرتی تھی۔ طویل عرصے کے بعد ۱۹۷۱ء میں ان سے دوبارہ بڑا قرب ہوگیا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ: "اگر ہمارے پاس ۶ گن بوٹ ہوتیں تو پاکستان نیوی آبی راستوں میں چھپے تمام دہشت گردوں کا صفایا کردیتی"۔

ساری بے تکلفی کے باوجود مجھے ان سے یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، کہ کیا ان کا مقصد بھی وہی ہوتا جو فوج اس وقت کر رہی تھی۔ کیونکہ اگر وہی جواب ہوتا جو میں دیکھ رہا تھا، یعنی اگر وہ ہاں کہتے تو پھر ان کے ساتھ میرا تعلق لازماً متاثر ہوتا اور میری نظر میں ان کے مقام کو ٹھیس پہنچتی (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، وہ وائس ایڈمرل کے عہدے پر خدمات انجام دے رہے تھے کہ اب سے پندرہ برس پہلے انتقال کرگئے)۔ اس لیے میں ایسے مواقع پر سوال کر کے مزید تحقیق کرنے کے بجائے احتراز برتنے میں ہی خیریت سمجھتا ہوں، تاکہ کم سے کم سہانے خواب تو نہ ٹوٹنے پائیں۔ خواب حقیقی نہ بھی ہوں تو کم سے کم دل کے لیے تو سرمایہ ہوتے ہیں۔

البدر کا قیام

اس کے بعد اگلا واقعہ ہے 'البدر' کا قیام۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ میرا پوری زندگی کا تعلق ہے، اور اس وقت بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ ان کی راہ نمائی کرتا تھا، احباب سے فنڈز اکٹھے کر کے دیتا تھا اور ان کے پروگراموں میں جانے کو کہیں زیادہ ترجیح دیتا تھا۔ جمعیت کے ارکان سے بڑی محبت و الفت کا تعلق تھا۔ لیکن اس شکل میں 'البدر' بنانے کا میں حامی نہیں تھا۔ جمعیت کے لوگ

میری یہ رائے جانتے تھے، اس لیے انھوں نے غالباً احترام کے طور پر مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا، اور اپنی صواب دید پر 'البدر' کو تشکیل دیا۔ اگرچہ انھوں نے پوری دیانت داری، خلوص اور خوفِ خدا سے یہ فیصلہ اس حوالے سے کیا تھا کہ ''ہمیں پاکستان بچانے کے لیے جدوجہد کرنا ہے، اور خود فوج کی جانب سے جو زیادتی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں، اس طرح ہمارے قریب رہنے سے ان واقعات میں بھی کمی آئے گی، کیونکہ وہ تمام کے تمام غیر بنگالی ہیں، یوں ہماری شکل میں بنگالی عنصر کی موجودگی، ان کی بے لگام کارروائیوں پر گرفت کا ذریعہ بن سکے گی'' —— اپنی جگہ یہ کوئی غلط سوچ نہیں تھی۔

مگر میں یہ بات کس طرح مان لوں کہ باقاعدہ فوج کے تحت اور اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے، کسی رضا کار کی بات کو باقاعدہ فوج وہی مقام دے گی، کہ جس کا تصور کیا جا رہا تھا۔ بلاشبہ بہت سے مقامات پر 'البدر' کی وجہ سے ظلم و زیادتی میں کمی بھی آئی، مگر کئی مقامات پر ایسا نہیں ہوسکا۔ بلکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کئی جگہوں پر تو خود 'البدر' کے ساتھ پاکستانی فوج نے سخت زیادتی کی۔ فوج کی ایسی کارکردگی دیکھ کر کس طرح ساتھ دینے کے لیے دل آمادہ ہوئے؟

'البدر' کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ مغربی پاکستان میں 'البدر' بنانے کا کریڈٹ اکثر میرے کھاتے میں ڈالا جاتا رہا۔ جب بھارتی قید سے رہا ہو کر یہاں آیا تو جگہ جگہ اجتماعات میں میرا تعارف کراتے وقت یہ کہا جاتا، کہ البدر اس نے بنائی تھی۔ اگر میں تردید کرتا تو فتنہ پیدا ہوتا، کہ زخم تازہ تھے اور اس طرح ایک نئی بحث کا دروازہ کھلتا۔ اگر تردید نہ کرتا تو وہ بات حقیقت بنتی، جو دراصل حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اس بات میں زیادہ مصلحت نظر آئی کہ خاموش رہوں۔

البدر کتاب جو سلیم منصور خالد بھائی نے لکھی ہے، اس میں بیان کردہ تفصیلات کی صداقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب امرِ واقعہ کی مفصل روداد ہے۔ ان نوجوانوں کے جذبے کی آخر کیوں نہ قدر کی جائے۔ مجھے آج بھی یقین ہے کہ ان سب کو شہادت کے نتیجے

میں جنت کے اعلیٰ درجات ملے ہوں گے۔ اپنی جان لڑا دینے والے ان پیارے ساتھیوں کے اس اقدام کے بارے میں، مَیں یہاں کوئی بحث نہیں کر رہا۔

میرے دردِ دل کا باعث تو وہ فوجی حکام ہیں، جنھوں نے اپنوں کو پرایا سمجھا، بے گناہ شہریوں کو اپنا دشمن جانا۔ ان حکام نے بظاہر پاکستان کو بچانے کا قدم اٹھایا، مگر حقیقت میں پاکستان کے جسدِ قومی کو اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ مجھے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی حدودِ کار اور پالیسی سے اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اختلاف میرا حق تھا، مگر میں نے اپنی سخت راے کے باوجود اجتماعی فیصلے کا احترام کیا اور 'البدر' کے قیام کے بعد بھی میں نے وہاں جمعیت کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ اس سلسلے میں اعانت کی ذمہ داری ادا کی۔ آج اس اختلاف کے اظہار کا سبب یہ ہے کہ خدانخواستہ ایسی صورت کبھی مستقبل میں پیدا ہو، تو فیصلہ کرتے وقت مزید گہرائی میں جا کر سوچ لیا جائے۔

تاہم، کتاب البدر کا میں نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ میرے احساسات کی مختصر تعبیر ہے۔

ضمنی انتخابات

مارشل لا حکام نے عوامی لیگ کے ان ارکانِ قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستوں کو خالی قرار دے دیا، جو ۲۵ مارچ کے بعد فرار ہو کر بھارت چلے گئے۔ یہ نشستیں بھی کوئی ایک دو نہیں تھیں، بلکہ صرف قومی اسمبلی کے ۸۸ ارکان کو نااہل قرار دیا گیا تھا۔

ان نشستوں پر ضمنی انتخابات کا شیڈول آیا۔ حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ ضمنی الیکشن میں سبھی کو بلامقابلہ منتخب ہونا تھا۔ کیونکہ نہ کوئی ووٹ دینے کو تیار تھا، نہ کسی پارٹی کا باہم کوئی مقابلہ ہونا تھا۔ یہ الیکشن حکومتی اور سیاسی سطح پر محض ایک خود فریبی تھے۔ دوسری سیاسی پارٹیوں مثلاً پاکستان جمہوری پارٹی، پاکستان مسلم لیگ وغیرہ کے ساتھ ہم نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ ضمنی الیکشن میں حصہ لیں گے۔ جس شوریٰ میں یہ فیصلہ ہوا، اس میں محترم میاں طفیل محمد صاحب بھی شریک تھے۔ میں نے بڑی تفصیل سے اپنا موقف پیش کیا تھا۔

اب تک مجھے اپنا جملہ یاد ہے کہ ''یہ انتخابات دھوکے اور حق غصب کرنے پر مبنی ہیں۔ ان انتخابات میں حصہ لینا بلا جواز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس انتخاب میں جو منتخب ہوگا، غالباً اسے اسمبلی میں بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوگا''۔ یہ بات سچ ثابت ہوئی، اور اس اسمبلی کا کبھی اجلاس نہیں ہوسکا۔

پھر فوج بھی اس میں ڈنڈی مار رہی تھی۔ فرمان علی صاحب نے بتایا کہ ''بھٹو صاحب، جن کا مشرقی پاکستان میں کوئی وجود نہیں، وہ بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ہم کو نشستیں دیں''۔ قومی اسمبلی کی ۷۸ اور مشرقی پاکستان صوبائی اسمبلی کی ۱۹۳ نشستوں پر ضمنی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے چھے پارٹیوں کا اتحاد [۱۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء] قائم ہوا۔ اس اتحاد میں مسلم لیگ (کونسل)، مسلم لیگ (کنونشن)، مسلم لیگ (قیوم)، پاکستان جمہوری پارٹی، نظامِ اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی شامل تھی۔ مسلم لیگ کو بڑی کثرت سے سیٹیں ملیں۔ پاکستان جمہوری پارٹی کو بھی خوب ملیں۔ خیر، وہ حصہ ہی کیا تھا؟ سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے وہ حصہ لینا ہی غلط تھا۔ اس میں بھی ہم نہ بڑا حصہ لے سکے اور نہ کوئی صحیح معاملہ بندی (bargaining) کرسکے۔

پھر مشرقی پاکستان کے غیر فوجی گورنر ڈاکٹر اے ایم مالک [ستمبر- دسمبر ۷۱ء] کی سربراہی میں ایک عبوری صوبائی کابینہ بنی، جس میں دو وزارتیں ہمارے سپرد کی گئیں۔ مولانا عباس علی خاں [م: ۳ اکتوبر ۱۹۹۹ء] وزیر تعلیم اور مولانا ابوالکلام محمد یوسف وزیر مال بنائے گئے۔ اگرچہ میں اس کے حق میں بھی نہیں تھا، لیکن تحریک کے کارکن کی حیثیت سے میں نے پوری معاونت کی اور نظم کی ہدایت پر سرکاری اجلاسوں میں بھی شرکت کرتا رہا۔

یہ وہ آخری چیز تھی جس نے مجھے مشرقی پاکستان میں فعال اور پُرجوش سرگرمیوں سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔

کمپنی کی جانب سے دریا پر بیراج بنانے کا ایک پراجیکٹ تھا، جس کے ڈیزائن کو تیار کرواکے مجھے اس کے قابلِ عمل ہونے کی (فزیبلٹی) رپورٹ لکھنا تھی۔ یہ کام مؤخر ہوتا

آ رہا تھا۔اس سال کے چھے ماہ بھی نکل گئے تھے۔واپڈا والے خفا تھے۔کمپنی، واپڈا سے پیسے لے چکی تھی۔فرض شناسی کا تقاضا تھا کہ اس کام کو مکمل کیا جائے۔ جماعت کی سرگرمیاں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ میں اپنی بنیادی تنظیمی ذمہ داریوں کے سوا، اجتماعی سرگرمیوں سے دست کش ہو کر بیٹھ گیا اور پراجیکٹ رپورٹ لکھنا شروع کی۔ اللہ کا فضل ہے کہ اکتوبر تک یہ رپورٹ لکھ کر متعلقہ حکام کے سپرد کر دی۔الحمدللہ یہ کام مکمل کیا۔

سفرِ برطانیہ

اسی عرصے میں برطانیہ میں مسلم طلبہ تنظیموں کے وفاق FOSIS (فیڈریشن آف اسٹوڈنٹس اسلامک سوسائٹیز) کی سالانہ کانفرنس ہونا طے پائی۔ انھوں نے مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی۔ ڈھاکہ جماعت سے وابستگی کے بعد بیرونِ ملک کسی تحریکی حلقے کی طرف سے یہ پہلی دعوت تھی۔ دسمبر ۷۰ء سے اب تک جو پالیسی رہی، اس کی وجہ سے ذاتی طور پر مسلسل دھچکے محسوس کر رہا تھا۔اسی سوچ بچار میں تھا، کہ یہ کیوں ہو رہا ہے، ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ جماعت اس دلدل سے نکل کر اپنی منزل کی طرف کس طرح جائے؟ وغیرہ وغیرہ...... جب کانفرنس میں شرکت کی دعوت آئی، تو میں نے قبول کر لی۔اس طرح برطانیہ میں تحریکی رفقا سے ملاقات ہوگئی۔ چند روز بعد ڈھاکہ واپس آ گیا۔

فوجی حکام، چند تاثرات

۱۹۷۱ء میں، صوبائی سطح پر مارشل لا حکام سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں، البتہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان [گورنر: جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء] سے ملاقات نہیں ہوئی۔لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ محمد یعقوب خان صاحب [گورنر: ستمبر ۶۹ء اور مارچ ۱۹۷۱ء] سے غلام اعظم صاحب کے ہمراہ ملاقات ہوئی تھی۔یعقوب صاحب بڑے شریف، نستعلیق، صاحبِ مطالعہ اور نرم خُو آدمی تھے۔

ان کے علاوہ میجر جنرل راؤ فرمان علی صاحب اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایک دین پسند آدمی تھے۔ جماعت کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ ایک ملاقات میں انھوں نے مجھ سے یہ دل چسپ سوال کیا تھا کہ ''اگر آپ کو اقتدار مل جائے تو آپ اپنا پروگرام کس طرح نافذ کریں گے؟''

ابھی میں نے جواب دینا شروع نہیں کیا تھا، کہ خود ہی کہنے لگے: ''مارشل لا میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے کوئی بھی منصوبے یا پروگرام ہوں اور فیصلے یا عزائم ہوں، یہ تمام کے تمام frustrate ہوکر بالکل ناکام ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے پاس مسلح افواج کی ایک بہترین تنظیم اور اتھارٹی رکھنے والی طاقت بھی موجود ہے، لیکن خود ہماری سول بیوروکریسی ان کو عملی جامہ نہیں پہناتی، بلکہ عمل درآمد سے پہلے ان کی روح نکال کر رکھ دیتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جب تک آپ تحصیل دار کی سطح تک، کمیونسٹوں کی طرح اپنے کسی تربیت یافتہ بااعتماد، بے لوث اور سمجھ دار فرد کو مقرر نہیں کریں گے، اس وقت تک آپ اپنے پروگرام کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نافذ نہیں کرسکیں گے۔ اسلامی انقلاب کا نفاذ تو ایک بہت بڑا کام ہے، اس کے لیے بہت زیادہ تربیت یافتہ، ہوشیار، دیانت دار، خدا خوف اور ایکسوٹیم تیار کرنا پڑے گی''۔

میرے خیال میں راؤ فرمان علی صاحب کی یہ بات بے وزن نہیں ہے۔ ان کا بیان کردہ نکتہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ گویا کہ راے عامہ کی ہم نوائی اور کثیر تعداد کے دلوں میں آمادگی کے باوجود، ہم اس نوعیت کے سپاہی، کارکن اور سرکاری کارندوں کی موجودگی کے بغیر وہ انقلاب نہیں لاسکتے، کہ جسے رات کے اندھیرے میں سونے کا تاج مل جائے اور وہ اپنا نام ظاہر کیے بغیر، سپہ سالار کے خیمے میں پہنچادے کہ ''یہ اُمت مسلمہ کی امانت ہے''۔

نفاذِ اسلام کا کام صرف قانون کے ڈنڈے، حکومت کی گرفت، پارلیمنٹ میں اکثریت اور سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ایک بڑی ٹیم کے من کی دنیا میں تبدیلی ضروری ہے۔ یہ حقیقت سب کے سامنے ہے کہ صدر ایوب خان کی شکل میں

ایک فرد کے ہاتھ میں زبردست اقتدار آیا تھا، مگر وہ پوری طاقت رکھنے کے باوجود 'اگرتلہ سازش کیس' کی سماعت تک نہ کرا سکے۔ جنرل یحییٰ خان پوری قوت اور مغربی پاکستان سے پیپلز پارٹی کی پشت پناہی رکھنے کے باوجود شیخ مجیب پر مقدمہ نہ چلا سکے۔

اسی طرح بعد میں مجیب الرحمٰن اور مسٹر بھٹو محض عوامی تائید کا زبردست طوفان اٹھانے کے باوجود، اپنے پرستار عوام کی معاشی حالت نہ سدھار سکے۔ حالانکہ وہ مقبولیت کے بامِ عروج پر تھے، ان کا ایک اشارہ کاروبارِ زندگی کو معطل کر سکتا تھا، اور ان کے منہ سے نکلا ہوا جملہ قانون بن جاتا تھا۔ جسے نہ عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا تھا، نہ اخبارات ردعمل دے سکتے اور نہ عوام میں جوابی ردعمل اُبھر سکتا تھا۔ ابتدائی برسوں میں تو فوج تک میں یہ دم خم نہ تھا کہ وہ سرتابی کر سکے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ چند روایتی اقدامات کے سوا وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں تبدیلی لانے کے لیے محض حکومت اور صرف ووٹ کی قوت ایک بڑی محدود چیز ہے۔ اصل چیز خود معاشرے کے اندر قلبی آمادگی اور فکری تبدیلی رونما کرنا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومت و سیاست اور اختیارات کے سرچشموں پر فائز لوگوں کی فکری تربیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

'دوستوں' کی مدد کا انتظار

اس وقت بھی ہمارا یہ خیال تھا کہ پاکستان کو توڑنے کے اس عمل میں کردار ادا کرنے والی بیرونی قوتوں میں امریکا اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اگرچہ اس حوالے سے خبریں بہت ہی کم گردش کر رہی تھیں۔

میں نے اپنا تجزیہ پیش کیا تھا کہ: ''امریکا کو پاکستان سے واحد دل چسپی روسی کمیونزم کے خلاف ایک دفاعی لائن کے حوالے سے ہے۔ باقی یہ پاکستانی مقتدر طبقوں یا صاحبِ اقتدار لوگوں کے ہوائی قلعے ہیں کہ امریکا، بھارت کے خلاف ہماری کوئی فوجی مدد کرے گا۔ یہ حقیقت تو ستمبر ۱۹۶۵ء میں صاف ظاہر ہوگئی تھی کہ امریکا، بھارت کے خلاف کبھی ہمیں

فوجی امداد نہیں دے گا۔ یاد رہے کہ ۶۵ء میں امریکا نے پاکستان کی امداد مکمل طور پر بند کردی تھی۔ البتہ اشترا کی روس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے وہ صرف مغربی پاکستان کی ضرور فوجی مدد کرے گا، کیونکہ گرم پانیوں تک روس کی رسائی کا راستہ روکنے کی آخری دیوار مغربی پاکستان ہے۔ جس کے ایک طرف افغانستان کی بفر ریاست ہے اور دوسری جانب خلیج فارس کا دھانا اور بحر ہند کا وسیع و عریض دامن ہے۔ صرف اس حوالے سے امریکا نے پاکستان کے ساتھ 'سیٹو' [SEATO-ستمبر ۱۹۵۴ء] اور 'سینٹو' [CENTO-۲۳ ستمبر ۱۹۵۵ء] جیسے دفاعی معاہدے کیے ہیں۔ جن کا مقصد اشترا کی روس کے خلاف پاکستان کو استعمال کرنا ہے۔ اس کارِ خیر کے لیے ہمارے وزیر اعظم لیاقت علی خان صاحب نے اپریل ۱۹۵۰ء کے دوران میں امریکا کو پیش کش کی تھی کہ ہم آپ کی فرنٹ لائن رہیں گے۔ امریکیوں اور ہمارے پالیسی سازوں کے نزدیک مشرقی پاکستان ایک محض دفاعی بوجھ ہے، جو جمہوریت کے نام پر مسلسل شورش پسندی اور بے اطمینانی کا ذریعہ ہے، جہاں سیاسی طور پہ ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ ویسے بھی مشرقی پاکستان کے راستے جمہوریت آنے کا 'خطرہ' ہے جو سردست امریکا کے لیے پسندیدہ نہیں ہے۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے اتحاد سے بننے والے ملک میں کسی بھی ڈکٹیٹر کے لیے مشکل ہے کہ وہ اپنی آمریت قائم کرے۔ البتہ ایک جمہوری سربراہ کی بہ نسبت امریکا کے لیے ایک ڈکٹیٹر سے معاملہ کرنا آسان ہے۔ ان حالات میں امریکا کا بہترین مفاد یہ ہوگا کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کے 'بوجھ' سے آزاد ہو اور اشترا کی خطرہ روکنے کے لیے زیادہ قابلِ عمل روپ میں ڈھل سکے''۔

۱۶ دسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ سے چند روز قبل خبریں آئیں کہ ''امریکا کا ساتواں بحری بیڑہ خلیج بنگال کی طرف بڑھ رہا ہے''۔ بلکہ اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ''یہ پاکستان کی مدد اور مشرقی پاکستان میں جنگ کو روکنے آ رہا ہے''۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ''یہ باتیں ایک خیالی دنیا میں رہنے والے ہی سوچ سکتے ہیں، میرے خیال میں تو وہ صرف مغربی پاکستان کو بچانے آ رہا ہے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان میں ۳ دسمبر کو کھلی جنگ چھڑی تھی، اور ۵،۶ دسمبر تک یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب اس کو الگ ہونے سے کوئی مادی سہارا نہیں بچا سکتا۔

میرے خیال میں امریکیوں نے یہ بھانپ لیا ہے کہ اب اس کے بعد مغربی پاکستان کو خطرہ لاحق ہے، اس لیے وہ آرہا ہے''۔

پاک امریکا تعلقات پر ترجمان القرآن [اگست ۱۹۹۵ء] کے 'اشارات' لکھتے وقت میں نے بہت سی دستاویزات کا مطالعہ کیا، تو معلوم ہوا کہ ۱۹۷۱ء میں واشنگٹن میں پالیسی سازوں کے اجلاس میں واقعی یہی بات زیر بحث تھی۔ اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے تو لکھا ہے کہ: ''مغربی پاکستان کی طرف بھارت کے حملے اور عمل دخل کی خبر پر ہم نے اسے وارننگ دی اور اس وارننگ میں زور پیدا کرنے کے لیے ہم نے اپنے ساتویں بحری بیڑے کو حرکت دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت نے ہم کو ضمانت دے دی کہ وہ مغربی پاکستان کو نقصان نہیں پہنچائے گا''۔ اس کے بعد جنگ بندی ہوگئی۔

بھارت کا مفاد اسی میں تھا کہ پاکستان ٹوٹ جائے، اور مشرقی پاکستان الگ ہوجائے۔ مگر دوسری طرف پاکستان اور بھارت کے درمیان طاقت کے توازن کا نظریہ بھی تھا۔ اگرچہ خود امریکا اور یورپ کے آزاد پالیسی ساز ادارے بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ''پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تو اس علاقے میں اسٹرے ٹیجک توازن بری طرح بگڑ جائے گا اور بھارت کو کلیدی مقام حاصل ہوجائے گا''۔ مگر پاکستان ٹوٹنے کے لمحوں میں وہ تمام ادارے بظاہر غیر جانب دار اور عملی طور پر بھارت کے طرف دار ہی نکلے۔

پاکستان بچانے کے لیے بیرونی طاقتوں اور وسیلوں پر انحصار کی غلط فہمی دو چار افراد تک محدود نہ تھی، بلکہ پاکستان کی فوج میں بھی ان طاقتوں سے مدد کی توقع پائی جاتی تھی۔ حالانکہ ۶۵ء کی جنگ سے پہلے بھی یہ خیال تھا کہ جس امریکا سے اتنی دوستی اور یاری ہے، ہماری ضرور مدد کرے گا، مگر وہ تو پاکستان پر پہلا بھارتی گولہ پڑتے ہی دھوکا دے چکا تھا۔ اس نے نہ صرف مدد نہیں کی، بلکہ جتنی امداد دے رہا تھا، وہ بھی بند کر دی۔ اسی طرح اب ۱۹۷۱ء میں معلوم نہیں کہ پاکستان نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا تھا کہ جس کی بنیاد پر اکثر سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگ اور فوجی افسر تک بھی اس خیال میں مگن تھے کہ ''عوامی جمہوریہ چین سے

لڑاکا جنگی جہاز ہماری مدد کو آئیں گے"۔

ادھر ہمارے جنگی اور دفاعی منصوبہ سازوں کی غیر ذمہ داری کی انتہا دیکھیے، کہ صرف ڈھاکہ میں ایک قابلِ ذکر ایئر بیس تھی۔ جسے بھارت نے پہلے ہی دن بمباری کر کے بے کار کر دیا تھا۔ اس کے رن وے پر ۳۰ فٹ گہرا گڑھا پڑ گیا تھا، جس نے پاکستان کے ۲۴ برسوں میں بننے والی واحد ایئر بیس کو مٹی اور گارے کی دلدل میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہاں پر ہماری فضائیہ کے پاس غالباً صرف چھے ہوائی جہازوں کا سرمایہ تھا۔ وہ بھی پرانے قسم کے تھے، جن کا دشمن فضائیہ سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ پاکستانی فضائیہ میں بھی ہماری تمام جمع شدہ قوت مغربی پاکستان میں موجود تھی اور اس کا یہ اکثریتی بازو اس دفاعی چھتری سے محروم تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو ایک ذمہ دار فوجی عہدے دار نے اپنی خوش فہمی کو لفظوں کا روپ دے کر مجھے بتایا کہ "ہمارے پائلٹ چین گئے ہوئے ہیں، وہاں سے طیاروں میں آ کر بھارتی فضائیہ کو منہ توڑ جواب دیں گے"۔ انھوں نے بھلا کہاں آنا تھا اور کیوں آنا تھا، مگر یہ ضرور ہے کہ بھارتی فضائیہ کے لڑاکا طیارے بلاخوف و خطر اور کھلم کھلا ہماری فضاؤں میں اڑتے پھرتے اور جس طرح چاہتے حملے کرتے تھے بلاشبہہ ہماری طیارہ شکن توپیں ان پر گولیاں برساتی تھیں، لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھیں۔ یہ ہمارے لوگوں کی سادگی کی انتہا تھی کہ وہ پرائی قوت کو اپنی طاقت سمجھ رہے تھے۔

ایک اور واقعہ، دل چسپ ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہے۔

یہ واقعہ چند فوجی بھائیوں نے مجھے بھارت کے جنگی قیدی کیمپ میں سنایا تھا۔ ان فوجیوں نے بتایا کہ "ہم جمال پور (ضلع میمن سنگھ) سے پیچھے ہٹتے ہوئے ڈھاکہ آ رہے تھے۔ ابھی ہم راستے میں تھے کہ بھارت نے اپنی چھاتہ بردار کمانڈو فوج کو اس علاقے میں اُتارنا شروع کیا، جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ جب دشمن کی چھاتہ بردار فوجیں زمین پر اُتر رہی ہوں تو یہ بہترین وقت ہوتا ہے، کہ انھیں اپنی فائرنگ کی زد میں لا کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے اپنے بریگیڈیئر کمانڈر سے کہا کہ "یہ تو بھارت کے فوجی آ رہے ہیں۔

اس لیے ان پر حملہ کیا جائے"۔ مگر کمانڈو صاحب نے کہا: "نہیں، یہ تو عوامی جمہوریہ چین کے لوگ ہماری مدد کو پہنچ رہے ہیں"۔ یہ بات ان فوجیوں نے مجھے بتائی جنھوں نے خود اپنے کانوں سے یہ مکالمہ سنا تھا۔

بھارت کے فوجیوں کا لباس ذرا گہرا سیاہی مائل سبز ہوتا ہے۔ مختلف حکایتوں کے بل پر سبز رنگ کے ساتھ فرشتوں کی غیبی مدد کا آنا ہمارے اَن پڑھ ہی نہیں بلکہ خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی نفسیات، سوچ اور خوابوں کا حصہ ہے۔ چنانچہ ہمارے فوجیوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بھارتی کمانڈو اُتر آئے اور اُترنے کے بعد انھوں نے پاکستانی بریگیڈیئر صاحب سمیت بہت سے فوجی جوانوں کو گھیرے میں لے کر گرفتار کرلیا۔ جب فوجیوں نے یہ قصہ سنایا، تو مجھے یاد آیا کہ ۱۲، ۱۳ دسمبر کو بھارتی ریڈیو نے یہ خبر دی تھی کہ "ایک پاکستانی بریگیڈیئر کو گرفتار کرلیا گیا ہے"____ اس واقعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں فرمان علی صاحب نے بیرونی امداد کے حوالے سے ہمیں کوئی ایسی بہلانے والی بات نہیں کہی تھی، بلکہ یہ خوش فہمی ہمارے جسدِ قومی میں راسخ ہوچکی تھی۔ ایک یہی کیا اور بھی بہت ساری خوش فہمیاں عقل پر پردہ ڈالنے والی تھیں۔

پناہ

حالات جس انتہا پر پہنچ چکے تھے، ان میں یہ واضح تھا کہ جنگ شروع ہوگی اور شاید بنگلہ دیش بننے پر ختم ہو۔ اس خطرے کے پیشِ نظر میں نے اپنے بیوی بچوں کو دوسری بار نومبر ۱۹۷۱ء میں کراچی بھیج دیا تھا۔ جب ۳ دسمبر کو باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی تو تین چار دن ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ اب یہاں پر پاکستانی انتظامیہ اور فوج کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ بہت سے لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ پاکستان کی کامیابی کا امکان ہے حالانکہ یہ عجیب قسم کی غلط فہمی تھی۔ البتہ مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اتنی تربیت یافتہ فوج یوں ہتھیار ڈال دے گی۔ بہرحال ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان صرف ۳ دسمبر سے ۱۵ دسمبر تک جنگ ہوئی۔ نہیں، بلکہ پاکستان کی افواج تقریباً مارچ ۱۹۷۱ء ہی سے

سخت نفسیاتی اور جنگی دباؤ میں تھیں۔ ۸، ۹ دسمبر کو مشرقی پاکستان کی پوری فضاؤں میں دشمن کی فضائیہ کا راج تھا اور پاکستان کے ہوائی جہاز اُڑ نہیں سکتے تھے۔ کہیں سے کوئی کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہر طرف چہروں پر وہ شکست دکھائی دیتی تھی، جو بہت جلد آنے والی تھی۔

ایک طرف میں اُردو بولنے والا تھا اور دوسری جانب جماعت اسلامی کا بھی ایک معروف اور نمایاں آدمی تھا۔ ان حالات میں میرا بچ نکلنا بڑا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ خود کسی سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ مجھے پناہ دو۔ یہ درخواست صرف اللہ سے کروں گا اور اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھوں گا، کہ وہی اپنی حکمت سے مجھے اس کا موقع فراہم کرے۔ اس جنگ کے زمانے میں، میں جگہ جگہ جاتا رہا، کیونکہ بڑے وسیع تعلقات تھے۔

یہ گیارہ اور بارہ دسمبر کی بات ہے۔

میرے دل میں خیال آیا کہ جن افراد سے پُرتپاک تعلقات ہیں، وہ مجھے ضرور دعوت دیں گے کہ ہمارے پاس آ جاؤ۔ جیسا کہ بتا رہا ہوں، شکست واضح تھی اور اس کے بعد کا ہولناک منظر بھی سامنے تھا۔ اتفاق سے سبھی ملنے والے صرف یہ پوچھتے تھے کہ ''آپ کا کیا ہوگا''۔ پھر وہ میرے بارے میں اپنی گہری تشویش اور پریشانی کا اظہار کرتے تھے، مگر ان میں سے کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا، جو ہمدردی کے ان جملوں سے آگے بڑھ کر کہتا کہ ''تم میرے پاس میرے گھر اور میری پناہ میں آ جاؤ، میں تمھاری حفاظت کروں گا اور تمھیں یہاں سے نکلنے میں بھی مدد دوں گا''۔ نہیں، ایسا کوئی جملہ یا ایسی کوئی بات کہیں سے سننے میں نہیں آرہی تھی۔ جماعت کے لوگ تو خود مجھ جیسی حالت سے دوچار تھے، اس لیے وہ پناہ دینے والوں میں نہیں بلکہ خود پناہ لینے والوں میں تھے۔

اسی حالت میں ۱۳ اور ۱۴ دسمبر ہوگئی۔ میں جگہ جگہ پریشان، گھومتا پھرتا رہا۔ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے یہ پختہ ارادہ باندھ رکھا تھا، کہ یہ درخواست کسی فرد سے نہ کرنی پڑے

کہ وہ مجھے اپنے پاس جگہ دے، ٹھکانہ دے، پناہ دے یا اس مصیبت سے نکالے، کہ جو مصیبت بھارت اور مکتی باہنی کی صورت میں آنے والی ہے۔ میں صرف اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ وہ کوئی اسباب پیدا کردے۔

میری کمپنی میں ایک ڈائرکٹر متین صاحب تھے۔ وہ بڑے اچھے ساتھی تھے۔ وہ ملے مگر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ اسی طرح کمپنی میں ساتھ کام کرنے والے ایک بنگالی نژاد چیف انجینیر تھے، وہ بھی ہمدردی کے چند جملوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ میرے بہنوئی ہمایوں صاحب نے مجھ سے کہا: ''ہمارے ہاں آجائیں'' لیکن ان بُرے حالات میں وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ میری وجہ سے وہ کسی مشکل میں پھنس جائیں۔

حتیٰ کہ آخری سے ایک دن پہلے، یعنی ۱۵ دسمبر کو میں اپنے گھر دھان منڈی میں رہ رہا تھا۔ ان حالات میں وہاں پر رہنا کوئی رہنا تو نہیں تھا۔ کیونکہ جماعت کے ایک معروف آدمی کا گھر تو پہلے ہی سے 'مکتی باہنی' کا ٹارگٹ تھا۔ گویا کہ اس روز میں اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی بے گھر تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ کہاں لے جایا جاؤں گا؟ ڈھاکہ جیل میں جاؤں گا، یا مار پیٹ کر میری کھال کھینچ لی جائے گی، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بس اللہ کی ذات پر بھروسا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس پریشانی کے باوجود دل اس طرح مضطرب نہیں تھا، کہ دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ یہی خیال تھا، اگر زندگی باقی ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی صورت نکالے گا، اور وہی صورت سب سے بہتر ہوگی۔ اور اگر موت کی گھڑی سر پر آن کھڑی ہے تو کہیں بھی چلا جاؤں، نہ ایک سانس زیادہ لے سکوں گا اور نہ کوئی فرد مجھے ایک سانس پہلے مار سکے گا۔ برابر یہ دعا کر رہا تھا کہ یا اللہ! مجھے کسی ایسی آزمایش میں نہ ڈالنا جو میری حدِ استطاعت سے باہر ہو۔

یہ ۱۶ دسمبر کی صبح تھی۔ میں اکیلا اپنے صحن میں کھڑا تھا، معلوم نہیں کیوں، اچانک محبوب انعام سے ملنے چلا گیا، جو ابوالمنصور صاحب کے بیٹے اور محفوظ انعام کے بڑے بھائی تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی ہمدردی کے لمبے چوڑے بول سنانے کے بجائے بے ساختہ

یہ کہا: ''آپ بلا تکلف میرے پاس آجائیے اور رہیے۔ جب بھی فضا کچھ سازگار ہوگی تو میں خود آپ کو اسلام آباد لے جاؤں گا یا کلکتہ چھوڑ آؤں گا''۔ یہ ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ ظاہر ہے کہ اس پیش کش کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں تھی، کہ اگست ۱۹۶۹ء کو میں نے اسلامی اخلاقیات کا ادنیٰ سا مظاہرہ کرتے ہوئے اِن کے چھوٹے بھائی کے معاملے میں ایک طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور جمعیت کے ساتھیوں کو آمادہ کیا تھا کہ محمد عبدالمالک شہید کے مقدمے میں وہ سچی بات کریں گے۔ اس کے بعد محفوظ انعام کو پہلے اپنے گھر پر رکھا تھا، اور پھر کراچی جانے میں مدد کی تھی۔

یہ اسی کا نتیجہ تھا، کہ انھوں نے اپنے گھر میں مجھے ٹھکانہ دیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہاں کے فتنے اور فساد سے زندہ نکل آنے کا انھیں ایک ذریعہ بنایا۔ یہ اس چیز کی چھوٹی سی مثال ہے کہ ولا تستوی الحسنة ولا السیئة: بھلائی اور برابر نہیں ہوتے۔ یہ میں نے ہمیشہ دیکھا ہے، کہ اگر ہم برائی کا جواب بھلائی سے دیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، ممکن ہے کہ فوری طور پر کوئی بڑا فائدہ نہ ہو، لیکن جو نقصانات اس برائی کا جواب کسی برائی سے دینے کے نتیجے میں رونما ہوتے ہیں، ان سے بہرحال بچا جا سکتا ہے۔

یہ ۱۶ دسمبر وہ دن تھا، جب ڈھاکہ ریس کورس گراؤنڈ میں پاکستانی کمانڈر جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی صاحب نے بھارتی کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس کے بعد مکتی باہنی کے لیے یہ کھلی اجازت تھی کہ وہ جماعت اور جمعیت کے لوگوں کو، اُردو، پنجابی اور پشتو بولنے والوں کو جہاں چاہیں، پکڑیں اور جس طرح چاہیں، اذیتیں دے دے کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اگرچہ بظاہر بھارتی فوج انھیں منع کرتی تھی، مگر وہاں پر کوئی اتھارٹی نہیں تھی۔ آزادی کا جوش اور فتح کی خوشی ایک ہیجانی جذبے اور انتقام کے شعلے میں ڈھل چکی تھی۔ جس کا اظہار خون کی ہولی کھیل کر کیا جا رہا تھا۔ ابوالمنصور صاحب عوامی لیگ کے بزرگ رہنما، سابق نائب وزیراعظم اور حسین شہید سہروردی مرحوم کے رفیق کار کا گھر میرا گوشۂ عافیت تھا۔ حالانکہ ان کے بیٹے مکتی باہنی کے مسلح گوریلے تھے۔

جب یہ ابتدائی سخت ترین دن گزر گئے تو میں نے خود ہی ان سے کہا کہ ''آپ میرے

بوجھ سے آزاد ہو جائیں'' حالانکہ مجھے رخصت کرنے کی انھیں کوئی جلدی نہ تھی۔ لیکن میرے اصرار پر انھوں نے مجھے ڈھاکہ چھاؤنی میں عبوری طور پر قائم شدہ جنگی کیمپ میں حفاظت کے ساتھ پہنچا دیا ـــــ جہاں سے میں جنوری ۷۲ء میں نرائن گنج سے بھارت روانہ کر دیا گیا اور پھر جنگی قیدی کیمپ نمبر ۵۰ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ کیمپ بھارتی ریاست مدھیہ پردیش کے شہر ساگر سے تقریباً ۲۰ میل دُور دھانہ گاؤں میں واقع تھا۔



جستجو

سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ ۹۰ ہزار پاکستانی دشمن ملک کی قید میں تھے۔

یوں تو یہ سارے، ایک سے بڑھ کر ایک محترم تھے۔ لیکن ان میں ایک نام اپنی قدر و منزلت کے اعتبار سے انفرادی شان کا حامل تھا ــــ یہ نام تھا: خرم مراد۔

ہر آن ایک دھڑکا لگا رہتا تھا،

اس گوہرِ تاب دار کو کہیں مکتی باہنی کے حوالے نہ کر دیا جائے۔

دشمن کہیں انھیں ختم نہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے انھیں خیریت سے رہائی دلائی۔ جب وہ رہا ہو کر آئے تو، جنگی قیدیوں کے کیمپ میں گزرے ایام کے پس منظر میں، اپنے ساتھ تجربات و مشاہدات کا ایک انوکھا خزینہ لے کر آئے۔ وہ اپنے ایامِ قید و بند کی یادوں کا ذکر کرتے تو ایک حکایتِ لذیذ کا احساس ہوتا۔ جی چاہتا تھا: وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ سننے والے پر ایک سحر سا طاری ہو جاتا۔

گھریلو مسائل اور اس سے بڑھ کر تحریکِ اسلامی کی گوناگوں مصروفیات نے انھیں موقع ہی نہ دیا، کہ وہ ان لمحوں کی روداد کو قلم بند کرتے۔ پھر ایران، سعودی عرب اور انگلستان میں کئی سال قیام کے بعد، جب وہ پاکستان آئے تو مسلم سجاد صاحب اور راقم نے اپنے مطالبے کا دائرہ اور وسیع کر دیا۔ پہلے ہمارا مطالبہ صرف قید و بند کی روداد تک محدود تھا،

لیکن اب ہم نے اس میں مشرقی پاکستان میں دعوت و تنظیم کے تجربے کی تفصیلات دینا بھی شامل کردیا۔ اس سے قبل ۱۹۸۰ء میں عزیز دوست جناب سید متقین الرحمٰن کے ہمراہ جب وہ ناظم اعلیٰ تھے (اول) کے لیے ان سے انٹرویو کیا تھا۔ یہ انٹرویو فکر، احتساب، امکانات اور تجربات کا خوش رنگ اور مہک بیز گلدستہ تھا۔ اس انٹرویو نے خرم صاحب کی سبق آموز یادداشتوں کے حصول کی خواہش کو دوچند کردیا۔

ویسے تو خرم صاحب کی صحت ایک عرصے سے اچھی نہیں تھی، لیکن ۱۹۹۳ء کے بعد ان کی شخصیت اس بڑے سائباں کی مانند تھی، جو اپنی وسعتوں کے ساتھ، گرنے اور سمٹنے سے پہلے کچھ مزاحمت کرتا ہے۔ ہم انھیں اپنی یادیں قلم بند کرنے کے لیے کہتے رہے۔ پہلے تو وہ اس کے لیے قائل نہ ہوئے۔ جب اصرار میں دلیل کی آمیزش ہوئی تو وہ کچھ کچھ مان گئے، لیکن اس کے بعد بھی ان کی صحت اور مصروفیات آڑے آتی رہیں۔

۱۹۹۵ء کے اختتام پر تکلیف بڑھ گئی تو محترم پروفیسر خورشید احمد کے اصرار پر خرم صاحب اپنے بیٹے فاروق مراد کے پاس انگلستان چلے گئے، تاکہ روز افزوں دردِ دل کا درماں تیسری جراحت کے ذریعے سے کیا جاسکے۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم نے انھیں جولائی ۱۹۹۶ء میں سوال نامے کی شکل میں ایک مفصل خاکہ ارسال کیا۔ وہ اس خاکے پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی یادداشتوں کو ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ طبیعت کی سخت خرابی کے باوجود اپنے وعدے کی تکمیل کے لیے وہ روزانہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ نکالتے رہے۔ (اس مشق یا مجلس میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے ہمارے ایک کرم فرما محترم مولانا ابوالفاروق صاحب نے بڑی باقاعدگی سے ایک سامع کا کردار ادا کیا)۔ حتیٰ کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے واقعے تک حوادث، تجربات اور تاثرات کو ریکارڈ کردیا۔ پھر یہ کہہ کر اسی سال ستمبر میں یہ کیسٹ پاکستان بھیج دیے کہ ''سن لیں اور بتائیں، اگر اس میں کوئی افادیت ہے تو آگے چلوں''۔ چند در چند مصروفیات کے باعث فوری طور پر ہم ان کیسٹوں کو نہ سن سکے، اور ظاہر ہے کہ انھیں کوئی ردِعمل بھی نہ دے سکے۔

اسی دوران اکتوبر ۱۹۹۶ء کے وسط میں، راقم سڑک کے ایک خطرناک حادثے کا شکار ہوگیا، یہ حادثہ نہیں تھا، بلکہ اپنی قبر کا مشاہدہ تھا۔ پھر بستر سے ایسا لگا کہ دائمی معذوری سے بچنے کی بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ ڈاکٹروں نے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لیے، جسم کو آہنی شکنجوں میں کس دیا، تو نومبر کے وسط میں یہ کیسٹ سننے کا موقع ملا، تب معلوم ہوا کہ یہ توقع سے کہیں زیادہ مؤثر چیز بن گئی ہے ــــــ راقم نے اپنے تاثرات سے بذریعہ فیکس خرم صاحب کو آگاہ کیا۔ جوابی فون آیا، جس میں انھوں نے تشکر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ لوگوں نے اپنا تاثر بیان کرنے میں بڑی دیر کر دی۔ بہرحال انھیں مرتب کر دینا، اگر اللہ کو منظور ہوا تو نظرثانی کرلوں گا، ورنہ اعتماد کے ساتھ یہ تمھارے سپرد کر رہا ہوں''۔ پھر اس ضمن میں بطور ہدایت چند احتیاطوں کا ذکر کیا۔

تین ہفتے بعد خرم صاحب کے دل کا تیسرا آپریشن تھا۔ انھیں بڑی حد تک اندازہ ہو چکا تھا کہ مہلت بہت کم، بہت ہی کم ہے۔ ہم نے اصرار کیا کہ'' کچھ مزید گفتگو ریکارڈ کرنے کی کوئی صورت نکالیے''۔ فرمایا: ''یہ تو اب مشکل ہے، تاہم کچھ بھی وقت نکال سکا، تو اپنی ترجیحات میں اسے اہمیت دوں گا، بس دعا کریں'' ــــــ بہرحال انھوں نے آپریشن سے تقریباً ۳۶ گھنٹے پہلے مزید تین کیسٹ ریکارڈ کرا دیے۔ وہ آپریشن تھیٹر گئے، اور پھر لوٹ کر نہ آئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

فروری ۱۹۹۷ء میں اس کام کو مکمل کرنے کی اسکیم بنائی گئی۔ محترم مسلم سجاد نے باہم رابطے اور کیسٹوں سے اُتروانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ کیسٹ اُتارنے میں محمد عرفان صاحب نے مدد کی۔ راقم نے اللہ کا نام لے کر اس مسودے کی ترتیب وتدوین کا نازک کام سنبھالا۔ اس طرح اپنی علالت اور بستر پر پابند ہونے میں یہی خیر کا پہلو نظر آیا کہ مسودہ مرتب و مدون ہوگیا۔

یہ کام کئی اعتبار سے مشکل اور ایک حد تک پیچیدہ عمل تھا۔ اس ترتیب وتدوین میں پیرابندی، ابواب بندی اور ضمنی عنوانات کے علاوہ بعض خلا پُر کرنے اور ترتیب زمانی قائم کرنے کے لیے، خرم صاحب کی دیگر تحریروں، خطوط اور انٹرویوز وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔

یہ کام احتیاط سے کیا گیا ہے۔

موجودہ شکل میں اس کتاب کا مسودہ، مرحوم کے نہایت قریبی احباب: پروفیسر غلام اعظم صاحب، پروفیسر خورشید احمد صاحب، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب اور خرم صاحب کی اہلیہ محترمہ لمعت النور نے دیکھا ہے۔ برادرم متقین الرحمٰن اور ڈاکٹر حسن صہیب مراد نے بھی ایک نظر ڈالی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے تدوین کے لیے قیمتی مشورے دیے۔ اس طرح مسودے کے بعض مقامات کو واضح کرنے میں مدد ملی ہے۔ ان محترم احباب کی محبت بھری توجہ اور زحمت پر اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ کا انتخاب ممکن نہیں۔

لمحات کی کمپوزنگ کے لیے جناب حیدر زیدی نے اپنی بھرپور مہارت استعمال کر کے، اپنے فن کے بارے میں، خرم صاحب کی مثبت رائے کو اور پختہ کر دیا۔ کتاب کی اشاعتی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ بروئے کار لانے کے لیے برادرم راشد الیاس مہر بھی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔

۱۰ جنوری ۲۰۰۰ء
گوجرانوالہ

سلیم منصور خالد